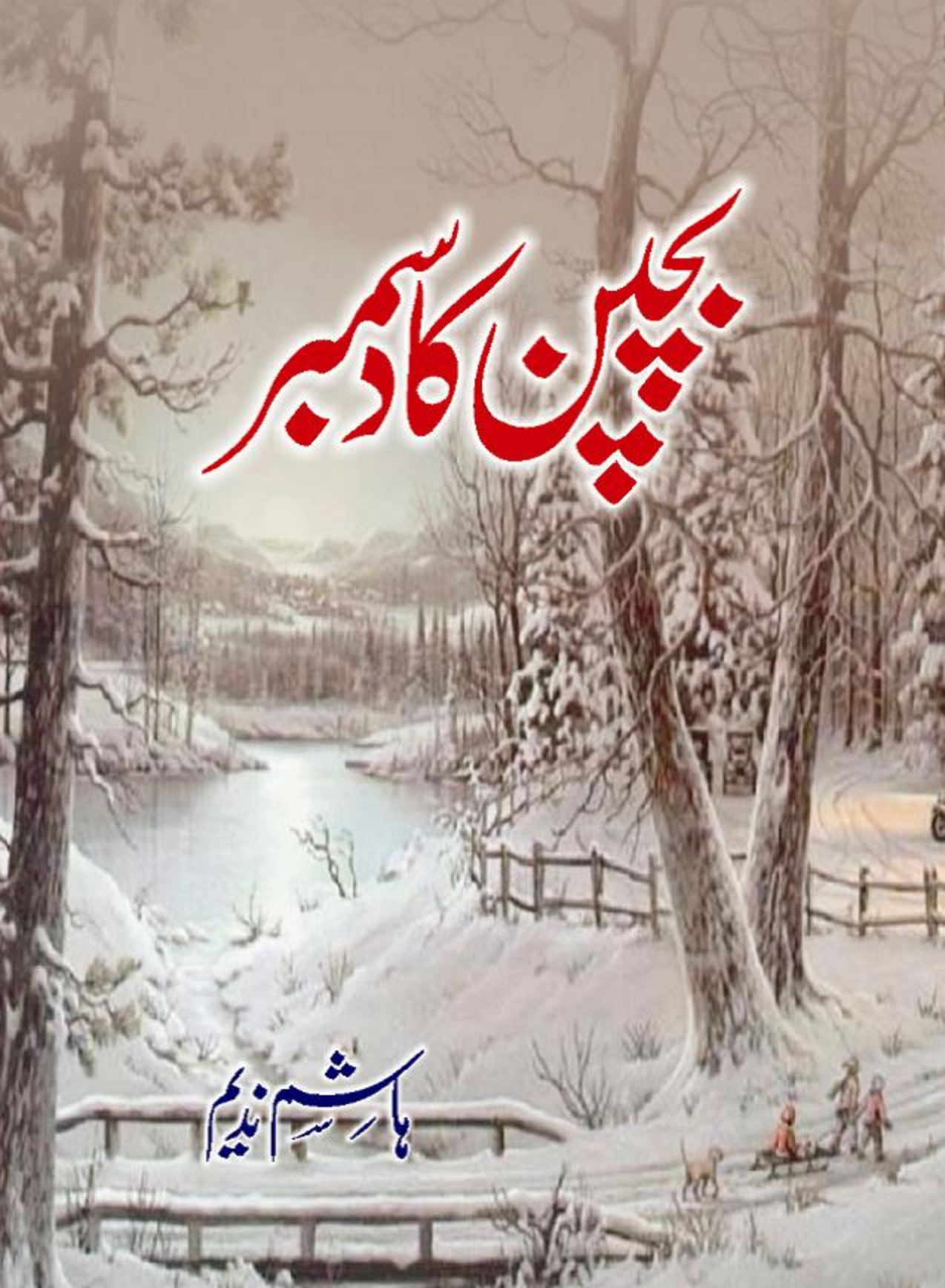


بچپن کا دہرہ

ہاشم ندیم



بچپن کا دسمبر..... دور حاضر کا مقبول ترین ناول..... نازک جذبوں میں گندمی..... بچپن سے جوانی تک کی محبت کی کہانی

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بچپن کا دسمبر

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہاشم ندیم

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

علم و عرفان پبلشرز

40-اردو بازار لاہور

فون: 042-7352332-7232336

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز

(علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس

کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے،

جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

(آخری صفحات میں ادارہ علم و عرفان کے شائع کردہ خوبصورت ناولوں کی تفصیلات ملاحظہ کیجئے)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	بچپن کا دسمبر
مصنف	ہاشم ندیم
ناشر	گل فراز احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور
سن اشاعت	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	اگست 2010ء
	500/- روپے

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ناشر)

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں: 0300-9450911

..... ملنے کے پتے.....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

اشرف بک ایجنسی

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

ویکلم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

کتاب گھر

اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

عالیہ کے نام

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

جن کی وجہ سے میں آج تک اپنے

بچپن کے دسمبر کو جی رہا ہوں۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے

کتاب گھر کو دیجئے۔

کتاب گھر کی پیشکش

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

☆..... کتابی شکل میں ملنے کے پتے.....☆

کتاب گھر کی پیشکش

مکتبہ قابل اردو بازار، لاہور

http://kitaabghar.com

کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فتحیم بکڈ پو، راجپوت مارکیٹ اردو بازار، لاہور

اشرف بک انجینیئرنگ چوک راولپنڈی

فضلی سنز اردو بازار، کراچی

ویکم بک پورٹ اردو بازار، کراچی

کتاب خانہ رشید راجہ بازار راولپنڈی

سعید بک بینک اسلام آباد

کمپنیل بکڈ پو، اردو بازار، راولپنڈی

http://kitaabghar.com

سعید بک بینک، پشاور

یونیورسٹی بک انجینیئر خیر بازار، پشاور

حافظ بک انجینیئر اقبال روڈ، سیالکوٹ

بک سنٹر اردو بازار، سیالکوٹ

پنجاب بکڈ پوسٹر کلر روڈ، گجرات

سلطان بک پبلش، گجرات

فائن بکس امین پور بازار، فیصل آباد

نیو مکتبہ دانش امین پور بازار، فیصل آباد

مقبول بک انجینیئر چوک پاک گیٹ، ملتان

الکریم نیوز انجینیئر، اوکاڑہ

http://kitaabghar.com

چوہدری بکڈ پو بین بازار، دیر

عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ، سرائے عالمگیر

فکیل بکڈ پو، سمندر

مسلم بک لینڈ، بینک روڈ، مظفر آباد

http://kitaabghar.com

نیو ہاڑی کتاب گھر، جناح روڈ، وہاڑی

ہلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ، میاں چنوں

نیو نیس بکڈ پو بین بازار، میانوالی

خالد کتاب محل، سیالکوٹ روڈ، اگواکی

http://kitaabghar.com

پاکستان بکڈ پو بین بازار، جلال پور جٹان

جہلم بک کارنر، جہلم

منور بک ڈپو گجرات

کتاب گھر کی پیشکش

خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

http://kitaabghar.com

مشتاق بک کارنر الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

اسلامی کتب خانہ، فضل الہی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

کتاب گھر کمیٹی چوک، راولپنڈی

علی شیشرز، حیدری چوک، لالہ موسیٰ

رحمن بک ہاؤس اردو بازار، کراچی

احمد بک کار پوریشن اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

مسٹر بکس سپر مارکیٹ اسلام آباد

http://kitaabghar.com

مکتبہ نیا سید پو ہڑ بازار، راولپنڈی

گلد بکس شاپ صدر بازار، راولپنڈی

بختیار سنز قصہ خوانی بازار، پشاور

نگش بکڈ پو اردو بازار، سیالکوٹ

ماڈرن بکڈ پو سیالکوٹ کینٹ

http://kitaabghar.com

کھوکھر بینک اسلام بازار، گجرات

ہلال بکڈ پو، گجرات

کتاب مرکز امین پور بازار، فیصل آباد

کتب خانہ مقبول عام امین پور بازار، فیصل آباد

شریف سنز کارخانہ بازار، فیصل آباد

کارواں بک سنٹر، ملتان کینٹ

http://kitaabghar.com

دارالکتاب کالج روڈ، لیہ

الیاس کتاب محل، کچہری بازار، جرنوالہ

ڈار برادر تحصیل بازار، جہلم

جائیداد بکڈ پو، ڈسکہ

یونائیٹڈ بک ہاؤس، کچہری روڈ، منڈی بہاؤ الدین

شمالی بک انجینیئر محلہ چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

میاں ندیم بین بازار، جہلم

http://kitaabghar.com

اسلامی کتب خانہ، حافظ آباد

کارواں بک سنٹر، بہاولپور

گلکسی بکس، خان آریڈ، کچہری روڈ، سرگودھا

النور بک کارنر محمدی پلازہ، میر پور آزاد کشمیر

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

بچپن کا دسمبر

ہاں مجھے یاد ہے

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

بچپن کا وہ دسمبر

ٹھٹھرتی ڈھلتی شاموں میں

آنگن کی دیوار سے سرکتی دھوپ

جلتے ہوئے کونے کی مہک

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

اور میرے پھٹے ہوئے گالوں پر

لکیریں بناتے

وہ جیمے ہوئے آنسو.....

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

آسمان پر جمتی، وہ بادلوں کی دھند دیکھ کر

امی کا دروازے میں کھڑے ہو کر پکارنا

اور ہم سب کا مٹی بھرے کچے سنبھال کر

اپنے اپنے گھروں کو بھاگنا.....

رات بھر چھپ چھپ کر

آسمان کو دیکھ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

برف گرنے کی دعائیں کرنا

اور پھر صبح پوچھتے ہی

صبح میں گرتی برف کے ستارے چُٹنا.....

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

اور برف گراتے آسمان کو دیکھ دیکھ

خود کو بھی برف کے گالوں کے ساتھ

اڑتے ہوئے محسوس کرنا

پھر تم آگئیں.....

اور بچپن کا دسمبر بیت گیا

تب پہروں اس سرکتی ٹھنڈی دھوپ تلے

اور ان ٹھٹھرتی ڈھلتی شاموں میں

میں تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے

آسمان سے گرتی برف کی چاندی

اپنے وجود پر سجاتا رہا اور

زمین پر بھی اس سفید چادر پر

میرے قدموں کا ہر نشان

تمہارے گھر کی دہلیز تک ہی جاتا رہا

پھر وہ دسمبر بھی بیت گیا

اور دیکھو.....

میں اب بھی گلی کے اسی کنارے پر کھڑا ہوں

ٹھٹھرتی ڈھلتی شام بھی ہے

پر سنہری دھوپ نہیں سرکتی

وقت جیسے تھم سا گیا ہے

برف کے ستارے میرے بالوں میں

چاندی بکھیر تو رہے ہیں

پرانہیں بھگو نہیں پاتے

یہ کیسی بر فیلی شام ہے

جس کی سردی میرے آنسو جما نہیں پارہی

جلتے کوئلے کا دھواں

آنکھ تو جلاتا ہے

پراس میں وہ مہک نہیں ہے

اور دیکھو میرے گھر کا دروازہ.....

پٹ کھولے کھڑا تو ہے لیکن

امی کی ڈانٹ نہ جانے کہاں کھو گئی ہے؟

تمہارے گھر کی طرف جاتے بھی راستے

اس قدر سنسان کیوں پڑے ہیں؟

اس بر فیلی شام میں

اور

میرے بچپن کے دسمبر میں

کتنا فرق ہے

ہاشم ندیم خان

۱۵ جنوری ۲۰۰۸ء

(کوئٹہ)

email: hashimnadeem@gmail.com

کتاب گھر کی پیشکش فہرست کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

پہلا دور

13	پہلی سہیلی	1- کتاب گھر کی پیشکش
17	پہلا اسکول	2- کتاب گھر کی پیشکش
21	پہلا ساون	3- کتاب گھر کی پیشکش
26	پہلا دوست	4- کتاب گھر کی پیشکش
29	پہلی برف باری	5- کتاب گھر کی پیشکش
31	پہلا مجیدہ	6- کتاب گھر کی پیشکش
36	پہلی چوری	7- کتاب گھر کی پیشکش
41	پہلی مار	8- کتاب گھر کی پیشکش
45	پہلا ڈاکہ	9- کتاب گھر کی پیشکش
50	پہلا بائی سکوپ	10- کتاب گھر کی پیشکش
58	پہلی جلن	11- کتاب گھر کی پیشکش
67	پہلا کش	12- کتاب گھر کی پیشکش
73	پہلا بھرم	13- کتاب گھر کی پیشکش
77	پہلا چاند	14- کتاب گھر کی پیشکش
82	پہلا جواہر	15- کتاب گھر کی پیشکش
88	پہلی قربانی	16- کتاب گھر کی پیشکش
97	پہلا الوداع	17- کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش فہرست کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

دوسرا دور

105 جنگلین بسم اللہ -18

113 راجہ کی کہانی -19

115 پہلی پریڈ -20

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

119 محافظ -21

121 پہلا چٹخ -22

127 پہرہ -23

130 پہلا چرچ -24

137 ہوا کی افواہ -25

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

140 پہلی ٹیوشن -26

143 پابندی -27

146 پہلی جلسہ سازی اور جنگلین کیڈٹ عباد -28

151 معصوم انتقام -29

155 پہلی جیت -30

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

159 پہلی محبت کی جوتک -31

165 پہلی قیامت -32

178 پہلی بغاوت -33

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

185 اپیل -34

187 پہلا چھاپہ -35

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

191 رشتہ -36

کتاب گھر کی پیشکش فہرست کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

193 پہلی دیر -37

196 دوسرا الوداع -38

200 پہلی ٹرائی -39

204 دھوکہ -40

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

208 آخری بٹک "Bunk" -41

211 رشتوں کی سولی -42

217 پہلا انقلاب -43

220 دیر ہو جاتی ہے -44

225 تیسرا الوداع -45

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com> تیسرا دور

229 دوسری قیامت -46

242 آخری نقشہ -47

246 پہلی نظر -48

250 آخری کفارہ -49

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

255 پہلی تعبیر -50

260 بچپن کا دبیر -51

267 آخری ٹیس -52

272 آخری بھرم -53

277 آخری دستک -54

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

283 آخری الوداع -55



کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلا دور

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی سہیلی

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

۱۹۷۹ء کا دور تھا۔ ملک میں مارشل لاء کو لگے دوسرا سال پورا ہونے کو آیا تھا۔ مجھے اردو کا پہلا قاعدہ لا کر دے دیا گیا تھا تاکہ میں ابھی سے اسے رٹنا شروع کر دوں۔ میں یعنی عباد خان عرف آدمی، اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور مجھ سے دو سال بڑی عمارہ اور پھر اس سے دو سال بڑے فاران بھی تھے، جنہیں سب پیار سے فاری کہتے تھے لیکن میرے لیے وہ بڑے بھیا تھے۔ میرے ابا درجہ سوئم کے سرکاری ملازم تھے اور ہمارا سرکاری کوارٹر بھی اسی سرکاری کالونی کے درجہ سوئم کے کوارٹروں میں واقع تھا، جس کے درجہ اوّل کے بنگلہ نما مکاناتوں میں غیاث چچا کا گھر واقع تھا۔ دراصل ہمارا محلہ کافی وسیع تھا اور اس میں محکمے کی درجہ بندی کے حساب سے محکمے کے اعلیٰ درجے کے افسروں سے لے کر درجہ سوئم کے ملازمین تک مکانات کو بھی تین درجہ بندیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یوں ایک ہی کالونی کے وسیع کمپاؤنڈ کی چار دیواری کے اندر دراصل تین محلے آباد تھے۔ کالونی میں داخلے کا راستہ ایک واحد اور بڑے پھانک نما گیٹ سے ہو کر گزرتا تھا اور اس راستے پر پہلی تین قطاریں درجہ سوئم کے ملازمین کی تھیں، پھر درجہ دوئم اور پھر درجہ اوّل کے افسران کی باری آتی تھی۔

بہر حال ہم سارے محلے کے بچے ایسی کسی بھی درجہ بندی سے قطعاً آزاد تھے اور ہم سب ہلا کسی روک ٹوک اور دھڑلے سے محلے کے سبھی گھروں میں کودا پھاندی کرتے پائے جاتے تھے۔ غیاث چچا، جن کا پورا نام غیاث الدین تھا، میرے ابا کے دور پار کے کسی رشتے سے چچا زاد بھی لگتے تھے اور وجیہ ان کی اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی کا نام تھا، جو ہم سب چھوٹے بچوں کی دُجو آتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس دن مجھے پہلی جماعت میں داخل کرایا گیا تھا، اسی دن دُجو آتی سفید فرائ اور بالوں میں سرخ ربن باندھے آٹھویں جماعت میں بیٹھ چکی تھیں۔ غیاث چچا نے ان کا داخلہ شہر کے سب سے اعلیٰ اور مہنگے انگریزی میڈیم اسکول میں کروا رکھا تھا اور روز صبح سویرے کرم دین (کرمو) کا تانگہ انہیں اسکول لے جانے کے لیے ٹھیک ساڑھے سات بجے بھونپو بجاتا ہوا محلے کے پھانک سے اندر داخل ہوتا تھا۔

حالانکہ ہمارے محلے میں دُجو آتی کی ہم عمریا ان سے ایک آدھ سال بڑی یا چھوٹی اور بھی بہت سی ”آپیاں“ موجود تھیں لیکن ان سب میں میری سب سے پسندیدہ دُجو آتی ہی تھیں اور میں صرف انہی کے کام بھاگ بھاگ کر کیا کرتا تھا۔ ہمارے محلے کے بڑے میدان میں جو دوسرے اور پہلے درجے کے مکانات کے بیچ میں پڑتا تھا، سرشام ہی مختلف پھیری اور ٹھیلے والے جمع ہو جاتے تھے اور جیسے ہی دُجو آتی کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی یا کچھ بھی منگوانا ہوتا تو آدمی میاں یعنی میں ہی بھاگ کر انہیں وہ چیز مہیا کرنے میں سرفہرست ہوتا تھا۔ کبھی میں فالسے والے کی پتوں کی ٹوکری لیے دُجو کے صحن میں پہنچا رہا ہوتا کہ وہ ٹوکری میں سے اچھے اور تازہ فالسے چھانٹ لیں تو کبھی برف ملائی والے سے قلفیاں یا گولے گنڈے والے سے برف

کے گولے پر اُن کے پسندیدہ رنگ دار شربت ڈلو کر ان کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا ہوتا تھا، لیکن یہ سب کچھ تبھی ہوتا، جب غیاث چچا گھر پر نہیں ہوتے تھے یا اپنے مطالعے کے کمرے میں بند ہو کر مطالعہ کر رہے ہوتے تھے، کیونکہ ان کی موجودگی میں ان تمام چیزوں کی ”رسد“ و ”جَوآپی“ تک پہنچانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ غیاث چچا کو یہ ٹھیلے والی چیزیں بالکل پسند نہیں تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان چیزوں کو کھانے سے بچے بیمار ہو جاتے ہیں۔ (حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی بچہ آج تک ان چیزوں سے بیمار نہیں پڑا تھا)۔ لہذا وہ مجھے بھی ان ٹھیلے والوں سے ہمیشہ دور رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے اور میں معصوم سی صورت بنائے سر ملاتا رہتا تھا لیکن جیسے ہی غیاث چچا نظروں سے اوجھل ہوتے، مجھے اور وُجَوآپی کو اپنی من مانی کا موقع مل جاتا۔ ایسے میں وُجَوآپی کی اماں، یعنی سکیئہ خالہ ہم دونوں کو روکتی ہی رہ جاتیں اور ہم تب تک سارے فالسے، جامن، ہیر یا رس بھری کی ٹوکری کی ٹوکری چٹ کر چکے ہوتے۔ ویسے بھی سکیئہ خالہ بہت نرم دل تھیں اور وُجَوآپی سے تو آج تک انہوں نے اونچے لہجے میں بھی کبھی کوئی بات نہ کی تھی لہذا ایسے میں اگر غیاث چچا کہیں سرکاری دورے پر دو چار دنوں کے لیے کہیں شہر سے باہر چلے جاتے تو میری اور وُجَوآپی کو چاندی ہو جاتی۔ تب وُجَوآپی میرے ذریعے ٹھیلے والے کو بالکل اپنے گھر کے دروازے کے سامنے بلوا لیتیں اور اگر کوئی چھوٹی پھیری یا ٹوکری والا ہوتا تو وہ ٹوکری سمیت گھر کے بڑے صحن میں موجود ہوتا اور ہم دونوں اطمینان سے اور بڑے ”شہانہ“ انداز میں اس کا مال اڑائے جاتے اور سکیئہ خالہ ”ارے، ارے.....“ کرتی رہ جاتیں۔ وُجَوآپی کے گھر کا ایک کردار فضلہ بابا بھی تھے، جن کا اصل نام تو فضل دین تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فضلہ بابا بن کر رہ گئے تھے۔ وہ غیاث چچا کے کنوارے بچے کے دور کی یادگار تھے اور ان کی محکمے میں پہلی تعیناتی کے وقت سے ان کے ساتھ ہی تھے۔ تب غیاث چچا نے مجبوراً کسی دوسرے شہر میں تعینات ہونے کے بعد انہیں عارضی طور پر اپنے گھر کے کام کاج کے لیے بھرتی کیا تھا، لیکن تب سے وہ غیاث چچا ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ غیاث چچا پچھلے تیس سالوں سے جہاں بھی گئے، فضلہ بابا ان کے ساتھ ہی رہے اور اب تو وہ ان کے گھر کا ایک مستقل حصہ بن چکے تھے اور گھر کی چھٹی جانب بنے سرونٹ کوارٹر میں ہی رہتے تھے۔ وُجَوآپی دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھیں اور وہی سب سے زیادہ ان کے لاڈ بھی اٹھاتے تھے، اس لیے اگر کبھی غلطی سے مجھ سے یا وُجَوآپی سے کوئی ٹھیلے والا چھوٹ بھی جاتا تو وہ آکر چپکے سے کبھی میرے اور کبھی وُجَوآپی کے کان میں بتا دیتے کہ باہر ”بھٹے والا گھوم رہا ہے“ یا پھر ”نمکین چنے اور میٹھے مرمے والا کچھ ہی دیر میں محلے سے نکل جائے گا، جلدی کر لو جو بھی کرنا ہے“ اور دوسرے ہی لمحے میں محلے کے پھاٹک کی طرف اڑا جا رہا ہوتا تھا۔

وُجَوآپی جب اسکول سے واپس آ جاتیں اور دوپہر کو اپنا اسکول کا کام لے کر برگد کے بیڑے کے نیچے اپنے صحن میں اپنا بستہ کھول کر اپنی کتابیں نکال لیتیں، تب میرا محبوب مشغلہ ان کی ڈرائنگ کی کاپی کے صفحے پلٹ پلٹ کر سیکنڈوں مرتبہ پہلے کی دیکھی ہوئی وہ تصاویر دیکھنا ہوتا تھا، جو خود وُجَوآپی نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوتی تھیں۔ ان کی ڈرائنگ بہت عمدہ تھی اور تصویروں میں رنگ بھرنا تو انہیں خوب آتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ ایک رنگ ڈرا سا بھی دوسرے رنگ پر چڑھنے پائے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی قاعدے اور سلیقے کی قائل تھیں۔ ان کے بستے میں رکھی کتابوں کی ترتیب تک ان کی نفاست کی گواہ تھی۔

جب تک میں اسکول میں داخل نہیں ہوا تھا، میرا تقریباً سارا دن ہی ان کے اسکول سے واپس آ جانے کے بعد انہی کے گھر میں گزرتا تھا، پھر شام ڈھلے فاری بھیا مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں آ پہنچتے اور گھر واپس لے جاتے وقت سارا راستہ ڈراتے رہتے کہ امی شدید غصے میں اور ہاتھ

میں باورچی خانے سے بڑا والا چمٹا لیے صحن ہی میں کھڑی میرا انتظار کر رہی ہیں لیکن جیسے ہی میں صحن کا دروازہ کھولتا اور امی پر میری نظر پڑتی میں بھاگ کر جا کے ان سے لپٹ جاتا اور اس سے پہلے کہ امی مجھے کچھ کہیں میں فوراً فاری بھیا کی شکایتیں لگانا شروع کر دیتا کہ وہ مجھے سارے راستے ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے لے کر گھر آئے ہیں۔ امی بھی دوسرے ہی لمحے سب بھول بھال کر بڑے بھیا کو ڈانٹنے لگ جاتیں کہ ”کتنی بار کہا ہے کہ چھوٹے بھائی کو یوں نہیں ڈرایا کرتے، اس طرح بچوں کے دل میں ہمیشہ کا ڈر بیٹھ جاتا ہے جو پھر کبھی نہیں نکلتا۔“ وغیرہ وغیرہ۔

یوں ہر بار میں امی کی ڈانٹ سے بچ جاتا اور ان کا سارا غصہ بڑے بھیا پر نکل جاتا، جو بے چارے پچھلے گھنٹہ بھر سے میری تلاش میں پورے محلے میں ہلکان ہو رہے ہوتے تھے۔

ڈوآپی جب اپنے اسکول کا کام کر رہی ہوتی تھیں تو اس وقت میرا پسندیدہ مشغلہ اپنی کچی کچی بنائی ہوئی تصویروں میں وجوہ آپنی سے ان کے پانی والے رنگ لے کر ان میں رنگ بھرنا ہوتا تھا۔ مجھے ان کے پانی والے رنگوں کی ڈبیا بہت پسند تھی، جس میں بارہ رنگوں کی نکلیاں اور اس کے ساتھ ہی صاف اور استعمال شدہ پانی کی چھوٹی چھوٹی سلور کی دو پیالیاں ڈبیا کے اندر ہی لگی ہوتی تھیں۔ وجوہ ساتھ ساتھ مجھے رنگ بھرنا بھی سکھائے جاتیں اور اپنے اسکول کا کام بھی ختم کر لیتیں۔ مجھے رنگوں کا جنون تھا لیکن خود میں اپنے محدود جیب خرچ میں بمشکل پچاس پیسے میں دستیاب مومی رنگوں کی وہ چھوٹی سی ڈبیا خرید پاتا تھا، جس کے اندر تین انچ کی لمبائی کے برابر، بارہ عدد رنگین مومی پنسلیں ہوتی تھیں لیکن وہ رنگ بے حد نازک ہونے کی وجہ سے بہت جلد ٹوٹ جاتے تھے اور استعمال بھی بہت تیزی سے ہو جاتے تھے، لہذا ڈوآپی کے ان قیمتی پانی والوں رنگوں سے اپنی تصویروں میں رنگ بھرنا میرے لیے ایک بہت بڑی عیاشی سے کم نہیں تھا۔ وجوہ آپیکے لیے غیاث پچا ہر ماہ ”ڈیر برانڈ“ کی بارہ رنگین پنسلوں کی ڈبیا بھی لے کر آتے تھے۔ ٹین کی بنی ہوئی اس ڈبیا پر کالے ہرن کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی اور ہر ماہ ہی نئی ڈبیا ملنے پر وجوہ اپنی پرانی آدھی استعمال شدہ پنسلیں میرے حوالے کر دیتی تھیں اور اگلا پورا مہینہ میں ان کی دی ہوئی یہ پنسلیں عمارہ اور بڑے بھیا سے چھپا چھپا کر رکھنے میں صرف کر دیتا تھا کیونکہ وہ دونوں میرے رنگوں کے دشمن تھے، باقی رنگوں کی تو خیر تھی لیکن وجوہ کے دیئے ہوئے یہ رنگ میں کسی بھی قیمت پر کسی اور کو استعمال کرنا نہیں دیکھ سکتا تھا لہذا عمارہ اور بھیا سے اس بات پر ہمیشہ میرا جھگڑا ہی ہوتا رہتا کہ ”میرے سبز رنگ کی پنسل کس نے اٹھائی؟“ ”یہ دھانی رنگ کی پنسل زیادہ گھسی ہوئی کیوں ہے؟“ ”سرخ پنسل کی نوک کس نے توڑی، ابھی تو میں نے تازہ گھر کے رکھی تھی۔“

مجھے تو خود ڈوآپی بھی کسی نازک رنگین پنسل جیسی ہی دکھتی تھیں۔ تیکھے اور نازک سے نقوش، گلابی رنگت، بڑی بڑی سی کالی آنکھیں، ستواں سی ناک اور گالوں میں پڑنے والے دو چھوٹے چھوٹے سے گلابی گڑھے گویا ہر نقش ایسا جیسے کسی مصور نے برسوں کی محنت کے بعد تیز نوک والی گلابی پنسل سے زندگی کے کورے سفید کاغذ پر کوئی مورت اتاری ہو اور پھر وہ ذہن بھی اتنی تھیں کہ پانچویں جماعت میں ہی ضلع بھر میں ان کی پہلی پوزیشن آئی تھی اور ان کو حکومت کی جانب سے وظیفہ بھی ملا تھا۔ مجھے یاد ہے اس روز غیاث پچا نے وجوہ کی اتنی بڑی کامیابی پر پورے محلے کی دعوت کی تھی۔ تمام گھر کو اندر اور باہر قلعی پھیر کر سفیدی سے چکایا گیا تھا۔ ماشکی دوپہر سے کئی مرتبہ گھر کے بیرونی راستوں پر چھڑکاؤ کر چکا تھا، تاکہ گرد مستقل بیٹھ جائے۔ نیلے پیلے، ہرے، سرخ اور اودے رنگوں کی بتیوں کی چمکتی لڑیوں سے سارے گھر کو سجایا گیا تھا۔ ہم سارے محلے کے بچوں کے لیے ”میری

بکٹ“ کے سرخ چمکتے ٹن منگوائے گئے تھے، جس پر ایک گھومتی ہوئی بچی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ غیاث چچا کونت نئے ریکارڈ جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا اور ان کے پاس ہرنی پرانی انڈین فلم کے بہت سے ریکارڈ جمع تھے اور اس شام بھی انہوں نے خصوصی طور پر ہیم لٹا کا مشہور ”اکھیوں کے جھروکے سے“ والا ریکارڈ اتنی زور سے لگا رکھا تھا کہ اس کی آواز ہمارے گھر تک بھی آرہی تھی۔

اسی دن سے ڈوآپی میری سیکلی کے طور پر مشہور ہو گئی تھیں کیونکہ محلے کے ایک بزرگ نے بھاگتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا تھا کہ ”آدی میاں کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“ میں نے جلدی سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ وجوآپی کے گھر دعوت پر جا رہا ہوں لیکن وہ بڑے میاں تو مجھے چھیڑنے کے موڈ میں تھے پھر پوچھنے لگے کہ ”بھلا یہ وجوآپی تمہاری کون ہیں؟“ مجھے جلدی سے اور کچھ رشتہ تو سوچا نہیں اسی لیے بول پڑا ”میری سیکلی“..... بس جی پھر کیا تھا وہ بڑے میاں خود تو ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو ہی گئے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے فوراً ہی پورے محلے میں منادی کروادی کہ ”ڈوآدی کی سیکلی ہیں۔“ پھر تو جسے بھی دیکھو مجھے روک روک کر یہی پوچھتا کہ ”ہاں بھئی، آدی کی سیکلی کیسی ہے؟“ خدا بچائے ان بڑوں کی شرارتوں سے، ایک بار کسی بات کے پیچھے بڑ جائیں تو پھر اس کا بنگلہ بنانے میں ان کا بھی جواب نہیں۔

جو چلے تو جاں سے گزرا گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالب ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔ آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ”انسان“ درحقیقت وہی ہے جس کا ”شر“ اس کے ”خیر“ کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ”خیر“ کا لاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔ **جو چلے تو جاں سے گزرا گئے** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلا اسکول

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

جَو آپنی کوروزانہ سفید فراک پہنے اور سر پر سرخ ربن سے پونی ٹیل باندھے بڑے کروفر سے اسکول جاتے دیکھ کر میرے دل میں بھی اسکول جانے کی خواہش مچنے لگی تھی۔ درمیان میں ایک آدھ مرتبہ وجوہ خود بھی مجھے اپنے ساتھ اپنے اسکول لے کر گئی تھیں۔ اس روزانہ کے اسکول میں ”مینا بازار“ لگا ہوا تھا اور سچ پوچھئے تو مجھے ان کا رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجا ہوا اسکول بے حد پسند بھی آیا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس بہت سی گوری میم جیسی عورتیں سارے بچوں کو تحفے تحائف دے رہی تھیں جن میں چاکلیٹ اور خشک دودھ کے بسکٹ بھی شامل تھے۔ وجوہ مجھے اپنی ٹیچر سے بھی ملوایا، جنہیں سارے بچے سسٹر کیری کے نام سے پکار رہے تھے۔ مجھے تو وہ خود کسی بڑی کلاس کی طالبہ جیسی لگی تھیں۔ پیاری سی سسٹر کیری نے مجھے بہت ساری کھانے کی چیزیں دیں اور میرے گال بھی خوب کیچھے۔ اسی دن سے میرے ذہن میں اسکول کا خاکہ ایک ایسی ہری بھری اور خوب صورت پھولوں اور گلابوں سے اٹی ہوئی رنگ برنگی چار دیواری کا بن گیا تھا، جس میں خوب صورت پری جیسی میمیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، انہیں کھانے کو اچھی اچھی چیزیں دیتی تھیں اور ذرا ذرا سی بات پر ”اوہ مائی لٹل چائلڈ“ کہہ کر ان کی طرف دوڑی ہوئی چلی آتی تھیں۔ حالانکہ اس وقت انگریزی کے اس جملے کی مجھے ذرا بھی سمجھ نہیں تھی لیکن ان کے انداز سے اتنا تو میں سمجھ ہی سکتا تھا کہ یہ بھی ان کے پیار کا ایک انداز تھا، جیسے جَو آپنی کبھی کبھی میری چھوٹی سی ناک کو اپنی انگلی سے زور سے دبا کر کہتیں ”چلو آدی، بلی بن کر دکھاؤ“ اور میں جلدی سے آنکھیں زور سے میچ کر بلی بن جایا کرتا تھا اور وجوہ آپنی زور سے ہنس پڑتی تھیں۔

اسی لیے میں نے بھی ابا کا لایا ہوا اردو کا قاعدہ جلدی جلدی عمارہ کی مدد سے پڑھ کر ختم کر دیا اور پھر آخر کار وہ دن آ ہی گیا، جب مجھے پہلی جماعت میں داخل کروانے کے لیے تمام ”تیاریاں“ مکمل کر لی گئیں۔ اس سے ایک رات پہلے خوشی کے مارے مجھے نیند ہی نہیں آئی اور میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح اٹھتے ہی میں نے بھاگ کر صحن کے دروازے سے باہر جھانکا کہ کہیں مجھے اسکول لے جانے کے لیے تاگتہ آ تو نہیں گیا لیکن گلی سنسان پڑی تھی۔ میں جلدی سے بھاگ کر امی کے پاس باورچی خانے میں گیا، جو آج اپنے راجہ بیٹے آدی کے اسکول جانے کے پہلے دن کی خوشی میں اس کے لیے پراٹھا بنا رہی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے لینے کے لیے تاگتہ کب آئے گا؟ امی میری بات سن کر زور سے ہنس پڑیں اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مجھے لینے کے لیے تاگتہ نہیں آئے گا بلکہ اب مجھے اپنی سائیکل پر اسکول داخل کرانے لے جائیں گے۔ یہ سنتے ہی میرا آدھا مزہ تو وہیں کر کر رہ گیا کہ بھلا بچے کب اپنے ابا کی سائیکل پر اسکول جاتے ہیں؟ اور سائیکل بھی کون سی.....؟ ابا کی وہ پرانی کھنارا ”سہراب“ سائیکل.....؟ میں تو عام حالات میں بھی اس پر ابا کے ساتھ بیٹھنے سے گریز کرتا تھا تو یہ تو پھر بھی اسکول جانے کا معاملہ تھا۔ بھلا میرے اسکول کی میم

استانیاں مجھے ابا کی سائیکل کے ڈنڈے پر لگی اگلی چھوٹی سی گدی پر بیٹھے اسکول آتے دیکھ کر کیا سوچیں گی؟ اور ان کی نظروں میں میری بھلا کیا خاک عزت رہ جائے گی؟ ایک بار تو جی میں آیا کہ صاف انکار کر دوں کہ میں تانگے کے بناء اسکول نہیں جاؤں گا لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ کہیں تانگے کو بہانہ بنا کر میرے گھر والے واقعی میرا اسکول جانا ہی منسوخ نہ کر دیں۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ ایک بار میرا اسکول میں پکا داخلہ ہو جائے، تب میں تانگے کے لیے بھوک ہڑتال ضرور کروں گا۔

خدا خدا کر کے ابا نے اپنی سائیکل گھر سے باہر نکالی اور میں امی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ملیشیا (کھدر) کے کپڑے کا بستہ گلے میں ڈال کر جلدی سے سائیکل پر بیٹھ گیا اور ابا مجھے لیے اسکول کی جانب روانہ ہو گئے لیکن یہ کیا؟ یہ تو کسی اور جانب ہی مڑ گئے تھے اور محلے کے پھانک سے نکل کر دائیں کے بجائے بائیں جانب چند ہی پیڈل مار کر سڑک کی دوسری جانب ایک عجیب سی بھدی اور بدنما پیلے رنگ کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں سمجھا یہ ابا کا دفتر ہو گا لیکن میرے تو ہوش ہی اڑ گئے، جب انہوں نے سائیکل کو اس کے اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور مجھے اتارتے ہوئے بولے ”لو بھئی..... آ گیا ہمارے آدی کا اسکول۔“ ابھی میں ان سے یہ کہہ بھی نہیں پایا تھا کہ ابا جی آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کہ اسی اثنا میں ایک سخت گیر قسم کے مولانا جن کی شکل و شبابت ہماری مسجد کے پیش امام سے ملتی جلتی تھی، سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے ابا سے ہاتھ ملایا اور مجھے یوں دیکھا، جیسے قصائی بکرے کو دیکھتا ہے۔ ابا نے ان سے کہا کہ یہ میرا بر خور دار عباد ہے اور آج سے یہ آپ کے حوالے ہوا۔ میں جلدی سے ابا کی ٹانگوں کے پیچھے چھپ گیا لیکن ابا تو بالکل ہی انجان بن گئے تھے۔ انہوں نے پھر سے کھینچ کر مجھے آگے کر دیا۔ مولانا صاحب (جن کا نام بعد میں حافظ انور معلوم ہوا) نے میرا ہاتھ تختی سے پکڑ لیا، جیسے ان کو اس قسم کے ”الوداعی لمحات“ کا پہلے سے ہی کافی تجربہ ہو۔ ابا بیگانوں کی طرح اپنی سائیکل پر بیٹھے اور پیڈل مارتے ہوئے یہ جا اور وہ جا۔ میں ان کے پیچھے چیختا چلاتا ہی رہ گیا اور میرے موٹے موٹے سے آنسو میرا دامن بھگوتے رہے اور ماسٹر جی مجھے کھینچتے کھانچتے میری جماعت میں لے آئے، جہاں پہلے سے زمین پر ٹاٹ بچھائے تیس پینتیس بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے وجوہ آپ کی کلاس میں خوب صورت ڈیسک پڑے ہوئے دیکھے تھے، جب کہ یہاں تو گرد سے اٹے ہوئے ٹاٹ پر مجھے زبردستی بٹھادیا گیا تھا۔ باقی بچے بھی کافی سہمے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں نے میم استانیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میرے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھے دوسرے بچے نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے دو دن پہلے سے یہاں آ رہا ہے اور اس نے یہاں کوئی میم نہیں دیکھی۔ بس اسی قسم کے ماسٹر پائے جاتے ہیں، جیسے ہمارے سامنے کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بچے کا نام راجہ تھا اور وہ ہمارے محلے میں تیسرے درجے کے کوارٹروں میں چند گھر چھوڑ کر رہتا تھا، پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو آس پاس بہت سے بچے ہمارے ہی محلے کے وہاں بیٹھے نظر آئے۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ کیسا اسکول تھا جو اسکول کم اور کوئی جیل زیادہ لگ رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر ہی ہول آنے لگے کہ اس ”فضول جگہ“ اب مجھے روزانہ آنا ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں ماسٹر جی نے ہمیں اردو کا پہلا قاعدہ نکالنے کا کہا اور ایک کالے رنگ کے تختے پر پہلے ”آ“ اور پھر ”م“ جوڑ کر آم لکھ دیا اور اگلے ایک گھنٹے تک ہمیں بے وقوف سمجھ کر اسی ایک لفظ کی گردان کرواتے رہے۔ ایک گھنٹے کے بعد اسی ماسٹر نے اردو سے دینیات کے استاد کا روپ دھار لیا اور ہمیں عربی کی آیتیں پڑھانے لگے، ایک گھنٹے کے بعد انہوں نے پھر چولا بدلا اور ریاضی کے ماسٹر بن کر دو کا پہاڑہ رٹانے لگ گئے۔ سچ پوچھیں تو میں اسی ایک استاد کا چہرہ دیکھ دیکھ کر بے حد بور ہوا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس

طرح کے سرکاری اردو میڈیم اسکولوں میں ہر جماعت کا بس ایک ہی ماسٹر ہوتا ہے، جو بیک وقت اردو دان، ریاضی دان، دینیات، معاشرتی علوم، سائنس اور اسلامیات تمام مضامین کا ”ماہر“ ہوتا تھا اور اگلا پورا ایک سال یہی صاحب ہمیں یہ سارے مضامین پڑھائیں گے۔ لاجول ولاقوہ..... بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہوا.....؟ وہاں جو آپنی کی جماعت میں تو میں نے خود دیکھا تھا کہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد استانی بدل جاتی تھی۔ چلو یہ بھی شکر ہے کہ پہلی جماعت میں صرف اردو قاعدہ اور دینیات کا سبق ہوتا تھا یا پھر ریاضی کے چند پہاڑے رٹا دیئے جاتے تھے ورنہ ایک ہی ”صورت“ سے اتنے مضامین پڑھنا کم از کم میرے بس کی تو بات نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہمیں سختی نکالنے کا حکم دیا گیا اور ایک جانب قاعدے سے الف ب دیکھ دیکھ کر اور دوسری جانب ایک سے لے کر دس تک گنتی لکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ آس پاس کے تمام بچے چالوں کی طرح اپنی اپنی دوات نکال کر اس میں قلم ڈبو ڈبو کر لکھنے سے زیادہ ارد گرد چھیننے اڑانے لگے۔ میرے اچلے پڑوں پر بھی چھیننے گرے اور مجھے بہت غصہ بھی آیا کیونکہ امی نے آج صبح ہی پورا ایک گھنٹہ لگا کر میرے یونیفارم کو اپنی جھیز والی کونکوں کی بڑی استری سے رگڑ رگڑ کر اس کی شکنیں دور کی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں میں نے لوہے کی جالی والی کھڑکی سے باہر دیکھا تو ایک بوڑھے سے شخص کو ایک ہاتھ میں لوہے کی ایک بڑی سی راڈ اٹھائے برآمدے میں لگی پیتل کی اس بڑی سے پلیٹ کی جانب جاتے ہوئے دیکھا جو ایک تار سے ٹنگی ہوئی تھی۔ اس نے وہ راڈ زور سے دوسرے پیتل کی تھالی پر ماری۔ ٹن ٹن کی آواز گونجی اور بچوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ میں سمجھا کہ چھٹی ہو گئی ہے اور جلدی سے اپنا بستہ اٹھا کر کھڑا ہو گیا لیکن ماسٹر جی نے مجھے گھورتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کے اشارے سے بستہ دوبارہ نیچے رکھ دینے کا اشارہ کیا۔ پتہ چلا کہ ابھی صرف آدھی چھٹی ہوئی ہے، جسے وہ اس کے اسکول میں بریک کہتے تھے۔ میں انتظار کرنے لگا کہ ابھی شاید کچھ دیر میں یہاں بھی وہ جو کے اسکول کی طرح کوئی میم نہ سہی، کوئی ماسٹر ہی آکر ہمیں کھانے کے پیکٹ دے کر جائے گا، جس میں بسکٹ، چاکلیٹ اور جام لگی ہوئی ڈبل روٹی ہوگی..... لیکن یہ کیا۔ یہاں تو ایسا کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ وہی شخص جس نے آدھی چھٹی کے اعلان کے لیے گھنٹی بجائی تھی کچھ ہی دیر میں مختلف خوانچے سجائے برآمدے میں آکر بیٹھ گیا تھا اور بچے اپنی اپنی جیبوں سے سکے نکال کر اس سے بھنے ہوئے چنے، مرمے، بتاشے اور جانے کیا کیا الا بلا لے کر کھانے لگ گئے۔ اتنے میں اسکول کے گیٹ سے ایک اور بابا ٹھیلہ دھکیلتے ہوئے برآمد ہوا اور زور زور سے آواز لگانے لگا ”آلو چھو لے..... املی والے چھو لے..... چاول چھو لے.....“ کچھ نندیدے قسم کے بچے اس کی آواز سن کر یوں اس کی جانب دوڑ پڑے، جیسے انہیں زندگی میں کبھی چاول چھو لے کھانے کو ملے ہی نہ ہوں۔ کچھ بچے جو صبح سے رورہے تھے اور جن کے ماں باپ نے انہیں اسکول جانے کی ”فیس“ کے طور پر چند بڑے سکے دیئے تھے وہ اپنے ساتھ اپنے دوستوں کو بھی بیر، فالسے، گڑ کے شیرے میں خشک کیے گئے چاولوں کے لڈو اور گڑ کی بنی لائی کی دعوت میں شریک کر رہے تھے۔ راجہ نے کوئی ایسی ہی اوٹ پٹانگ سی چیز بے دھیانی میں میرے ہاتھ میں پکڑ دی، جسے میں نے فوراً ہی نظر بچا کر کیاری میں پھینک دیا۔

آدھی چھٹی ختم ہوتے ہی ہمیں اپنی تختیاں پھر سے دھونے کا حکم دیا گیا اور ہم سب اسکول کے احاطے میں بنے تالاب پر اپنی تختیوں پر میٹ ملنے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے آس پاس بہت دیکھا لیکن یہاں ”اوہ مائی چائلڈ“ کہہ کر بچوں کے کام کرنے والی کوئی آیا دکھائی نہیں دی۔ کیا بے ہودہ اسکول تھا یہ بھی۔ تختیوں کو دھوپ میں خشک کرنے کے لیے رکھ کر ہم پھر سے جماعت میں آ گئے۔ ماسٹر جی نے ہمیں صبح کے سبق کی دہرائی

کا حکم دے دیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگ گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ ہی دیر میں کلاس کا ہر بچہ انہی کی طرح لمبی لمبی جمائیاں اور انگڑائیاں لینے لگ گیا۔ جماعت کی آخری رو میں بیٹھے چند بچوں میں سے ایک آدھ تو اپنی نیند کی جھونک میں زور سے سامنے زمین پر سجدے میں گر پڑا اور پھر جلدی سے اٹھ کر طوطے کی طرح اپنا سبق دوبارہ رٹنے لگ گیا۔

بالآخر پوری چھٹی کا گھر بھی بج ہی گیا اور سب بچے شور مچاتے ہوئے ایک ریوڑ کی مانند تیزی سے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل کر باہر کے گیٹ کی جانب بھاگے۔ گرد کا ایک ایسا طوفان اٹھا کہ پہچانا مشکل ہو گیا کہ ہم میں سے کون محدود ہے اور کون ایاز.....؟

میں نے سب بچوں کے نکل جانے کا انتظار کیا اور پھر اپنا بستہ گلے میں ڈالے اور اپنی حتمی تمام کرگھر کی راہ لی۔ ابا نے آتے ہوئے مجھے راستہ سمجھا دیا تھا اور ہمارا محلہ دوسرے پار ہی تو واقع تھا لیکن راستے میں پڑتی شہر کی بڑی سڑک پار کرنا میرے لیے ہمیشہ اور پہلے دن ہی کی طرح مشکل اور جان جوکھم میں ڈالنے والا کٹھن مرحلہ رہا۔ آخر کار میں نے اس خطرناک رش والی سڑک کو پار کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈ ہی لیا۔ میں اپنی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں ایک، دو، تین کہہ کر ادھر ادھر دیکھے بنا ہی دوڑ کر بند آنکھوں سے ہی سڑک پار کر جاتا تھا۔ اپنے ڈر اور خوف اور سڑک پر دوڑتی بڑی بڑی خوفناک گاڑیوں کے خطرات سے بچنے کا یہ ”تیر بہدف“ نسخہ کبھی ناکام نہیں ہوا۔ بعد میں بھی زندگی میں کئی مرتبہ، جب مجھے کسی ایسے خوف اور ان جانے خطرے کا سامنا کرنا پڑا تب بھی میں نے یہی فارمولا آزمایا اور ہر مرتبہ میں اپنے خوف اور ڈر کی وہ خطرناک سڑک کامیابی سے پار کرتا گیا البتہ جب کبھی میں نے اس خوف سے چونک کر آنکھیں کھولنے کی غلطی کی اور ڈر کر کر پلٹا، تو وہیں ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔

گلدستہ اولیاء

اللہ کے برگزیدہ بندوں کے حالات و واقعات پر مشتمل ایک گرانقدر تصنیف جو اسلام اودھی کی عالمانہ عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ، حضرت شاہ قبول اولیاءؒ، حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، حضرت سلطان باھوؒ، حضرت حافظ محمد عبدالکریمؒ (موہری شریف)، حضرت خواجہ صوفی نواب الدین (موہری شریف)، حضرت الحاج محمد معصومؒ (موہری شریف)، حضرت شاہ کمالؒ بخاری، حضرت مخدوم حسام الدین ملتانی، حضرت حافظ محمد اسحاق قادری نقشبندی، حضرت سید سلطان احمدؒ بنی سرور، عاشق رسول حضرت صوفی بندے حسن خان، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس قادری کے حالات زندگی رقم ہیں۔ گلدستہ اولیاء کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے تحقیق و تالیف سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا ساون

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

بہر حال اسکول کے پہلے دن مجھ پر جو بھی گزری اس کے بعد میں نے گھر آتے ہی امی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اسکول کے نام پر آج مجھے جہاں بھیجا گیا تھا میں دوبارہ اس جگہ ہرگز جانا پسند نہیں کروں گا کیونکہ وہاں اسکول جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں اور سارے کے سارے بچے نالائق ہیں، کسی کو کچھ نہیں آتا جاتا اور بچوں کی تو بات ہی رہنے دیں وہاں تو ماسٹر بھی پورے دن میں صرف ایک لفظ ”آ.....م“ ہی ہمیں رٹاتا رہا تھا۔ میں تو سائیکل پر بیٹھ کر جانے کو رو رہا تھا جبکہ اس اسکول میں تو تانگے پر بیٹھ کر جانا خود تانگے کی توہین تھی۔

میں نے امی سے کہا کہ مجھے و سب جو آپنی کے اسکول جیسے اسکول میں داخل کروادیں پھر چاہے تانگہ نہ بھی لگا کر دیں تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں پیدل ہی چلا جایا کروں گا۔ امی نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور میرے بالوں میں اپنی انگلی سے کنگھی کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”آدی میرا پیارا راجہ بیٹا ہے نا.....“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ امی ایسی بات سمجھی کرتی تھیں، جب انہوں نے مجھ سے اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تھی۔ امی نے دھیرے دھیرے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ و جو آپنی جیسے اسکول کی فیس بھرنا ابا کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر میرے بڑے بھیا اور عمارہ بھی تو اردو میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے، اس لیے مجھے بھی اب روزانہ اپنے اسی اسکول جانا ہوگا، جس میں پڑھنے کے لیے میں آج گیا تھا۔ میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا اور پیر پٹنے کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ امتیاز بھی نا..... فوراً ہی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لیتی ہیں اور پھر مجبوراً ہم بچوں کو ان کی ”ضد“ کے آگے بارماننا ہی پڑتی ہے۔ سو ایک بار پھر مجھے ہی ہارنا پڑا۔ امی نے خوش ہو کر اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

”تم دیکھنا..... میں اپنے راجہ بیٹے کے لیے کتنی اچھی گڑیا لے کر آؤں گی.....“

پتہ نہیں وہ گڑیا کب آئی تھی لیکن مجھے اگلے دن سے اسی اسکول کی یا تر شروع کرنی پڑی۔ وقت رفتہ رفتہ گزرنے لگا۔ پہلی جماعت خدا خدا کر کے ختم ہوئی اور میں باعزت طور پر دوسری جماعت میں آ گیا۔ اب اس پہلی عمارت میں رفتہ رفتہ میرا دل لگنے لگا تھا پھر ایک دن میری زندگی کا وہ پہلا ساون برسا، جس نے آگے چل کر میری زندگی میں بہت کچھ بھگودیا۔

شاید مجھے وہ پہلی بارش یاد بھی نہ رہتی اگر اس روز و جو اسکول سے گھر واپس پر اتنی دیر نہ کر دیتیں۔ ہلکے جاڑوں کا زمانہ تھا۔ و جو آپنی اپنے نوں اور دسویں جماعت کے مشترکہ بورڈ کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھیں۔ غیاث چچا ان دنوں ہر لمحے و جو آپنی کو نصیحتیں کرتے دکھائی دیتے کہ میٹرک کا امتحان زندگی کا سب سے اہم تعلیمی موڑ ہوتا ہے اور یہیں سے طالب علم کی مستقبل کی راہ متعین ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں

اور وجوہ آپ بظاہر غیاث چچا کی موٹی موٹی باتیں غور سے سن رہے ہوتے لیکن ان سے نظر بچا کر ہم یونہی جھکے سر ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرتے اور نمک لگا کر کچے باداموں کی پھلیاں کھانے کے منصوبے بنا رہے ہوتے۔

اس روز صبح ہی سے آسمان پر شریر بادلوں کے گورے چنے اور سانولے سلونے جوڑے مغرب کی جانب سے اٹھنے لگے تھے۔ بادلوں کی سبیلی ہوا انہیں آسمان کی گود میں اڑائے لیے پھرتی رہی، پھر دھیرے دھیرے یہ سارے شریر ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے تاکہ زمین والوں پر برسیں اور پھر ہم زمین والوں کو اس برستی بارش سے بچنے کے لیے یہاں وہاں بھاگتا دیکھ کر ہنستے رہیں اور خوشی سے تالیاں بجا بجا کر گر گڑا ہٹ اور بجلی کی چمک پیدا کر سکیں۔

میری نانی اماں ہمیشہ مجھ سے کہتی تھیں کہ یہ سارے بادل اللہ میاں کے ”دُبنے“ ہیں۔ سو مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اللہ میاں ایک بڑا سا گڈ ریا ہوگا، جس کے ہاتھ میں بڑی سی لٹھی ہوگی اور وہ اس لٹھی سے اپنی بھٹیروں اور دُنبوں کے اس ریوڑ کو ہانکتا پھرتا ہوگا۔ کبھی کبھی تو میرے ذہن میں خود اللہ میاں کی تصویر ایک بڑے سے بادل کی صورت میں ابھرتی جو اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنی بڑی بڑی سی آنکھیں کھولے آسمان سے نیچے زمین پر اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہو۔

اس روز بھی ہم سب جماعت کے بچوں نے آسمان پر تیرتی بدلیاں دیکھ کر گر گڑا کر اور باقاعدہ ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں کہ ”یا خدا آج بارش برسا دے۔“ ہماری رقت آمیز دعائیں بارش کے رومانی موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں تھیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ ہماری کلاس کی چھت بارش میں اس تیزی سے ٹپکتی تھی، جیسے کوئی چھلنی پانی سے بھری ہو اور نیتجنّا ماسٹر جی کو بادل نخواستہ ہمیں چھٹی دینی پڑتی تھی کیونکہ برسات کے دنوں میں ہمیں باقاعدہ چھتری لے کر جماعت میں بیٹھنا پڑتا تھا یا پھر ہم سب بچے اخبار کے کاغذ سے ٹکون چینی ٹوپیاں بنا کر سر پر رکھ لیتے اور بارش کی ٹپ ٹپ پڑتی بوندوں کو اپنے سر پر تال دیتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ یہ کلاسیکی موسیقی سنایوں بھی ہماری مجبوری تھی کیونکہ تقریباً ہم سبھی بچوں کے گھروں میں ایک عدد چھتری ہی بمشکل میسر ہوتی تھی جس پر ہمارے اباؤں کا قبضہ رہتا تھا۔ جب کبھی دھوپ کے دنوں میں خوش قسمتی سے وہ چھتری ہماری پہنچ میں آتی تو میں اور میرے دوست اسے کھول کر اونچائی سے چپ لگانے کا مقابلہ کیا کرتے تھے لیکن ہماری چھتری کی اندرونی کڑیاں اکثر ہوا کے دباؤ کے باعث الٹی ہو کر چھتری کے پیالے کو آسمان کی جانب پلٹ دیتی تھیں، یوں چھتری کا رخ اوپر کی جانب ہوتا اور ہم سب زمین پر اوندھے منہ پڑے ہوتے تھے۔

آخر کار اس روز بھی ہماری دعائیں رنگ لے ہی آئیں اور آدھی چھٹی ہونے سے پہلے ہی موسلا دھار بارش برسنے شروع ہو گئی۔ ماسٹر صاحب فوراً ایک تیزی جھرجھری لے کر کھڑے ہو گئے کیونکہ عین ان کے سر کے اوپر سے پانی کا ایک تیز پر نالہ گرنا شروع ہو گیا تھا۔ سب بچے پنچوں کے بل بیٹھے انہیں اس طرح امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، جیسے کسی ریس کورس گراؤنڈ میں ریس کے انتظار میں گھوڑوں پر بیٹھے ”جوکی“ اس شخص کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جس کے ہاتھ میں گھوڑوں کو آگے بڑھنے سے روکنے والے بانس کا لیور ہوتا ہے اور پھر جیسے ہی ہمارے ماسٹر جی نے بارش اور بادلوں کی شان میں کچھ بڑبڑا کر بچوں کو اشارہ کیا تو سبھی بچے واقعی کسی ریس کے میدان میں نکلے گھوڑوں کی طرح کودتے پھاندتے اور

آوازیں نکالتے ہوئے کلاس روم سے نکل بھاگے لیکن میں ایسے معاملات میں ہمیشہ سے کافی صابر و شاکر اور آخری فرد کے بھی باہر نکل جانے کا قائل رہا ہوں۔ سو آخری بچے کے نکل جانے کے بعد میں بھی برستی بوندوں سے بچنے کے لیے سر پر اپنی تختی رکھے گھر کی جانب چل پڑا۔ تختی پر ابھی کچھ دیر پہلے ہی ماسٹر جی نے اردو املا لکھوائی تھی لہذا کچھ سیاہی کے لفظ بارش کی بوندوں سے دھل کر تختی سے ہوتے ہوئے میرے گالوں پر بہنے لگے تھے۔ بڑی سڑک پر حسب معمول بارش کے پانی کا ریلہ آیا ہوا تھا۔ یہ پہاڑوں کی بارش کا پانی تھا، جو ہمارے شہر سے ہوتا ہوا گزرتا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب لوگ کھڑے ہو کر اس ندی نما سڑک کو پار کرنے والوں کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ محلے کے دیگر بچے اس شور مچاتے اور اپنے ساتھ سب کچھ بہاتے پانی کے اندر اخبار اور کاغذ کی بڑی بڑی سی کشتیاں بنا کر پھینک رہے تھے۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا، آنکھیں بند کر کے ایک دو تین کہا اور بھاگتے ہوئے سڑک پار کر لی۔ محلے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری نظر غیاث چچا کے گھر سے نکلتے فضل و بابا پر پڑی، جو آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا اٹھا کر جانے کون سی دعائیں مانگ رہے تھے، میں بھاگ کر جلدی سے بارش سے پناہ لیتا ہوا ان تک جا پہنچا۔ فضل و بابا کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ پتہ یہ چلا کہ ان کی چینیٹی ”جوبی“ صبح گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود شدید بارش میں تانگہ منگوا کر اسکول چلی گئی تھیں۔ ان کا ارادہ اسی اسکول والے تانگے میں واپسی کا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تانگے والے نے آکر گھر پر اطلاع دی تھی کہ وجوبی نے تو انہیں اسکول کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیا تھا کیونکہ ان کی سہیلیوں کا اصرار تھا کہ وہ کچھ دیر اسکول میں ان کے ساتھ رہیں۔ اس وقت ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی لہذا طے یہ پایا کہ تانگے والا دن بارہ بجے کے قریب انہیں اسکول سے واپسی کے لیے لینے آجائے گا لیکن گھنٹہ بھر پہلے شروع ہونے والی موسلا دھار جھڑی نے سارا شہر ہی اتھل پتھل کر دیا تھا اور اس وقت شہر کے لڑکیوں کے بڑے اسکول کی جانب جانے والا ہر راستہ پانی کے بڑے بڑے ریلوں نے ڈھانپ رکھا تھا لہذا تانگہ کسی بھی صورت و جوبی کو لینے ان کے اسکول تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ غیاث چچا بھی دورے پر اور شہر سے باہر تھے۔ ایسے میں اس وقت فضل و بابا کو کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اوپر سے یہ طوفانی بارش جس کا زور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اب تو بارش کے ساتھ ساتھ کچھ وقفوں سے بجلی کے کڑکنے کی آواز بھی اس طوفانی شور میں شامل ہوتی جا رہی تھی اور دن کے وقت بھی گھٹا نوپ اندھیرا سا چھایا جاتا تھا۔ وجوبی کی امی یعنی سکینہ خالہ بھی بے حد پریشان تھیں اور بار بار بے چینی سے گھر کے دروازے تک آتیں، اس راستے پر نظر ڈالتیں، جس جانب سے وجوبی کا تانگہ آیا کرتا تھا اور پھر راستہ سنسان پا کر بے چینی اور مایوسی سے ہاتھ ملتے ہوئے واپس اندر چلی جاتیں۔

بارش کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی اور دھیرے دھیرے محلے کا کپاؤ نڈ خالی ہوتا گیا اور دو پہر تین بجے تک میرے اور فضل و بابا کے علاوہ باقی سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ درمیان و وقفے میں، میں چند لمحوں کے لیے بستہ رکھنے کے لیے گھر بھی گیا لیکن جیسے ہی امی کی نظر چوکی، میں پھر سے باہر بھاگ آیا تھا۔ امی مجھے آوازیں دیتی رہ گئیں پر وہ بھی جانتی تھیں کہ میں بارش کے موسم میں گھر میں نکل کر نہیں بیٹھ سکتا تھا اور پھر اس دن تو بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میرا گھر میں رہنا ناممکن تھا۔ ساڑھے تین بج چکے تھے اور اب فضل و بابا نے کسی بھی صورت خود وجوبی کے اسکول تک پہنچنے کی ٹھان لی تھی۔ حالانکہ اس بڑھاپے میں ان

کی حالت ایسی تھی کہ وہ اس طوفانی بارش کے تھپیڑوں اور ان سیلابی ریلوں کی طغیانی کو پار کر سکتے لیکن اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس دن خود مجھے اپنے چھوٹے اور کم زور ہونے پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے دل میں پکا طے کر لیا تھا کہ جیسے ہی میں کچھ بڑا ہوا خود اپنے پیسے جمع کر کے ایک تانگہ خرید لوں گا تاکہ آئندہ کبھی ایسا ”موقع“ ملے تو میں خود جا کر وجوہ آپ کو گھر واپس لاسکوں اس دن فضلہ بابا کے ساتھ کھڑے بارش میں بھگتے ہوئے خیالوں میں جانے کتنی دیر میں وجوہ آپ کو اپنے تانگے پر بٹھائے سڑکوں پر گھومتا رہا۔

بالآخر فضلہ بابا نے اپنی پرانی اور بوسیدہ برساتی کے ٹن کے، سر پر برساتی کی ٹوپی اور چھتری اٹھا کر اللہ کا نام لیتے ہوئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ محلے کے بڑے اور سال خوردہ چوٹی گیٹ سے طاہر بھائی اپنی نئی ”ریلے“ سائیکل تھا مے اندر داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ بری طرح بھگتے ہوئے تھے اور سائیکل پر سوار بھی نہ تھے کیونکہ شاید اتنے تیز پانی میں سائیکل کی سواری ہی ناممکن تھی۔ طاہر بھائی ہمارے محلے کے ہونہار نوجوان تھے اور ابھی حال ہی میں انہوں نے بارہویں کا امتحان نہایت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ان کے ابو بھی میرے ابا کے ساتھ سرکاری ملازم تھے اور ان کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا ڈاکٹری پڑھ کر شہر کا نامور ڈاکٹر کہلائے۔ یہ نئی سائیکل بھی طاہر بھائی کے ابا نے ان کے بارہویں جماعت کے نتیجے کی خوشی میں انہیں دلوائی تھی۔

فضلہ بابا کو یوں برستی بارش میں محلے سے باہر جاتے دیکھ کر انہوں نے وجہ پوچھی تو جواب میں فضلہ بابا نے صبح سے لے کر اب تک کی تمام رام کہانی سنا دی کہ وجوہ آپ اب تک اسکول سے واپس نہیں آئیں اور سارا گھر ان کی وجہ سے کس قدر پریشان ہے۔ طاہر بھائی نے ایک نظر سڑک پر بہتے پانی کے پھرے ہوئے ریلے پر اور دوسری نظر اب بھی چھا جوں برستے آسمان پر ڈالتے ہوئے پوچھا ”لیکن آپ اتنی دور کیسے جائیں گے؟ بڑے اسکول تک تو سارا راستہ پانی سے گھرا ہوا ہے؟“

فضلہ بابا نے گہری سی سانس لی اور بے چارگی سے بولے ”جانا تو پڑے گا بیٹا، وہاں وجوہ بیٹھی ہماری راہ تک رہی ہوں گی۔ اب تو شام بھی سر پر ٹھہرنے کو ہے۔ چھوٹی بیگم کا گھر میں پریشانی سے برا حال ہے۔“

فضلہ بابا جانے کیوں سیکنہ خالہ کو چھوٹی بیگم کہا کرتے تھے۔ مجھے تو سیکنہ خالہ بالکل بھی چھوٹی نہیں لگتی تھیں۔ فضلہ بابا کی بات سن کر طاہر بھائی نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور پلٹ کر ریلے کی طغیانی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں ناپا۔ ”نہیں..... آپ اس طوفان میں اسکول تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ میں نے آتے ہوئے خود بہت سی جگہوں پر لوگوں کو رسہ پکڑ کر راستہ پار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ یہیں رکیں۔ وجوہ کو میں اسکول سے جا کر لے آؤں گا۔ آپ بس ذرا میرے گھر میں اطلاع کرواد دیجیے گا۔ امی میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔“

فضلہ بابا نے فوراً طاہر بھائی کو ہاتھ اٹھا کر ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ طاہر بھائی وہیں سے لٹے پیروں وجوہ آپ کو لینے کے لیے پلٹ گئے۔ میں جلدی سے بھاگ کر طاہر بھائی کے گھر میں اطلاع دے کر پلٹ آیا۔ اب میں اور فضلہ بابا پلکیں جھپکاتے بنا، اسکول کی طرف سے آنے والی سڑک کو یوں گھور رہے تھے، جیسے کچھ ہی دیر میں وہاں سے قارون کا کوئی خزانہ نکلنے والا ہو۔ گھنٹہ بھر یونہی بیت گیا اور پھر وہ آخر کار دور سے اپنی سائیکل

تھامے خراماں خراماں آتے ہوئے نظر آئے۔ وجو آپنی ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ڈری سہی سی بھگی ہوئی چلی آرہی تھی۔ پتہ یہ چلا کہ جب طاہر بھائی انہیں لینے کے لیے اسکول پہنچے تو اسکول خالی ہو چکا تھا اور صرف اسکول کا بوڑھا چوکیدار وجو آپنی کی وجہ سے وہاں رکا ہوا تھا۔ وجو آپنی کا پریشانی اور خوف کے مارے برا حال تھا۔ طاہر بھائی کو اتادیکھ کر ان کی جان میں جان تو آئی، پر ان کے ساتھ یوں اکیلے چل پڑنے میں بھی ان کی حیا آڑے آرہی تھی، وہ طاہر بھائی سے اچھی طرح واقف تھیں کہ ان کی شرافت اور لیاقت کے قصے تو سارے محلے میں زبان زد عام تھے لیکن پھر بھی وہ ان کے لیے تو اجنبی ہی تھے لیکن اس وقت ان دونوں کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ پہلے تو طاہر بھائی اور وجو آپنی بہت دیر تک اسکول کے گیٹ پر ہی کسی تانگے یا سائیکل رکشہ کا انتظار کرتے رہے تاکہ وجو آپنی کو اس پر سوار کروا کر طاہر بھائی خود اپنی سائیکل پر ان کے ساتھ ہی پیچھے چل پڑیں لیکن جب آدھا گھنٹہ گزرنے کے باوجود دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا تو مجبوراً ان دونوں کو پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہونا پڑا۔ سائیکل پر سواری کا تو یوں بھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اول تو آج تک وجو آپنی کبھی سائیکل پر سوار ہوئی ہی نہیں تھیں۔ غیاث چچا کے پاس سرخ رنگ کی اٹلی کی بی ہوئی ایک ویسپا سکوتر تھی، جس پر کبھی کبھی وہ شام کو وجو آپنی کو سیر کے لیے لے کر نکلتے تھے۔ اس وقت اگر میں بھی کہیں محلے میں انہیں دکھائی دیتا تو وہ مجھے بھی اسکوٹر کے اگلے حصے میں جہاں سامان رکھنے کی ایک ٹوکری سی بنی ہوتی ہے وہاں کھڑا کر لیتے تھے اور محلے کے گیٹ پر اتارتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے کیونکہ مجھے گیٹ سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن وجو آپنی کے ساتھ کی ہوئی اسکوٹر کی یہ چند لمحوں کی سواری بھی ہفتوں مجھے سرشار رکھتی تھی۔ طاہر بھائی کو اُمید تھی کہ شاید راستے میں سواری مل جائے لیکن اس برستی شام میں تو کوئی تانگہ بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا بالآخر طے یہی پایا کہ دونوں پیدل ہی ممکنہ راستوں سے اور پانی سے بچتے ہوئے گھر کی راہ پکڑ لیں کیونکہ شام دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی تھی اور اب وہاں کھڑے رہ کر مزید انتظار کرنا صرف اور صرف وقت برباد کرنے کے مترادف تھا۔ جب وہ دونوں محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو شام کے پانچ بج چکے تھے اور دونوں ہی سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور تھے۔ وجو آپنی کو تو باقاعدہ چھینکیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور طاہر بھائی کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ فضلہ بابا نے طاہر بھائی سے بہت کہا کہ سیکنہ خالہ نے گھر میں ان دونوں کے لیے گرم گرم جو شانہ تیار کر رکھا ہے، وہ پیٹے جائیں لیکن طاہر بھائی مسکرا کر ٹال گئے۔

گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وجو آپنی نے مڑ کر اک لمحے کو پلکیں اٹھائیں اور دھیرے سے طاہر بھائی سے ”شکریہ“ کہا۔ جواب میں طاہر بھائی صرف سر ہلا کر ہی رہ گئے۔

اگلا ایک ہفتہ دونوں ہی اپنے اپنے گھروں میں نزلے زکام اور بخاری کیفیت میں بستر سے لگے رہے لیکن اس وقت کون جانتا تھا کہ وجو آپنی اور طاہر بھائی کی یہ پہلی اور بھگی سی ملاقات اگلے چند ہفتوں میں دونوں کو ایک ایسے جذبے سے جھگو کر شرابور کر دے گی، جس کی سیلن زندگی کی آخری سانس تک ان کے دلوں کے بند کمروں میں گھٹن پیدا کرتی رہے گی۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا دوست

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

رفتہ رفتہ محلے میں میرے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا لیکن میرا سب سے پہلا دوست راجہ بی میرا سب سے گہرا اور رازدار دوست تھا۔ راجہ بھی میرے ساتھ ہی پرائمری اسکول میں میرا ہم جماعت تھا۔ اس کا گھر میرے گھر کے بالکل سامنے والی گلی میں چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ہماری دوسری جماعت کے سالانہ امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ میرے پاس امتحانی گتہ (ہارڈ بورڈ) نہیں تھا لہذا میں سختی کے اوپر رکھ کر پڑھ دیتا تھا اور سختی کے سرے پر پڑھ جکڑنے کے لیے لوہے کا چھوٹا سا کلپ (چپٹی) لگا لیتا تھا جبکہ راجہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا اور بے حد لاڈلہ بچہ تھا۔ اس کے ابا نے اس کے لیے بہت خوب صورت سا امتحانی گتہ خرید کر دے رکھا تھا جس پر سکس ملین ڈالر مین کی ایک بہت بڑی سی تصویر بھی بنی ہوئی تھی۔

ان دنوں ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں تھا۔ محلے میں صرف ایک ہی گھر میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا اور ہم سب بچے گھر والوں سے چھپ کر غفور چچا کے گھر ہفتے کی رات کو سکس ملین ڈالر مین دیکھنے کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جایا کرتے تھے۔ غفور چچا لاٹ صاحب کے دفتر میں کلرک تھے اور ان کے ٹھٹھاٹ بھی کسی لاٹ صاحب سے کم نہ تھے۔ ہفتے کی رات غفور چچا اپنا ٹی وی گھر میں کسی ایسے مقام پر رکھ دیتے تھے، جہاں سے صحن اور گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے بچوں کی نظر بھی ٹی وی پر پڑ سکے۔ میں اپنے ابا کے ڈر سے سب سے آخر میں گھر سے نکلتا تھا لہذا راجہ کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ وہ میرے لیے اس منی سینما گھر کے ”اسٹال“ یا ”بالکونی“ میں کوئی اچھی سی جگہ گھیرے رکھتا اور میرے دیر سے آنے پر ہمیشہ غصے سے مجھے گھورتا کہ مجھ سے پروگرام کی شروعات یا سکس ملین کی اونچی سے لگائی گئی ایک بہت عمدہ جپ چوک گئی ہے۔ اگلی صبح راجہ مجھے وہ تمام کہانی پھر سے باقاعدہ پر فارم کر کے دکھاتا۔ ان دنوں اکثر میرے اور راجہ کے ہاتھوں پیروں یا سر پر پٹیاں بندھی دکھائی دیتی تھیں کیونکہ جب تک ٹی وی پر سکس ملین ڈالر مین چلتا رہا ہم دونوں نے ہر اونچائی سے اس کی طرح کودنے کی اور مختلف چیزوں کو ہاتھ پیر اور سر سے توڑنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ان دنوں ہم دونوں اپنی اپنی انٹیوں کے ساتھ (جو آپس میں گہری سہیلیاں بھی تھیں) لنڈا بازار جا کر خاص طور پر ایسی جیکٹس اور دستانے وغیرہ چنتے تھے جیسے پچھلی قسط میں ہم نے سکس ملین صاحب کو پہنہ دیکھا ہوتا تھا اور پھر میں اور راجہ ویسے کپڑے پہن کر محلے میں دوسرے بچوں کے درمیان اتراتے پھرا کرتے تھے۔

دوسری جماعت کے امتحان شروع ہو چکے تھے۔ میں صبح سویرے چائے کا ایک پیالہ گرم تندور کی آدھی روٹی کے ساتھ حلق سے اتار کر جلدی سے راجہ کے گھر پہنچ جاتا تھا لیکن راجہ ہمیشہ دیر کر دیتا تھا۔ اس کی امی اسے باورچی خانے میں اپنے سامنے چوکی پر بٹھائے گرم پراٹھے اور انڈوں کا ناشتہ کروا رہی ہوتی تھیں۔ مجھے سر پر کھڑے بڑبڑاتا دیکھ کر راجہ جلدی جلدی نوالے نگٹے کی کوشش کرتا تو اسے ماں کی جھاڑ سننا پڑتی کہ ٹھیک سے ناشتہ ختم کرے، خدا خدا کر کے راجہ کی تیاری ختم ہوتی اور اس کی ماں اس طرح دعائیں دیتے ہوئے میرے ساتھ روانہ کرتی، جیسے وہ اسکول کا

امتحان دینے نہیں بلکہ کسی جنگی محاذ پر دشمن کے ٹینکوں کے سامنے لیٹنے جا رہا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ نکلنے پر عام طور پر راجہ کو بمشکل اعزازی نمبر دے کر ہی پاس کیا جاتا تھا۔ راجہ کا دھیان کبھی پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ سردیوں کی نرم گلابی دھوپ میں جب ہم دونوں پرچہ دینے کے لیے اسکول کی طرف جا رہے ہوتے تو اس وقت بھی راجہ دیواروں اور دکانوں کی چھتوں پر لگے فلموں کے پوسٹروں پر زیادہ دھیان دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنا رٹا ہوا امتحانی سبق دہرا رہا ہوتا جبکہ وہ ان فلمی پوسٹروں پر رواں تہرہ جاری رکھتا۔ ”یار سنا ہے محمد علی کی ”ان داتا“ بڑی زبردست پکچر ہے۔ یا تو نے سنا ”آئینہ“ میں ندیم شبنم نے غضب کام کیا ہے کل تو اس کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے۔ کل شاہد کی ”بھروسہ“ ریگل میں لگ رہی ہے۔ وحید مراد کی ”پرکھ“ آرہی ہے۔ تو اس اتوار کو میرے ساتھ رگیلا کی ”کبڑا عاشق“ کا ٹریلر دیکھنے ضرور چلنا۔“ راجہ کے یہ تہرے جاری رہتے اور ہم آخر کار اسکول میں داخل ہو جاتے۔ ہمارے پرائمری اسکول میں کوئی امتحانی ہال نہیں تھا لہذا ہم سب بچوں کو میدان میں ایک ایک قطار میں ان کی جماعت کے حساب سے بٹھادیا جاتا تھا اور تختہ سیاہ پر آٹھ دس سوال لکھے جاتے، جنہیں ہم جلدی جلدی اپنی محنتی یا پرچے پر اتار لیتے اور پھر ان میں سے پانچ سوالوں کے جواب ہمیں پرچے پر اتارنا ہوتے تھے۔ راجہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے میرے پیچھے یا دائیں بائیں کی جگہ پر قبضہ جما لیتا تھا اور میرا فرض تھا کہ میں اپنے پرچے کا رخ اس طرح سے رکھوں کہ راجہ کی نظر برابر اس پر پڑتی رہے اور وہ آسانی سے نقل کر سکے۔ اگر کسی پرچے میں بد قسمتی سے کسی استاد کی نظر راجہ پر پڑ جاتی تو اس کا وہ پرچہ ہمیشہ ادھورا ہی رہ جاتا۔ ایسی صورت میں امتحان کے نتیجے سے پہلے راجہ کے ابا کو ہمارے اسکول کا ایک ”خیر سگالی“ کا پھیرہ لگا نا ضروری ہو جاتا تھا۔

البتہ راجہ کو میرا یوں دن بھر وجوہ آپنی کے گھر کے پھیرے لگانا بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے اس بات پر لڑتا تھا کہ میں بھرے کھیل کے میدان میں سے وجوہ آپنی کی ایک آواز پر یوں دوڑ کر ان کی بات سننے چلا جاتا تھا، جیسے مجھ سے کوئی نماز قضا ہو رہی ہو۔ اس دن بھی مغرب سے کچھ پہلے ہم سب محلے کے بچے مل کر ”کھوکھوہ“ کھیل رہے تھے کہ اچانک دور سے میری نظر وجوہ آپنی پر پڑی، جو اپنے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے مجھے بلانے کے لیے اشارے کر رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے میں کھیل کے تمام قواعد و ضوابط توڑتا ہوا، ملیج سی وجوہ آپنی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس وقت گلابی لباس اور سفید دوپٹے میں خود بھی کوئی گلابی پری سی لگ رہی تھیں۔ دور راجہ کھڑا میری طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں میری شان میں کچھ بڑبڑا رہا تھا اور چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر مجھے خبردار کر رہا تھا کہ اگر میں کھیل چھوڑ کر کہیں گیا تو میری خیر نہیں لیکن اس وقت میری تمام تر توجہ وجوہ آپنی کے گلابی چہرے کی طرف تھی، جس پر شام کے ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں کچھ اس طرح اجالا کر رہی تھیں کہ ان کی ناک میں انکا چھوٹا سا سنہری کوکا خود ایک چھوٹا سا سورج دکھنے لگا تھا۔

وجوہ آپنی کے ہاتھ میں نیاز کی کھیر کی پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں گیارھویں کے کورس کی اردو کی کتاب تھی، جس کے شاعری والے حصے میں انہوں نے میرا اور غالب کے چند اشعار کو نشان زدہ کر رکھا تھا۔ کھیر کی پلیٹ انہوں نے مجھے طاہر بھائی کی امی کے حوالے کرنے کی تاکید کی اور کتاب دیتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ طاہر بھائی سے کہوں کہ جو مشکل شعر انہیں سمجھ میں نہیں آ رہے تھے..... ان سب کو انہوں نے سرخ پنسل سے نشان لگا کر واضح کر دیا ہے۔ طاہر بھائی کو جب بھی وقت ملے ان کی تشریح لکھ کر وجوہ آپنی کو بھیجوا دیں۔

میں فوراً ہی اُلٹے قدموں طاہر بھائی کے گھر کی طرف بھاگا۔ طاہر بھائی کی امی صحن میں بیٹھیں اتار داندہ سکھا رہی تھیں۔ میری آواز سن کر طاہر بھائی بھی کمرے سے نکل آئے۔ میں نے وجوہ آپنی کی کتاب ان کے حوالے کی اور سارے راستے ان کا دیا ہوا جو پیغام رٹتے ہوئے آیا تھا، وہ میں نے انہیں فر فرنا دیا۔ طاہر بھائی ہلکے سے مسکرائے اور بولے ”یہ تمہاری وجوہ آپنی کو پڑھائی لکھائی کے علاوہ دوسرا کوئی کام بھی ہے یا نہیں۔“ مجھے ان کی اس بات پر شدید غصہ آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان سے کچھ کہتا خود طاہر بھائی کی امی نے انہیں جھڑک دیا۔

”ارے تو کیا ہوا؟ اگر بچگی نے ذرا سی مدد مانگ ہی لی ہے پڑھائی میں تو کون سا آسان گر گیا۔ تیری لیاقت تو نہ جھڑ جائے گی اسے کچھ بتانے سے؟“

طاہر بھائی جواب میں ہنستے ہوئے کتاب لیے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئے اور جاتے جاتے مجھے کہہ گئے کہ وہ رات کو تمام شعروں کی تشریح کر کے کتاب سمیت وجوہ آپنی کو بھجوا دیں گے۔

میں نے واپسی پر کافی نمک مرچ لگا کر طاہر بھائی کی شکایت و ”جوہ آپنی سے لگائی اور ان سے یہ بھی کہا کہ آئندہ وہ طاہر بھائی کو کوئی کام نہ کہا کریں۔ میں جب گیا رہوں جماعت میں آ جاؤں گا تو خود انہیں اردو پڑھا دیا کروں گا لیکن میری بات پر غصے میں آنے کی بجائے وہ ہلکے سے مسکا دیں اور میرے گال پر زور سے چٹکی کاٹ کر اندر چلی گئیں۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ طاہر بھائی کو سخت سُست سنائیں گی کہ ان کی مجال کیسے ہوئی ایسی کوئی بات کہنے کی جبکہ کھیر کی پلیٹ تو کتنی جلدی طاہر بھائی کی اماں نے ہتھیلیا تھی۔ بدلے میں دو چار شعروں کی تشریح ہی تو کرنا تھی ان کے ہونہار بیٹے کو؟ اس ذرا سے کام کے لیے اتنے غرے؟ اور پھر یہ ”جوہ آپنی“ بھی نا..... بجائے غصے میں آنے کے، ان کا گلابی چہرہ مزید گلابی ہو گیا تھا۔ میں سخت کشمکش میں ان کے گھر سے واپس لوٹا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان لڑکیوں کے مزاج کا بھی کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ گھڑی میں تو لہ اور گھڑی میں ماشہ.....

دیوانہ اہلیسی

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سلفی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی صوفشائیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اُن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے۔**

کتاب گھر کی پیشکش پہلی برف باری

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

بالآخر تیسری جماعت کے امتحانات کا نتیجہ بھی نکل آیا اور میں ”امتیازی“ اور راجہ ”اعزازی“ نمبروں سے باعث پاس ہو گئے۔ اس دن صبح سے ہی آسمان پر گلابی بادلوں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہوا رک سی گئی تھی۔ خزاں میں خشک درختوں کے سنہری پتے زمین پر فرش کی صورت میں بچھے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ آج موسم کے تیور کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ صبح جب میں اسکول نتیجہ سننے کے لیے گھر سے نکلنے لگا تھا تو امی نے اوپر تلے بہت سی سویٹریں مفلر اور اونی ٹوپی سے مجھے لیس کر کے بھیجا تھا، جب تک راجہ کے نام کا اعلان پاس شدہ لڑکوں میں نہیں ہوا وہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر بیٹھا رہا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے اشاروں میں پوچھتا رہا کہ وہ پاس ہوا ہے یا فیل؟ بڑی مشکل سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے کانوں سے ہٹا کر اسے یقین دلایا کہ اتفاق سے وہ بھی پاس ہو گیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا اور جیب میں موجود تمام پیسوں سے راستے میں پڑتی پہلی پرچون کی دکان سے ڈھیر سارا گڑ خرید لیا۔ شدید سردی میں ہم سب بچوں کی ایک پسندیدہ تفریح یہ بھی تھی کہ ہم ایک بڑی سی کڑاہی میں گڑ کو خوب کوٹ کر پانی سے بھر کر اسے خوب ابلاتے اور پھر جب وہ سارا گڑ حلوے کی سی شکل اختیار کر لیتا تو ہم اسے شدید سردی میں پڑتی برف میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے کڑاہی سمیت ڈھکن بند کر کے رکھ دیتے۔ گڑ کا حلوہ سردی میں جم کر برتن ہی کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ہم اسے چھری سے قاشوں کی صورت میں کاٹ کاٹ کر مزے سے دعوت اڑاتے۔

اس دن بھی ہمارے گھر پہنچتے پہنچتے برف کے گالوں سے ہماری اونٹنیاں بھر چکی تھیں۔ محلے کے مرکزی کپاؤنڈ میں بچے اور جوان مل کر برف کا پتلا بنانے کے مقابلے میں مشغول تھے۔ کچھ ہی دیر میں غفور چچا اپنا ”بیش قیمت“ کوڑیک کا کیمرو گھر سے اٹھالائے اور ہم سب بچوں اور بڑوں کی ایک ایک کر کے گروپ میں تصویریں اتارنے لگے۔ ہم سب بچے بڑے اہتمام سے سنجیدہ سی شکلیں بنائے تصویروں کے لیے رخ دینے لگے۔ غفور چچا ہر سال اپنے اسی کیمرو سے ایسی برف باری کے موسم میں تمام محلے والوں کی تصویر بناتے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے کبھی ان تصویروں کو دھل کر آتے نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دل جلے نوجوانوں کا خیال تھا کہ ان کے کیمرو میں کبھی فلم کی ریل ہوتی تو تصویریں بھی دھل پاتیں.....؟ جب کیمرو ہی خالی ہوگا تو تصویریں کیا خاک دھل کر باہر نکلیں گی؟

لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ ان تمام شکوک و شبہات کے باوجود جب کبھی غفور چچا اپنا کیمرو لیے برستی برف میں گھر سے باہر نکلتے تو کیا بچے، کیا بوڑھے، کبھی فوراً اپنے بال سنوارتے، کپڑوں کی شکنیں دور کرتے فوراً محلے کے احاطے میں جمع ہونے لگ جاتے۔ ہم میں سے کسی میں بھی ہمت نہ ہوتی کہ آگے بڑھ کر غفور چچا کے کیمرو کو جانچ ہی لیں کہ اس کے اندر کچھ ہے بھی یا نہیں؟

لیکن اس برف باری میں قدرت نے میری تصویر کھوانے کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ غیاث چچا کہیں سے ایک ”پولارائیڈ“ کیمرو اٹھا

لائے تھے۔ یہ ایک جادوئی ڈبہ تھا۔ یہاں تصویر کھینچی اور وہاں کیمرے کی دوسری جانب سے دھیرے سے چمکتی اور دھلی دھلائی سی تصویر نکل آتی۔ اس دن بھی میں نے وہ جو آپنی کے صحن میں ان کے ساتھ مل کر برف کا ایک بہت پیارا سا پتلا بنایا اور پھر اس پتلے کے گلے میں بانہیں ڈال کر، گود میں بیٹھ کر اور اسے گلے لگا کر بہت سی تصویریں بنوائیں لیکن کون جانتا تھا کہ میری یہ خوشی بھی چند لمحوں کی اور ہمیشہ کی طرح ادھوری ثابت ہو گی۔ ابھی ہم صحن میں اس پہلے گلے میں مشغول ہی تھے کہ اچانک باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو طاہر بھائی ہاتھ میں تھرموس پکڑے کھڑے دکھائی دیئے۔ غیث پچا نے انہیں بھی اندر ہی بلوالیا۔ پتہ یہ چلا کہ طاہر بھائی کی اماں نے وہ جو آپنی کے لیے چوزوں کی خاص بنی بنا کر بھیجی ہے۔ مجھے شدید غصہ آیا۔ راجہ پچھلے کئی دنوں سے مجھے اکسار ہاتھ کا طاہر بھائی کے گھر کے باہر پھرتے ان چوزوں پر اپنا ہاتھ صاف کر لینا چاہیے پر مجھے مرنے کے ان معصوم بچوں پر ترس آتا تھا۔ کاش اس وقت میں نے راجہ کی بات مان لی ہوتی تو آج طاہر بھائی کی جگہ بنی کا یہ تھرموس میں وہ جو آپنی کے لیے لے کر آیا ہوتا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

طاہر بھائی زیادہ دیر وہاں نہیں رہے لیکن جتنی دیر بھی وہاں رہے وہ جو آپنی اپنے باورچی خانے کی صحن کی جانب والی کھڑکی میں سے جلدی جلدی چائے بناتے ہوئے چپکے چپکے پلکیں اٹھا کر طاہر بھائی کو دیکھتی رہیں۔ سیکنہ خالہ کے بے حد اصرار پر طاہر بھائی نے چائے کے دو گھونٹ لیے اور وہاں سے چل پڑے۔ اسی دوران انہوں نے غیث پچا کے پوچھنے پر بتایا کہ ان کا نام ڈاکٹری کے کالج کی فہرست میں آچکا ہے اور مارچ سے ان کی کلاسیں بھی شروع ہو جائیں گی۔ اس بات پر غیث پچا نے تو کچھ ایسی خوشی کا اظہار کیا، جیسے طاہر بھائی کو نہیں خود ان کو میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا ہو۔ مجھے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر اس میں اس قدر خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ بھلا ڈاکٹر بننے میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا اور پھر مجھے تو ویسے بھی ڈاکٹروں سے چڑھتی۔ سارا دن بے چارے ٹریدوں کی چیر بھاڑ کرتے رہتے تھے اور پھر انہی ہاتھوں سے کھانا کھانے بھی بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے تو بڑے ہو کر مصور بننا تھا۔ سارے جہاں کی تصویریں بنانا تھیں یا پھر ایک بڑا سا پیانو خرید کر اس پر ساری دنیا کو پاگل کر دینے والی دھنیں سنانا تھیں۔ بھلا ڈاکٹری بھی کوئی پیشہ تھا؟..... ہونہ۔..... ڈاکٹر کہیں کا.....

میں جانے کتنی دیر اپنے انہی خوابوں اور خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ہوش آیا تو طاہر بھائی جانے کب کے جا چکے تھے اور راجہ جانے کب سے گلی میں کھڑا مجھے آوازیں دے رہا تھا۔ پتہ چلا کہ باہر محلے میں ایک دوسرے پر برف کے گولے برسائے کا مقابلہ شروع ہو چکا ہے اور ہماری ٹیم میری غیر موجودگی کی وجہ سے مسلسل گولے کھا رہی تھی اور ہار رہی تھی۔ ہم سب بچوں کا برف باری کے دوران یہ سب سے پسندیدہ کھیل تھا۔ ہم چھتوں پر چڑھ کر، درختوں کے پیچھے چھپ کر اور دیواروں کی منڈیروں سے ایک دوسرے کی ٹیم کو تاک تاک کر نشانے مارتے تھے لیکن جانے کیوں اس دن میرا ہر نشانہ خطا ہو رہا تھا۔ شاید اسی دن سے خود میں تقدیر کے نشانے کی تاک پر تھا اور کتنی ستم ظریفی کی بات تھی کہ ہم انسانوں کے نشانے تو چوک بھی جاتے ہیں لیکن اس بے رحم مقدر کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا۔ اس سفاک تقدیر کا ہر وارکاری اور ہر نشانہ اٹل ہوتا ہے، جو ہم بے بس انسانوں کو ذرا سا تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیتا۔ میرے بچپن کا دمبر بھی قسمت کے ایک ایسے ہی وار کے نشانے پر تھا لیکن میں اس بے رحم وار سے بے خبر راجہ کے ساتھ مل کر دوسری ٹیم کے بچوں پر برف کے گولے برسا رہا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا سجدہ

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

چوتھی جماعت میں آتے ہی ابا کی طرف سے نماز کی پابندی اور نختی کی تاکید شروع ہو گئی۔ سپارہ تو اس سے بہت پہلے ہی ہم سب محلے کے بچے محلے کی ایک جگت خالہ کے ہاں پڑھنے جاتے تھے، جو ہم سب بچوں کو نہایت انہماک سے سپارہ پڑھاتی تھیں۔ شام کو ان کے گھر کے برآمدے میں محلے بھر کے بچے اور بچیاں اپنے سروں پر چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اور دوپٹے اوڑھے اپنے اپنے سپارے اور بغدادی قاعدے اپنے سینوں سے لگائے جمع ہو جاتے تھے اور اگلے گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے کے لیے ان کا گھر ہم سب بچوں کے سبق یاد کرنے کے شور سے گونجنے لگتا۔ سارے بچے گود میں سپارہ رکھے اور سر ہلا ہلا کر اپنا سبق انواع و اقسام کی آوازوں میں یاد کرتے رہتے اور جس بچے کا سر جتنی تیزی سے ہلتا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اتنی ہی ”شدت“ سے اپنا سبق یاد کر رہا ہے اور جہاں کسی بچے کے سر ہلنے کی رفتار کم ہوتی، وہیں خالہ زور سے ایک ہنکارا بھر کر اسے خشمگیں لگا ہوں سے گھورتیں اور دوسرے ہی لمحے اس بچے کا سر دوبارہ اسی تیزی سے ہلنے لگ جاتا۔

محلے کے تقریباً سبھی نوجوان اپنی جگت خالہ کے ہاں سے اپنے اپنے ختم قرآن سے مستفید ہو چکے تھے کیونکہ خالہ گزشتہ بیس، پچیس سالوں سے اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو قرآن شریف کا درس دے رہی تھیں۔ قیوآپی بھی ان کی شاگرد رہ چکی تھیں اور میرے لیے وہ دن عید کا دن ہوتا تھا، جب خالہ اپنے صحن میں لگے سرخ انگوروں کے خوشے پکنے پر ہم سب بچوں کو حکم دیتی تھیں کہ سب بچے مل کر احتیاط سے اور ایک ایک کر کے تمام انگوروں کے گچھے ڈالیوں سے توڑ کر اتار لیں پھر اس تمام انگور کے ڈھیر کے حصے بخرے کرنے کا مرحلہ آتا تھا۔ جگت خالہ پورے محلے میں اپنے گھر سے اترے انگور بھجوا کرتی تھیں۔ سب بچے بڑی بڑی پراتوں میں انگور لیے محلے کے مختلف گھروں میں بانٹنے کے لیے دوڑتے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی ایسے موقع پر خالہ محلے کی اپنی پرانی شاگرد لڑکیوں کی ٹولی کو بھی بلوایا کرتی تھیں۔ بڑی لڑکیاں انگور تو توڑ کر پراتوں میں رکھتی جاتیں اور حساب سے محلے کے ہر گھر کو بھیجتی جاتیں لڑکیوں کی اسی ٹولی میں و ”جوآپی بھی شامل ہوتیں اور میں بھاگ بھاگ کر سب سے پہلے صرف انہی کے کام کیا کرتا۔

ایسے موقعوں پر راجہ عمو مایا تو کھسک جایا کرتا تھا یا پھر اس کے ہاتھ جس گھر کو انگور بھیجے گئے ہوتے۔ وہاں کبھی پہنچ نہیں پاتے تھے۔ آخر کار اس کا حل خالہ نے یہ نکالا کہ راجہ کے ہاتھ انگوروں کی پرات دے کر دو مزید بٹے کٹے اور مشنڈے قسم کے بچوں کی کارڈ بطور نگرانی ساتھ بھیجنا شروع کر دی، جنہیں راجہ نے راستے میں کئی بار جھانے اور جھانسنے دینے کی کئی کوششیں کیں لیکن اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

مجھے یاد ہے جس دن ابا نے مجھے پہلی مرتبہ نختی سے ڈانٹ کر نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا وہ بھی ایک ایسا ہی انگور اتارنے کا دن تھا۔ میرا موڈ پہلے ہی کافی خراب تھا کیونکہ اس روز جوآپی بھی خالہ استانی کے گھر انگور اتروانے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ میں نہایت انہماک سے انہیں اپنے نازک

ہاتھوں سے انگوروں کو ان کے کچھوں سے علیحدہ کرتا دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بہت احتیاط اور نفاست سے بہترین کچھوں کا انتخاب کیا اور پھر اپنے گلابی ہاتھوں کی لمبی اور مخروطی انگلیوں سے انگوروں کو علیحدہ کر کے ایک پرات میں رکھ کر اس کے اوپر ململ کی جالی کا کپڑا ڈال دیا۔ میں جوان کی ہر ہر حرکت کو نہایت غور سے بیٹھا تک رہا تھا ایک دم بڑا سا گیا کیونکہ انہوں نے پلکیں اٹھا کر میری جانب دیکھا اور دھیرے سے میرا نام لیا۔ ”آدی“.....

پتہ نہیں کیوں جب کبھی آدی آپنی یوں میرا گھر کا نام دھیرے سے گنگنائی تھیں تو میرے وجود میں اچانک ہی ایک ساتھ اتنی بہت سی گھنٹیاں کیوں بجنے لگتی تھیں؟ میں جلدی سے اٹھا اور بھاگ کر ان کے پاس آیا۔ آس پاس دوسری لڑکیاں بھی انگور اتارنے اور آپس میں خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ میں اور راجہ اکثر سبق یاد کرتے ہوئے ان لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے کہ آخر وہ کون سی باتیں ہوتی ہیں، جنہیں یہ لڑکیاں ایک دوسرے کے کانوں میں گھنٹوں سرگوشیاں کر کے بے تحاشہ کھلکھلا کر ہنستی رہتی تھیں؟ لیکن اس سوال کا جواب ہم دونوں کو کبھی نہیں مل پایا۔ اس وقت بھی آدی کے آس پاس موجود لڑکیوں کی ٹولیاں آپس میں گھس گھس اور کھی کھی کرنے میں مشغول تھیں لیکن میں نے آدی کو کبھی ان دوسری اور ان کی ہم عمر لڑکیوں کی طرح خواہ مخواہ میں ہنسی مذاق یا قہقہے لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ بہت ہوتا تو وہ ایسے موقعوں پر ہلکے سے مسکرا دیا کرتی تھیں اور ان کی اس ہلکی سی مسکراہٹ سے ان کے گالوں پر پڑنے والے دو ہلکے سے گلابی گڑھے مجھے نہال کر جایا کرتے تھے لیکن اس روز ان کے یوں رازدارانہ انداز سے بلانے کے طریقے نے مجھے کچھ حیرت اور الجھن میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے انگوروں کی پرات اٹھائی اور اسے میرے حوالے کرتے ہوئے نہایت دھیرے سے پلکیں جھکا کر بولیں۔

”آدی..... یہ بڑے شکور چچا کے ہاں دے آؤ۔“ شکور چچا کا نام سنتے ہی میرا جی چاہا کہ اسی لمحے وہ بڑے وہیں پھینک کر کہیں بھاگ جاؤں۔ شکور چچا طاہر بھائی کے ابا کا نام تھا۔ تو گویا نفاست اور سلیقے سے یہ انگوروں کی پرات شکور چچا کے گھر بھیجنے کے لیے سجائی جا رہی تھی۔ غصے اور بے بسی سے میری آنکھوں میں اسی لمحے آنسو آ گئے، جنہیں میں نے بڑی مشکل سے ٹپکنے سے روک رکھا لیکن کیا کرتا میں نے کبھی پہلے زندگی میں آدی کا کہا نا تھا جو اس دن نال پاتا؟ میں خاموشی سے ان کے ہاتھوں سے بڑے لیے باہر آ گیا۔ گھر کے باہر والے چھوٹے میدان میں راجہ محلے کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کچے کھیلنے میں مشغول تھا۔ اس نے اپنا انگوٹھا زمین پر رکھا اور لمبی والی انگلی سے اپنا ہر بلوری کینچہ دور پڑے مخالف کے کچے کی طرف اچھال دیا۔ ٹخ سے کینچہ ٹکرانے کی آواز ہوا میں گونجی اور دوسرا لڑکا اپنی ہار پر منہ بسورتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ راجہ کا نشانہ، جسے کینچوں کے کھیل میں ”آینٹ“ کے نام سے پکارا جاتا تھا، ہمیشہ سے بے حد پکا تھا۔ وہ درجنوں گز دور پڑے ہوئے کسی بھی کینچے کو اپنا کینچہ ہوا میں اچھال کر نشانہ بنا سکتا تھا اور اس معاملے میں پورے محلے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

مجھے استانی خالہ کے ہاں سے نکلتے دیکھ کر اس نے وہیں سے چلا کر کہا ”اوئے آدی..... استانی خالہ سے مار کھا کر آیا ہے کیا.....؟ اور یہ ہاتھ میں کیا پکڑ رکھا ہے۔“ میں نے راجہ کو بتایا کہ یہ انگور شکور چچا کے ہاں دینے جا رہا ہوں۔ راجہ نے کپڑا اٹھا کر انگوروں کو اس لومڑی کی طرح لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھا، جس کے بارے میں ماسٹر جی ہمیں اسکول میں سبق پڑھایا کرتے تھے۔

”واہ پیارے..... انگور تو بڑے عمدہ دکھائی پڑتے ہیں۔ ضرور تمہاری آدی نے بیلوں سے اتارے ہوں گے..... ہے نا؟“

میں راجہ کی بات سن کر مزید چڑ گیا۔

”ہاں..... انہی نے اتارے ہیں..... تم کہو تو واپس بیلوں پر چڑھا آؤں؟“ راجہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑا۔

”دوسروں کا غصہ مجھ پر کیوں اتار رہے ہو یا راجہ۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ سارے محلے کے گھروں میں انگور پہنچانے کا ٹھیکہ تو نہیں

لے رکھنا ہم نے؟ انگور کھائیں کوئے اور دکھائیں ہم.....“

راجہ نے حسب معمول اردو کے محاورے کی ٹانگ توڑتے ہوئے میری جانب داد طلب نظروں سے دیکھا۔ راجہ نے محاورہ تو غلط بولا تھا

لیکن اس کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ بھلا تو آپ کی باتھوں سے توڑے ان انگوروں پر کسی اور کا حق کیسے ہو سکتا تھا.....؟

چند لمحوں بعد میں اور راجہ محلے میں اپنی سب سے پسندیدہ جگہ یعنی محلے کی چار دیواری کی منڈیر پر بیٹھے انگوروں کی پرات اپنی گود میں رکھے

ان انگوروں سے انصاف کر رہے تھے، یہ وہ دیوار تھی، جو ہمارے محلے کے گرد چاروں طرف چار دیواری کے طور پر کھڑی کی گئی تھی۔ بڑے بوڑھے

بتاتے تھے کہ یہ دیوار انگریز نے ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے بھی پہلے سرکاری کوارٹرز کی چار دیواری کے طور پر بنوائی تھی۔ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ہم بچے

آرام سے چوڑی مار کر بھی اس پر جا بیٹھتے تھے۔ ہم دونوں انگور کھاتے جاتے اور پرلی جانب سڑک سے گزرتی گاڑیوں کو بھی گنتے جارہے تھے۔ اس

دیوار پر بیٹھ کر پرلی جانب کی سڑک پر گزرتی گاڑیاں گننا میرا اور راجہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب کوئی گم سم ڈرائیور کسی نئی ”فیٹ کار“ میں یا پھر کسی پرانی

شیورلیٹ میں اپنے خیالوں میں کھویا سڑک سے گزر رہا ہوتا تو راجہ اچانک ہی زور سے ”اوئے“ کی آواز نکالتا اور جب ڈرائیور گھبرا کر یا چونک کر اور

بڑبڑا کر آواز کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا تو میں اور راجہ ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے لیکن اس دن میں اس قدر اداس تھا کہ میرا من اپنے اس محبوب

مشغلے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ وجہ آپنی کے دیئے ہوئے انگور ہم دونوں نے ”انتقاماً“ آدھا گھنٹہ پہلے ہی ختم کر دیئے تھے۔ دھوپ بھی تیزی سے ڈھل

رہی تھی اور شام کو چلنے والی برقیلی ہواؤں نے میرے پاؤں سن کر ناشروع کر دیئے تھے لہذا میں نے خالی پرات راجہ کے حوالے کی اور سختی سے تاکید کی

کہ اسے محلے میں آنے والے ٹین، بوری، بوتل خریدنے والے کباڑیے کے ہاتھ فروخت کرنے کے بجائے سیدھے سجاؤ فوراً استانی خالہ کے ہاں

واپس دے آئے۔ راجہ نے جلدی سے دل پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ راجہ جب کبھی دل پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھا، تب وہ صرف اور صرف

سچ ہی بولتا تھا لہذا مجھے یہ یاطمینان ہو گیا کہ اب یہ بڑے حفاظت سے استانی خالہ کے ہاں واپس پہنچ جائے گی۔

راجہ سے رخصت ہو کر جب میں نے گھر کے دروازے سے اندر قدم رکھے ہی تھے کہ ابا کی گرجدار آواز نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

”کہاں سے آ رہے ہو اس وقت.....؟ دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہو..... کتنی مرتبہ کہا ہے کہ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس آ جایا کرو۔“

میں نے گھبرا کر امی کی طرف دیکھا کیونکہ ایسے کڑے وقت میں عمو ماہہ ہی میری مدد کے لیے کوئی عمدہ سا بہانہ تراش کر ابا کا پارہ نیچے لانے

کی کوئی ترکیب کرتی تھیں لیکن آج تو امی بھی آنکھیں چرا گئیں۔ پتہ یہ چلا کہ بڑے بھیا آج مغرب کی نماز پر مسجد سے غیر حاضر پائے گئے تھے اور

ابھی تک ہوسٹل میں دوستوں کے ساتھ پڑھائی کے بہانے سے گھر سے باہر تھے لہذا ان کے حصے کا سارا نزلہ مجھ پر آن گرا تھا۔ ابھی میں ابا کے پہلے

سوال کا ہی کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پایا تھا کہ فوراً ہی گرج چمک کے ساتھ ان کا دوسرا حکم بھی نازل ہو گیا۔

”چلو..... اپنی امی سے کہو کہ تمہیں ٹھیک سے وضو کرنا سکھا دیں، وضو کرو۔۔۔۔۔ آج سے تم بھی اپنے بڑے بھائی سمیت میرے ساتھ نماز کے لیے مسجد جایا کرو گے۔۔۔۔۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو میں تھوڑا بہت احتجاج تو ضرور درج کرواتا، چاہے اکیلے میں امی کے سامنے ہی کہی۔۔۔۔۔ کہ بھلا ساڑھے آٹھ سال کی عمر بھی کوئی مسجد جانے کی ہوتی ہے لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ ذرا سی بھی ”آئیں بائیں“ کافی ”نقصان دہ“ ثابت ہو سکتی تھی۔ امی نے بھی اشاروں اشاروں میں مجھے سعادت مندی سے سر جھکانے کا مشورہ دیا۔ عمارہ باجی، جو ایسے موقعوں پر میری گت بنتے دیکھ کر ہمیشہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھیں انہوں نے ابا کو دکھانے کے لیے جلدی سے وضو کا بڑا سا چاندی کا لوٹا پانی سے بھر کر امی کے حوالے کر دیا اور امی نے مجھے ہاتھوں پیروں اور چہرے پر پانی ڈالنے کا طریقہ سکھلا دیا۔ باجی برآمدے کے ستون کے پیچھے کھڑی دانت نکالتی رہیں اور امی نے کنگھی کر کے اور میرے گال پر سرمے کا بڑا سائیکل لگا کر مجھے عشاء کی نماز کے لیے تیار کر دیا۔ شاید دنیا کی ہر ماں اپنے راج دلارے بیٹے کو ”نظر بندی“ کا ایسا ٹیکہ ضرور لگاتی ہوگی۔

لیکن میرا دھیان اس وقت کسی اور جانب ہی تھا۔ وہ جمعرات کی شام تھی اور آج رات ٹی وی پر میرے پسندیدہ ڈرامے ”انکل عرفی“ کی چوتھی قسط نشر ہونا تھی۔ راجہ کو میں پہلے ہی پابند کر چکا تھا کہ وہ غفور پچا کے صحن میں عین برگد کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر اپنے اور میرے لیے جگہ سنبھالے اور پکڑے رکھے۔ عشاء کی باجماعت نماز کا وقت عین وہی آٹھ بجے کا تھا، جس وقت ”انکل عرفی“ شروع ہوا کرتا تھا۔ جانے آج یہ ابا کو کہاں سے مجھے اپنے ساتھ مسجد لے جانے کا جنون سر پر سوار ہو گیا تھا۔ جبکہ فی الحال تو میرے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ میں نے فوری طور پر ذہن میں ان تمام بیماریوں کو یاد کرنے کی کوشش کی، جو ایسے موقع پر اچانک کہیں سے بھی پیدا ہو کر مجھے اس ”مسجد باترا“ سے بچا سکتی تھیں لیکن بد قسمتی سے اس ضرورت کے وقت میں اپنے چہرے پر بیماری سے پیدا ہونے والے ”سچے تاثرات“ بھی ٹھیک طرح سے نہیں ابھار سکا اور اسی شش و پنج میں عشاء کی نماز کا وقت آن پہنچا۔ عین اسی لمحے راجہ کی مخصوص سیٹی باہر گلی میں گونجی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ غفور پچا کے ہاں جا رہا ہے اور کچھ دیر کے اندر میں بھی وہاں پہنچنے کی کروں، پر آج تو یہاں معاملہ ہی دوسرا تھا۔ میں نے بے بسی سے ہاتھ ملے۔ جانے آج مینا کی انکل عرفی سے ملاقات ہو پائے گی یا نہیں.....؟ مینا اس ڈرامے کی ہیروئن کا نام تھا، جو قہو آپی سے مماثلت کی وجہ سے مجھے اچھی لگتی تھی اور آج کی قسط میں تو بہت اہم فیصلے ہونے تھے لیکن یہاں گھر میں تو ابا نے پہلے ہی میری قسمت کا فیصلہ سنا دیا تھا اور آج سے باجماعت نماز کی پابندی مجھ پر فرض کر دی گئی تھی۔

کچھ دیر میں ابا گھر سے مسجد کے لیے نکل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے سر جھکائے کچھ ایسی مجبوری کے عالم میں چل رہا تھا جیسے کوئی بکرا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ راہ اسے قربان کا گاہ کی طرف لے کر جائے گی، اپنے مالک کے پیچھے وفاداری سے سر ہلاتے ہوئے چلتا رہتا ہے۔

میں اس سے پہلے بھی مولوی صاحب کو نیاز و نذر دینے کے لیے مسجد آتا رہتا تھا۔ ابھی تین مہینے پہلے ہی راجہ کی ممانی کے ہاں بیٹا ہوا تھا تو ہم لوگ اس کے کان میں اذان دلوانے کے لیے اسے یہاں مسجد میں لائے تھے۔ اس وقت یہ مسجد مجھے کافی مناسب سی جگہ محسوس ہوئی تھی لیکن آج تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابا مجھے کسی قید خانے میں لے کر آ گئے ہوں۔

مجھے دیگر بچوں کے ساتھ سب سے پچھلی صف میں بٹھا دیا گیا اور کچھ ہی دیر میں مولوی صاحب بڑے رعب اور دبے کے ساتھ جماعت

کردانے کے لیے تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی سب لوگ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ میں بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پتہ چلا کہ ان کے آتے ہی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے اور نمازیوں میں یہ کھلبلی اسی وجہ سے مچتی تھی۔ ٹھیک آٹھ بجے مولوی صاحب نے زور سے تکبیر پڑھی اور اسی لمحے میرے ذہن میں ”انگل عرفی“ کی تعارفی موسیقی بجنا شروع ہو گئی۔ میں اپنے خیالوں میں اس قدر رگن تھا کہ مجھے رکوع میں جانا تب یاد آیا جب ساری جماعت رکوع سے سر اٹھا چکی تھی اور میری زندگی کا پہلا سجدہ ٹی وی ڈرامے کے خیالات کی نذر ہو گیا۔ کیسا کچا کچا ساجدہ تھا، ماتھا زمین پر، آنکھیں ارد گرد اور ذہن ساتویں آسمان سے بھی کہیں دور اٹکا ہوا۔ جب پہلے سجدے میں مولوی صاحب نے میری بساط سے کچھ زیادہ ہی دیر لگا دی تو میں الجھن اور جلدی میں خود ہی اٹھ بیٹھا تب ساتھ ہی نماز پڑھنے والے نسبتاً بڑی عمر کے لڑکے نے جلدی سے مجھے کھینچ کر دوبارہ سجدے میں ”پہنچا“ دیا۔

تب سے لے کر اب تک میری زندگی کا ہر سجدہ اتنا ہی نامکمل، اتنا ہی جلد بازی میں کیا گیا ادا ہو رہا ہے دلی سے سر ہٹنے کے برابر ہے جتنا بے فائدہ، جھوٹا اور منافقت بھرا میرا پہلا سجدہ تھا۔ میں لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ کوئی ایک سجدہ تو اس ریا کاری، اس جھوٹ، دکھاوے اور منافقت سے پاک ہو پائے۔ کبھی تو میرا ماتھا زمین پر ٹکٹنے کے بعد اس کی رضا پا کر ہی واپس اٹھے..... لیکن افسوس میری یہ ادھوری خواہش آج تک ادھوری ہی رہی ہے۔

سی ٹاپ

سی ٹاپ، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا یورپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گو یہ مجرم تنظیم عام بد معاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید قومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلی چوری

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

اُس رات پہلی جماعت نماز کے بعد تو ابا نے اپنا وطیرہ ہی بنا لیا کہ یہاں اذان ہوئی اور وہاں ان کا نماز کے لیے تیار ہو جانے کا حکم نامہ صادر ہوا۔ اس رات جب میں ابا کے ساتھ نماز ختم کر کے لٹم پشتم کسی نہ کسی طرح بھاگم بھاگ غفور چچا کے ہاں پہنچا تو آدھا ڈرامہ گزر چکا تھا اور میری جگہ پر بھی سٹو کی تائی اماں قبضہ جما چکی تھیں۔ راجہ نے غصے سے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں نے کندھے اچکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا تھا کہ میرے بچنے کے بعد پینا کا بس ایک ہی منظر آیا۔ وہ بھی بس چند لمحوں کا ساری رات میں بے چینی اور افسوس سے بستر پہ کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح میں نے راجہ سے اس نئی ”افتاد“ کا ذکر کیا تو وہ بھی پریشانی سے سوچ میں پڑ گیا۔ باقی نمازوں کا اتنا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ فی الحال فجر کی نماز کی تو مجھے ابا کی طرف سے مٹھوٹ تھی البتہ باقی سب گھر والوں کو ان کی ایک ہی گرجدار آواز فجر کی پہلی اذان سے بھی کہیں پہلے جگا دیتی تھی۔ ظہر کا وقت تو اسکول سے آنے اور کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے کھانا کھانے میں نکل جاتا تھا۔ لہذا ظہر کی نماز گھر پر پڑھنے کی رعایت بھی حاصل تھی۔ اصل مسئلہ عصر، مغرب اور عشاء کا تھا۔ عصر کے وقت ہم لوگ کھیل کے میدان میں ہوتے تھے جو کہ مسجد سے اتنا دور تو نہ تھا کیونکہ محلے سے نکلنے ہی ایک سڑک پار کر کے ہم اس میدان تک پہنچ جاتے تھے لیکن بچ کھیل میں نماز کا وقفہ کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ مغرب ہماری کھیل سے واپسی کا وقت تھا اور سب سے کٹھن وقت تو عشاء کا تھا۔ اس وقت تو ہمیں سکس ملین ڈالرین، پلانٹ آف ایپس (Planet of Apes)، شہہ زوری اور اپنے پسندیدہ ”جیدی انکل“ کا کھیل ”انتظار فرمایے“ دیکھنے کے لیے غفور چچا کے ہاں جمع ہونا لازمی ہوتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت عرصے تک ہمیں یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ٹی وی پر شام کو عصر اور مغرب کے درمیان ”اصل“ بچوں والے پروگرام جیسے کارٹون شو، الف لیلا، تک تک کمپنی، سارے دوست ہمارے اور کلیاں بھی آتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے تو غفور چچا کا منی سینما گھر کھلتا ہی صرف آٹھ سے نو بجے کے لیے تھا۔ یوں ہم سب محلے کے بچوں کی ٹی وی بنی کی ابتدا ہی بڑوں کے پروگرام سے ہوئی۔ بہت عرصہ بعد جب راجہ کے ابا نے اس کی ضد پر ”توشیا“ کا بڑا سابلیم اینڈوائٹ ٹی وی خریدا تو ہمیں پتہ چلا کہ اب سے پہلے تک ہم جو بھی دیکھتے رہے وہ بڑوں کے پروگرام تھے۔

میں اور راجہ کافی دن سر جوڑے بیٹھے سوچتے رہے کہ عشاء کی نماز سے چھٹکارے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ راجہ کا ذہن ایسے موقعوں پر خوب چلتا تھا لیکن یہ ایک ایسا گھمبیر مسئلہ تھا، جس کا توڑ اس کے ذہن میں بھی نہیں آ پا رہا تھا۔ مغرب کے وقت سے ہی ہمیں بخار پڑھنا شروع ہو جاتا تھا، خاص طور پر جب میرے دیر سے آنے پر راجہ مجھے بتاتا تھا کہ ”آخری چٹان“ کے چنگیز خان نے اپنے بیٹے جو جو اور قبلانی خان کے ساتھ مل کر امیر

خوارزم کے کتنے جان باز سپاہیوں کو شہید کر دیا ہے اور یہ سب کیا دھرا ہمارے ہی مسلمانوں کے امیر کے وزیر اعظم کا ہے تو میں غصے اور بے بسی سے یوں ہاتھ ملتا، جیسے اگر میں آٹھ بجے وقت پر آ جاتا تو ان سب کو بچا ہی تولیتا.....

ہمارے محلے کے اندر ہی پرلی طرف چوتھے درجے کے ملازمین کی عیسائیوں کی ایک بستی بھی تھی، جن دنوں ٹی وی پر ”آخری چٹان“ آتا تھا ان عیسائیوں کے چھوٹے بچوں کی شامت آئی رہتی تھی کیونکہ جیسے ہی آخری چٹان ختم ہوتا ہم سب مسلمان بچے اپنی لکڑی کی تلواریں لے کر ”یلغار ہو“ کے نعرے لگاتے ہوئے ان عیسائی بچوں پر پل پڑتے۔ چنگیز خان کے بغداد کے مسلمانوں پر کئے گئے مظالم کا حساب لینے کا کوئی اور طریقہ جو نہ تھا ہمارے پاس۔ یوں ہر ہفتے کسی نہ کسی عیسائی بچے کی آنکھ سوجی ملتی یا سر پھٹا ہوتا..... بالآخر عیسائی بستی کے بڑے بوڑھے ہاتھ باندھے ہمارے بزرگوں کے پاس ہماری شکایت لیے آن پہنچے کہ یسوع مسیح کے واسطے ہمیں ان چھوٹے ”مسلوں“ کی روزانہ بلکہ ہفتہ وار یلغار سے بچایا جائے اور پھر ہمارے بڑوں کے ہاتھوں ہم سب کی جو درگت بنی وہ سب تقریباً ناقابل اشاعت ہے۔ مجھے اور راجہ کو سب سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ہمارے بڑوں کو خود تو اسلام کی خدمت کی ”توفیق“ نہیں ہو پاتی اگر ہم بچپن میں مسلمانوں کی ”بھلائی“ کے لیے کچھ کر رہے تھے تو بجائے اس کے کہ وہ ہماری کچھ حوصلہ افزائی کرتے، وہ تو جوتا لے کر الٹا ہمارے ہی پیچھے پڑ گئے تھے۔

بہر حال ان دنوں اپنے بڑوں کی یہ ”قدر ناشناسی“ اور ”عیسائیت“ کے لیے ان کے دلوں میں موجود درد ہمیں اتنا نہیں کھٹکتا تھا جتنا عشاء کی نماز کا وقت اور میرے ابا کی نظر کی سختی۔ راجہ کا مسئلہ تو مجھ سے بھی بڑا تھا۔ اسے میرے بنائی وی دیکھنے میں بالکل بھی مزہ نہیں آتا تھا کیونکہ اسے کوئی بھی پروگرام دیکھتے ہوئے رواں تبصرہ کرنے کی عادت تھی اور اس کی اس فضول بکواس کو میرے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جھیل پاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خاص جذباتی مناظر پر خوب موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے کا بھی ماہر تھا اور اس کو یہ ہرگز گوارہ نہ تھا کہ آدی یعنی میرے علاوہ دوسرا کوئی اس کے یہ آنسو دیکھ پائے۔ لہذا مجھ سے زیادہ ان دنوں وہ مشکل کا شکار تھا۔

اس رات "Chips" چپس سیریز، جس میں ہمارے بے انتہا پسندیدہ موٹر سائیکل سوار سارجنٹ اپنے کمالات دکھاتے تھے، کی دوسری قسط آنا تھی۔ راجہ شام ہی سے میرے ساتھ ہی تھا اور ہم میرے ہی گھر کے صحن میں بیٹھے مختلف متبادل منصوبوں (Contingency Plans) پر غور کر رہے تھے کہ آج کی عشاء کی نماز سے کس طرح بچا جاسکتا ہے۔ ہم اپنا کھسکا کھسکا سر میں اس قدر غرق تھے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میرے ابا ہم دونوں کے سر پہ آن پہنچے ہیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....؟“

میں اور راجہ یوں اچھلے جیسے ہمارے سروں پر کوئی بم آ کر پھوٹا ہو۔ راجہ گھکھکیا۔
 ”وہ چچا..... دراصل میں آدی سے کہہ رہا تھا کہ کل سے مجھے بھی اپنے ساتھ نماز کے لیے جاتے ہوئے آواز دے جایا کرے.....“
 ابا کے چہرے پر سختی کچھ کم ہوئی۔

”ہوں..... اچھی بات ہے..... لیکن کل سے کیوں.....؟ آج سے کیوں نہیں.....؟ ابھی کچھ وقت ہے..... تم بھی یہیں آدی کے ساتھ ہی

وضو کر لو..... آج سے تم بھی ہمارے ساتھ ہی نماز کے لیے جایا کرو گے..... خدا نے تمہارے ابا کو تو توفیق نہیں دی کہ زندگی میں کبھی عید کی نماز ہی پڑھ جائیں..... چلو اچھا ہے اسی بہانے کم از کم ان کا بیٹا ہی نمازی بن جائے گا۔“

میرے ابا کو جانے کیوں ہمیشہ ہی سے رجب کے ابا سے کوئی نہ کوئی شکایت رہتی تھی۔ آج وہ ان کی نماز نہ پڑھنے کی عادت کا رونا لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ابا رجب کے ابا کی شان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ان کے جاتے ہی میں نے ایک زوردار چپت رجب کے سر پر رسید کی اور غصے سے سرگوشی میں کہا۔

”یہ کیا حماقت کی تم نے..... تم یہاں میری جان بچانے کے لیے آئے تھے یا خود کو پھنسانے.....؟“

”کیا کرتا یار..... تمہارے ابا یوں اچانک سر پر آن پہنچے تھے کہ جلدی میں اور کچھ سمجھ ہی نہیں آیا..... آدی یار..... اب کیا ہوگا..... مجھے تو نماز کی سورتیں بھی پوری طرح سے یاد نہیں ہیں.....“

اتنے میں عمارہ ہمارے سر پر پہنچ گئی اور ہمیں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر مشکوک سے لہجے میں بولی۔

”یہ کیا تم دونوں سر جوڑے بیٹھ ہو.....؟ چلو جلدی سے وضو کرو..... ابا انتظار کرتے ہوں گے۔“

ہم دونوں نے دانت پس کر عمارہ کی جانب دیکھا لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اگر ہم لوگوں نے اسے کچھ کہا تو وہ وہیں سے آواز لگا کر ابا کو سب بتا دے گی۔ پوری تھالی کی بیٹینگن تھی وہ اور اس نازک مرحلے پر ہم دونوں ہی مزید کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ لہذا چپ چاپ عمارہ کی ہدایات پر عمل کرتے رہے۔

تھوڑی ہی دیر میں ابا اپنی تسبیح گھماتے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے اور میں اور رجب کسی معمول کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے چل دیئے۔

راتے میں ابا کو چند اور محلے کے نمازی بھی مل گئے، جو محلے کے ساتھ ملحق مسجد کے مستقل نمازی تھے۔ ابا ان کے ساتھ باتوں میں مشغول آگے آگے روانہ تھے اور میں اور رجب سب سے آخر میں ان کے پیچھے۔ ابا کا معمول کچھ یوں تھا کہ پونے آٹھ بجے ہم مسجد میں داخل ہو جاتے تھے اور آٹھ بجے عشاء کی جماعت کے بعد سوا آٹھ بجے تک باقی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل آتے۔

میں اپنی قسمت اور رجب کی عقل کو کوستا ہوا جیسے ہی ”ابا پارٹی“ کے پیچھے مسجد میں داخل ہونے لگا تو یکا یک رجب نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ تب تک ابا اور ان کے دو دوست مسجد کا صحن پار کر چکے تھے۔ میں نے حیرت سے رجب کی طرف دیکھا۔ رجب نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں ابا مسجد کے اندرونی حصے میں واقع ہال میں داخل ہو گئے۔ میں نے رجب سے اپنا بازو چھڑایا۔

”اب اندر بھی چلو گے یا یہیں باہر کھڑے رہ کر پوری نماز پڑھنے کا ارادہ ہے؟“

رجب نے رازدارانہ انداز میں ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”یہاں سے اب نمازی کتنے بجے چھوٹیں گے.....؟“

میں نے رجب کو ڈانٹا۔

”کیا مطلب..... یہ مسجد ہے کوئی سینما گھر نہیں، جہاں سے لوگ شو دیکھنے کے بعد چھوٹتے ہیں۔“

راجہ نے اپنا سر ہلایا۔ ”ارے یار کیا فرق پڑتا ہے..... ایک ہی بات ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اب تمہارے ابا یہاں سے کتنے بجے باہر نکلیں گے.....؟“

<http://kitaabghar.com>

”سوا آٹھ بجے تک..... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی ہمارے پاس آدھا گھنٹہ موجود ہے؟ ہم ٹھیک سوا آٹھ بجے یہاں پر موجود ہوں گے۔ مسجد کے اندر تمہارے ابا کو اتنے نمازیوں کی موجودگی میں بھلا کیا پتہ چلے گا کہ ہم اندر ہیں یا باہر صحن یا برآمدے میں چلو جلدی کرو۔ کہیں موٹر سائیکلوں کے کرتب نہ چھوٹ جائیں ہم سے۔“

راجہ مجھے ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹا ہوا وہاں سے غفور پچا کے گھر کی طرف لے دوڑا۔ دل تو میرا بھی خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا لیکن منہ دکھاوے کے لیے میں کچھ جتیں پیش کرتا گیا لیکن راجہ بھی مجھے خوب جانتا تھا کہ یہ تمام تاویلیں میں خود اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے گھڑ رہا ہوں۔ چند ہی لمحوں میں ہم دونوں ٹی وی کے سامنے اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھے ”چس“ کی شروعات دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی آٹھ بج کر دس منٹ پر پہلا وقفہ آیا راجہ نے مجھے کہنی ماری اور ہم دونوں غیر محسوس طریقے سے غفور پچا کے ہاں سے یوں نکلے، جیسے عام طور پر پانی وغیرہ پینے کے لیے دیگر ”ناظرین“ اٹھ کر باہر جاتے تھے۔ یہ طریقہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کوئی دوسرا بچہ ہماری جگہ پر قبضہ نہ کر لے۔ غفور پچا کے گھر سے نکلنے ہی میں نے اور راجہ نے سر پٹ دوڑ لگائی اور چند ہی لمحوں میں ہم مسجد کے بیرونی دروازے پر موجود تھے۔ راجہ نے جلدی سے اندر جھانک کر اطمینان کر لیا کہ میرے ابا کے جوتے اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کچھ ہی دیر میں جب ابا اندر سے نکلے تو میں نے اور راجہ نے نہایت ”سعادت مندی“ سے ان کے جوتے سیدھے کیے۔ ابا نے ہمیں دعا دیتے ہوئے جوتے پہنے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے اسی سعادت مندی سے چل پڑے، جس طرح ہم یہاں تک آئے تھے اور جیسے ہی ابا ہمارے گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوئے ویسے ہی ہم اگلے پاؤں کسی گولی کی سی رفتار کے ساتھ بھاگتے ہوئے دوبارہ غفور پچا کے گھر میں آن موجود ہوئے۔ وقفہ ختم ہوئے ابھی دو چار منٹ ہی ہوئے تھے اور ہماری جگہ ویسے ہی خالی پڑی تھی۔ میں اور راجہ لپک کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور چند لمحے تو ہم دونوں سے ٹھیک سے سانس بھی نہیں لی گئی کیونکہ اتنی بھاگ دوڑ کے بعد ہمارا دم بری طرح سے پھول چکا تھا۔

بہر حال راجہ کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا اور ہم دونوں کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ ابا کو ذرا بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ ہم دونوں نماز کے دوران مسجد میں موجود ہی نہ تھے۔ فلم ختم ہوئی تو میں اور راجہ باہر نکل آئے۔ راجہ نے زور سے میرے کاندھے پر ہاتھ مارا اور فرخ یہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا۔

”کیوں آدمی پیارے..... مانتے ہو راجہ کے دماغ کو یا نہیں؟“

میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر راجہ کے سر کی بلائیں لے لیں کیونکہ اس کا شیطانی دماغ اسی سر کے اندر موجود تھا۔ نماز کی یہ چوری میری زندگی کی پہلی چوری تھی۔ میں نے اس کے بعد بھی بہت سی چوریاں کیں، بڑے بھیا کے گلک میں سے چار آنے اور دس پیسے نکالنے کی چوری، عمارہ کے بستے میں سے اس کی پسندیدہ خوشبودار منانے والی ربڑ کی چوری، باورچی خانے میں امی کے مختلف ڈبوں میں

چھپائے ہوئے گڑ کی چوری، اُبال کر رکھے گئے ٹھنڈے ہوتے ہوئے دودھ کے اوپر سے بالائی کی چوری اور جانے ایسی کتنی چوریاں لیکن ہر چوری کسی نہ کسی ایک مقام پر آ کر مجھے چھوڑنی ہی پڑی یا پھر مجھ سے خود ہی چھوٹ گئی لیکن اپنی پہلی چوری کو میں آج تک نہیں چھوڑ پایا۔ یہ لت مجھے کچھ اس طرح سے چمٹی کہ میں آج تک اپنی نماز اور اپنے مذہب میں چوریاں کرتا پھرتا ہوں۔

جانے نماز اور مذہب میں چوری کرنے کی یہ لت میرا پیچھا کب چھوڑے گی۔ جانے خود اپنے ہی اندر کی جانے والی اس نقب زنی کی شرمندگی اور اس عذاب سے میری جان کب چھوٹے گی..... جانے کب.....؟

کاغذی قیامت

ہماری دنیا میں ایک ایسا کاغذ بھی موجود ہے جس کے گرد اس وقت پوری دنیا گھوم رہی ہے۔ اس کاغذ نے پوری دنیا کو پاگل بنا رکھا ہے۔ دیوانہ کر رکھا ہے۔ اس کاغذ کے لئے قتل ہوتے ہیں۔ عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ معصوم بچے دودھ کی ایک ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ کاغذ ہے کرنی نوٹ..... یہ ایسا کاغذ ہے جس پر حکومت کے اعتماد کی مہر لگی ہے۔ لیکن اگر یہ اعتماد ختم ہو جائے یا کر دیا جائے تو پھر کیا ہوگا؟ اس کاغذ کی اہمیت یکنخت ختم ہو جائیگی اور یقین کیجئے پھر کاغذی قیامت برپا ہو جائے گی۔ جی ہاں! کاغذی قیامت..... اور اس بار مجرموں نے اس اعتماد کو ختم کرنے کا مشن اپنا لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کاغذی قیامت پوری دنیا پر برپا ہو گئی۔ اس قیامت نے کیا کیا رخ اختیار کیا۔ پوری دنیا کی حکومتوں اور افراد کا کیا حشر ہوا؟ اسے روکنے کے لئے کیا کیا حربے اختیار کیے گئے۔ کیا مجرم اپنے اس خوفناک مشن میں کامیاب ہو گئے..... یا.....؟

اس کہانی کی ہر ہر سطر میں خوفناک ایکشن اور اس کے لفظ لفظ میں اعصاب شکن سسپنس موجود ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو یقیناً اس سے پہلے صفحہ قرطاس پر نہیں ابھری۔ اس کہانی کا پلاٹ اس قدر منفرد ہے کہ پہلے دنیا بھر کے جاسوسی ادب میں کہیں نظر نہیں آیا۔ **عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس** نے اس کہانی میں کیا کردار ادا کیا ہے جہاں دنیا بھر کی حکومتیں اور سیکرٹ سروسز خوف و دہشت سے کانپ رہی ہوں جہاں موت کے بھیانک جبرؤں نے دنیا میں بسنے والے ہر فرد کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہو وہاں **عمران اور سیکرٹ سروس** کے جیالوں نے کیا رنگ دکھائے۔ یہ عمران کی زندگی کا وہ لافانی اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے کہ جس پر آج بھی عمران کو فخر ہے اور کیوں نہ ہو، یہ کارنامہ ہے ہی ایسا.....

کاغذی قیامت کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی مار

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

راجہ کا فارمولا انتہائی کامیابی سے جاری تھا اور ہم عشاء کی نماز سے یونہی جان چھڑا کر بچتے رہے حالانکہ ان دنوں میں کئی مرتبہ نماز پر وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے بڑے بھیا کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہو چکی تھی۔ ہم ٹھیک وقت پر ابا کے مسجد سے نکلنے سے پہلے مسجد کے دروازے پر پہنچ جابایا کرتے تھے لیکن ایک مرتبہ ہم سے وقت کے اندازے میں کچھ چوک ہو ہی گئی۔ ہم جیسے ہی مسجد کی طرف جانے والی سڑک کا موڑ مڑنے لگے تو ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ابا دیگر نمازیوں کے ساتھ دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔

دراصل یہ سب راجہ کی حماقت کا نتیجہ تھا۔ ہم نے ”پابندی وقت“ کو مزید سخت کرنے کے لیے کلوکباڑیے کے ٹھیلے سے ملی ایک پرانی سی ہاتھ پر باندھنے والی گھڑی بھی پانچ روپے میں اس کی منتیں ترے کر کے خرید لی تھی اور راجہ نے خاص طور پر عصر کے وقت مسجد جا کر میرے سامنے مسجد کی گھڑی سے اپنی اس ہاتھ والی گھڑی کا وقت ملا لیا تھا لیکن ہمیں کیا پتہ تھا کہ اس کلوکباڑیے کی طرح اس کی دی ہوئی یہ بوسیدہ گھڑی بھی یوں لنگڑا لنگڑا کر چلتی ہوگی۔ اس رات میں اور راجہ ”شارٹریک“ جسے ہم ستاروں والی فلم کہتے تھے، دیکھنے میں مگن تھے۔ میں نے دو مرتبہ راجہ سے وقت پوچھا اور دونوں مرتبہ بے دھیانی میں آٹھ بج کر پانچ منٹ بتایا۔ جب تیسری مرتبہ بھی میرے پوچھنے پر راجہ کے منہ سے آٹھ بج کر پانچ منٹ نکلا تو ہم دونوں ہی زور سے چوکے۔ راجہ نے کلائی پر بندھی گھڑی کو غور سے دیکھا اور زور سے چلایا۔

”ابے..... یار مارے گئے.....“

سب لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے جلدی سے راجہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجہ نے ہاتھ اٹھا کر بند گھڑی کی رکی ہوئی سوئیاں مجھے دکھائیں اور ہم دونوں اصطبل سے بھاگے ہوئے گھوڑوں کی طرح قلائچیں بھرتے ہوئے غفور چچا کے گھر سے نکل کر مسجد کی جانب بھاگے۔ راستے میں راجہ اپنی بیٹی کے گھر سے واپس لوٹی ہوئی ٹخن بوا سے زور سے ٹکرا بھی گیا۔ دراصل اس میں میرا اور راجہ کا اتنا قصور نہیں تھا جتنا ٹخن بوا کے بڑے سے شٹل کاک برقعے کا تھا، جس کا گھیرا اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ مشرق سے مغرب تک ہر سمت صرف ان کا برقعہ ہی بکھرا نظر آتا تھا۔ ہم بھاگتے ہوئے کالونی سے نکل رہے تھے اور ٹخن بوا سا ٹیکل رکشہ والے کو صلو اتیں سناتیں محلے میں داخل ہو رہی تھیں۔ موڑ مڑتے ہی وہ ہم دونوں کے سامنے آگئیں۔ میں تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح جھکائی دے کر ان کے خیمہ نمابر قعے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن راجہ پوری کوشش کے باوجود ان کے برقعے کی زد میں آ ہی گیا۔ ٹخن بوا کے منہ سے زور سے ایک لمبی اور اونچی ”ہائے“ کی آواز نکلی۔ پہلے ان کی چٹائی کی بنی ہوئی ٹوکری فضا میں بلند ہوئی، اس کے بعد ان کا سال خوردہ پلاسٹک والے فریم کا موٹا سا چشمہ اور پھر مجھے صرف اتنا ہی نظر آیا کہ راجہ ان کے برقعے میں کچھ اس طرح

سے گڈمڈ ہوا کہ کچھ دیر تک پتہ ہی نہیں چل پایا کہ ان میں سے کون سا کون سی ہے اور راجہ کدھر ہے؟ ایسا لگتا تھا، جیسے کسی بہت بڑے خیمے میں کوئی جنگلی بھیڑیا آن گھسا ہو۔ اگلے ہی لمحے راجہ کون بوا سمیت سڑک پر الٹا ”دھرا“ ہوا تھا۔ کون بوا کے منہ سے مغالطات کا ایک ریلہ تھا، جو نکلے جا رہا تھا لیکن چونکہ ان کا چشمہ بھی اتر کر سڑک کے درمیان کہیں پڑا ہوا تھا لہذا انہیں میں اور راجہ ٹھیک سے دکھائی نہیں دے پائے۔ وہ ہائے ہائے کرتے ہوئے ہمیں صلو تیں سنائی جا رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کے برقعے کے اندر سے راجہ کو کسی طرح ڈھونڈ کر نکالا جو ابھی تک بدحواسی سے یہاں وہاں ہاتھ مار رہا تھا۔ اسے کھڑا کر کے میں نے جلدی سے بوا کا چشمہ اٹھا کر انہیں پکڑا یا اور اس سے پہلے کہ وہ چشمہ اپنی آنکھوں پر لگا کر ٹھیک سے ہمیں دیکھ پاتیں، ہم دونوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔

لیکن اسی تمام کش مکش میں الجھتے اور گرتے پڑتے جب ہم نے مسجد کا موڑ کاٹا تو ابا کو مسجد کے دیگر نمازیوں سمیت باہر نکلتے دیکھ کر میری تو سٹی ہی گم ہو گئی۔ ابا کی نظر ابھی تک ہم پر نہیں پڑی تھی۔ ان کے پیچھے بڑے بھیا بھی سر پر اوئی ٹوپی پہنے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ میں اور راجہ اپنی جگہ پر جیسے جم کر رہ گئے اور پھر اچانک ہی راجہ نے جلدی سے اپنا رخ اسی طرف پلٹ لیا اور میرے گلے میں بھی بانہیں ڈال کر مجھے بھی اسی جانب موڑ لیا جس طرف سے ہم بھاگتے ہوئے مسجد کی جانب آ رہے تھے۔ اب دور سے ابا کی نظر پڑی تو انہیں یوں محسوس ہوتا کہ ہم ان سے کچھ دیر پہلے ہی مسجد سے نکل کر اچھے دوستوں کی طرح گلے میں بانہیں ڈالے واپس گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور چند لمحوں کے وقفے میں ہوا کہ خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا۔ ابھی ہم نے پہلا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے ہم دونوں کا خون خشک کر دیا۔

”یہ تم دونوں کہاں بھاگے جا رہے ہو، کوئی ٹرین چھوٹ رہی ہے کیا۔ یہاں آؤ اور اپنے بھیا کے ساتھ ساتھ چلو۔۔۔۔۔“

میری اور راجہ کی سانس میں سانس آ گئی۔ مطلب ابا کو پتہ نہیں چلا تھا کہ ہم مسجد میں موجود نہیں تھے۔ جانے خدا کو ہماری کون سی نیکی یاد آ گئی تھی۔ بہر حال ہم دونوں بھاگتے ہوئے ابا کے پیچھے چلتے ہوئے بھیا سے قدم ملا کر چلنے لگے لیکن ایک دوسری مصیبت ہماری تاک میں بیٹھی تھی۔ فاری بھیا نے غور سے مجھے اور راجہ کو دیکھا اور مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”تم دونوں نے کب نماز پڑھی۔۔۔۔۔؟ میں نے تو تم لوگوں کو مسجد میں کہیں نہیں دیکھا۔۔۔۔۔؟“

میں نے گہرا کر راجہ کی طرف دیکھا، یہ تو شکر تھا کہ ابا کسی اور نمازی سے باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے ورنہ بھیا کی آواز ان کے کانوں تک ضرور پہنچ جاتی۔

راجہ نے فوراً بھیا سے پوچھا۔

”آپ کہاں کھڑے تھے جماعت کے وقت؟“

بھیا راجہ کے جھانسنے میں آگئے اور بول پڑے ”تیسری صف میں، اندر۔“

”ہاں تو بھلا آپ ہمیں کیسے دیکھ پاتے۔ میں اور آدی تو باہر برآمدے میں کھڑے تھے۔“

اس وقت تو راجہ نے بھیا کو جواب کر دیا لیکن کاش ہم دونوں اسی لمحے یہ بھی جان پاتے کہ یہ مصیبت ابھی ٹلی نہیں ہے تو کتنا اچھا ہوتا۔

ابا کے گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی میں اور راجہ بھاگ کر غفور چچا کے ہاں پہنچ چکے تھے۔ بھیا کے دل میں شک جڑ پکڑ چکا تھا اور اگلے چند دن تک ہماری باقاعدہ نگرانی کرنے کے بعد وہ میرے اور راجہ کے ”بے داغ“ منصوبے سے واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے عمارہ کو بھی بتا دیا تھا کہ عشاء کی نماز کے وقت میں اور راجہ کہاں پائے جاتے ہیں لیکن ابھی تک ان دونوں کو کوئی مناسب موقع نہیں مل پایا تھا کہ وہ ابا کے سامنے نمبر بنانے کے لیے میری شکایت لگا سکیں۔

لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر مناتی.....؟ ایک رات ابا کچھ پہلے ہی نماز کے لیے نکل پڑے۔ اتنے عرصے میں اب انہیں اس بات کا اطمینان ہو چکا تھا کہ میں راجہ کے ساتھ خود مسجد پہنچ جاؤں گا۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے اور راجہ کو جوگلی میں میرے ساتھ کھڑا کسی عیسائی بچے کا انتظار کر رہا تھا کہ ادھر سے گزرے تو ہم اس کی خبر لے سکیں، کچھ کہا لیکن ہم دونوں ابا کی بات پر دھیان نہیں دے سکے، صرف اتنا ہی سمجھ میں آیا کہ نماز کے لیے آجانا۔

راجہ نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ابھی صرف ساڑھے سات بجے تھے۔ میں اور راجہ ابا کے جانے کے بعد سیدھے غفور چچا کے ہاں پہنچ گئے۔ نیرہ نور کی مدھر آواز ”جلے تو جلاؤ گوری“ پر ہم کافی دیر تک سر دھنتے رہے لیکن ہم دونوں کو خبر نہ تھی کہ آج خود ہمارے پرسکون آشیانے کے پروں کے جلنے کا وقت آچکا ہے۔ سوا آٹھ بجنے سے ایک منٹ پہلے میں اور راجہ بھاگتے ہوئے مسجد کے دروازے پر جا پہنچے لیکن یہ کیا؟ مسجد تو بالکل ویران پڑی ہوئی تھی۔ ایک نمازی بھی اندر موجود نہیں تھا۔ میرے اور راجہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ اتنے میں مولوی صاحب اپنے حجرے سے کھنکارتے ہوئے باہر نکلے اور ہمیں یوں دروازے میں گم سم کھڑا دیکھ کر وہیں سے بولے۔

”بچو..... تم لوگ دیر سے آئے ہو، نماز تو کب کی ہو چکی.....“

پتہ یہ چلا کہ بڑھتی سردیوں کے ساتھ ہی نماز کے اوقات میں پیچھے کی جانب تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور آج نماز پونے آٹھ بجے ہی ہو گئی تھی۔ مطلب یہ کہ ابا آٹھ بجے گھر واپس جا چکے تھے۔ مجھے مولوی صاحب پہ شدید غصہ آیا۔ اگر نماز کے اوقات تبدیل کرنا ہی تھے تو پہلے ہی کسی اونچی جگہ پر لکھ کر لگانا چاہیے تھا۔ ضرور انہوں نے کل رات جماعت ہونے کے بعد نماز کے اوقات تبدیل ہونے کا اعلان کیا ہوگا۔ ابا یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم نے کل ہونے والا اعلان سن لیا ہوگا اور شاید جاتے ہوئے گلی میں انہوں نے مجھ سے اور راجہ سے یہی کہا تھا کہ جلدی مسجد پہنچ جائیں۔ پر اب کیا ہو سکتا تھا۔ راجہ نے رقت بھری آواز میں مولوی صاحب سے درخواست کی کہ آئندہ جب کبھی نظام الاوقات بدلنے ہوں تو براہ مہربانی مسجد کی بیرونی دیوار پر بھی لکھ کر لگوا دیا کریں تاکہ ہم جیسے ”گناہ گار“ نمازیوں کو بھی وقت کی اس تبدیلی کا پتہ چل سکے۔ جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ مولوی صاحب سے کہوں کہ ہماری آج کی رات خیریت سے گزرنے کی دعا سب سے پہلے کریں کیونکہ میں جانتا تھا کہ آج کی رات کم از کم مجھ پر بے حد بھاری گزرنے والی تھی۔ سارے راستے راجہ مجھے تسلیاں دیتا رہا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنی گلی کے کٹڑ پر میں نے اسے گلے لگا کر اپنی آہوں اور سسکیوں میں رخصت کیا۔ آپیں راجہ کی تھیں اور سسکیاں میری، جو میرے منہ سے ابا کی مار کا سوچ کر ہی پہلے سے نکل رہی تھیں۔

گھر میں داخل ہوتے برآمدے میں غصے سے ٹپکتے ہوئے ابا پہ میری نظر پڑی۔ انہوں نے غصے سے ہنکارا بھرا۔

”آگئے جناب..... بڑی لمبی نماز پڑھی آج تو میرے لعل نے۔“ میں منہ ہی منہ میں بد بدایا۔

”جی..... وہ..... میں..... جی.....“

ابا گرجے۔ ”یہ کیا جی جی لگا رکھی ہے..... اور وہ دوسرا لوفر کہاں ہے، جو تمہارے ساتھ روزانہ گھر سے نماز کا کہہ کر نکلتا ہے۔“

مطلب یہ کہ اگر ابا نے راجہ کو دوسرا لوفر کہا تھا تو یقیناً انہوں نے پہلے لوفر کے درجے پر مجھے ہی فائز کر رکھا ہوگا۔ میں ابھی اپنے ذہن میں

<http://kitaabghar.com>

اس درجہ بندی میں مصروف ہی تھا کہ ابا کی گرج دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”میں پوچھتا ہوں کہاں تھے نماز کے وقت..... ذرا شرم نہیں آتی یوں اللہ کے گھر سے بھاگتے ہوئے تمہیں، کب سے دھول جھونک رہے

ہو ہماری آنکھوں میں.....؟“

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ عمار اور بھیا برآمدے کے ستونوں کے پیچھے سے نکل آئے اور عمار نے الف سے لے کر ی

تک تمام داستان امیر حمزہ ابا کے گوش گزار کر دی۔ بھیا کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی، جیسے کہہ رہے ہوں ”دیکھ لیا ناٹو۔ یہ انجام ہوتا ہے میرے

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

گلک سے پوچھے بنا پیسے نکالنے کا۔ اب بھگتو۔“

عمارہ بولتی گئی اور ابا کا پارہ آسمان کی آخری حدوں کو چھونے کے درجے کو پہنچتا گیا۔ ایسے موقعوں کے لیے خاص ”چھڑی“ بھیا نے پہلے ہی

برآمدے میں لا کر رکھ دی تھی تاکہ بعد میں ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں ابا کی وہ چھڑی ٹوٹ کر مجھ پر برس رہی تھی۔ اس رات تو

امی کی مداخلت بھی کام نہ آئی۔ بالآخر جب امی نے ابا کی چھڑی کی ضربیں خود اپنے ہاتھ پر سہنا شروع کر دیں اور اپنے ہاتھوں کو میرے جسم کی مستقل

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ڈھال بنا لیا تب ابا کو رکننا ہی پڑا۔

یہ پہلی مار تھی جو ابا کے ہاتھوں اس رات مجھے پڑی تھی۔ اس کے بعد بھی مجھے بہت بار مار پڑی۔ کبھی ابا کے ہاتھوں، کبھی اپنے درس دینے

والے مولوی کے ہاتھوں، کبھی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے ہاتھوں لیکن ان میں سے سب سے بُری مار وہ تھی، جو اس زمانے اور وقت نے مجھے ماری۔

شاید اس دنیا میں سب سے بڑی مار اس زندگی کی مار ہوتی ہے۔ آگے چل کر زندگی نے مجھے بہت مارا۔ ہر موڑ پر اٹھا اٹھا کر پٹخا۔ میرا جسم میری روح

جانے کتنی بار لہو لہان ہوئی اس کی میں گنتی بھی بھولتا گیا۔ کاش زندگی، زمانے اور وقت کی مار بھی اُس رات ابا کی مار جیسی ہوا کرتی، جس سے بچانے

کے لیے امی کے محافظ ہاتھ ہمیشہ میری ڈھال بن جایا کرتے تھے لیکن وقت کے ان بے رحم تپھیروں سے بچانے کے لیے امی کے مہربان ہاتھ ہمیشہ

اور ہر جگہ میری ڈھال نہیں بن پائے۔ زخم پر زخم لگتا رہا اور میں اپنے مقدّر کی مار سہتا چلا گیا۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا ڈاکہ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

اُس رات کی ابا کی مار اور ان کی چھڑی کے نشانات بہت دنوں تک میرے جسم کی زینت بنے رہے۔ راجہ نے جب میری پیٹھ پہ یہ نشانات دیکھے تو اسے پکا یقین ہو گیا کہ میں ابا کا سرگایا نہیں ہوں اور ضرور انہیں کسی میلے وغیرہ سے ملا ہوں گا، جہاں اپنے اصل ماں باپ سے بچھڑ کر میں کسی جھولے میں لٹکا رو رہا ہوں گا اور ابا کو مجھ پر رحم آ گیا ہوگا اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے ہوں گے۔ راجہ کے اس ”یقین کامل“ کی وجہ حال ہی میں ریگل سینما میں لگی محمد علی اور شاہد کی نئی فلم ”جوش“ تھی، جس میں ہیر واپنے گھر والوں سے ٹھیک یوں ہی بچھڑ جاتا ہے اور پھر جوان ہونے کے بعد اسے اپنے اصلی ماں باپ واپس مل جاتے ہیں۔ راجہ نے کئی قسطوں میں چھپ کر یہ فلم دیکھی تھی اور اسے محمد علی کے تمام مکالمے زبانی یاد بھی تھے۔ راجہ کے بقول اسے تو میرے نازک انداز و اطوار دیکھ کر پہلے دن سے ہی پکا یقین تھا کہ میں کسی نہایت امیر و کبیر گھرانے کا چشم و چراغ ہوں جو نہ جانے کیسے اس غریب محلے میں آ پہنچا تھا۔

میں ابھی حیرت سے منہ کھولے راہ کی یہ تصویر سن رہا تھا کہ اچانک ہی راجہ نے زور سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انتہائی جذباتی لہجے میں اس نے مجھ سے یہ وعدہ کرنے کو کہا کہ جب کبھی میرے اصل ماں باپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ پہنچیں اور میں ان کی لمبی سی مر سڈیز گاڑی میں اس محلے سے رخصت ہونے لگوں تو جاتے جاتے راجہ کو بھی اپنے ساتھ ہی پچھلی سیٹ پر بٹھا کر لیتا چلوں کیونکہ میرے بغیر اس کا دل بھلا اس جگہ پھر کیوں کر لگے گا؟

میں نے بھی فوراً اسی قدر جذباتی لہجے میں راجہ سے وعدہ کیا کہ میں ہر گز اسے لیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ بھلا امی کے بناء میرا دل وہاں کیسے لگ پائے گا۔ لہذا میں نے امی کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عمارہ اور بڑے بھیا میرے ساتھ وہاں نہ ہوئے تو میں اپنی امارت کا رعب کس پر ڈالوں گا اور روزانہ میری لڑائی کس سے ہوگی؟ لہذا طے یہ پایا کہ عمارہ اور بڑے بھیا کو بھی شدید دشمنی کے باوجود ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یہ خیال ستانے لگا کہ اگر ہم سب ہی یہاں سے چلے گئے تو پھر ابا کیلئے یہاں رہ کر کیا کریں گے۔ ان کی سائیکل روزانہ کون صاف کرے گا؟ شام کو انہیں حقہ کون بھر کر دے گا؟ مانا کہ آج کل ان کا سلوک مجھ جیسے ”امیر گھرانے“ کے بچے کے کچھ شایان شان نہیں ہے لیکن کبھی کبھی شام کو وہ مجھے اپنی سائیکل کے ڈنڈے پر لگائی ہوئی چھوٹی والی گدی پر بٹھا کر کھنڈی سڑک کی سیر کو بھی تولے جایا کرتے تھے اور ابھی پچھلے ہی مہینے انہوں نے مجھے سرخ اور پیلے رنگ کا بنا بڑا سا سینا جہاز کا کھلونا بھی تو خرید کر دیا تھا۔ ان سب باتوں کے مقابلے میں اس ذرا سی مار کی حیثیت اب مجھے ثانوی سی لگنے لگی تھی لہذا طے یہ پایا کہ میں، راجہ اور ابا سمیت اپنے تمام گھر والوں کو اپنے ”ہونے والے بنگلے“ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے اصل اور امیر ماں باپ میری یہ ”معصوم خواہش“

کبھی رو نہیں کریں گے بلکہ میں نے اور راجہ نے تو پکا طے ہی کر لیا کہ اگر انہوں نے ابیا راجہ کو ساتھ لے جانے میں ذرا بھی آنا کافی کی تو میں بھی ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گا۔

لیکن فی الحال مجھے اپنے اصلی ماں باپ کی تلاش سے بھی بڑی ایک اور فکر لاحق تھی اور وہ فکر تھی و جو آپنی کا سامنا کرنے کی، جانے کب عمارہ نے میری مار کا تمام قصہ ڈھو آپنی کے گوش گزار کر دیا تھا۔ دراصل عمارہ بھی میرے ساتھ ہی استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھنے جایا کرتی تھی اور مجھ سے چار سپارے آگے بھی تھی۔ اب کی مار کے بعد میں ایک آدھ دن ”انتقاماً“ استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھنے نہیں گیا۔ تبھی ان دنوں میں بد قسمتی سے ڈھو آپنی کسی کام سے استانی خالہ کے ہاں آئیں اور مجھے نہ پا کر عمارہ سے میرے بارے میں پوچھ بیٹھیں۔ بس پھر کیا تھا عمارہ کو تو ویسے بھی ہمیشہ میری ”عزت نفس“ دوسروں کے سامنے مجروح کرنے میں بے حد مزہ آتا تھا اور اس دن تو وہ ویسے بھی مجھ سے لڑ کر گئی تھی کیونکہ میں نے اس کی کاپی پر ”بے دھیانی“ میں سیاہی الٹ دی تھی۔ عمارہ نے خوب نمک مرچ لگا کر ڈھو آپنی کو اس رات کا سارا قصہ سنا دیا اور پھر واپس آ کر مجھے بھی بتانے لگی کہ ڈھو آپنی مجھے اپنے گھر بلارہی ہیں۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ہی ٹھنک گیا تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ تو پوری دال ہی کالی ہے۔ دو چار دن تو میں ڈھو آپنی سے نظر بچا گیا لیکن پھر ایک دن جب ہم محلے کے بڑے میدان میں اسٹاپو کھیل رہے تھے اور کھیل میں اس قدر مگن تھے کہ ہمیں ڈھو آپنی کے تانگے کے آنے تک کا پتہ نہیں چلا۔ میں اس وقت چونکا، جب مجھے فضلہ بابا کی آواز سنائی دی، جو تانگے والے سے کرائے پر بحث کر رہے تھے۔ گھبرا کر دوسری جانب دیکھا تو ڈھو آپنی بڑی سی چادر لپیٹے تانگے سے اتر رہی تھیں۔ میں فوراً وہاں سے رفو چکر ہونے کی نیت سے بھاگا لیکن دوسرے ہی لمحے میری کلائی ڈھو آپنی کی نازک گرفت میں تھی۔

”آدی..... کہاں بھاگے جا رہے ہو..... میرے ساتھ گھر چلو..... اماں نہ جانے کتنے دن سے تمہارے لیے ماش کی دال کا حلہ بنائے بیٹھی ہیں۔ روز تمہارا پوچھتی ہیں۔“

سیکنہ خالہ ماش کی دال کا حلہ واقعی بہت لذیذ بناتی تھیں لیکن اس وقت مجھے یہ ترغیب بھی لبھا نہیں سکتی تھی لیکن اب کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ڈھو آپنی اسی طرح میرا ہاتھ تھامے مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئیں۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے اپنی اماں کو آواز لگا کر مطلع کر دیا کہ میں یعنی جناب آدی صاب ان کے ساتھ ہی تشریف لے آیا ہوں لہذا میرے لیے بھی شام کی چائے بنائی جائے۔

سیکنہ خالہ کو ہدایات دینے کے بعد ڈھو آپنی نے مجھے اپنے سامنے پڑی چوکی پر بٹھالیا اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے اچانک ہی پوچھ بیٹھیں۔

”آدی..... یہ میں تمہارے بارے میں کیا سن رہی ہوں.....؟ سچ کہوں تو تم سے ایسی امید مجھے ہرگز نہ تھی۔“

میں ان کے اس اچانک حملے سے گھبرا گیا اور پھر میرے دل کے دوسرے چور نے بھی اسی لمحے سراٹھایا، کہیں انہیں طاہر بھائی نے یہ تو نہیں بتا دیا کہ اس روز ان کے گھر انگوروں کی پرات نہیں بچتی تھی۔ اتنے دنوں سے وہ انگوروں والا ماجرا تو میں بھلائے ہی بیٹھا تھا اب جو و جو آپنی سامنے آئیں تو اچانک ہی میری نظروں کے سامنے انگور کے گچھے لہرانے لگے تھے۔

میرے منہ سے بس اتنا ہی نکل پایا۔ ”جی..... کیا.....؟“

تب و جَو آپنی نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”مجھے تمہاری نماز چوری والے راز کے بارے میں سب پتہ ہے۔ کتنی بری بات ہے آدی۔ بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟ میں جانتی ہوں یہ ساری شرارت اس راجہ کی ہوگی۔ میری مانو تو اس راجہ سے دور ہی رہا کرو۔ وہ تو ہے ہی سدا کا شرارتی..... تمہیں بھی اپنی طرح کا بنا ڈالے گا جب کہ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارا آدی بہت اچھا بچہ ہے۔“

کتنی عجیب بات تھی کہ دنیا میں ہر کسی کو اپنا بچہ ہی سب سے زیادہ شریف معصوم اور اللہ میاں کی گائے نظر آتا ہے۔ راجہ اکثر مجھے بتاتا تھا کہ اس کی اماں اسے پو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ پو کی امی کو گڈو سے شکایت تھی اور گڈو کے ابا اسے راجہ سے دور رہنے کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ان بڑوں کی آپس میں تو کبھی بنتی نہیں تھی الٹا یہ سب مل کر ہم بچوں کے اتحاد و اتفاق کو تباہ کرنے کے درپے رہتے تھے لیکن شکر ہے کہ ہم سب بچوں کو ان ”خراقات“ میں پڑنے کی بالکل بھی عادت نہیں تھی۔ ہم اپنے اپنے گھر والوں کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے لیکن آج بات ہمارے گھر والوں میں سے کسی بڑے کی نہ تھی۔ آج تو و جَو آپنی نے خود مجھ سے یہ بات کہی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے انہوں نے بہت بڑے ”دھرم سنکھٹ“ میں ڈال دیا تھا۔ راجہ ویسے ہی میری و جَو آپنی کی جانب بے تحاشہ توجہ سے بہت چڑتا تھا۔ اگر اسے یہ بات پتہ چل جاتی کہ و جَو آپنی نے مجھے اس کے ساتھ کھیلنے سے منع بھی کر دیا ہے تو پھر تو بھونچال ہی آ جاتا۔ بہر حال اس وقت تو میں چپ ہی رہا کیونکہ میں فی الحال بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ سوچا کسی وقت فرصت میں و جَو آپنی کو تفصیل سے پوری بات اور راجہ کی خوبوں کے بارے میں بتاؤں گا۔ اس وقت ان کے پوچھنے پر میں نے ان سے صرف اتنا ہی کہا کہ ”میرا دل نہیں لگتا نماز میں۔“ اتنے میں سیکہ خالہ چائے لے کر آگئیں اور بات مل گئی۔

و جَو آپنی کے گھر سے باہر نکلا تو راجہ کو وہیں ٹہلتے پا کر میں کچھ گھبرا سا گیا۔ راجہ نے حسب معمول چڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یار ایک توجہ تمہیں تمہاری یہ و جَو آپنی بلا لیتی ہیں تو تمہیں دنیا کی کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ کیا کہہ رہی تھیں.....؟“

”کچھ نہیں..... عمارہ کی بچی نے نماز کی مار والا سارا قصہ انہیں بتا دیا ہے۔ اسی وجہ سے بلایا تھا۔ بڑی بے عزتی ہو گئی یا راپنی۔“

راجہ نے بھی یہ سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ ہم دونوں نے اسی وقت عہد کیا کہ موقع ملے ہی عمارہ سے ایسا بدلہ لیں گے کہ وہ بھی ساری زندگی یاد رکھے گی۔ عمارہ کو ریگنے والے کیڑوں مثلاً لال بیگ، چھپکلی وغیرہ سے بے حد ڈر لگتا تھا۔ میں نے راجہ کو کہیں سے بھی ایک عدد موٹی تازی چھپکلی کا انتظام کرنے کو کہا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ استانی خالہ کے ہاں سبق پڑھتے ہوئے راجہ انگوڑی تیل کے اوپر سے کسی طرح اس چھپکلی کو عمارہ کے اوپر گرائے گا۔ اس کے بعد عمارہ کا خوف کے مارے جو حشر ہوتا اس سے میں اور راجہ خوب واقف تھے۔ ہم کافی دیر تک وہیں کھڑے اس منصوبے کی جزئیات طے کرتے رہے اور ہمارے انتقامی جذبے اور خیالات کو کافی حد تک وہیں کھڑے کھڑے سوچ کر ہی کافی تسکین مل گئی۔ اتنے میں مغرب کی اذان سنائی دی تو ہم دونوں مسجد کی جانب دوڑ پڑے، کیونکہ آج کل ایک نئی افتاد ہم پر پڑی ہوئی تھی۔ ابانے باقاعدہ ہماری مسجد میں حاضری لگانا شروع کر دی تھی۔ ان کے حاضری لگانے کا انداز بھی عجیب تھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد گھر میں گھستے ہی ان کا پہلا سوال ہوتا۔

”ہاں میاں..... نماز کے لیے آئے تھے یا نہیں.....؟“

میں منمناتا ”جی آیا تھا۔“

ابا گھور کر پوچھتے ”کون سی صف میں کھڑے تھے۔“

”جی چوتھی صف میں۔“

”ہوں..... اور میں کہاں کھڑا تھا۔“

”جی آپ پہلی صف میں..... مولوی صاحب کے بائیں جانب۔“

”اچھا تو بتاؤ مولوی صاحب نے پہلی اور دوسری رکعت میں کون سی سورۃ پڑھائی تھی.....؟“

”جی پہلی رکعت میں سورۃ فیل اور دوسری میں قل ہواللہ۔“

یوں ابا مطمئن ہو کر ایک لمبا سا ”ہوں“ کرتے اور اس دن کے لیے میں اس پل صراط کو پار کر جاتا لیکن روز روز یہ مقابلے کے امتحان سے بھی بڑا امتحان پاس کرنا اب میرے لیے کافی کٹھن کام ثابت ہونے لگا تھا کیونکہ میرے اور راجہ کے دل کا چوراہا بھی ہمیں نماز کی چوری پر اکساتا رہتا تھا۔ خاص طور پر جس دن ٹی وی پر ”بائیونک وومن“ یا عائب ہو جانے والے ”جینی مین“ Gmni Man کا کھیل چلنا ہوتا اس دن تو ہمارے پیٹ میں گویا مستقل درد ہی رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ راجہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری تو مجبوری ہے کیونکہ میں رہتا ہی ابا کے گھر میں ہوں لہذا ان کا سامنا ہونا لازمی ہے لیکن اسے تو اس پیشی سے بچنے کے لیے صرف ابا کے سامنے آنے سے گریز کرنا ہوگا پھر وہ کیوں اپنی ساری تفریح کا بیڑہ غرق کر کے اپنا مزہ کر کر کرتا ہے۔ چپ چاپ جا کر غفور چچا کے ہاں مزے سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ لیا کرے لیکن راجہ میری اس بات پر باقاعدہ مجھ سے روٹھ گیا کہ کیا وہ ”اس قدر گر گیا ہے کہ اب اکیلے ٹی وی دیکھنے جایا کرے گا؟“ بڑی مشکل سے میں نے راجہ کو منایا کہ میرا مطلب وہ نہیں تھا، جو وہ سمجھ بیٹھا تھا۔ بہر حال ہمارا مسئلہ اپنی جگہ قائم تھا۔

اس شام بھی ہم دونوں سر جوڑے بیٹھے اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی حل سوچ رہے تھے کہ اتنے میں ہمارے سامنے سے مولوی سعید سائیکل پر اپنے بیٹے اختر کو بٹھائے گزرے۔ اختر کو بھی ہم بچے مولوی اختر کے نام سے ہی پکارتے تھے کیونکہ وہ ہر بات میں اپنے ابا کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولوی سعید صاحب نکاح خواں تھے اور باقاعدہ کسی مسجد کے مولوی نہ ہونے کے باوجود سب انہیں مولوی ہی کہتے تھے۔ میں نے اور راجہ نے اچانک سر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاید ہم دونوں کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی بات کسی بجلی کی طرح کوندی تھی۔ میں نے فوراً اپنا جیب الٹا، میرے پاس آٹھ آنے اور راجہ کی جیب سے کوئی ایک روپے کے قریب سکے نکلے۔ ہم دونوں وہ ڈیڑھ روپیہ لیے کچھ ہی دیر میں مولوی سعید کے دروازے پر کھڑے تھے اور اختر ہمارے سامنے حیران پریشان سا کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

”میں سمجھا نہیں..... مجھے کرنا کیا ہوگا.....؟“

راجہ نے سکے اپنی مٹھی سے اس کی ہتھیلی میں منتقل کرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

”کوئی مشکل کام نہیں ہے پیارے، صرف مسجد میں اس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ آدمی کے ابا کون سی صف میں اور کس نمبر پر کھڑے ہوتے ہیں اور یہ کہ مولوی صاحب نماز کے دوران کون سی سورتیں پڑھاتے ہیں۔ نماز ختم ہوتے ہی ہم مسجد کے باہر تمہارا انتظار کرتے ملیں گے۔ تم یہ ساری معلومات ہمیں دینے کے بعد ہی گھر واپس آؤ گے..... کیا سمجھے؟“

مولوی اختر نے پیسے اپنے گرتے کی جیب میں ڈالے اور دانت نکالتے ہوئے سر ہلا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے قدرت نے پھر ہماری اس نماز چوری کا بندوبست کروا دیا تھا۔ اب اختر مسجد سے باہر نکلتا تو میں اور راجہ کاغذ، پنسل لیے اس کا انتظار کر رہے ہوتے۔ اختر جلدی جلدی ہمیں ابا کی پوزیشن اور باقی معلومات فراہم کرتا اور میں اور راجہ اسے رٹا لگاتے ہوئے گھر کی جانب بھاگتے۔ کبھی کبھی وہ کم بخت اختر سورتوں کی ترتیب بھول جاتا اور ہماری جان تب تک اٹکی رہتی، جب تک ہم ابا کے وائیو Vival (زبانی امتحان) سے گزر نہ جاتے۔ بھیانے بیچ میں ایک آدھ بار ہمیں پکڑوانے کی ناکام کوشش کی لیکن ہمیں یہ سب کیسے پتہ چلتا تھا یہ بات وہ بھی کبھی نہ جان پائے کیونکہ ہماری معلومات سو فیصد پکی ہوا کرتی تھیں۔ راجہ نے اس معاملے میں کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصے میں ہم دونوں کو یہ بات کبھی سمجھ نہیں آ سکی کہ ہم اس تمام عمل میں جس مشقت سے گزر رہے ہیں اور تو اور اپنا جیب خرچ بھی اس لالچی اختر کی جیبوں میں بھر رہے ہیں۔ اوپر سے ہر لمحہ ابا کا ڈر اور پکڑے جانے کا خوف الگ۔ اس تمام عذاب سے تو کہیں آسان تھا کہ ہم سیدھے سبھاؤ مسجد میں جا کر خود ہی نماز پڑھ لیتے کیونکہ اختر کو درمیان میں ”ملوث“ کرنے کے بعد کبھی کبھی تو ہمارا اس سے بھی کہیں زیادہ وقت ضائع ہو جاتا تھا جتنا اس صورت میں ہوتا، جب ہم سیدھے مسجد جا کر خود نماز پڑھ کر نکل آتے لیکن ہمارے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ یہ چوری تو ہمیں کچھ دینے کے بجائے خود ہم سے ہمارا بہت کچھ چھین رہی تھی، لٹا ہماری اپنی جیبوں پر بھاری پڑ رہی تھی۔ دنیا میں کس چور نے ایسے چوری کی ہوگی جس کے بعد ہر بار وہ خود ہی لٹا ہو۔ شاید میں اب تک بھی یہ بات نہیں سمجھ پایا کہ بہت سی چوریاں ایسی ہوتی ہیں جو خود اپنے اندر ہی ڈاکہ مارنے کے مترادف ہوتی ہیں۔ میرا اپنے اندر کا یہ ڈاکہ، یہ فریب، یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ کبھی ایک صورت میں، تو کبھی کسی دوسری صورت میں..... چاہے کچھ ہو جائے پر میرے اندر کا ڈاکو، ڈاکہ مارنے سے باز نہیں آتا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اپالو

اپالو کہانی ہے حسن و عشق کے دیوتا اور تباہی و بربادی کی علامت اپالو کی..... ایک عالم اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا..... قدم قدم پہ موت اس کی راہ میں جال بچھائے بیٹھی تھی..... اپالو..... جسے خود اپنی تلاش تھی اور خود آگہی کی جدوجہد میں وہ ساری دنیا گھوم گیا..... پراسرار حالات میں غیر معمولی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک **اپالو** کیا اپنی تلاش میں کامیاب ہوا؟

اپالو کتاب گھر کے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا بائی سکوپ

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

جس دن سے راجہ نے یہ انکشاف کیا تھا کہ میرے امی ابا میرے سکے ماں باپ نہیں ہو سکتے اس دن سے محلے میں کوئی بھی کھیل کھیلتے ہوئے ہماری نظر جب کبھی محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوتی ہوئی کسی لمبی چوڑی امپالا، شیڈورے یا فیٹ کار پر پڑتی تو میں اور راجہ کھیل چھوڑ چھاڑ کر اس گاڑی کا طواف کرنے لگ جاتے۔ ہم دونوں کو اب بھی پورا یقین تھا کہ ایسی ہی کسی بڑی گاڑی میں کسی دن ہماری قسمت کے مسیحا بھی ہمیں لینے آ جائیں گے۔ راجہ، صاحب لوگ اور میم صاحبہ کے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی جلدی سے مجھے گاڑی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتا اور میں انتہائی معصوم سی شکل بنا کر اس وقت تک ان کے سامنے پلکیں پٹ پٹاتا رہتا جب تک ان لوگوں کی مجھ پر نظر نہیں پڑ جاتی تھی۔ دراصل میں اور راجہ چاہتے تھے کہ اگر وہ بڑی گاڑی والے صاحب اور میم میری ہی تلاش میں ہمارے محلے میں آئے ہیں تو پہلی ہی نظر میں وہ مجھے پہچان جائیں لیکن درجنوں جوڑوں کے دیکھنے کے باوجود میں کسی کا ”مطلوبہ کھویا ہوا بچہ“ ثابت نہ ہوا۔ کبھی کسی میم یا صاب کی نظر مجھ پر پڑ بھی جاتی تو ”ہاؤ سوئیٹ“ کہہ کر میرے گال کھینچ کر آگے بڑھ جاتے، ایک آدھ نے چاکلیٹ بھی تھمادی اور ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ میں اور راجہ دیے تو محلے کے سب سے فیشن ایبل بچے تھے اور ہماری امتیاز ہمیں خوب چمکا کر اور کنگھی پٹی کر کے گھر سے باہر نکالتی تھیں۔ میری امی کو تو ہمیشہ مجھے کسی کی نظر لگ جانے کا ڈر رہتا تھا لہذا وہ میرے ماتھے، ناک یا گال پر ایک آدھ کا لائیکہ لگا کر گھر سے باہر بھیجتی تھیں لیکن اس دن میں اور راجہ استانی خالہ کے ہاں سے سبق پڑھ کر سیدھے محلے کے بڑے میدان میں ”ٹھوگر م کھیلنے“ کے لیے آ گئے تھے لہذا ہمارے سروں پر ابھی تک گھر سے نکلنے وقت رکھی گئی سفید دوپلی ٹوپیاں بھی موجود تھیں۔ ابھی ہم نے کھیل شروع ہی کیا تھا کہ محلے میں سفید رنگ کی ایک بڑی سی کینڈلک داخل ہوئی۔ میں اور راجہ گاڑی دیکھتے ہی فوراً اس کے رکنے سے پہلے ہی عین اس کے اگلے دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اندر سے سوٹ پہنے ایک صاحب اور فیروز رنگ کے نیل باٹم میں ملبوس ایک خوب صورت سی خاتون اتریں۔ راجہ نے فوراً مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک قدم آگے کھڑا کر دیا۔ میرے چہرے پر اس وقت وہی معصومیت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور راجہ بھی اس طرح مودب کھڑا تھا، جیسے اس جوڑے سے کہنا چاہ رہا ہو کہ ”لیں جی..... سنبھالیں اپنی امانت..... بہت عرصہ حفاظت کر لی میں نے آپ کے بچے کی۔ اب ہم سے مزید نہیں ہوتا.....“ عورت ہم دونوں کو دیکھ کر ذرا سا مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک ہلکی سی لہر ابھری۔ اس نے اپنے مرد سے ہلکے سے کچھ کہا۔ میرا اور راجہ کا دل زور سے دھڑکا۔ مرد نے بھی مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ راجہ نے پیچھے سے سرسراتی سی آواز میں ہلکے سے کہا۔

”اوئے آدی کے بچے..... گلتا ہے یہی تیرے اصلی امی ابا ہیں۔ تیار ہو جا۔ یہ لوگ تجھے ہی لینے آئے ہیں۔“

میں نے اپنے ذہن میں فوراً اپنی چیزوں کی فہرست ترتیب دے ڈالی کہ اپنے ”ترکے“ میں سے کیا کچھ مجھے ساتھ لے جانا تھا اور کون سی ایسی چیزیں تھیں، جنہیں میں جاتے ہوئے محلے کے ان غریب بچوں میں بانٹ جاؤں گا۔

عورت اور مرد دونوں ہی مسکراتے ہوئے میری اور راجہ کی جانب بڑھے، ہم دونوں نے اپنے دم سادھ لیے۔ دونوں ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میم صاحب نے میرے گال چھو لیے اور مرد نے راجہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ دونوں کے ہاتھ آگے بڑھے اور کوئی کاغذ نما چیز ان کے ہاتھوں سے ہمارے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی اور جوڑا آگے بڑھ گیا۔ کچھ دیر تک تو میں اور راجہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب ہم دونوں نے اپنی اپنی ہتھیلیاں کھولیں تو اس میں دس دس روپے کے دونوٹ میری اور راجہ کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میم صاحب اور بڑے صاحب میرے اور راجہ کے حلیے اور ہمارے سر پر بھی سفید ٹوپیاں دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھے کہ ہمارے ہاتھوں میں پیسے تھما گئے تھے۔ بقول راجہ وہ ہمیں مدر سے کے لیے چندہ جمع کرنے والے بچے سمجھے تھے۔ اس قدر بے عزتی.....؟ غصے کے مارے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ میں وہیں پیسے پھینک کر اور پیر چٹختے ہوئے وہاں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ راجہ مجھے پیچھے سے آوازیں دیتا رہ گیا لیکن میں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور بھاگتا ہوا گھر چلا گیا۔ مغرب کے وقت راجہ نے مجھے گھر کے باہر دھر ہی لیا لیکن میں اب بھی اس سے روٹھا روٹھا سا تھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے تو ہوا تھا۔ نہ وہ مجھے یہ قیمتی مشورے دیتا اور نہ آج یوں لوگ ہمیں مدر سے کے بچے سمجھ کر ہمارے ہاتھوں میں چندے کے پیسے تھماتے۔ میں نے تو راجہ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اب مجھے اس کی کسی بات کا یقین ہی نہیں رہا۔ یہ سن کر راجہ غصے میں آ گیا اور اس نے تیسری جماعت کی اردو کی کتاب کے سبق میں موجود بابا قادر جیلانی کی قسم کھائی کہ اس نے خود سینما کے بائیسکوپ میں یہ سارا قصہ دیکھا ہے اور اگر مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تو پھر اس اتوار کو میں بھی اس کے ساتھ فلم دیکھنے چلا چلوں۔

سچ تو یہ ہے کہ راجہ کے منہ سے فلم کی کہانیاں اور سینما کے ماحول کے بارے میں سن کر خود مجھے بھی سینما جانے کا بے حد شوق ہونے لگا تھا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ آج تک میں نے اکیلے کبھی محلے سے باہر والی سڑک پر بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ سینما تو بہت دور کی بات ہے، مجھے کبھی سڑک کے پار پر چون کی دکان سے اپنے لیے پنسل، شاہ پزیر یا بڑ وغیرہ لینے ہوتی تھی تو میں بڑے بھیا کے ساتھ سڑک پار دکان تک جاتا تھا۔ فلم کے نام پر میں نے آج تک صرف محلے میں ہر ہفتے آنے والے ایک بابا کاٹھن کا بڑا سا ڈبہ دیکھا تھا۔ اس ڈبے میں چاروں جانب اندر جھانکنے کے لیے چھوٹے چھوٹے سے گول روشن دان سے بنے ہوتے تھے، جن کے منہ پر ٹین کے ڈھکن لگا کر انہیں بند کیا ہوا ہوتا تھا۔ ہم نے اس بابے کا نام ہی منڈوا بابا رکھ چھوڑا تھا اور جب کبھی وہ بابا ہمارے محلے میں اپنی سائیکل پر منڈوے کا بڑا سا ٹین کا بسکہ اٹھائے داخل ہوتا تو ہم سب بچے اپنی اپنی جیبوں سے ریزگاری نکال کر اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے، جو جتنا بڑا اسکے اسے پیش کرتا اس بچے کو اتنی ہی زیادہ دیر کے لیے اس بکس میں جھانکنے کی اجازت ہوتی۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ اس چھوٹے سے بکس میں ندیم، شبنم، رانی، شاہد اور بارہ شریف وغیرہ کبھی کیسے ایک ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم سب کو یوں نادیدوں کی طرح اس بکس کے گرد طواف کرتے دیکھ کر راجہ ہم سب بچوں کا بہت مذاق اڑایا کرتا کہ بھلا یہ بھی کوئی فلم ہے؟ فلم دیکھنی ہے تو سینما کی فلم دیکھو، جس کے جہازی ساز کے پردے پر جب سندباد بحری قزاقوں سے لڑتا ہے یا نازن جب شیر کی سواری کرتا ہے تو کیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ یہ ڈبہ بھلا کیا فلم دکھائے گا؟ یہ تو فلم کے نام پر دھبہ ہے۔ اسے تو بائیسکوپ کہنا بھی اصل بائیسکوپ کی توہین ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اور پھر جس دن سے میں نے راجہ کی لے پالک بچے والی تھیوری Theory پر شک کا اظہار کیا تھا اس دن سے تو وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ کچھ بھی ہو ایک بار تو مجھے اس کے ساتھ ریگل میں لگی ندیم شبنم کی ”دل لگی“ کا میٹنی شو تو دیکھنے جانا ہی ہوگا تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ وہ سچا ہے یا جھوٹا۔

آخر کار ”راجہ کے اصرار“ کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ راجہ نے خوشی سے ایک لمبا ”اوئے ہوئے“ کا نعرہ لگایا۔ پتہ یہ چلا کہ محلے میں راجہ کے علاوہ تین اور بچے یعنی گڈو، مٹی اور نتھو بھی فلم بنی کے شوقین تھے اور راجہ ہی کی قیادت میں اس سے پہلے چند مرتبہ گھریا اسکول سے بھاگ کر مارنگ یا میٹنی شو دیکھ چکے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر قسطوں میں فلم دیکھتے تھے مثلاً ہمارے شہر میں ایک فلم عموماً دو ہفتے تو نکال ہی جاتی تھی۔ یہ لوگ کبھی فلم کا شروع کا آدھ گھنٹے کا حصہ، کبھی انٹرول کے بعد کا کچھ حصہ اور کبھی اختتام ہی پہلے دن دیکھ آتے تھے۔ اس طرح سے انہوں نے آج تک کوئی فلم پوری ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ بعد میں یہ سب بچے مل بیٹھ کر آگے پیچھے کی کہانی جوڑ کر اپنے طور پر پوری فلم کی کہانی ”سمجھنے کی کوشش“ کرتے جو کہ عام طور پر اتنی گھمبیر ہوتی کہ کوئی ہدایت کار سن لیتا تو شاید اسی فلم میں سے چار پانچ مزید فلمیں اور کہانیاں نکال ڈالتا۔

سب سے پہلا مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میں نے راجہ سے کہا کہ میرے پاس نکٹ کے پیسے نہیں ہیں۔ راجہ نے دانت نکالے اور جیب سے بیس روپے نکال کر مجھے دکھائے ان میں سے ایک نوٹ وہ تھا، جو میں اس دن کار کے پاس پھینک کر بھاگ آیا تھا۔ راجہ نے تب مجھے سمجھایا کہ ”مایا“، یعنی پیسے روپے کی یوں ناقدری نہیں کرنی چاہیے ورنہ مایا دیوی روٹھ جاتی ہے۔ اسی خیال سے راجہ نے اس دن میرا پھینکا ہوا نوٹ بھی اٹھالیا تھا کہ میرے کسی ”برے وقت“ میں کام آئے گا۔ میں نے گھور کر راجہ کو دیکھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت ہم پانچوں ہی برے حال میں تھے۔ فلم کا سب سے اگلی لائن کا نکٹ تین روپے کا ملتا تھا۔ مطلب ہم پانچ کے ہوئے پندرہ روپے، باقی پانچ روپے میں راجہ نے ہمیں انٹرول کے دوران عیاشی کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب ہمیں بے چینی سے اتوار کے دن کا انتظار تھا کیونکہ عام اسکول کے دنوں میں ہمارا گھر سے نکلنا ناممکن تھا۔ خاص طور پر مجھ پر تو اتنے زیادہ پہرے لگے ہوئے تھے کہ اگر میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ گھر سے باہر رہ جاتا تو امی فوراً بھیا بھیا عمارہ کو باہر محلے میں مجھے دیکھنے کے لیے بھیج دیتی تھیں۔ لہذا مجھے اس بات کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ اتنی دیر تک میں گھر والوں کی نظر میں آئے بغیر گھر سے باہر کیسے رہ پاؤں گا؟

پہلے میں نے سوچا کہ قہو آپی کے گھر کا کہہ کر گھر سے اجازت لے لوں اور قہو آپی کو کسی بہانے منالوں گا کہ اگر گھر سے کوئی پوچھنے آئے تو اسے کہہ دیں کہ وہیں کہیں ہوں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے ذہن کا بنایا یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ قہو آپی میرے گھر والوں کو تو سنبھال لیں گی لیکن ان کو کون سنبھالے گا؟ وہ تو سوال پوچھ پوچھ کر مجھے ہی نڈھال کر دیں گی اور پھر اگر انہیں اس بات کی ذرا بھی بھٹک پڑے گی کہ میں راجہ کے ساتھ اتنی دیر کے لیے کہیں جا رہا ہوں تو پھر تو سمجھو قیامت ہی برپا کر دیں گی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ معہ کیسے حل ہوگا؟

آخر کار راسی شش و پنج میں اتوار کا دن بھی آ گیا۔ اس دن میری کچھ ایسی حالت تھی کہ میں ہر آہٹ پر چونک ہی تو پڑتا تھا، جیسے میرے ماتھے پر لکھا ہوا ہو کہ آج میں فلم دیکھنے جا رہا ہوں۔ دو مرتبہ تو آتے جاتے صحن میں ابا سے ٹکرا گیا۔ ایک مرتبہ ٹھوکر سے ان کا حقہ الٹ گیا۔ ابا زور سے گرجے ”کیا ہو گیا ہے لڑکے؟“ وہاں سے گھبرا کر پلٹا تو برآمدے میں اسکول کا کام کرتے آڑھے ترچھے لیٹے بھیا کی کمر پر چڑھ گیا۔ ان کی ایک زور

دار جیج گوٹھی اور اس سے پہلے کہ میں ان کے ہتھے چڑھتا میں بھاگ کرا می کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسے جیسے مینٹی شوکا وقت قریب آتا جا رہا تھا میری دل کی دھڑکنیں یوں بے ترتیب ہوئی جاتی تھیں، جیسے دل ابھی سینے کے پنجے سے باہر نکل جائے گا۔ آخر کار قسمت کو مجھ پر کچھ رحم آ ہی گیا۔ میرے سب سے بڑے پہرے دار یعنی بڑے بھیا دو پہر دو بجے امی سے اجازت لے کر ہاکی کا میچ کھیلنے بڑے ہاکی گراؤنڈ چلے گئے۔ ان کے ٹلنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عمارہ کو بھسائی شاہدہ اپنے گھر بلا لے گئی وہ عمارہ کے ساتھ مل کر پھر کسی بد مزہ ٹاٹر کی چٹنی بنانے کا کوئی نیا تجربہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کا اور عمارہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان دونوں کی بنائی ہوئی چٹنیاں اور مرے عام طور پر محلے کی بلیوں اور مرغیوں کے آگے ڈالنے کے کام آتے تھے۔

ڈھائی بج چکے تھے اور تین بجے مینٹی شوکا وقت تھا۔ باہر سے راجہ کی مخصوص سیٹیوں کی آواز لگتا رہا تھا شروع ہو گئی تھی۔ ابا اتوار کے دن دادی سے ملنے جایا کرتے تھے، ان کی واپسی عصر سے پہلے ناممکن تھی۔ امی دو پہر کو زار دیر کے لیے کمر لگاتی تھیں۔ بس مجھے اسی موقعے کا انتظار تھا۔ کچھ ہی دیر میں امی باورچی خانے سے برتن وغیرہ سنبھال کر باہر نکلیں اور کمرے کی طرف جاتے ہوئے مجھ سے بولیں۔

”آدی، وہاں صحن میں بیٹھے کیا کر رہے ہو چلو کچھ دیر کے لیے لیٹ جاؤ۔ دیکھو دو پہر میں کہیں کھسک نہ جانا ورنہ بہت پٹائی کروں گی۔“

امی اندر چلی گئیں۔ ہم بچے عام طور پر اپنی اماؤں کی ایسی دھمکیوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ماؤں کی پٹائی کیسی ہوتی ہے۔ مارتے ہوئے بھی ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ خود ان کا ہاتھ دکھتا ہے تو دکھ جائے پر ان کے جگر گوشے کو کوئی کاری ضرب نہ لگنے پائے اور پھر میری امی کے لیے تو میرے منہ سے نکلی ایک زور کی ”ہائے“ ہی کافی تھی۔ ساری مار پٹائی بھول کر درد والی جگہ پر پھونکنیں مارنے لگتی تھیں۔ امی کے کمرے میں جاتے ہی میں دے پاؤں اٹھا اور گلی میں نکلتے ہی میں نے محلے کی چار دیواری کی طرف دوڑ لگا دی جہاں راجہ دوسرے فلم بین بچوں سمیت میرا انتظار کر رہا تھا۔ راجہ نے مجھے دیکھتے ہی جھاڑا کہ ”اتنی دیر کہاں لگا دی؟“

میں نے حیرت سے ان چاروں کے حلیے کو دیکھا۔ وہ سب کے سب بڑے چیک والی بوٹرس پہنے، آنکھوں پر بڑے بڑے کالے چشمے لگائے، بالوں میں تیل ڈالے اور بڑے بڑے خانوں والی کھلے پانچوں والے فلپیر پہنے کھڑے تھے۔ صرف ان کے کپڑوں کے رنگ ہی مختلف تھے ورنہ وہ چاروں اس وقت ایک ہی گھر کے چار جو کر لگ رہے تھے۔ نھو کا چشمہ تو اس کے چہرے سے بھی کافی بڑا تھا لہذا بار بار پھسل کر اس کی گردن تک آ جاتا تھا، جسے وہ جلدی سے پھر سے اپنی ناک پر ٹکانے کی کوشش میں اسے مزید لٹکا دیتا۔ پتہ چلا کہ راجہ نے ان سب کو ”بڑوں والے حلیے“ میں آنے کے لیے کہا تھا۔ راجہ چاہتا تھا کہ ہم سب ایسے حلیے میں فلم دیکھنے کے لیے جائیں جس میں اتوار والے دن شہر کی جینٹری جاتی تھی تاکہ ہم ان لوگوں سے الگ نہ دکھائی دیں۔ اسی ٹینشن میں گڈو، نھو اور مٹی کو جو چیز بھی گھر سے ہاتھ لگی وہ پہن کر اور ”ڈال“ کر آ گئے تھے۔ نھو اپنے تایا کا چشمہ پہن آیا تھا، گڈو اپنے ابا کی واسٹ اور مٹی نے تو حد ہی کر دی تھی وہ اپنی بڑی بہن کا جاسی رنگ کا فلپیر میچنگ شرٹ کے ساتھ پہن آیا تھا۔ خود راجہ بھی کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے بال اپنے پسندیدہ ولن اسلم پرویز کے انداز میں اوپر بنا کر ماتھے پر ایک لٹ چاند کی صورت میں چپکا رکھی تھی۔ گلے میں رومال خاص لوفروں کے انداز میں باندھ رکھا تھا اور اپنی بشرٹ کے بٹن بھی آگے سے کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ چند لمحوں تک میں انہیں اور وہ مجھے حیرت سے دیکھتے رہے اور پھر اس سے پہلے کہ میں ان کا مذاق اڑاتا وہ چاروں مجھے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ راجہ نے دور ہی سے نعرہ لگایا۔

”اوائے آدی..... استانی خالہ کے ہاں سبق لینے کے لیے آیا ہے کیا.....؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے سراپے پہ نظر ڈالی۔ میں حسب معمول گھر کے عام شلواریں کرتے میں ملبوس تھا۔ سینے پر امی کا بنا ہوا سامنے سے کھلا سویٹر تھا اور سر پر گرم اونٹنی ٹوپی جس کے سامنے کاٹن ہمیشہ کس کر باندھ دیتی تھیں تاکہ کان ٹھنڈے نہ ہوں۔ مجھے تو اپنے حلیے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی، جسے دیکھ کر کسی کو بھی کوئی خاص اعتراض ہو سکتا ہو۔ بہر حال اب ان باتوں پہ دھیان دینے کا وقت بھی کہاں بچا تھا۔ ششروع ہونے میں چند منٹ ہی تو رہ گئے تھے۔ ریگل سینما ہمارے محلے سے اتنا دور نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم سینما کے بیرونی گیٹ کے باہر موجود تھے لیکن یہ کیا؟ نکٹ والی کھڑکی پہ تو اس قدر بھیڑ تھی کہ لوگ باقاعدہ ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی، جسے جالی لگا کر مزید چھوٹا کر دیا گیا تھا اس کے اندر بنے ایک چھوٹے سے روشن دان میں بیک وقت درجنوں ہاتھ گھمے ہوئے تھے۔ لوگ لڑ رہے تھے، چیخ رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔ میں جلدی سے ڈر کر راجہ کے پیچھے چھپ گیا۔ راجہ اتار ڈال دیکھتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑایا۔

”غضب ہو گیا..... آج تو لگتا ہے کھڑکی تو زدن ہے پکڑ کا۔“

میں راجہ کی بات سمجھ نہیں پایا۔ اگر کھڑکی ہی تو زنی تھی تو پہلے ہی سے توڑ کر رکھتے.....؟ خواخواہ اتنے بہت سے لوگوں کو عذاب میں ڈال رکھا تھا۔

اتنے میں ایک اور عجیب بات ہوئی۔ کھڑکی کے گرد درجنوں لوگ شہد کے چھتے سے چبٹی کھیلوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔ کچھ نو جوان جو بہت دیر سے پیچھے والی قطار میں کھڑے تھے اور ان میں بے چینی اپنی انتہا کو پہنچتی جا رہی تھی، ان میں سے ایک نو جوان نے اچانک ایک زوردار نعرہ لگایا اور اپنی قیص اتار کر ہوا میں اچھال دی، جسے اسی کے ایک ساتھی نے دبوج لیا۔ اس نو جوان کے دوستوں نے اسے کمر اور پیروں سے پکڑ کر ہوا میں اونچا اچھال دیا، وہ نو جوان سیدھا جا کر کھڑکی کے گرد بھیڑ کے سروں پر جا گرا، بھیڑ میں سے کسی نے اس نو جوان کی ماں بہن کے بارے میں کچھ نامناسب الفاظ کہے لیکن وہ نو جوان کسی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے اور باقاعدہ تیرتے ہوئے لوگوں کے سروں کے دریا کو کسی ماہر پیراک کی طرح ہاتھ پیر چلاتے ہوئے نکٹ والی کھڑکی تک جا پہنچا اور وہیں لوگوں کے سروں پر لیٹے لیٹے اس نے اپنا ہاتھ کھڑکی کے اندر ڈال دیا اور کچھ دیر میں چہرے اور ہاتھوں پر چند خراشیں، پچھی ہوئی بنیان اور بکھرے ہوئے بالوں سمیت ہاتھوں میں نکٹ تھا۔ اپنے دوستوں کے پاس فخر سے اکڑتا ہوا واپس آن پہنچا۔ اس کے دوستوں نے خوشی میں زوردار نعرے لگائے اور اسے اسی طرح اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے اندرونی ہال کی جانب بڑھ گئے۔

میں نے مایوسی سے راجہ کی جانب دیکھا۔ اس طرح تو ہمیں ساری زندگی بھی اگر وہاں کھڑے رہنا پڑتا تو نکٹ ملنے کی امید نہیں تھی۔ راجہ نے ہم سب کو تلی دی اور ہمیں سینما کی بالکونی کے باہر گلے فلم کے پوسٹر اور تصویریں دیکھنے کا مشورہ دیا اور خود کسی جانب چلا گیا۔ میں، مشی، گڈا اور نفو بھیڑ بھاڑ سے دور ہٹ کر بالکونی میں گھوم پھر کر تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ تو خاصا بڑا سینما ہال لگ رہا تھا۔ بلکہ ہمارے پرائمری اسکول سے بھی بڑا تھا۔ دیوار پر ہمارے قد سے بھی بڑی ندیم اور شبنم کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ایک بہت بڑے سے تختے پر اندر چلنے والی پکچر کی کہانی کی تصویریں بھی لگائی گئی تھیں۔ ہمارے لیے یہ سب بہت عجیب، خوب صورت اور خواب ناک تھا۔ کچھ ہی دیر میں شہر کی وہ ”ہیمنٹری“ بھی آنا شروع ہو گئی جس کا ذکر

راجہ نے ہم سے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی سے نکت بک کروا رکھتے تھے یا پھر شہر کے اہم عہدوں پر فائز لوگوں کی فیملیز تھیں، جیسے کمشنر صاحب، ڈپٹی صاب، بڑے لاٹ صاب، ایس پی صاحب وغیرہ۔ جنہیں ہر نئی فلم کے رعایتی پاس پہلے ہی سے مہیا کر دیئے جاتے تھے۔ یہ سب لوگ بنا کسی بھیڑ میں بنی قطار میں لگے اور بنا اپنے کپڑے اور سنورے ہوئے بال خراب کیے ہاتھوں میں بیگم صاحبات کے ہاتھ تھامے اور نوکروں کو لیمن اور Limca لکایا فالے کی ٹھنڈی بوتلوں کی ٹوکریاں تھمائے، چپن اور چیونگم چباتے ہوئے ہنستے مسکراتے سینما کے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ سب ان بچوں کو پیار کر رہے تھے اور ان کو جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش اور خیال نے اسی لمحے جنم لیا کہ آئندہ میں تب ہی پکچر دیکھنے آؤں گا، جب میں خود لاٹ صاب بن جاؤں گا، بھلا یوں بھیڑ بھاڑ میں اور گرد میں لڑتے ہوئے نکت حاصل کر کے بائیسکوپ دیکھنے میں بھی کوئی مزہ ہے۔ مجھے تو باہر موجود کبھی لوگ لڑاکا مرغوں کا ایک بچہ اہوا غول لگ رہے تھے۔

اب اندر سے زوردار اور گھن گرج کے ساتھ کچھ آوازیں بھی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ ننھو جو پہلے بھی راجہ کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ پکچر دیکھنے آ چکا تھا اس نے بتایا کہ اندر ”پاکستان کا تصویری خبرنامہ“ شروع ہو چکا ہے اور اب کچھ ہی دیر میں جھنڈا دکھا کر ترانہ بجایا جائے گا اور پھر اصل فلم شروع ہو جائے گی۔

راجہ کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اب تو ہم سب کو اس کی فکر شروع ہو گئی تھی۔ اچانک گیلری کے اختتام سے راجہ ایک عمر رسیدہ شخص کے ساتھ دکھائی دیا۔ اس شخص نے مونسا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہم سب کو اپنے چشمے کے پیچھے گھورتی دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے غور سے دیکھا اور راجہ سے پوچھا۔

”کیا یہی چاروں ہیں؟“

راجہ نے جلدی سے دانت نکالے۔

”جی جی..... ہم پانچوں کو ہی شاہ جی نے بھیجا ہے۔“

عمر رسیدہ شخص نے اپنے آپ سے بڑبڑاہٹ کی۔

”کمال کرتے ہیں شاہ جی بھی۔ اتنے کم عمر بچوں کو اکیلا بھیج دیا سینما ہال.....“ پھر وہ ہم سے مخاطب ہوا۔

”اچھا چلو آؤ میں تم لوگوں کو ہال میں بٹھا دوں۔ جب نکت چیکر آئے تو صرف اس سے اتنا کہہ دینا کہ تم شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہو۔ سمجھ گئے

نا۔“ راجہ نے جلدی سے سر ہلایا۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس شاہ جی کی بات ہو رہی ہے، جس نے ہمیں بھیجا ہے اور خود ہی کو خبر نہیں۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے راجہ کی طرف دیکھا لیکن اس نے چھپ کے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کا

اشارہ کر دیا۔

وہ شخص ہمیں لیے ہوئے ایک بہت بڑے سے اندھیرے ہال میں داخل ہو گیا، جہاں ایک بہت بڑے پردے پر تصویریں چل رہی

تھیں۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ مٹی کسی عورت کے پاؤں پر چڑھ گیا۔ وہ زور سے چلائی ہم سب ہم گئے۔ عورت کے

ساتھ بیٹھے ہوئے کمزور سے شخص نے کڑک کر کہا۔

”اجی دیکھ کر چلے۔ ہماری بیگم کے پاؤں کا قیمہ کر دیا۔“

ہم سب جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ بعد میں راجہ سے پتہ چلا کہ اس جگہ کو اسٹال کہتے ہیں۔ یہ ہال کے سب سے آخر میں بنی ہوئی بہت سی بالکونیوں میں سے ایک بالکونی تھی۔ میں نے راجہ کو کہنی مار کر کہا کہ اتنی دور بیٹھ کر پکچر دیکھنے میں بھلا کیا خاک مزہ آئے گا۔ راجہ نے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ ہمیں سب سے اگلی قطار میں بٹھا کر فلم دکھائے گا۔ راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”ابے جاہل، میں تم لوگوں کو دس روپے والے اسٹال میں بٹھوا رہا ہوں اور تم لوگ بارہ آنے والے شیخ پر بیٹھنے کی ضد کر رہے ہو۔ چپ چاپ میرے پیچھے چلے آؤ۔“

اس دن پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا کہ سینما کی جو سیٹ پردے سے جتنی دور ہوتی ہے اس کا کرایہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ عجیب بے وقوف لوگ تھے یہ سینما والے بھی۔ غفور پچا کے ہاں تو ٹی وی کے قریب بیٹھنے کے لیے ہم بچوں میں باقاعدہ جنگ ہوا کرتی تھی اور یہاں یہ لوگ دور بیٹھنے کے لیے باقاعدہ زیادہ پیسے دینے کو تیار تھے۔

وہ عمر رسیدہ شخص ہمیں ہماری سیٹوں پر بٹھا کر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ازراہ مروت راجہ سے پوچھا کہ کھانے پینے کے لیے کچھ چاہیے ہو تو بتادیں۔ راجہ نے فوراً اس سے گرم موگ پھلیاں، آکس کریم، بھنے ہوئے پاپ کارن اور لیمن سوڈے کی بوتلیں سب کے لیے بھجوانے کا کہہ دیا۔ میں شدید حیرت زدہ تھا کہ بیس روپے میں ہمیں سٹال میں سیٹ بھی مل گئی تھی اور اس کے باوجود بھی اتنے پیسے بچ گئے تھے کہ راجہ نے اتنا بہت کچھ آرڈر بھی کر دیا تھا۔

ہم ابھی اسی شش و پنج میں تھے کہ فلم شروع ہو گئی۔ ہیرو کے پردے پر آنے پر لوگوں نے زوردار سیٹیاں بجانیں اور کچھ لوگوں نے اسکرین پر سکے نچھاور کیے۔ نھو اور گڈو نے سکے اٹھانے کے لیے اٹھ کر لپکنا چاہا تو راجہ نے انہیں جھڑک کر منع کر دیا۔ واقعی اتنے بڑے پردے پر پکچر دیکھنے کا تو اپنا ہی کچھ الگ مزہ تھا۔ فلم میں گانے بھی تھے لیکن میوزک بجانے والے مجھے ڈھونڈنے پر بھی دکھائی نہ دیئے۔ پتہ نہیں جب ہیرو یا ہیروئن گانا گانے لگتے تو اچانک میوزک کہاں سے بجنّا شروع ہو جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے بجانے والے ان درختوں یا پہاڑوں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہوں، جہاں ہیرو اور ہیروئن ہانہوں میں بانئیں ڈالے سریلے گیت گنگنا رہے تھے۔ انٹرول میں ہمارے لیے کھانے پینے کی چیزیں بھی آگئیں۔

میں نے نوٹ کیا کہ چیزیں لانے والے شخص بھی ہم سب سے بہت عزت اور پیار سے پیش آئے۔ راجہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک کے بعد دوسرا آرڈر دیتا رہا اور کریٹوں اور پھلوں اور ڈرائی فروٹ سے بھری ٹوکریاں آتی رہیں۔

درمیان میں ایک مرتبہ ایک شخص نارنج لیے لکٹ چیک کرنے کے لیے بھی آیا تھا لیکن راجہ نے تحکمانہ لہجے میں اسے بتایا کہ سیٹ نمبر ایک سے لے کر پانچ تک سارے بچے شاہ جی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ لکٹ چیکر جلدی سے سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ فلم کا ہیرو ندیم اس میں موثر ملکینک کا کردار ادا کر رہا تھا۔ گڈو اور نھو نے وہیں پر عہد کر لیا کہ وہ دونوں بھی بڑے ہو کر موثر ملکینک بنیں گے اور شبنم جیسی میم سے ہی شادی کریں گے۔

آخر کار تین گھنٹے کے بعد فلم ختم ہو گئی۔ فلم کے اختتام پر راجہ کچھ جلدی میں دکھائی دیا۔ اس نے ہم سب کو بھی جلد از جلد سینما سے نکل کر باہر جمع ہونے کا حکم دیا اور خود بھی بیٹھریں کو دتا پھاندا غائب ہو گیا۔

سینما سے نکلتے ہی مجھے گھر کی فکر دامن گیر ہوئی۔ مجھے جتنی سورتیں اور آیات یاد تھیں وہ سب پڑھتے ہوئے میں دل ہی دل میں خدا کے سامنے گڑ گڑاتا رہا کہ خدا کرے میری اتنی لمبی غیر حاضری کا گھر والوں نے نوٹس نہ لیا ہو۔ ورنہ میری توخیر ہی نہیں تھی۔

کانپتے ہاتھوں سے میں نے ٹھیک شام چھ بج کر پندرہ منٹ پر گھر کا دروازہ کھولا صحن میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے برآمدے میں جھانکا تو امی پر نظر پڑی جو استانی خالہ کے ساتھ بیٹھی ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی غصے سے بولیں۔

”آدی..... کہاں آوارہ گردی کرتے رہے ہو دن بھر۔ ابھی تمہارے بھیا کو میں نے سیکنے کے ہاں بھیجا ہے تمہیں بلانے کے لیے۔ کہاں غائب تھے دن بھر.....؟“ مطلب امی کو خاص پتہ نہیں تھا کہ میں کب سے غائب ہوں۔ میں کچھ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ بڑے بھیا اندر داخل ہوئے اور وہیں سے بولے۔

”اے لو..... یہ جناب یہاں موجود ہیں اور میں ان کی تلاش میں سارے کا سارا محلہ چھان کر آ رہا ہوں۔ اس کے لوفر دوستوں میں سے بھی کوئی دکھائی نہیں دیا۔ کہاں تھے تم سارے۔“

”یہیں تو تھے ہم سارے۔ راجہ کے ساتھ اسکول کا کام کر رہے تھے۔“ راجہ کے نام پر بھیا کچھ چونکے لیکن استانی خالہ کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھی اور امی نے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے بعد مجھے منہ ہاتھ دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ ابا کہاں تھے، یہ میں نے پوچھنے کی جسارت ہی نہیں کی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا لاکھ شکر ادا کیا کہ کسی کو بھی میری اتنی بڑی واردات کی کچھ خبر نہ ہو سکی تھی۔ لگتا تھا اس دن قسمت واقعی مجھ پر مہربان تھی کیونکہ ابا بھی دادی کی طرف سے آنے کے بعد عمارہ کو لے کر بازار چلے گئے تھے۔ شام کو بھی میں جلد ہی بستر میں گھس گیا اور وہ شام میری ایسے سنے دیکھتی گزری، جس میں سب کچھ ”دل لگی“ جیسا تھا سوائے ہیرو کے جس کی جگہ آدی نے لے لی تھی۔

داستان مجاہد

عظیم اسلامی ناول نگار نسیم جازئی کا ایک ایمان افروز ناول۔ مجاہدوں کی زندگی کی ایک مختصر سی جھلک۔ نسیم جازئی کے اسلامی ناولوں کی پہلی کڑی۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی جلن

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن ہم سب جیسے ہی اکٹھے ہوئے تو میرے من میں اٹھتے سوال مجھ سے پہلے گڈ واوٹشی نے کر ڈالے کہ آخر یہ شاہ جی تھا کون، جس کے صدقے ہمیں سینما ہال میں اس قدر عزت اور اہم شخصیات جیسا استقبال ملا تھا لیکن راجہ ہمیں مالتا رہا۔ آخر ہم سب نے بیک زبان چلا کر اس سے پوچھا۔

”بتاتے کیوں نہیں..... یہ شاہ جی آخر ہے کون.....؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”مجھے کیا پتہ.....؟ میں تو آج تک کبھی شاہ جی سے ملا ہوں نہ ہی میں نے اسے دیکھا ہے۔“

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے منہ سے نکلا۔

”کیا.....؟ تو پھر کل وہ سب کیا ڈرامہ تھا.....؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجہ کا جواب سن کر ہم سب کے پیروں کے نیچے سے جیسے کسی نے زمین ہی کھینچ لی ہو۔ پتہ یہ چلا کہ راجہ نے اپنے طور پر ٹکٹ نکالنے کی تمام ترکیبیں آزما دی کھیں لیکن سینما پر فلم اتنا شدید رش لے رہی تھی کہ سب سے چھوٹا ٹکٹ بھی بلیک میں پانچ روپے سے اوپر کا ہی مل رہا تھا۔ قطار میں ٹکٹ لینے کے لیے راجہ نے تین مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار جب بھی کھڑکی کے قریب پہنچنے لگتا تو کوئی نہ کوئی مشتعلوں کا ٹولہ اسے اٹھا کر پھروہیں کھڑا کر دیتا، جہاں سے قطار میں راجہ نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوتا تھا۔

آخر راجہ مایوس ہو کر ہمیں یہ اطلاع دینے کے لیے اوپر بالکونی کی طرف آنے لگا کہ ہم آج فلم دیکھنے کا خیال دل سے نکال دیں لیکن جیسے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر بالکونی کی طرف آنے ہی لگا تھا کہ اسے نیچے یہ عمر رسیدہ شخص اور ایک دوسرا شخص باتیں کرتے سنائی دیئے۔ راجہ کے کان ان کے پہلے جملے پر ہی کھڑے ہو گئے۔ وہ آپس میں کسی شاہ جی کا ذکر کر رہے تھے کہ جانے ان کے گھر والے اور بچے اب تک فلم شو پر کیوں نہیں پہنچے؟ راجہ وہیں کھڑے ہو کر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگ گیا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پہلا شخص کہنے لگا۔

”اب تک تو شاہ جی کے گھر والوں کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔“ عمر رسیدہ شخص نے بھی اپنی ہاتھ کی گھڑی کی جانب دیکھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”واقعی شو تو سمجھو شروع ہوا ہی چاہتا ہے اور پھر آج مجھے بھی گھر جلدی واپس جانا ہوگا۔ تمہاری بھابی میکے گئی ہوئی ہے۔ نہ جانے بچوں نے پیچھے کیا اودھم مچایا ہوگا۔ میں تو شو شروع ہوتے ہی گھر کے لیے نکل جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آج کا پروگرام منسوخ کر دیا ہو۔ بہر حال اگر وہ لوگ آجاتے ہیں تو انہیں عزت کے ساتھ لے جا کر ہال میں بٹھا دیجئے گا اور ٹھنڈا گرم بھی پوچھ لیجئے گا۔ شاہ صاحب ہمارے بہت پرانے مہربان ہیں اور ان کے گھر سے کبھی کبھار ہی کوئی فلم دیکھنے کے لیے سینما ہال آتا ہے۔ ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔“

پہلا شخص عمر رسیدہ شخص کو یہ ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ راجہ کے ذہن میں آمدہاں سی چلنے لگ گئیں۔ لگتا تھا قدرت نے یہ موقع خود راجہ کے لیے ہی پیدا کیا تھا۔ راجہ اس ادیب عمر چٹھے والے شخص کی غیر محسوس طور پر نگرانی کرتا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ اب وہ شخص مایوس ہو کر سینما سے نکلنے ہی والا ہے تو راجہ اس شخص کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا کہ اسے شاہ جی نے بھیجا ہے۔ باقی گھر والے تو کسی وجہ سے نہیں آئے صرف بچوں کو بھجوا دیا ہے۔ تبھی وہ شخص ہمیں دیکھ کر حیرت زدہ تھا اور بڑبڑاتا رہا کہ شاہ جی نے اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کیلا سینما کیسے بھیج دیا تھا.....؟

ہم سب نے راجہ کی بات سن کر اپنا سر پیٹ لیا۔ سینما کا سب کھایا پیا الٹا واپس منہ کو آنے لگا تھا۔ اگر اس دوران شاہ جی خود یا پھر اس کے گھر والے سینما پہنچ جاتے تو ہمارا جو حشر ہونا تھا اسے سوچ کر ہی ہمیں پسینے آنے لگے تھے۔

ہم سب نے راجہ کو سخت سُست سنائیں کہ آخر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے تو ہماری ”عزت اور جان“ دونوں کو ہی داؤ پر لگا دیا تھا لیکن راجہ بے فکری سے ہماری ساری کڑوی کیلی باتیں سنتا رہا اور ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ جب ہم سب اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے تو اس نے آخر میں ایک ہی جملہ کہا۔

”اے یار..... تم لوگ یہ کیوں سوچ رہے ہو کہ کیا ہو سکتا تھا..... یہ سوچو کہ ہوا کیا ہے۔ ہم سب نے مزے سے فلم بھی دیکھی اور وقفے میں خوب عیاشی بھی کی..... کی یا نہیں.....؟ اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو تم سب کبھی فلم نہ دیکھ پاتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگلے اتوار پھر چلتے ہیں ریگل۔ انہیں کیا پتہ کہ شاہ جی کے گھر میں یا اس کے خاندان میں مزید کتنے بچے ہیں۔ نہ ہی انہیں شاہ جی کے خاندان کے ہر بچے کی شکل زبانی یاد ہو گی۔ اگلے ہفتے ہم اپنا حلیہ مزید بدل کر پہلے سے بالکل مختلف بنا کر چلیں گے۔“

راجہ کی یہ بات سن کر ہم سب اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں سے سر پٹ بھاگے کیونکہ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ راجہ کے ساتھ مزید کھڑے رہنا اپنی زندگی مزید خطرے میں ڈالنے ہی کے مترادف تھا۔

لیکن راجہ نے اپنی یہ رٹ بعد میں بھی جاری رکھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے موقعوں سے منہ پھیرنا ”کفرانِ نعت“ کے زمرے میں آتا تھا۔ جس دن ہم فلم دیکھنے ریگل گئے تھے اس کے چوتھے دن قوآ پی کی بارہویں جماعت کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ انہوں نے پورے ضلع میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ غیاث چچا اور سیکنہ خالہ کا سر خوشی اور فخر سے یوں اونچا ہوا کہ انہوں نے پورے محلے میں خاص ملتان کے دیسی گھی سے بنے لڈو اور مٹھائی بانٹی۔ سارے محلے میں قوآ پی کی کامیابی کی دھوم تھی۔ سنا ہے اگلے دن کے اخبار میں قوآ پی کی تصویر بھی آئی تھی۔ افسوس مجھے اس وقت پتہ نہیں چل سکا کیونکہ اس وقت ہمارے گھر میں باقاعدگی سے اخبار نہیں آتا تھا۔ ورنہ میں ان کی تصویر کاٹ کر اپنی کاپی میں ضرور لگاتا۔

اس شام جب ان کی کامیابی کا چرچا پورے محلے میں پھیلا ہوا تھا میں بھی اپنی امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر

گیا تھا لیکن ان کے گھر میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر طاہر بھائی اور ان کی امی پر پڑی، جو ہاتھوں میں مٹھائی کا ڈبہ تھامے صحن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ طاہر بھائی کی اماں نے اپنے ہاتھوں سے ڈھونڈنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

سیکنہ خالہ نے جلدی سے سر ہلا کر انہیں جواب دیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... وجہ یہ کہ کامیابی میں اپنے طاہر کی محنت اور وقت کا بھی تو سب سے زیادہ عمل دخل ہے اگر طاہر میاں اسے اپنا وقت دے کر اتنی دل جمعی سے نہ پڑھاتے تو بھلا ہماری ڈھونڈ آتی کامیاب ہو پاتی.....؟ ابھی بلاتی ہوں اسے۔“

سیکنہ خالہ نے جلدی سے ڈھونڈنے کو آواز دی جو اندر کمرے میں اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ان سے مبارک باد وصول کر رہی تھیں۔

جھونپڑی کمرے سے نکلیں تو میری اور طاہر بھائی کی بیک وقت ان پر نظر پڑی۔ مجھے ایسا لگا کہ آسمان سے کوئی پری اتر کر غیاث چچا کے صحن میں آکھڑی ہوئی ہو۔ ڈھونڈنے نے مکمل سفید جوڑا پہن رکھا تھا، جس کے کناروں پر ہلکا سا فیروزہ دھاگے کا کام کڑھا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ غیاث چچا کا پورا صحن کسی نور کی بارات سے بھر گیا ہو۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت میرے دل نے شدت سے یہ خواہش کی کہ صحن میں موجود باقی سب لوگ وہاں سے ایک پل کے لیے کہیں اوجھل ہو جائیں اور ڈھونڈنے کی پوری توجہ صرف میری جانب رہے۔ خاص طور پر طاہر بھائی کی اس وقت وہاں موجودگی مجھے بہت بری طرح کھل رہی تھی کیونکہ جس وقت سے ڈھونڈنے کمرے سے باہر آئی تھیں تب سے مستقل طاہر بھائی کی نظر کسی نہ کسی بہانے ان کے سراپے ہی کا طواف کر رہی تھی اور ڈھونڈنے بھی مستقل شرمائے جا رہی تھیں اور دبی دبی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے پھوٹی جا رہی تھی۔

اوپر سے غیاث چچا اور سیکنہ خالہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح سے طاہر بھائی کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھالیں کیونکہ بقول ان کے ڈھونڈنے کی کامیابی میں طاہر بھائی کی محنت اور ان کا وقت بے وقت اپنی پڑھائی کے اوقات میں بھی آکر ڈھونڈنے کو سبق دینے اور سکھانے کا بھی بہت دخل تھا۔

سچ پوچھیں تو مجھے یہ سب کچھ ایک آنکھ بھی نہیں بھار رہا تھا۔ اگر طاہر بھائی نے ڈھونڈنے کو دو چار لفظ بتا دیے تھے تو اس میں ایسی کون سی خاص بات تھی؟ پتہ نہیں ڈھونڈنے کے گھروالوں کو کب عقل آئے گی؟ اور میں جو ہمیشہ بھاگ بھاگ کر ان کے سارے کام کرتا تھا ان کی پینسلیں گھڑتا تھا، ان کے G اور Z نمب والے ہولڈر اور ”ایگل“ پین بھر کر ان کے لیے تیار کر کے رکھتا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرا کوئی ذکر بھی نہیں کر رہا تھا اور یہ جو طاہر بھائی آج شان سے غیاث چچا کے برابر کڑے ہوئے بیٹھے ہیں ان کے گھر سے بھی کتابیں اور پرانے حل شدہ پرچے کون ڈھونڈنے کو لا کر دیتا تھا۔ بارہویں کے امتحانات کے دوران جب ڈھونڈنے کے تانگے والے کو بخار ہو گیا تھا تو فضلہ بابا کے ساتھ جا کر ان کے لیے باہر سڑک سے تانگہ یا سائیکل رکشہ کون لا کر دیتا تھا لیکن مجال ہے کہ کسی نے بھی میری ان ”خدمات“ کا ذرا سا بھی ذکر کیا ہو۔ سب کے سب اپنی دھن میں مگن تھے۔ باقیوں کی تو چلو خیر ہے نہ ہی مجھے ان سب کی ایسی کوئی خاص پروا بھی تھی لیکن کم از کم ڈھونڈنے کو تو دو لفظ میری تعریف میں ان سب کے سامنے بولنے چاہئیں تھے لیکن آج تو انہوں نے بھی حد ہی کر دی تھی۔ اپنی سہیلیوں اور دیگر مہمانوں کے ساتھ وہ اس قدر مگن تھیں کہ مجھ سے ہمیشہ کی طرح ہاتھ ملانا اور شرارت سے میرے بال بکھیرنا بھی بھول گئیں۔ میں ان کے اس ”بیگانگی“ کے رویے سے شدید دل برداشتہ ہو گیا، کچھ دیر تک تو میں نے انتظار کیا کہ وہ مجھ پر بھی توجہ دیں گی اور میں خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے رنگ بھر کر ان کے لیے مبارک باد کا جو کارڈ بنا کر لے گیا تھا، خود اپنے ہاتھوں سے انہیں دوں گا اور انہیں یہ بھی

بتاؤں گا کہ میں نے کتنی محنت سے پورا ایک ہفتہ لگا کر اس کارڈ میں ڈھواؤں کی پینڈ کے رنگ بھرے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میرے اپنے رنگ تو تیسرے دن ہی ختم ہو گئے تھے، اس لیے مجبوراً مجھے عمارہ کے بستے سے اس کے رنگ چرا کر اور راتوں کو جاگ جاگ کر ان کے لیے یہ کارڈ مکمل کرنا پڑا تھا۔ راتوں کو جاگنا اس لیے ضروری تھا کیونکہ عمارہ کے بستے سے کوئی چیز دن میں نکالنا تو گویا ناممکن ہی تھا اس لیے یہ ناخوشگوار فریضہ مجھے رات کے وقت ہی سرانجام دینا پڑا تھا۔

لیکن یوں لگتا تھا جیسے میری ساری محنت ہی رائیگاں چلی گئی ہو۔ میں اپنے ہاتھوں میں کارڈ تھا مے ڈھواؤں کی توجہ کا منتظر ہی رہ گیا اور ان کے گرد مبارک باد دینے والوں کا اور انہیں اور ان کی کامیابی کو سراہنے والوں کا جھوم بڑھتا ہی چلا گیا۔ جن میں سرفہرست طاہر بھائی اور ان کی اماں تھیں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شخص سے جلن اور حسد محسوس ہوا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا، جیسے طاہر بھائی میرے حق پر ڈاکہ مار رہے ہوں۔ اگر آج اس وقت وہ وہاں موجود نہ ہوتے تو یقیناً ڈھواؤں کی ساری توجہ کا حق دار صرف اور صرف میں ہی ہوتا۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ ایسے موقعوں پر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بھی مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا کرتی تھیں پھر چاہے وہ گھنٹوں دوسروں کے ساتھ گفتگو میں مگن رہیں لیکن میرے لیے ان کا ساتھ ہی بہت ہوتا تھا لیکن آج تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تک نہیں تھا۔ آخر کار میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں اپنے ہاتھوں میں پکڑا کارڈ وہیں ڈھواؤں کے صحن میں پھینک کر وہاں سے پیر پختا ہوا نکل آیا۔ امی، استانی خالہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ باتوں میں مگن تھیں، اس لیے انہیں میرے باہر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا، بلکہ صرف ایک میری امی یہ کیا منحصر تھا وہاں تو پوری کی پوری محفل ہی اپنی دھن میں مست تھی، لہذا مجھے جیسے غیر اہم ”شخص“ کے محفل چھوڑ دینے سے کسی کو کیا فرق پڑتا تھا۔ بے بسی اور غصے سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے طے کر لیا کہ آئندہ ڈھواؤں کی گھر کبھی نہیں آؤں گا۔

باہر نکلا تو محلے کے بڑے نیم کے پیڑ کے نیچے راجہ بخو، مشی اور گڈو کو پھر سے قائل کرنے میں مصروف تھا کہ شاہ جی کے نام کا سہارا لے کر ایک آدھ شواور دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں چپ چاپ آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ راجہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

”لگتا ہے تمہاری ڈھواؤں کی ملاقات نہیں ہو پائی۔“

جانے راجہ کو میرے اندر کی باتوں کی خبر اتنی جلدی کیسے ہو جاتی تھی۔ میں نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔

”نہ ہوا کرے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آئندہ ان کے گھر کبھی قدم بھی نہیں دھروں گا۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے وعدے اور ارادے تو تم تقریباً ہر ہفتے ہی کرتے ہو لیکن جیسے ہی تمہاری ڈھواؤں کی تمہیں بلانے کے لیے صرف ایک آواز لگاتی ہیں تم سب کچھ بھول بھال کر پھر سے ان کے پاس دوڑتے ہوئے چلے جاتے ہو۔“ راجہ کی بات پر ان سب نے بھی دانت نکالے۔ مجھے مزید غصہ آ گیا۔

”تم لوگ دیکھ لینا..... اب ایسا نہیں ہوگا۔“

راجہ نے بات پلٹ دی۔

”اچھا چلو اب رہنے بھی دو۔ یہ بتاؤ چلو گے اس اتوار کو رینگل سینما؟ شاہد اور نشو کی ”بھروسہ“ لگ رہی ہے۔ تھوڑی سی ہمت کرو تو ایک بار پھر عیاشی کروا سکتا ہوں تم سب کو۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو میں راجہ کو صاف منع کر دیتا لیکن اس وقت میں وجوہ آپنی کی وجہ سے اس قدر اُداس اور صدمے..... بلکہ غصے کے زیر اثر تھا کہ میں نے بنا سوچے سمجھے ہی ہاں کر دی۔ راجہ نے تو یہ سن کر خوشی کے مارے ”یا ہو“ کا ایک لمبا سانعرہ لگایا جبکہ باقی تینوں حیرت کے جھٹکے سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر میں دوبارہ اس طرح سینما جانے کی بے وقوفی نہیں کروں گا۔ گڈ و نے مجھے کاندھے پکڑ کر زور زور سے ہلایا اور تنھو نے میرے گالوں پر ہلکے ہلکے کئی طمانچے بھی مارے لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس اتوار کو دوبارہ ”شاہ جی کے مہمان“ بن کر فلم دیکھنے ضرور جائیں گے بلکہ ایک فلم دیکھنے کے لیے جانے پر ہی کیا منحصر تھا، میں اس وقت ہر وہ کام کرنا چاہتا تھا، جس سے مجھے قُوتِ آپنی نے منع کیا ہو۔ مٹی کا خیال تھا کہ مجھے سردی لگ گئی ہے جس کی وجہ سے میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے جبکہ گڈ و اور تنھو مجھے مکمل دیوانہ ہی سمجھ رہے تھے۔ بہر حال فیصلہ ہو چکا تھا اور اب ہمیں صرف اتوار کا انتظار تھا۔

شام کو میں دیر سے گھر گیا تو امی قُوتِ آپنی کے گھر سے واپس آ چکی تھیں۔ انہوں نے سرسری طور پر مجھ سے دریافت بھی کیا کہ میں وہاں سے اٹھ کر کیوں چلا آیا تھا؟ بعد میں سب میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے امی کو کریدنے کی کوشش بھی کی کہ ”سب“ سے ان کی مراد کون کون ہے لیکن امی رات کا کھانا بنانے میں اس قدر مصروف تھیں کہ انہیں میرا سوال ٹھیک سے سمجھ ہی نہیں آیا اور انہوں نے مجھے نال کر باورچی خانے سے باہر بھیج دیا۔ بہر حال مجھے کیا پڑی تھی کہ میں اب وجوہ آپنی کی جانب سے کوئی آس لگاتا اور پھر انہیں بھلا فرصت ہی کہاں ملی ہوگی میرے بارے میں پوچھنے کی یا پھر میری غیر حاضری کو محسوس کرنے کی؟ راجہ ٹھیک ہی تو کہتا تھا ”ان لڑکیوں کی طبیعت کا کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

انہی خیالات میں غلطان و پچان رات کو جانے کب میں نیند کی حسین وادیوں میں جا اتر ا۔ اگلے دن بارش کی وجہ سے ہمارے اسکول میں صبح سے ہی چھٹی کا اعلان کر دیا گیا۔ میں، راجہ اور گڈ و اپنے بستے گلے میں لٹکائے سڑک کے کنارے بٹے ہوئے نالے میں اپنی اپنی کاغذ کی کشتیوں کے ساتھ چلتے چلتے جب محلے کے گیٹ تک پہنچے تو وہیں ہماری فضلو بابا سے مڈ بھیڑ ہو گئی جو سیکندہ خالہ کی پرانی سیلتھ سلائی مشین کو مستری کے ہاں سے تیل ڈلو کر واپس لا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے وہیں سے ہانک لگائی۔

”آدی میاں..... جاتے کہاں ہو..... وجوہ آپنی کل شام سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں، چلو میرے ساتھ ہی گھر چلو۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ آدی جہاں کہیں بھی دکھائی پڑے اسے ساتھ ہی لیتا آؤں۔“

راجہ اور گڈ و دونوں نے میری طرف یوں چونک کر دیکھا، جیسے کوئی جج کسی عادی مجرم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ راجہ نے دھیرے سے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔

”اوئے آدی کے بچے..... آج اگر تو نے ہمت نہیں دکھائی تو پھر آئندہ ہمارے سامنے خواٹواہ کی بڑھکیں مارنے کی کوشش نہ کرنا۔“

سچ تو یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے خود میرا ایمان بھی ڈگمگا سا گیا تھا لیکن پھر میں نے ہمت کر کے فضلو بابا سے آخر کہہ ہی دیا۔

”قوآ پی سے کہیے گا کہ آج کل میں کچھ مصروف ہوں۔ فرصت ملی تو میں خود آ جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر اور فضلہ بابا کو حیرت زدہ کھڑا چھوڑ کر میں راجہ اور گڈو کے ساتھ پیر پختا آ گئے بڑھ گیا۔ راستے میں گڈو اور راجہ نے میری خوب پیٹھ ٹھوکی کہ آج میں نے واقعی مردوں والا جواب دیا ہے لیکن جانے کیوں خود میرا دل اندر سے مجھ سا گیا تھا۔ راجہ اور گڈو اگلے دن سینما جانے کا پر جوش منصوبہ بناتے رہے اور میں بے خیالی میں ہوں ہاں کر کے ان کے ساتھ شریک ہونے کا تاثر دیتا رہا۔ کبھی کبھی یہ دل کچھ فیصلے کرتے وقت کتنا خوش ہوتا ہے لیکن جانے کیوں چند لمحوں بعد ہی وہی دل اس فیصلے کا سوچ کر ہی ڈوبنے کیوں لگتا ہے؟ میری وہ رات میری زندگی کی چند ان راتوں میں سے تھی، جو میں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزاری تھیں اور قوآ پی سے آئندہ بات نہ کرنے کا فیصلہ میرے دل میں کھلتا رہا۔

اگلی صبح ابھی میں ناشتہ ہی کر رہا تھا کہ باہر گلی میں راجہ کی سیٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اتنی سویرے.....؟ یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے چائے کا پورا پیالہ غراب سے حلق کے اندر رائد یا اور امی سے نظریں بچا کر باہر گلی میں نکل آیا۔ راجہ اور ممشی باہر گلی میں کھڑے بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج کے میٹنی شو کے وقت یعنی دوپہر تین بجے استانی خالہ نے محلے کے تمام بچوں کو اپنے گھر گھٹلیاں پڑھنے کے لیے بلایا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچوں کے ساتھ ان کی امائیں بھی ثواب حاصل کرنے کی خاطر گھٹلیاں پڑھنے آیا کرتی تھیں۔ مطلب یہ کہ آج دوپہر اپنے گھر والوں سے نظر بچا کر سینما گھر تک پہنچنا ناممکن تھا لہذا راجہ نے میٹنی شو کے بجائے مارنگ شوپہ جانے کا پروگرام بنایا تھا، جو صبح گیارہ بجے شروع ہوتا تھا۔ مطلب ہمارے پاس اب بھی دو ڈھائی گھنٹے تھے تیاری کرنے کے لیے۔ میں نے راجہ کو ایک آخری مرتبہ سوچ لینے کا کہا لیکن بقول راجہ ”جب اوکھلی میں سردے ہی دیا تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا؟“

اگلے دو گھنٹے میں ہم پانچوں کسی نہ کسی طرح تیار ہو کر سینما کے باہر کھڑے اندرونی گیٹ پر رش چھٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ راجہ کو اس عمر رسیدہ شخص کی تلاش تھی، جس نے پچھلی بار ہمیں ہال میں بٹھایا تھا۔ یہاں پر سب لوگ اسے غفار صاحب کے نام سے جانتے تھے اور وہ سینما کی انتظامیہ کا حصہ تھا لیکن آج وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار راجہ نے سینما کی کینٹین کے پیچھے بنے اسٹنٹ منیجر نام کی ختی لگے کمرے میں سے ایک شخص کو نکلے دیکھا تو بھاگ کر اس کے پاس جا پہنچا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں آپس میں جانے کیا باتیں کرتے رہے اور ہم چاروں کا یہاں بے چینی اور گھبراہٹ سے برا حال ہو رہا تھا۔ نھو نے تو باقاعدہ پیشین گوئی بھی کر دی کہ آج صبح سے ہی اس کی بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی بری خبر ملنے والی ہے۔ گڈو نے اسی لمحے اسے جھڑک کر چپ کر دیا کیونکہ اصل میں خود اس کے دل میں بھی کچھ ایسے ہی وسوسے پل رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم چاروں یہاں تک راجہ کے ہمت دلانے پر آ تو گئے تھے لیکن اندر سے ہم سب کے دل کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہے تھے۔

آخر خدا خدا کر کے راجہ واپس پلٹا، اس کے ہاتھ میں کوئی پرچی پکڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ راجہ کے آتے ہی ہم سب نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ”کیا ہوا.....؟ کون تھا وہ شخص.....؟ بات بنی یا نہیں.....؟ اسے شک تو نہیں ہوا.....؟“

راجہ نے ہاتھ اٹھا کر ہم سب کو خاموش کروایا۔

”ارے یا راجہ ٹھیک ہے..... دراصل آج غفار صاحب آئے نہیں ہیں..... یہ شخص جس سے میں بات کر رہا تھا یہاں کا اسٹنٹ منیجر ہے۔ میں نے اسے شاہ صاحب کا حوالہ دیا تو بے چارہ کافی مرعوب ہو گیا تھا۔ اس نے ہم سب کے لیے اسٹال کی یہ پرچی دے دی ہے، جو ہم گیٹ

والے کے حوالے کر دیں گے۔ اندر جب ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ہم سب کو صرف ایک جملہ کہنا ہے کہ ”ہم شاہ جی کے بندے ہیں اور بس..... چلو اب دیر نہ کرو۔ شو شروع ہو چکا ہے۔“

رہجہ اپنی بات ختم کرتے ہی اسٹال کی جانب بھاگا اور ہم سب بھی رہجہ کی تقلید کرتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے سینما ہال میں داخل ہو گئے۔ گیٹ کیپر نے اسٹنٹ منیجر کی پرچی دیکھ کر ہمیں اسٹال کی سب سے پچھلی قطار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور ہال میں ہیر وئن کی پردے پر آمد پر زوردار سیٹیاں بج رہی تھیں۔

ہم پانچوں بھی اندھیرے میں ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے اپنی سیٹوں تک پہنچ ہی گئے۔ رہجہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک اسٹنٹ منیجر نے ہمارا آرڈر لینے کے لیے کسی بیرے کو کیوں نہیں بھیجا؟ البتہ ہم چاروں کی توجہ مکمل پردے کی جانب تھی۔ مجھے فلم کی ہیر وئن نشو بھی بہت اچھی لگی کیونکہ جب وہ ہنسی تھی تو اس کے گالوں میں بھی بالکل ڈوا آئی کی طرح دو گلابی گڑھے پڑ جاتے تھے۔ ہمارے بیٹھنے کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ میں بالکل درمیان میں تھا اور میری بائیں جانب دروازے کی طرف گڈو اور مشی بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دائیں جانب رہجہ اور ننھو براجمان تھے۔ وقفے سے کچھ دیر پہلے ٹکٹ چیکر اندر آیا اور ہمیشہ کی طرح سینما کے بوائے لیمکا Limca کی بوتلیں، چائے کے بہت سے گلاس جو ایک گول اسینڈ میں بھنپے ہوتے تھے اور سوڈے کی بہت سی بوتلیں اٹھائے اندر داخل ہو گئے۔ ہال میں ذرا دیر کو پچھل سی مچی اور لوگوں کی آوازیں ابھریں ”آکس کریم بوائے..... ذرا دو پوکا ادھر بھی..... سوڈا بوائے..... ایک لیمن سوڈا اینگیم صاحب کے لیے..... اور میرے لیے دو پیکٹ گرم پینٹس (Peanuts).....“ یہ تو پیچھے کی جانب بیٹھی ہوئی جینٹری کی آوازیں تھیں جبکہ بہت دور ہال کی اگلی جانب سے مزدور اور چوتھے درجے کے ملازمین کی آوازیں

اور لہجہ ان اسٹال کی آوازوں سے بالکل مختلف تھا۔
”اے اوپنے والے، آٹھ آنے کے گرم پنے دے ذرا مسالہ ڈال کر..... اوگنڈیری والے بھائی، آدھ کلو گنڈیری لیکن بیٹھی ایسی ہوں کہ شیرا ہاتھوں سے ٹپکے..... اوسیون اپ کے شہزادے، دو سوڈا ادھر بھی..... اور خالی بوتل آخر میں لے جائیو، ہمارے سروں پہ منکر نکیر بن کر نہ ٹک جائیو.....“

غرض بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس وقت ہال میں گونج رہی تھیں لیکن مجھے ان سب آوازوں سے شدید الجھن ہو رہی تھی کیونکہ فلم کا باقاعدہ وقفہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہیر وئن کے باپ اور بیر وینس ایک بے حد جذباتی قسم کا مکالمہ اپنے اختتام کے قریب تھا۔ جانے یہ سینما والے درمیانی وقفے سے پہلے ہی ان چھاڑی والوں اور سینما بواز کو اندر کیوں آنے دیتے تھے؟

اتنے میں ٹکٹ چیکر دروازے کی جانب سے ہماری قطار میں سب سے پہلے بیٹھے ہوئے گڈو کے پاس ٹارچ لے کر پہنچ گیا۔ گڈو فلم دیکھنے میں اس قدر مگن تھا کہ وہ شاہ جی کا نام بھول گیا اور اس نے جلدی سے ننھو سے پوچھا۔
”یار ہم کس کے بندے ہیں.....؟“

ننھو جلدی سے بولا ”اللہ جی کے۔“ میں نے زور سے اسے کہنی ماری، ننھو ہکلا یا ”مطلب ہے شاہ جی کے۔“
ٹکٹ چیکر نے سر ہلایا اور ننھو کے چہرے پہ ٹارچ ماری۔ ننھو نے بھی دہرایا۔

”ہم شاہ جی کے آدمی ہیں۔“

نکٹ چیکر نے میرے چہرے پر روشنی ڈالی۔ میں نے بھی مخصوص کوڈ ورڈ دہرایا۔ میرے بعد گڈونے بھی اسی اسم اعظم کا ورد کیا۔ نکٹ چیکر نے راجہ کا رخ کیا راجہ نے بھی انتہائی معتبر لہجے میں رعب سے کہا ”ہم پانچوں شاہ جی کے بندے ہیں۔“

نکٹ چیکر نے آخری مرتبہ تسلی کے لیے ایک بار پھر ہم پانچوں پر نارنج لہرائی اور راجہ سے پوچھا ”بس یہ پانچ کی نفری ہی ہے یا پھر ہال میں کوئی اور بھی شاہ جی کا بندہ بیٹھا ہے۔“

راجہ نے انکساری سے جواب دیا۔ ”نہیں جی..... بس ہی پانچ ہیں شاہ جی کے خاص بندے۔“

راجہ کی بات ختم ہوتے ہی راجہ کے پیچھے سے ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی ”بہت خوب..... تم سب شاہ جی کے بندے ہو اور میں شاہ جی ہوں..... بقلم خود..... راجہ فیاض شاہ۔“

چند لمحوں تک تو ہمیں سمجھ ہی نہیں آیا کہ اس شخص نے یہ کون سا انکشاف کیا ہے اور ہم پانچوں ہونٹوں کی طرح اس شخص کو اور وہ ہمیں دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ہی وہ غصے میں زور سے چلایا۔

”پکڑ لو ان پانچوں فراڈیوں کو۔“

راجہ نے ہم سب میں سے سب سے پہلے حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا اور وہ اچھل کر سیٹ سے اتر ا اور باہر کے دروازے کی جانب سرپٹ دوڑتے ہوئے زور سے چلایا۔

”بے وقوفوں کی طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو، سارے اٹھ کر بھاگو۔“

راجہ کی چیخ کے ساتھ ہی جیسے ہم سب بھی کسی گہرے خواب سے چونک کر جاگے اور اپنی اپنی سیٹوں سے یوں اچھلے جیسے ہمیں کسی پچھونے کاٹ لیا ہو۔ اسٹال میں ایک بھگدڑ سی مچ گئی اور نازک بیگمات تو باقاعدہ چیخنے چلانے لگ گئیں شاید وہ سمجھی تھیں کہ سینما میں کوئی بڑی ”واردات“ ہو گئی ہے۔

شاہ جی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے حفظِ مقدم کے طور پر پہلے ہی سے اسٹال کے بیرونی دروازے پر کوئی پہرے دار کھڑا نہیں کیا تھا اور صرف نکٹ چیکر کے بھروسے ہم پر چھاپے مارنے آگئے تھے۔ نکٹ چیکر کو بھی ہم سے ایسی پھرتی کی امید ہرگز نہ تھی ورنہ کم از کم وہ دروازہ ہی بند کر آتا۔ ہم پانچوں کرسیاں پھلا نکتے، بیگمات کے بیل باٹم اور شراروں غراروں میں الجھتے، گرتے پڑتے، اسٹال کے دروازے سے باہر نکلے۔ اسٹال میں کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ ہمیں یوں دیوانہ وار باہر بھاگتے دیکھ کر کچھ جلد باز قسم کے ”پیر وکاروں“ نے بھی بنا کچھ جانے یا بنا کسی سے کچھ پوچھے باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور ہمارے اور نکٹ چیکر اور شاہ جی کے درمیان میں دراصل یہی جلوس تھا جس کی وجہ سے ہم نکٹ چیکر کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ورنہ گڈون کی نئی بشرٹ کا کالر تو اس کے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا لیکن افسوس کہ اس کے ہاتھ میں وہ کالر ہی دبا رہا گیا اور گڈون کو آئندہ وہ قیص ہمیشہ بنا کالر کے پہننا پڑی۔ ہمارے پیچھے اسٹال میں عورتوں کی چیخوں اور مردوں کی ”پکڑو، لپکو، جانے نہ پائے“ کی آوازوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ اسٹال سے نکلنے ہی ہم سینما کی لمبی سے راہداری میں یوں دوڑے جیسے اسکول میں ہزار گز کی ریس میں دوڑتے ہیں۔ راہداری سے گزرتے ہی ہم اس حصے میں آ پہنچے جہاں سے پہلے صحن اور پھر بیرونی گیٹ کا جنگلہ دوری سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہمارے پیچھے ہماری تقلید میں دوڑتے

ہوئے پیر و کاروں کا نجوم، اس کے پیچھے چننا چلاتا لکٹ چیکر اور اس کے پیچھے اور سب سے آخر میں ہانپتے کا نپتے ہوئے شاہ جی سرپٹ بھاگتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سینما کا بیرونی جنگلہ ابھی تک تالے سے بند تھا کیونکہ شاید فلم کے درمیانی وقفے میں بیرونی لوگوں کی آمد کو روکنے کے لیے اسے بند ہی رکھا جاتا تھا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا لہذا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم پانچوں ایک قطار میں دوڑتے ہوئے لوہے کے جنگلہ نما گیٹ کے پاس پہنچے اور اگلے ہی لمحے سب پہلے گڈ اور پھر اس کے پیچھے باقی چار بھی کسی ”اسپائیڈر مین“ کی طرح ہٹا ہٹا پل ضائع کیے جنگلہ پار کر گئے لیکن اس کوشش میں غصے کے لمبے کاروں والی قمیص نے دھوکہ دیا اور اس کی قمیص کا آدھا حصہ نشانی کے طور پر جنگلے میں ہی اٹکا رہ گیا۔ مشکی کا فیشن اسبل چشمہ اور میرا مفلر بھی اسی بھاگ دوڑ کی نذر ہو چکا تھا لیکن اس وقت ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی، جنگلے سے دوسری جانب اترتے ہی ہم نے ہمارے سڑک پار کی اور اپنے پیچھے بھاگتے اور چیختے چلاتے ”دیوانہ وار“ نجوم کو دوڑ چھوڑ آئے۔ چند ہی لمحوں میں ہم ہانپتے کا نپتے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے اور راستہ بھر دوڑتے ہوئے ہم اپنے پیچھے بھی نظر ڈالتے آئے کہ کہیں کوئی جوشیلا تماشا بین ہمارے پیچھے ہمارے گھروں تک نہ پہنچ جائے لیکن یہ دیکھ کر ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس ریس میں ہم پانچوں نے ان سب کو پچھاڑ دیا تھا۔

<http://kitaabghar.com>

اس کے بعد ہم سب نے مل کر راجہ کی جو گت بنائی اور ہمارے حلیوں کو دیکھ کر ہمارے گھر والوں کے ہاتھوں خود ہم سب کی جو درگت بنی..... وہ داستان ”ناقابل اشاعت“ ہے۔ بہت دن بعد راجہ نے سینما کے کسی چھوٹے اہل کار سے معلومات کروائیں تو پتہ چلا کہ شاہ جی کے گھر والے تو پچھلے ہفتے بھی سینما آئے تھے لیکن انہیں بتایا گیا کہ ان کے نام کے پاس پر تو چند بچے نہ صرف فلم دیکھ گئے ہیں بلکہ اپنی طرف سے خوب عیاشی بھی کر گئے ہیں۔ بات شاہ جی تک پہنچی تو انہوں نے سینما انتظامیہ کو جو کس کر دیا کہ اب اگر وہ ”گروہ“ فلم دیکھنے آئے تو انہیں اطلاع کر دی جائے اور سینما والوں نے وہی کیا۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم اس دن ان کے ہتھے نہیں چڑھے، ورنہ وہ ہماری ہڈی پلسی ایک کر دیتے۔ لیکن زندگی کی اس پہلی بے ایمانی سے سبق لینے کے بجائے یہ بے ایمانی ہمارے دلوں کے کسی کونے میں ہمیشہ کے لیے چھپ کر بیٹھ گئی۔ ہم سب کے دلوں نے کہیں نہ کہیں اپنے اندر اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ وہ بے ایمانی جو پکڑی نہ جاسکے، جائز ہوتی ہے۔ بس ایک ذرا سی ہمت ہی کی تو بات ہے اور جب کبھی بھی میں نے وہ ایک ذرا سی ہمت کر دکھائی تھی میرے اندر کار راجہ فوراً باہر نکل کر میرے سامنے آ بیٹھتا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے پوچھتا۔

<http://kitaabghar.com>

”ہاں پیارے..... عیاشی کرنی ہے تو بولو.....؟ لیکن یاد رکھو عیاشی کرنے کے لیے خطرہ بھی مول لینا پڑتا ہے۔ تو کہو.....؟“

میں کو نے کی.....؟“

میں سہم کرفنی میں سر ہلاتا ”نہیں نہیں..... اگر پکڑے گئے تو.....؟“

میرے اندر کی بے ایمانی مجھے بچپن کے دوست راجہ کی طرح پکارتی ہے ”ارے یار..... اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو اب موسلوں کا کیا ڈر.....؟“

<http://kitaabghar.com>

میں کچھ دیر سوچتا ہوں اور پھر چپ چاپ اپنا سر اوکھلی میں ڈال دیتا ہوں۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلا گش

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

اُس دن سینما والے واقعے کے بعد ہم سب نے بہت دن تک ڈر کے مارے محلے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ میں وجوہ آپنی سے بھی کترایا کترایا سا پھر تار با حالانکہ ان کے درجنوں پیغامات آتے رہے کہ آکر مل جاؤ لیکن میں نے بھی جیسے کانوں میں سیسہ ہی بھر لیا تھا لیکن ایک عجیب بات یہ تھی کہ جب تک عمارہ، فضلو بابا، بڑے بھیا یا امی میں سے کوئی بھی مجھے ان کے پیغامات پہنچاتا رہتا، میرے دل کو ایک اطمینان سا رہتا اور جس دن ان کی طرف سے کوئی پیغام نہ ملتا میرے دل کو ایک عجیب سی بے چینی لاحق ہو جاتی۔ ایسے لگتا تھا، جیسے دل کے پتھوں بچ کسی نے کوئی سوئی سی گاڑ دی ہو اور میری یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہتی، جب تک کسی جانب سے وجوہ آپنی کا پھر سے بلا واند آ جاتا۔

اور پھر یہ کش مکش بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکی۔ وجوہ آپنی کو میرے سبھی ٹھکانوں اور نظام الاوقات کا اچھی طرح پتہ تھا۔ اس روز استانی خالہ نے جانے کیوں مجھے سب سے آخر میں سبق سنانے کا کہہ دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ آج کل میں کچھ دیر سے سبق لینے کے لیے جا رہا تھا۔ معمول کے مطابق پہلے سب بچے اپنا سبق یاد کر لیتے اور پھر جس ترتیب سے بچے سبق لینے کے لیے آئے ہوتے تھے، اسی ترتیب سے ایک ایک کر کے وہ استانی خالہ کو سبق سناتے جاتے اور ان کو چھٹی ملتی جاتی۔

تقریباً سبھی بچے اپنا سبق سنا کر جا چکے تھے۔ صرف میں اور محلے کی دو لڑکیاں رہ گئی تھیں جن کا سبق سنانا ابھی باقی تھا۔ ان میں سے ایک آمنہ تھی، جسے ہم سب لڑکے بھوری چڑیل کہہ کر چڑاتے تھے۔ دراصل اس کے بھورے بال ہمیشہ مٹی سے بھرے ہوتے اور کچھ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے تھے جیسے کوئی ان میں ہوا بھر گیا ہو یا پھر کسی شریر بچے نے اس کے بالوں کے بیچ میں پناخہ پھوڑ دیا ہو۔ دوسری پٹر پٹر بولنے والی پروین تھی جس کے بال اس کی اماں اس قدر کس کے باندھتی تھی کہ اس کی بھویریں تک کھچ جاتی تھیں اور ماتھے تک جا پہنچتی تھیں۔ ہم سب اسے ”چالا کو ماسی“ کہہ کر پکارتے تھے۔

استانی خالہ جانے کن کاموں میں الجھی ہوئی تھیں کہ انہیں ہم سے سبق سننے کا وقت ہی نہیں مل پارہا تھا۔ دراصل اندر کمرے میں ان کے چند مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان کی مہمان داری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آواز کے منتظر تھے کہ کب وہ ہمیں چھٹی کرنے کی نوید سناتی ہیں۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی نازک سی آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو میرا سانس اور میری دھڑکنیں جیسی رک سی گئیں۔ وجوہ آپنی اب باقاعدہ بڑی چادر لے کر گھر سے نکلتی تھیں اور اس وقت وہ اسی بڑی سی کالی چادر کو اوڑھے ہوئے تھیں جس کے کناروں پر سفید لیس دار پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس کا لے نقاب میں ان کا چہرہ نور سے یوں دک رہا تھا جیسے کسی نے ماہتاب کا کوئی ٹکڑا اس کالی عبا کے اندر چھپا رکھا ہو۔ سچ پوچھئے تو میں واقعی اپنی سُدھ بدھ ہی کھو بیٹھا تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے اور دبے پاؤں ہمارے سر پر آ پہنچی تھیں کہ آمنہ اور

پروین کو بھی ان کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ وہیں میرے پاس ہی زمیں پر پڑی استانی خالہ کی چوکی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے جلدی سے سر جھکا لیا اور یوں ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگا، جیسے میں سبق یاد کرنے میں بے حد مگن ہوں۔ دُؤ آئی کچھ دیر تک یونہی میری جانب دیکھتی رہیں اور پھر ہولے سے بولیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”آدی..... ابھی تک ناراض ہو.....؟“

میں نے مزید سر جھکا لیا۔ دراصل میرے اندر ہمیشہ سے ایک کم زوری تھی اگر کوئی مجھے منانے کی کوشش کرتا یا جس کسی سے مجھے بہت شکایت ہوتی اور وہ مجھے منانے کی کوشش کرتا تو فوراً میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے اور مجھے ان دو موٹے موٹے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ہمیشہ لوگوں سے اپنا چہرہ چھپانا پڑتا تھا کیونکہ مجھے کسی کے سامنے رونے سے بھی بہت شرم آتی تھی۔ اس وقت بھی میری جان کے دشمن، وہی دو آنسو، ایک ہی لمحے میں میری آنکھوں میں چھلک آئے اور وجوہ آپنی سے اپنی حالت چھپانے کے لیے مجھے مستقل سر جھکائے رکھنا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے پھر دھیرے سے پوچھا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”مجھ سے بات نہیں کرو گے آدی؟“

جانے کیسے بے حد ضبط کے باوجود میری ہلکی سی مدھم سکی نکل ہی گئی اور دُؤ آپنی نے جلدی سے اپنی ہتھیلی سے میرا چہرہ اوپر کر دیا۔ وہ میرے آنسو دیکھ کر خود بھی پریشان ہو کر رو ہانسی سی ہو گئیں اور جلدی سے اپنے دوپٹے سے میری آنکھیں پونچھ کر بولیں۔

”ارے ارے..... یہ کیا.....؟ ایسے نہیں روتے..... آدی تو بہت بہادر ہے نا۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے جلدی سے خود پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ پروین اور آمنہ کے سامنے میں رونا نہیں چاہتا تھا لیکن دُؤ آپنی سے میں نے ابھی تک بھی نظر نہیں ملائی تھی۔ دُؤ آپنی نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور دھیرے سے پوچھا۔

”اپنی دوست کو معاف نہیں کرو گے آدی۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اتنی معصوم اور اپنی الماری پر رکھی اس گڑیا کی طرح شکل بنا کر اپنی آنکھیں پٹ پٹاتی تھیں، جسے دیکھ کر ہمیشہ میری ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔ دُؤ آپنی کو اچھی طرح سے پتہ تھا کہ چاہے میں کتنا ہی اداس کیوں نہ ہوا کروں، مجھے ہنسائے کا یہی سب سے کارآمد اور آزمودہ نسخہ ہوتا تھا۔ سو اس وقت بھی یہی ہوا اور وہ اپنے حربے میں کامیاب رہیں۔ میں ہنگامی پلکوں کے ساتھ ہی ہنس پڑا اور دُؤ آپنی کے چہرے پر چھایا غبار بھی چھٹ گیا۔ وہ بھی ہنس دیں۔ وہ جب بھی ہنسی تھیں مجھے لگتا تھا جیسے سارا جہاں ہنس پڑا ہو۔

”یہ ہوئی نابات۔ دیکھو میرے پاس کیا ہے اپنے آدی کے لیے۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

انہوں نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا، جو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر اس میں رنگ بھرے تھے۔ میں نے خوشی اور حیرت سے ”شکریہ“ کے اس کارڈ کو الٹ پلٹ کر چاروں جانب سے دیکھا۔ وجوہ آپنی کے ہاتھوں میں اب ایک اور کارڈ بھی نظر آ رہا تھا، انہوں نے کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرایا۔ یہ وہی کارڈ تھا، جو میں ان کے نتیجے والے دن ان کے لیے بنا کر لے گیا تھا لیکن پھر ان کی بے توجہی کے باعث غصے میں وہیں پھینک آیا تھا۔ میں اپنا کارڈ ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر اپنی ساری ناراضگی اور شکایات بھول کر حیرت سے چلا یا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ارے..... یہ آپ کو کہاں سے ملا.....؟“

دو آپی مسکرائیں۔ ”وہیں سے..... جہاں تم اسے پھینک آئے تھے۔“

دو آپی نے مجھے بتایا کہ اس شام جب میں ناراض ہو کر ان کے گھر سے نکل آیا تھا تب کچھ ہی دیر بعد انہیں وہاں پر میری غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے میری امی سے بھی میرے بارے میں پوچھا اور فضلو بابا کو بھی میرے پیچھے دوڑایا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ میں خاص انہی کی خاطر اس شام امی کے ساتھ انہیں مبارک باد دینے کے لیے وہاں آیا تھا لیکن سب ہی میری تلاش میں ناکام ہو گئے۔ تبھی ان کی نظر اس کرسی کے نیچے پڑی، جہاں میں پہلے بیٹھا ہوا تھا وہاں پر انہیں یہ مڑاڑ سا کارڈ پڑا دکھائی دیا۔ دو آپی نے آگے بڑھ کر یہ کارڈ اٹھالیا اور بقول ان کے اس شام انہیں ملنے والا یہ سب سے پیارا کارڈ اور سب سے پیارا تھا۔ وہ تبھی سمجھ گئی تھیں کہ میں ان سے ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا ہوں۔ پر وہ بے چاری بھی کیا کرتیں؟ اتنے بہت سے مہمان جو گھر میں جمع تھے اور پھر ان سب کی خاطر داری اور ہزار دوسرے کام جو ان کی جان کو آئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ نہ ہی میرے پاس بیٹھ سکیں اور نہ ہی انہیں اتنا ہی موقع ملا کہ وہ خود مجھے ہی اپنے پاس بلا لیتیں۔ دو آپی نے اتنی تفصیل سے اور اتنی اچھی طرح مجھے اپنی اس شام کی مجبوری بتائی کہ خود مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں نے کارڈ وہاں پھینک کر ان کا کنٹال دیکھایا ہے؟ اور دو آپی کا دل کتنا بڑا ہے کہ اس کے باوجود خود مجھے منانے چلی آئیں۔ دو آپی تو تھیں ہی ایسی..... وہ کسی کو خود سے ناراض ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ چاہے غلطی خود دوسرے کی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ خود چل کر اسے منانے، اس کے پاس پہنچ جاتیں اور پھر اسے منا کر ہی دم لیتیں۔ ان کے دل اور روح کی یہی پاکیزگی تو تھی جو ان کے چہرے اور آنکھوں سے نور بن کر نکلتی تھی۔ وہ شام میری زندگی کی حسین ترین شاموں میں سے ایک تھی۔ دو آپی بہت دیر تک میرے ساتھ وہیں برآمدے میں بیٹھی رہیں۔ پروین اور آمنہ کو انہوں نے سبق سن کر چھٹی دے دی تھی۔ وہ استانی خالہ کے ساتھ مہمان داری میں بھی ہاتھ بٹاتی رہیں اور خود میرے ساتھ بیٹھ کر انہوں نے چائے بھی پی۔

رابعہ کو میں نے دوسرے روز یہ سارا ماجرا بتایا تو اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”تبھی میں کہوں..... یہ اپنے آدی پیارے کا چہرا اتنا روشن اور کھلا کھلا سا کیوں ہے۔ چلو یار..... ہم تو یاروں کی خوشی میں خوش رہنے والے ہیں۔ جاؤ تمہیں معاف کیا۔“

رابعہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میری جان دو آپی میں اٹکی رہتی ہے اور میں زیادہ عرصے تک اپنے اس کچے وعدے پر قائم نہیں رہ سکوں گا، جو میں نے اپنے سارے دوستوں کے سامنے دو آپی سے نہ ملنے کے بارے میں کیا تھا لیکن رابعہ کی سب سے اچھی عادت یہی تھی کہ وہ مجھے میرے ٹوٹے ہوئے ارادے اور توڑے ہوئے وعدے یاد دلا کر کبھی شرمندہ نہیں کرتا تھا۔

دو آپی بارہویں پاس کر کے تیرہویں میں لڑکیوں کے بڑے کالج میں پہنچ گئیں اور ہم سب چوتھی سے پانچویں میں آ گئے۔

دو آپی کو اب سیکند خالہ نے باقاعدہ ایک کالے رنگ کا برقعہ سلا کر دے دیا تھا، جسے اوڑھ کر وہ بڑے کالج جایا کرتی تھیں۔ فضلو بابا اب مزید جھک کر چلنے لگے تھے لیکن اپنی دو بی کی خدمت میں وہ اب بھی اسی پرانی پھرتی سے کام لیتے تھے۔ انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نیا خاندان تازہ تازہ آ کر بسا تھا۔ اسی میں ہماری عمر کا ایک لڑکا بھی شامل تھا جس کا نام تو اقبال تھا لیکن سب اسے پیار سے بالا کہتے تھے۔ بالے کے ابا کا پنجاب سے یہاں تبادلہ ہوا تھا اور ان کی ڈیوٹی بھی میرے اور رابعہ کے ابا کے محکمے میں انہی کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ بالے کے ابا کریم نے بالے کو بھی ہمارے

ہی اسکول میں پانچویں میں داخلہ دلا دیا تھا۔ بالا دیکھنے میں ہم سب سے بہت بڑا لگتا تھا بعد میں پتہ چلا کہ اسے ایک کلاس میں دو سال لگانے کی عادت ہے لہذا وہ اب تک آٹھویں کے بجائے پانچویں میں ہی اٹکا ہوا ہے۔ بالے کا ایک بڑا بھائی اکرم اور ایک بڑی بہن گڈی بھی تھی جسے ڈوآ پی کے ساتھ لڑکیوں کے بڑے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اکرم جسے گھر میں سب اٹو کہتے تھے، بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا اور نکما ہونے کے باعث بمشکل دسویں ہی کچی پکی پاس کر پایا تھا۔ بقول میرے ابا کے اس کے انداز ہی خاص لو فروں والے تھے۔ اٹو سارا دن محلے میں کھڑا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہتا تھا اور آتی جاتی لڑکیوں کو غور غور سے دیکھتا اور زیر لب مسکائے جاتا۔ پنجاب سے بتادلے سے پہلے اس کے ابا نے اسے کسی فرنیچر والے کی دکان پر کام سکھنے کے لیے بٹھا دیا تھا اور اب تو اسے فرنیچر کا کام کرتے اور رندہ چلاتے ہوئے بھی پانچ سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا تھا۔ چھوٹی عمر سے آری اور رندے چلا چلا کر اس کے ہاتھ بھی کسی بڑی اور بھدی قسم کی سخت لکڑی کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ آج کل یہاں ہمارے شہر میں بھی اپنے لکڑی کا کام بڑھانے کے لیے کسی دکان کی تلاش میں تھا لیکن فی الحال اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

طاہر بھائی کی ڈاکٹری کی پڑھائی اپنے تیسرے سال میں تھی اور اب انہیں مکمل ڈاکٹر بننے کے لیے صرف دو سال مزید درکار تھے جب ہم صبح سویرے اپنے بستے اپنے گلوں میں لٹکائے گھر سے اسکول کے لیے نکل رہے ہوتے تھے تب اکثر طاہر بھائی پر میری نظر پڑتی تھی۔ وہ اپنے گلے میں ڈاکٹروں والا آلہ لٹکائے اور بازو پر اپنا سفید کوٹ ڈالے بابوؤں والی پینٹ شرٹ پہنے اپنے میڈیکل کالج کے بس کے انتظار میں کھڑے نظر آتے تھے۔ کچھ ٹھیک یہی وہ صبح کا وقت تھا جب ڈوآ پی فضلو بابا کے ساتھ اپنے گھر سے تانگے کا ہارن سن کر نکلا کرتی تھیں۔ فضلو بابا ڈوآ پی کو تانگے میں سوار کروا کر اور ان کا خوب صورت سائیک جو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا، ان کے حوالے کر کے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے تانگے کو گیٹ تک رخصت کرنے آتے تھے۔ ایسے میں عام طور پر ان کی طاہر بھائی سے بھی ملاقات ہو جاتی، جنہیں اب فضلو بابا احترام سے ”ڈاکٹر صاب“ کے نام سے بلاتے تھے۔ یہاں ڈوآ پی کا تانگہ محلے کے گیٹ سے نکلتا وہاں طاہر بھائی کی بس بڑی سڑک کا موڑ کاٹ کر ہمارے گیٹ کے پاس رکتی اور یہاں ہم محلے کے بچے شور مچاتے اور کودتے پھاندتے محلے کے گیٹ سے اپنے اسکول کے لیے باہر نکلتے۔ میرا وہ دن انتہائی بے چین اور افسردہ گزرتا، جب کبھی میں گیٹ سے نکلتے ہوئے ڈوآ پی کی چہرے کے آدھے نقاب سے جھانکتی بڑی بڑی کالی اور جھکی نگاہوں کو طاہر بھائی کی انٹھی ہوئی آنکھوں سے ملتے پاتا۔ ساری رات میری یہی دعا مانگتے گزر جاتی کہ خدا کرے کہ کل طاہر بھائی کی بس جلدی آجائے یا پھر ڈوآ پی کا تانگہ طاہر بھائی کے گیٹ پر آنے سے پہلے ہی وہاں سے گزر جائے لیکن ظاہر ہے کہ ہر روز میری دعا قبولیت کا شرف بھی نہیں پاسکتی تھی اور ہر تیسرے چوتھے روز ڈوآ پی اور طاہر بھائی کی نظروں کے ملاپ کا یہ ”اتفاق“ سرزد ہو ہی جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ طاہر بھائی کی بس کے اوقات بھی ڈوآ پی کے تانگے کی روانگی سے متصل ہیں۔ بہت عرصے بعد مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ میڈیکل کالج والوں کی ایک ہی رنگ اور ایک ہی حلیے کی تین چار بسیں ہوتی ہیں جو مختلف اوقات میں چلا کرتی ہیں۔ بہر حال اس وقت مجھے بس کے اوقات کا رے زیادہ اس بات کی فکر ہوتی تھی کہ صبح سویرے میرے دل پہ بجلی گرانے والا نظروں کا یہ تصادم کسی نہ کسی طور ٹل جائے۔

وہ بھی میرے لیے ایک ایسا ہی جھل اور بے حد اداس دن تھا کیونکہ صبح اسکول کے لیے آتے ہوئے محلے کے گیٹ پر میں نے یہ تصادم ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ڈوآ پی کی نگاہ جیسے ہی طاہر بھائی سے ٹکرائی انہوں نے فوراً اپنی نظریں جھکا لی تھیں لیکن طاہر بھائی کی نگاہوں نے ڈوآ پی کی

نظروں کا تاحد نگاہ تعاقب کیا۔ میں نے طاہر بھائی کو اپنا کالر ٹھیک کرنے کے بہانے دھیرے سے اپنا ہاتھ اٹھاتے بھی دیکھا اور اگر میں نے راجہ سے ان ”معاملات“ کے بارے میں مکمل تفصیلات نہ لے رکھی ہوتیں تو مجھے کبھی پتہ نہ چلتا کہ یہ سلام پیش کرنے کا ایک آزمودہ طریقہ ہے۔ طاہر بھائی کے ہاتھ کالر تک لے جاتے ہی ڈوآ پی نے فوراً اپنی پلکیں جھکائی تھیں لیکن ان کے جسم کا سارا خون گلابی رنگ میں تبدیل ہو کر ان کے چہرے پہ سٹ آیا تھا۔ جبکہ یہ سارا ماجرا دیکھنے کے بعد خود میرے اپنے چہرے کا ہر رنگ صرف اسی ایک لمحے کے وقفے میں ہی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں نے ایک لمبی سی سانس بھری اور دل ہی دل میں خود سے کہا۔

”ہوں..... تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے..... اب تو اس کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔“

اس دن میرا من کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اسکول میں بھی سارا دن دل بوجھل سا رہا۔ راجہ نے کئی بار مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن میں اسے بھی ٹال گیا۔ شام کو ہم دونوں استانی خالہ کے گھر سے باہر نکلے تو بالے سے ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ کچھ جلدی میں لگ رہا تھا۔ راجہ نے اسے آواز لگائی تو اس نے ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے محلے کے چھوٹے میدان کے کچھواڑے بنے کوارٹرز کی کچھلی جانب بڑھ گیا۔ دور محلے کے کچھ بچے شام کی سردی سے بچنے کے لیے ٹین کے ایک کنسٹر میں جس کے اطراف اور کناروں پر بہت سے چھوٹے چھوٹے سوراخ کیے گئے تھے، سگلتے ہوئے انگارے ڈال کر اس ڈبے کو ایک مضبوط بندھی تار سے پکڑ کر ہوا میں خوب زور زور سے گول چکر دے رہے تھے۔ ان سوراخوں سے ہوا ٹین کے کنسٹر میں داخل ہوتی تو انگارے سلگ کر آگ پکڑ لیتے تھے اور بچے جلدی سے ٹین کے کنسٹر کے گرد جمع ہو کر اس آگ سے اپنے ہاتھ سینکے لگتے تھے۔

بالا ان بچوں کے ہجوم سے ذرا ایک طرف ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور مجھے اور راجہ کو بھی اس نے وہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بالے کے اس مشکوک انداز نے ہمیں بھی تجسس میں ڈال دیا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے سرگوشی میں ہم سے پوچھا۔

”کبھی کش لگایا ہے.....؟“

میں نے اور راجہ نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر حیرت سے پوچھا۔

”کیسا کش.....؟“

بالے نے اپنی جیب سے ایک مڑا تڑا سا سگریٹ نکال کر ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”اس کا کش.....“

میں اور راجہ سگریٹ دیکھ کر یوں اچھلے جیسے بالے کے ہاتھ میں سگریٹ نہ ہو کوئی سپنولیا ہو، جسے وہ اچانک ہمارے سامنے لہرا بیٹھا ہو۔ ہم دونوں بے اختیار چلائے۔

”سگریٹ.....“

بالے نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں غصے سے گھورا اور آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے بولا۔

”چپ..... مَر وَاؤ گے کیا..... کیا اس سے پہلے کبھی سگریٹ نہیں دیکھا.....؟“

راجہ نے حیرت سے بالے کی جانب ایسے دیکھا، جیسے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو۔

”تم سگریٹ پیتے ہو.....؟“

بالے نے حسرت سے ایک آہ بھری۔

”روز ایسی عیاشی کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے یار۔ کبھی بکھاراٹو بھائی کی ڈبیا میں سے اڑا لیتا ہوں۔ آج بھی ان کی ڈبیا میں آخری یہی بچی تھی۔ وہ صبح گھر پہ بھول گئے تھے۔ مجھے موقع ملا تو میں اڑا لایا۔“

بالے نے جیب سے کیمل سگریٹ کی ایک ڈبیا نکالی جو سگریٹ کے ادھ چلے ٹوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سگریٹ ماچس نکال کے سلاگیا اور خاص ”لو فروں“ کے انداز میں اس نے ایک لمبا سا کش لیا اور دھواں ہمارے چہروں پہ بکھیر دیا۔ میری تو آنکھیں جلنے لگ گئیں۔ بالے نے ایک دوا اور کش لیے۔ میں اور راجہ اس کے سامنے بیٹھے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے جیل میں عادی اور چھوٹے موٹے مجرم اپنے گرو اور بڑے استاد کو دیکھتے ہیں۔ بالے نے سگریٹ ہماری طرف بڑھایا۔

”کش لگاؤ گے.....؟“

میں نے اور راجہ نے ہنچکپاتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ بالے نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔

”لگا لو یار..... ایک کش سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ مردوں کے پینے کی چیز ہے۔“

پہلے راجہ نے ڈرتے ڈرتے سگریٹ ہاتھ میں اس طرح پکڑا جیسے وہ سگریٹ نہیں بلکہ پورے کا پورا ایک جلتا انگارہ ہو۔ بالے نے ایک دوسرا ٹوٹا سا لگا کر میرے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ میں نے اور راجہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر ایک، دو تین کہا اور سگریٹ ہونٹوں سے لگالی۔ جیسے ہی دھواں میرے حلق سے نیچے گیا مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے حلق میں کانٹوں سے بھرا تلخ اور شدید چبھتا ہوا کوئی گولہ آن پھنسا ہو۔ میرے اور راجہ دونوں کے گلے میں دھوئیں کا پھندا اٹک گیا اور ہم دونوں کا کھانسنے کا برا حال ہو گیا۔ میری آنکھوں سے تو یوں پانی بہہ رہا تھا، جیسے کسی دریا کا بند ٹوٹ گیا ہو۔ راجہ کا حال بھی بہت برا تھا۔ بالا ہم دونوں کی حالت دیکھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ یہ میری اور راجہ کی زندگی کا پہلا کش تھا۔ مجھے اسی دن سے سگریٹ سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ وہ چیز ہے، جسے یہ سارے بڑے مزے لے لے کر پیتے تھے۔ اس کش کی کڑواہٹ، تنخی اور عجیب سی جلتی ہوئی بونے میری روح تک دھوئیں سے بھر دی تھی لیکن راجہ پر اس کش کا الٹا اثر ہوا۔ اس نے شاید اپنے حلق سے اترتے اور خون میں شامل ہوتے ٹوٹین کے نشے اور اس مزے کو محسوس کر لیا تھا جس کا ہر سگریٹ پینے والا دیوانہ ہوتا ہے۔ سگریٹ کچھ سالوں میں ہی راجہ کی انگلیوں کا مستقل حصہ بن گیا جس کے بغیر کبھی کبھی راجہ کی اپنی شخصیت ادھوری لگنے لگتی تھی۔ میں نے بہت بعد میں کہیں پڑھا تھا کہ ”سگریٹ کے ایک کونے پر ایک سلگتا ہوا انگارہ اور دوسرے کونے پر ایک احقر ہوتا ہے.....“ سو میرا دوست راجہ بھی اسی دن سے ان احمقوں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا، افسوس میں یہ حماقت دوبارہ کبھی نہ کر سکا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا بھرم

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

اُس دن کیمل سگریٹ کے ایک ہی کش نے میری حالت ابتر کر دی تھی۔ بالے نے سگریٹ ختم کرنے کے بعد جیب سے ہرے پودینے (Mint) کی خوشبو والی گولیاں نکال کر خود بھی زبان کے نیچے رکھ لیں اور مجھے اور راجہ کو بھی ایک ایک میٹھی گولی چوسنے کے لیے دے دی۔ راجہ سے ہی ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ منہ سے سگریٹ کی مہک کو ختم کرنے کا یہ سب سے تیر بہدف نسخہ ہے۔

اگلے چند دن میں رمضان شروع ہو گیا اور میری اُداسی مزید بڑھ گئی۔ پتہ نہیں بھوک سے ان دنوں میری اُداسی کا کیسا عجیب سا تعلق تھا۔ جتنی زیادہ بھوک لگتی اتنا زیادہ میں اُداس ہوتا جاتا۔ ابا کی طرف سے مجھے باقاعدہ روزے رکھنے کا حکم نامہ مل چکا تھا۔ لہذا امی سحری کو باقی لوگوں کے ساتھ مجھے بھی جگا دیتی تھیں۔ شروع کے چند روزے تو میں نے سحری بھی بند آنکھوں سے ہی کی۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ روزہ اتنی صبح سے بلکہ منہ اندھیرے ہی کیوں شروع ہو جاتا ہے۔ ہم صبح کے ناشتے کے بعد سے لے کر رات تک بھی تو روزہ رکھ سکتے تھے؟

بہر حال دو چار روزوں کے بعد ایک سحری کو، جب میں ذرا جلدی نیند سے جاگ گیا تھا اور امی کے ساتھ باورچی خانے میں بیٹھا انہیں پراٹھے بناتے ہوئے اپنے لیے عمارہ اور بڑے بھیا سے بڑا پراٹھا بنانے کے لیے تنگ کر رہا تھا تب اچانک ہی باہر گلی سے راجہ کی مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں حیرت اور خوشی کے عالم میں جلدی سے باہر بھاگا، گلی میں راجہ، گڈ واور بالے لیپ پوسٹ کی روشنی سے ذرا ہٹ کر بڑی بڑی کالی چادریں اوڑھے کھڑے تھے۔ پتہ چلا کہ آج سے ان سب نے محلے میں اُن سب گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بھاگنے کا منصوبہ بنایا ہے جو دن میں ہمیں اپنے گھر کے سامنے کھیلنے سے ڈانٹتے تھے۔ تنھو اپنے گھر سے چپکنے والی سفید ٹیپ لینے کے لیے گیا ہوا تھا کیونکہ کچھ دروازوں کی گھنٹیوں پر مستقل بجانے کے لیے یہ ٹیپ بھی جوڑی جانی تھی۔

راجہ نے مجھے کہا کہ میں جلدی سے سحری کر کے نماز کے بہانے اپنے ابا سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آؤں کیونکہ ہمیں آدھے گھنٹے کے وقفے میں پورے محلے کی ”خدمت“ کرنا تھی۔

کچھ ہی دیر میں میں اپنے سیدھے نوالے نگل کر، گھر والوں کو دکھانے کے لیے سر پہ سفید ٹوپی اوڑھ کر، کپے نمازیوں کی طرح سنجیدہ سی صورت بنا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ باہر پوری ٹوٹی تیار کھڑی تھی۔ کچھ گرجن میں گھنٹی کی سہولت موجود نہیں تھی ان کے بیرونی دروازوں کی بڑی بڑی کنڈیوں سے کالا دھاگا باندھ کر، کسی دور جگہ پہ چھپ کر اسے ہلانے کا انتظام بھی کیا گیا تھا جن گھروں کے صحن اور دالان بہت لمبے چوڑے تھے جہاں تک کمرے سے نکل کر آنے میں کمینوں کو کچھ وقت لگتا تھا ان کے دروازے کی گھنٹی پر ہم مضبوط ٹیپ اس طرح چپکا دیتے کہ گھنٹی مستقل بجتی ہی

رہے جبکہ کچھ گھروں کے دروازوں پر گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی ہمیں تیزی سے بھاگ کر اپنی جان بچانی پڑتی تھی۔ اس کھیل کے اصول کچھ یوں تھے کہ ہر بچے کو اپنی باری ملتی تھی اور باقی بچے اس کی مدد کچھ فاصلے سے کرتے تھے، سب ہی کو ایک ایک بار کسی نہ کسی دروازے پر جانا ہی ہوتا تھا۔ مجھے، راجہ، بالے، گدو اور نحو کو ملا کر ہم سب پانچ بنتے تھے، لہذا ہر پانچویں گھر کے بعد پہلے بچے کی باری دوبارہ آ جاتی تھی۔ اگلے دو تین دن میں مشی اور پوپ نے بھی ہمارا ”گروہ“ جوائن کر لیا اور یوں ہم سات ہو گئے اور سارا محلہ سحری کے وقت گھنٹیوں اور کنڈیوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سے گونجنے لگا۔ روزہ دار گھرانوں کی تو خیر تھی کیونکہ وہاں تو عموماً سبھی جاگ ہی رہے ہوتے تھے لیکن سب سے زیادہ پریشانی ان گھرانوں کے لیے تھی جہاں روزہ رکھنے والا کوئی ایک آدھ یا بالکل ہی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں چند ہندو گھرانے بھی گھنٹی والے گھروں میں شامل تھے۔ ان سب کی توجان پر ہی بن آئی تھی۔ ہم گھنٹی بجا کر یوں سرپٹ بھاگتے کہ دروازہ کھولنے والے کو ہمارا نام و نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ دن کو ہم سب معصوم صورت بنائے جب انہی گھروں کے سامنے کھیل رہے ہوتے اور آس پاس کے محلے داروں کو آپس میں ان سحری کی وارداتوں کے بارے میں بات کرتے سنتے تو ہمیں بے حد مزہ آتا۔

صدیقی صاحب غصے سے تملاکر مرزا صاحب سے کہتے۔

”ارے جناب..... یہ زمانہ تو شرافت کا ہے ہی نہیں..... آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے ان لونڈوں نے..... جانے کون آدمی رات کو گھنٹی پر ٹیپ چکا جاتا ہے۔ میرے ہاتھ لگے تو ایسی خبر لوں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے.....

وہاں سے دبلے پتلے قد و س صاحب اپنی باریک آواز میں منماتے۔

”اجی شرافت کی کیا بات کرتے ہیں آپ..... یہ تو محلہ ہی غنڈوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے۔ پچھلی سحری تو اس قدر زور سے میری کنڈی کھڑکائی کہ بختوں نے کہ میرے ہاتھ سے تو دودھ پھینکی کا پیالہ پھسل کر منے کی اماں کے سر پہ جا گرا۔ مجبوراً آج کا روزہ قضا کرنا پڑ گیا انہیں۔“

کچھ ”کم زور دل حضرات“ جو پہلے ہی سے صبح کی نماز مسجد سے قضا کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہوتے تھے، اپنے دوسو سے یوں بیان کرتے۔

”نہیں یا مرزا..... مجھے تو یہ کوئی آسیب کا چکر لگتا ہے۔ جس لمحے میری کنڈی کھڑکی تھی، تبھی میں پھلانگ لگا کر دروازے کے باہر آ موجود ہوا پر دو دو روتک ایسا سنا تھا کہ میرا تودل ہی ہول کھانے لگا..... جلدی سے چار قل پڑھ کر میں دوبارہ بستر میں جا گھسا۔ بڑے بوڑھوں نے ہمیں تو یہی سکھایا ہے کہ میاں ایسی مخلوقات سے ماتھا بھڑانا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔“

غرض کوئی اسے بین الاقوامی چوروں کے کسی گروہ کی سازش قرار دیتا اور کوئی اپنے ہمسائے کی نیت پر شک کرتے ہوئے اس سے لڑ بیٹھتا اور ہم ساتوں دور کھڑے معصومیت سے یہ تماشا دیکھتے اور تنہائی ملتے ہی ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

انہی متاثرین میں سیٹھ گردھاری مل کا گھر انہ بھی شامل تھا جو پہلے ہی اپنے موٹاپے کے ہاتھوں بے حد پریشان تھے اوپر سے روزانہ صبح چار ساڑھے چار بجے کی اس دوڑ پریڈ نے ان کا بلڈ پریشر اتنا ہائی کر دیا تھا کہ ان کا جینا حرام ہو گیا تھا۔ گردھاری مل کی چار نازک اور خوب صورت سی بیٹیاں بھی تھیں جنہیں جب ان کی ”ماتا“ محلے سے کسی کام کے لیے باہر جانے کے لیے لے کر نکلتی تھیں تو ان کی زبان پر زیر لب صرف ”رام رام“ کا

ورد ہوتا تھا تا کہ یہ مشنڈے ”مسلے“ ان کی بیٹیوں پر نظر نہ ڈال سکیں۔

وہ غالباً تیرھواں روزہ تھا۔ ہم حسب معمول سحری کو کامیابی سے محلے والوں کی نیند حرام کرنے میں مشغول تھے، گردھاری مل کا دروازہ آنے پر راجہ کی باری آگئی۔ ہم سب اصول کے مطابق دروازے سے دس بارہ گز دور ہی رک گئے اور ہم نے راجہ کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ کر گھنٹی بجائے جبکہ ہم سب نے گھنٹی بجتے ہی واپسی کے لیے سرپٹ بھاگنے کے لیے پرتول لیے۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بچے کے لیے ہوتا تھا جو گھنٹی بجانے کے لیے دروازے کے پاس جاتا تھا کیونکہ باقی لوگ تو اتنی دور کھڑے ہوتے تھے کہ انہیں بھاگنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ راجہ دبے پاؤں گردھاری مل کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا اور ہم سب دم سادھے بھاگنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ راجہ نے آخری بار پلٹ کر ہماری جانب دیکھا اور بالے نے دھیرے سے گنتی پڑھتی شروع کی۔

”ایک..... دو..... تین.....“ کہتے ہی راجہ نے گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا اور ہم دیوانہ بھار بھاگے لیکن یہ کیا.....؟ راجہ کے گھنٹی پر ہاتھ رکھتے ہی دھڑ سے دروازہ کھلا اور ایک موٹا اور کالا سا آدمی زوردار آواز میں ”جے بجرنگ ملی..... توڑ دشمن کی ملی.....“ کا نعرہ لگاتے ہوئے باہر آ کودا اور سیدھے اپنا ہاتھ راجہ کی کلائی پر ڈال دیا۔ راجہ بدحواسی میں چلایا ”بھاگو.....“ لیکن اس وقت اس کی ہدایت پر عمل کرنے والے ہم سبھی تو پہلے ہی خوف زدہ جانوروں کی طرح سرپٹ بھاگ ہی رہے تھے۔ خوش قسمتی سے اس ”کالی بلا“ کا ہاتھ ٹھیک طرح سے راجہ کی کلائی پر نہیں پڑا تھا اور راجہ کا بازو اس کی گرفت سے پھسل کر نکل گیا۔ راجہ بھی کسی ریس کے بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح اس شخص کی گرفت سے نکل کر وہاں سے ایسا بھاگا کہ کچھ ہی دیر میں ہمیں بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بھاگتے ہوئے راجہ نے زور سے نعرہ لگایا۔ ”مسجد کی طرف..... مسجد کی طرف۔“ شاید راجہ کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ گردھاری مل کے گھر سے برآمد ہونے والی یہ مصیبت مسجد کی طرف آنے کی جرأت نہ کرے۔ اس شخص سے پیچھے دونو جوان مزید سینٹھ کے گھر سے نکلے اور وہ بھی ہمارے پیچھے بھاگے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہم میں سب سے آگے راجہ، اس کے پیچھے ہم، ہمارے پیچھے وہ کالی بلا اور سب سے پیچھے دونو جوان ہمارے تعاقب میں بکٹتے دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ہم ساتوں ان کی پہنچ سے کافی دور نکل گئے اور بھاگتے ہوئے سڑک کر اس کر کے مسجد میں جا گھے، جماعت کھڑی ہونے والی تھی۔ ہم بھی جلدی سے باقی نمازیوں کے ساتھ صفوں میں رل مل گئے۔ راجہ کے کہنے کے مطابق ان لوگوں نے ہمیں مسجد میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا لہذا نماز ختم ہونے کے بعد ہمیں اپنی نمازیوں کی ٹولیوں کے ساتھ ہی محلے میں واپس داخل ہونا لازمی تھا تا کہ سیٹھ گردھاری مل اینڈ کمپنی ہمیں پکڑ نہ سکے۔

لیکن جیسے ہی ہم مسجد سے باہر نکلے تو یہ دیکھ کر ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ وہ تینوں بمع سینٹھ گردھاری مل، مسجد کے باہر موجود ہیں اور مسجد سے نکلنے والے نمازیوں سے بمع میرے ابا کے، ہماری شکایت کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور تھا لیکن سوائے راجہ کے وہ اور کسی کو نہیں پہچانتے تھے کیونکہ ہم سب ان سے دور تھے، مسجد سے اور بھی کافی بچے جو ہماری ہی عمر اور سائز کے تھے، برآمد ہو رہے تھے۔ لہذا بڑوں نے وہیں مسجد کے سامنے والے میدان میں ہماری ”شناخت پریڈ“ کا بندوبست کرتے ہوئے سبھی بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سینٹھ گردھاری مل کو اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ملزم پہچاننے کا کہا گیا۔

گردھاری مل اینڈ کمپنی نے راجہ کو تو دور ہی سے پہچان لیا اور اسے ”ملزمان“ سے نکال کر مجرموں کی لائن میں کھڑا کر دیا گیا۔ راجہ کے بعد انہوں نے بالے کو اس کے نمایاں قد کاٹھ کی وجہ سے شناخت کر لیا گیا۔ بالے کے ساتھ ہی میں کھڑا تھا۔ گردھاری مل نے ہانپتے ہوئے بغور میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنے چہرے پر نہ صرف اپنی بلکہ آس پاس کی بھی تمام معصومیت کو یوں یکجا کیا ہوا تھا کہ خود گردھاری مل کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ بہر حال انہیں سات ملزمان کی گنتی تو پوری کرنی ہی تھی لہذا میرا نزلہ میرے ساتھ کھڑے ”پڑھا کو“ رفاقت پر گرا اور اس کے لاکھ چیخنے چلانے کے باوجود اسے گھسیٹ کر راجہ اور بالے کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ پپو، پنھو اور مٹی بھی پکڑے گئے جبکہ گڈو کی جگہ انہوں نے غلطی سے مولوی سعید کے بیٹے نعیم کو دھر لیا۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ مجرمان کی قطار میں رفاقت ”پڑھا کو“ اور ”چھوٹا مولوی“، نعیم زارو قطار رو رہے تھے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اپنے گلے کا پورا زور لگا کر چیخ چلا کر قسمیں کھا رہے تھے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فرد جرم سنائی جا چکی تھی اور اب صرف ان کی سزا کا فیصلہ باقی تھا اور یہ فیصلہ ہمارے بڑوں نے ایمان دار اور عظیم مسلمان حکمرانوں کی طرح سیٹھ گردھاری مل پر چھوڑ دیا کہ ”بول ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“

<http://kitaabghar.com>

سیٹھ گردھاری مل کی خواہش یہ ان سبھی کو وہیں آدھے گھنٹے کے لیے مرغا بنا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان ساتوں کے گھر والوں سے یہ درخواست بھی کی کہ گھر جا کر بھی ان سب کی ”قد مکرر“ کے طور پر ٹھیک ٹھاک خبر لی جائے یوں ہمارا اچھا خاصہ اور مزے سے گزرتا ہوا رمضان اس سیٹھ گردھاری مل کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ آئندہ کے لیے ہم سب بچوں پر سحری کے دوران پہرہ بہت سخت کر دیا گیا۔ سواب ہم بچوں کا رمضان میں صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے گھڑی کی طرف دیکھتے رہتے کہ وقت کب گزرے گا۔ افطار کے وقت جب ہم سب محلے کے بڑے میدان میں جمع ہوتے اور کسی بھی کھیل میں مشغول ہوتے تو زوردار آواز میں جنگی سائرن جیسا ایک بھونپو پورے ایک منٹ کے لیے بجتا تھا جو اس بات کا اشارہ ہوتا کہ روزہ بس کھلنے کو ہے۔ ہم سب بچے اس سائرن کی آواز پر اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ جاتے۔

ڈوآ پی تک بھی یہ گھنٹی بجانے کی واردات کی شہرت اور تذکرہ کسی طور پہنچ گیا تھا اور پہلے تو وہ بہت دیر تک ہنستی رہیں پھر انہوں نے مجھے قریب بیٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آدی..... تم تو ان شرارتی بچوں کے ساتھ اس شرارت میں شامل نہیں تھے نا؟“

نہ چاہنے کے باوجود مجھے اپنی گردن فوراً نفی میں ہلا پڑ گئی۔ جانے کیوں میں ڈوآ پی کو چاہ کر بھی یہ بتا نہیں پایا کہ اس روز میری جگہ کسی اور کو سزا بھگتنی پڑی تھی۔ حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اس دن میں بھی ان بچوں میں شامل تھا جو اس گھنٹی بجانے کی واردات میں ملوث تھے لیکن مجھ سے سوال کرتے وقت ڈوآ پی کی آنکھوں میں ایک ایسا یقین اور میرے اوپر ایک ایسا اعتماد اور بھرم تھا کہ میں ان سے سچ بولنے کی ہمت نہیں کر پایا۔ اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کا بھرم توڑ نہیں پایا۔ یہ میری زندگی میں مجھ پر کسی کا پہلا مان تھا جو میں نے اپنے جھوٹ کے ذریعے قائم رکھا۔ تب سے اب تک میں صرف لوگوں کے بھرم ان کا مان ہی قائم رکھتا آ رہا ہوں۔ سچ یا جھوٹ، غلط یا صحیح بس کسی نہ کسی طور میں لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہی رہا ہوں لیکن میں یہ بات شاید آج تک نہیں سمجھ پایا کہ یہ جھوٹے بھرم جب ٹوٹیں گے تو میری حیثیت میرے اپنوں کے سامنے شاید کاغذ کے پرزے جتنی بھی باقی نہ رہے۔ کاش میں اسی روز ڈوآ پی کا وہ پہلا بھرم سچ بول کر توڑ دیتا۔ کاش میں اسی روز پورا سچ بولنا سکھ جاتا۔

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چاند

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

یوں روتے پیٹتے دن بھر بھوک اور پیاس سے نڈھال اور سارا دن اپنے لیے افطاری کے وقت کے لیے کھانے کی چیزیں جمع کرتے میرا وہ پہلا رمضان بھی بیت گیا جس میں میں نے اپنی زندگی کے پہلے تیس (۳۰) روزے پورے کیے۔ میں ہر دو پہر اپنے آپ سے پکا وعدہ کرتا کہ کل کا روزہ تو کسی صورت نہیں رکھوں گا اور اگر ابانے زبردستی رکھوا بھی دیا تو اسکول جا کر یا پھر بالے اور راجہ کے ساتھ مل کر توڑ دوں گا لیکن ہر صبح، سحری کے وقت امی مجھے کوئی نہ کوئی نیا لالچ دے کر مجھے اپنا روزہ افطار تک ”کھینچنے“ کی ترغیب مہیا کر ہی دیتی تھیں۔ سیٹھ گردھاری مل والے واقعے کے بعد ہم سب بچوں کی ساکھ کالونی میں کافی خراب ہو چکی تھی اور ہمیں کوئی نیا گل کھلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ پچیسویں روزے کے بعد بابا مجھے عمارہ اور بڑے بھائی کو بازار لے جا کر ہمیں نئے جوتے بھی دلوائے۔ کپڑے تو پہلے ہی محلے کے درزی سے سل کر آچکے تھے اور کپڑے خریدنے سے پہلے میں خاص طور پر قو آپی کے گھر جا کر ہمیشہ کی طرح ان سے پوچھ آیا تھا کہ اس بار میں عید پر کون سے رنگ کے کپڑے بنواؤں۔ اس طرح کے معاملوں میں میں ہمیشہ قو آپی کے مشورے کو ہی ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔

رمضان میں دن کے وقت بالے کا بڑا بھائی اٹو گھر سے کم ہی باہر نکلتا تھا کیونکہ بالے کی طرح وہ بھی روزے نہیں رکھتا تھا اور ایک بار محلے کے بزرگوں نے اسے سرعام سگریٹ پینے پہ سخت سنائیں تو وہ ان سے الجھ پڑا۔ جس پر اس کے باپ نے اٹو کا دن میں گھر سے نکلنا کم کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اٹو خود اپنے گھر والوں کے قابو میں بھی نہیں تھا اور یہ بھی اس کی مہربانی ہی تھی کہ وہ اپنے باپ کے کہنے میں آ کر جھوٹے منہ ہی سہی لیکن لوگوں کے سامنے روزے میں سرعام سگریٹ پینے سے باز آ گیا تھا۔ میں جب بالے سے اس کے بڑے بھائی اٹو کے کارنامے سنتا تو میرے دل میں اٹو کا خوف مزید گہرا ہوتا جاتا۔ بالے نے جب مجھے اور راجہ کو یہ بتایا کہ اٹو کے نیٹے میں چوبیس گھنٹے گزاری والا چاقو اڑسا رہتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ وہ کئی مرتبہ جھگڑے کے دوران یہ آٹھ گزاری والا چاقو استعمال بھی کر چکا ہے تو ہم دونوں کی آنکھیں خوف اور اٹو کی مرعوبیت سے پھلتی چلی گئیں۔ میں نے خود ایک آدھ مرتبہ اٹو کو اہنی مکہ (کلپ) اپنے منچے پر چڑھائے اور دیوار پر مکہ بازی کی مشق کرتے دیکھا تھا۔

آخر خدا خدا کر کے تیس (۳۰) روزے بیتے اور چاند رات آ گئی۔ پورے محلے کے بزرگ، جوان اور بچے بڑے میدان میں عید کا چاند دیکھنے کے لیے سرشام ہی جمع ہو گئے تھے اور ہر بزرگ کو کسی الگ ہی ٹہنی کے پیچھے سے عید کا چاند ابھرتا دکھائی دے رہا تھا جو بعد میں باقی سب کچھ ثابت ہو جاتا سوائے چاند کے۔ غور چچا تو اپنے آباؤ اجداد کی پرانی کاربین کی بندوق نما دو رہیں بھی اٹھلائے تھے جس کا شیشہ وقت کی دھول سے اس قدر دھندلا گیا تھا کہ اس سے سامنے بیٹھی چیز بھی بمشکل دکھائی دیتی تھی۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ جب تیس روزے پورے ہو ہی چکے ہیں تو پھر

اس چاند دیکھنے کے جھنجھٹ میں پڑنے کا فائدہ کیا تھا؟ ابھی کل شام ہی تو یہ سارے عید کا چاند دیکھنے جمع ہوئے تھے لیکن بسا کرکوشش کے بعد بھی جب چاند نظر نہیں آیا تو پتہ چلا کہ کل بھی روزہ رکھنا ہوگا۔ یہ سنتے ہی کل شام ہم سب بچوں کے منہ لٹک گئے تھے۔ حالانکہ راجہ نے قسمیں کھا کھا کر سب کو یقین دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ خود اس نے اپنی ”گناہ گار“ آنکھوں سے انصاری صاحب کے چھت کی چپنی کی اوٹ سے جھلکتی، چاند کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی لیکن حسب معمول راجہ کی بات پہ کسی نے یقین نہیں کیا اور آج ہمیں یہ تیسواں روزہ بھی رکھنا پڑا تھا اور جب آج بھی ان بزرگوں کو چاند دکھائی نہیں دے رہا تھا تو ہم سب بچوں کے دلوں میں یہ خوف کہیں جڑ پکڑ رہا تھا کہ کہیں اب کل اکتیسواں (۳۱) روزہ بھی نہ رکھنا پڑ جائے۔ باقی بچوں کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن خود میرے دل سے اس اکتیسویں روزے کا خوف ساری زندگی نہیں نکل پایا۔ میں نے باقی ساری عمر جتنی بھی نیکی کی صرف فرض کی حد تک ہی کی، کبھی مجھے خود اپنے آپ کوئی نیکی کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ جہاں فرض کی حد پوری ہوئی وہیں میں کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کبھی اس حد سے بڑھنے کی چاہ نہیں کی۔ ساری زندگی بس تیس (۳۰) روزوں پر ہی انکار رہا۔ کبھی اکتیسویں (۳۱) روزے کی سیزھی خود سے پار نہیں کر پایا۔ یوں میری جھولی خود میری مرضی کی کی ہوئی نیکی سے سدا خالی ہی رہی۔

آخر خدا خدا کر کے کسی ایک کو نے سے ایک بزرگ کی لرزتی کانپتی سی چیخ ابھری ”وہ رہا..... وہ رہا چاند.....“ ہم سب نے فوراً ان کی شہادت کی ابھی ہوئی انگلی کے تعاقب میں اپنی نظریں دوڑائیں اور پھر کسی نہ کسی طرح سب ہی کی وہ دھات کی پتلی سی تار جیسا پہلی کا چاند نظر آ ہی گیا۔ سب نے گلے مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ چند ہی لمحوں بعد شہر کی میونسپلٹی سے دوور فوجی میدان میں توپیں دانے جانے کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حکومت کی طرف سے بھی باقاعدہ عید کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ہم سب بچوں نے خلوص دل سے اللہ میاں کا شکر ادا کیا کیونکہ اندر سے ہم سب ہی کی جان نکلی ہوئی تھی کہ چاند نظر نہ آیا تو کیا ہوگا؟

یہاں میدان میں سارے ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دے رہے تھے اور میں قوآ پی کو مبارک دینے کے لیے ان کے گھر کی جانب دوڑا جا رہا تھا۔ قوآ پی گھر کے برآمدے میں بیٹھیں سیکنہ خالہ کے ساتھ مہندی گیلی کروا رہی تھیں۔ غیاث چچا فضلو بابا کے ساتھ مل کر چند مزدوروں سے گھر کے خراب شدہ حصوں پر دوبارہ سے قلعی کے چھینے پڑوا رہے تھے۔ وجہ آپنی نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ میں نے انہیں چھت پر چلنے کا اشارہ کیا تاکہ میں انہیں چاند دکھا سکوں۔

عید کا چاند ویسے بھی تو چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے لہذا ہم دونوں تیزی سے صحن کی سیزھیاں چڑھ کر چھت پر جا پہنچے۔ میں نے چاند نکلنے کی جگہ اچھی طرح یاد کر رکھی تھی لہذا مجھے قوآ پی کو اسے ڈھونڈ کر دکھانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ قوآ پی نے چاند دیکھتے ہی جلدی سے سر پہ دوپٹہ درست کیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ پتہ نہیں وہ آنکھیں بند کیے اتنے جذب کے عالم میں کون سی دعا مانگ رہی ہوں گی؟ میں قوآ پی کے چاند چہرے کو دیکھتے ہوئے یہی سوچتا رہا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں اللہ میاں ہوتا تو قوآ پی کی ہر دعا بن مانگے ہی قبول کر لیتا لیکن مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ ”اصلی“ اللہ میاں بھی ان کی ہر دعا سب سے پہلے سنتا ہوگا۔ قوآ پی نے دعا ختم کر کے آنکھیں کھولیں اور مجھے اپنی جانب یوں پٹ پٹ گھورتے دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ”کیا دیکھ رہے ہو آدی.....؟“ قوآ پی میرے بالکل مقابل یوں کھڑی تھیں کہ ان کے چہرے کے پیچھے ہی عید کا وہ باریک

ساچا نہ بھی جھک رہا تھا۔ میں ابھی انہیں کوئی جواب دینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ یکا یک دھواؤ پی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ یوں لگا جیسے چاند کو اچانک ہی پریشانی اور غصے کے بدل نے ڈھانپ لیا ہو۔ میں نے چونک کر ان کی نظروں کے تعاقب میں نیچے میدان کی طرف جھانکا۔ میدان اب تقریباً سنان ہو چکا تھا کیونکہ کچھ دیر پہلے چاند دیکھنے کے لیے جمع ہوا ہجوم اب عید کی تیاریاں کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی جانب چھٹ چکا تھا لہذا میری سیدھی نظر میدان میں تنہا کھڑے اٹو پر جا پڑی جس کا دھواؤ پی کی جانب سلام کرنے والا ہاتھ ابھی تک اس کے ماتھے سے ہٹا نہیں تھا۔ وہ لگاتار اور بناء کسی خوف کے نیچے کھڑا مسلسل جانے کب سے دھواؤ پی کو گھورے جارہا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے جسم کا تمام خون ایک دم ہی میری کن پٹیوں کی جانب بہنا شروع ہو گیا ہو۔ دھواؤ پی نے پریشانی میں جلدی سے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے ہوئے نیچے اتر آئیں۔ راستے میں سیڑھیوں پر انہوں نے مجھے منع کیا کہ میں غیاث چچا کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں کیونکہ غیاث چچا کو یوں تو غصہ کچھ کم ہی آتا تھا لیکن اگر کبھی آجاتا تو پھر پورا محلہ اس سے پناہ مانگتا تھا اور دھواؤ پی نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کی بھی عید بدمزہ ہو۔

لیکن آج میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اسی وقت اگر غیاث چچا کو نہیں تو کم از کم سیکنہ خالہ کو تو اٹو کی وہ بے ہودہ حرکت چپکے سے بتا دیتا تو شاید آگے چل کر وہ سب نہ ہوتا جس نے ہم سب کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔ بہر حال اس وقت میں دھواؤ پی کی وجہ سے چپ ہی رہا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ پہلی بار نہیں تھی جب اٹو نے دھواؤ پی کو تنگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ بلکہ وہ پہلے بھی آتے جاتے کئی بار کالونی میں ان کا راستہ کاٹ چکا تھا۔ بلکہ اب تو اس کی وجہ سے دھواؤ پی نے بلا ضرورت گھر سے باہر قدم نکالنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اٹو ہر لمحے دھواؤ پی کے گھر کے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب غیاث چچا گھر پر نہیں ہوتے تھے اور جیسے ہی دھواؤ پی کو کہیں باہر آتے جاتے دیکھتا فوراً ان سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگتا۔ ویسے تو دھواؤ پی فضلو بابا کے ساتھ ہی گھر سے باہر کہیں آتی جاتی تھیں لیکن فضلو بابا اب اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ انہیں اٹو جیسوں کی آوارہ نظری خبر بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ بے چارے تو اپنی لائمی ٹیکتے آگے آگے چلے جاتے اور دھواؤ پی نظریں جھکائے ان کے پیچھے پیچھے، لیکن اٹو کی مجال کی حد تو دیکھئے کہ وہ ایک آدھ بار موقع پا کر فضلو بابا کی موجودگی میں بھی ان کے اور دھواؤ پی کی راہ کے درمیان آکھڑا ہوا اور دھواؤ پی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچیں۔ آگے چلے فضلو بابا کو اس لمحے کے ہزارویں حصے میں ہوئی واردات کی خبر تک نہ ہوئی۔

پھر تو اٹو نے اپنا وطیرہ ہی بنالیا کہ جب بھی دھواؤ پی کہیں بھی نظر آتیں وہ ان کے پیچھے ہی پڑ جاتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے راستے میں انہیں رقعہ دینے کی بھی کوشش کی جو ہمیشہ گھبرا کر تیز تیز چلتی ہوئی دھواؤ پی کے قدموں میں ہی پڑا رہ گیا۔ ان سب باتوں سے تنگ آکر دھواؤ پی نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تبھی وہ اتنے دنوں سے ہمارے گھر بھی نہیں آئیں تھیں اور جب استانی خالہ نے ستائیسویں رمضان کو اپنے گھر میں ختم قرآن پر پورے محلے کو دعوت دی تھی تب بھی صرف سیکنہ خالہ ہی تنہا وہاں آئیں تھیں۔ اب مجھے دھیرے دھیرے ہر بات کی سمجھ آنے لگی تھی لیکن پھر بھی انہیں دن میں دو مرتبہ کالج آنے اور جانے کے وقت تو محلے کے میدان سے گزرنی پڑتا تھا جہاں وہ لفنگا اٹو ان کی راہ میں ہمیشہ کانٹا بنے کھڑا ملتا۔ کالج جاتے ہوئے تو پھر بھی فضلو بابا ان کے ساتھ گیٹ تک جاتے تھے لیکن واپسی پر تو وہ محلے کے چھوٹے ٹھکانک پرتا لنگے سے اترنے کے بعد اپنے گھر تک انہیں تنہا ہی یہ پل صراط پار کرنا ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دھواؤ پی پڑھائی کے لیے اتنی دیوانی نہ ہوتیں تو وہ اس کم بخت اٹو کے ہاتھوں بے زار ہو کر کب

کی پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ گئیں ہوتیں۔ اوپر سے وہ خواب جو غیاث پچانے ان کے مستقبل کے بارے میں ان کے بچپن سے ہی دیکھ رکھے تھے؟ ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے بھی تو قوۃِ آپنی کو اس کڑوے زہر کا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔ جانے وہ معصوم اور نازک سی لڑکی کب سے یہ اذیت سہہ رہی تھی اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا بھی نہیں تھا۔ غصے میں میرا ترن من کھول اٹھا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر اٹکوں کے نیپے میں اڑسا چاقو نکال کر خود اسی کے پیٹ میں گھونپ دوں۔ یوں چاند رات کو میرا موڈ بہت خراب تھا۔ میں نے دیگر بچوں کے ساتھ مل کر رات کو آتش بازی میں بھی حصہ نہیں لیا۔ حالانکہ راجہ میرے لیے بھی بہت سی شرشریاں اور انار والے پٹاخے لے کر آیا تھا لیکن میں نے سبھی عمارہ کو دے دیئے۔ امی عید کی رات ہی شیر خرما اور کھیر تیار کر دیتی تھیں اور میں باورچی خانے میں رات کو دیر تک اور پھر صبح تازہ پوریاں تلنے وقت ان کی مدد کیا کرتا تھا حالانکہ عمارہ اس بات سے بے حد چڑتی بھی تھی کہ امی مجھے اس سے زیادہ دیر تک چولھے کے پاس کیوں بیٹھنے دیتی تھیں اور میں اس سے زیادہ خشک میوہ چھیل کرا می کو کیوں دیتا تھا جسے امی کھیر اور شیر خرما کے اوپر پروتی جاتیں تھیں، لیکن اس رات میرا دل اپنے اس محبوب مشغلے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اٹکوں کا مکروہ چہرہ اور اس کا ماتھے تک اٹھا ہوا ہاتھ آ جاتا تھا۔

چاند رات کو یہی ماجرا مجھے خواب میں بھی نظر آتا رہا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وجوۃِ آپنی اور میں کہیں جا رہے ہیں کہ اچانک اٹکوں کہیں سے ہمارے سامنے آ جاتا ہے اور قوۃِ آپنی کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میں اٹکوں کا ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیتا ہوں کہ وہ دور جا گرتا ہے اور اس کا چاقو بھی میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ ابھی میں چاقو کی چار گراریاں ہی کھول پایا ہوتا ہوں کہ اٹکوں ڈر کر بھاگ جاتا ہے اور قوۃِ آپنی خوشی کے مارے حسبِ عادت میرے گال زور سے کھینچ کر مجھے خوب پیار کرتی ہیں۔

اگلی صبح عید کی نماز پڑھ کر حسبِ معمول ابا مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا کو لے کر دادی اماں اور نانی اماں کے گھر سلام کے لیے لے گئے۔ دادی اور نانی اماں ہمیشہ مجھے، عمارہ اور بڑے بھیا سے زیادہ عیدی دیا کرتی تھیں۔ دادی اماں کے کمرے میں دیوار کے اندر بنی دو بڑی بڑی کھڑکی نما الماریاں بھی تھیں جن کے اندر دادی اماں اپنی جوانی کے برتن اب تک سنبھال کر رکھتی تھیں۔ انہی سبز رنگ سے پینٹ شدہ الماریوں کے کچھ برتنوں میں وہ ہمیشہ میرے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ چھپا کر رکھتی تھیں جو ایسے کسی موقع پر سب سے چھپ کر میرے حوالے کر دیتیں۔ ہم سب خاندان کے بچوں کی عید ہمیشہ دادی اماں کے صحن میں کھیلتے ہی گزرتی تھی۔ میری چچا زادوں میں عالیہ بھی تھی جو تھی تو بہت خیرلی لیکن جانے کیوں وہی مجھے سب کزنز میں سب سے زیادہ اچھی بھی لگتی تھی۔ ہم دونوں میں ہمیشہ اس بات کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا کہ دادی اماں ہم دونوں میں سے سب سے زیادہ پیار کس سے کرتی ہیں۔ کھیل کے دوران بھی میں ہمیشہ اسی کو اپنی ساتھی بنایا کرتا تھا۔ اس عید کے روز بھی حسبِ معمول عابد، ساجد، روبی، فوزیہ اور باقی سبھی چچا زاد دادی کے صحن میں اچھل کود میں مصروف تھے اور دادی اور نانی اماں اندر کمرے میں مل کر عید کا دسترخوان سجاتی تھیں کیونکہ عید کے روز ہمارا پورا خاندان ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ عالیہ نے مجھے یوں گم سم بیٹھے دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آئی وہ سمجھی میرے پاس عیدی کم جمع ہوئی ہے اس لیے میں اداس بیٹھا ہوں۔ میں نے اسے وجوۃِ آپنی کی پریشانی کے بارے میں بتایا کہ انہیں کوئی غنڈہ تنگ کرتا ہے جس کے پاس گراری والا چاقو بھی ہے۔ وہ وجوۃِ آپنی کے بارے میں پہلے ہی سے جانتی تھی کیونکہ جب وہ ہمارے گھر آتی تھی تو کئی بار اس کی وجوۃِ آپنی سے ملاقات ہوئی تھی بلکہ وجوۃِ آپنی نے کئی بار اس

کی گڑیا کے لیے کپڑے اور گندے کے لیے گھر بھی بنا کر دیا تھا۔ میری سبھی بچا زادوں میں وہی وجوہ آپنی کی بھی پسندیدہ تھی۔ عالیہ میری بات سن کر گہری سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے یوں چٹکی بجائی جیسے مسئلہ کا حل اسے سمجھ آ گیا ہو۔ وہ بھاگ کر دادی کے کمرے میں گئی اور کچھ ہی دیر میں واپس آئی تو ہاتھ میں ایک تعویذ تھامے ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کی گلی میں ایک بہت ”بچی ہوئی بزرگی“ آئیں تھیں جنہوں نے اسے یہ تعویذ دو روپے میں دیا تھا۔ اس تعویذ کی خاصیت یہ تھی کہ جس کسی نے اسے گلے میں پہن رکھا ہوتا تھا اس پر کسی قسم کا ”لوہا“ اثر نہیں کرتا تھا اور چاقو بھی ظاہر ہے لوہے سے ہی بنا ہوتا ہے لہذا اگر وجوہ آپنی اس تعویذ کو گلے میں ڈالے رکھتیں تو ان پر انگو کا چاقو کبھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ شام کو واپس کالونی پہنچ کر رکشے سے اترتے ہی میں امی کے ساتھ گھر جانے کی بجائے وجوہ آپنی کے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر ہی اپنی عید ملنے کے لیے آنے والی سہیلیوں کو رخصت کرتی مل گئیں اور مجھے اس دن ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ لڑکیاں کبھی آرام سے کمرے میں بیٹھ کر اتنی دیر بات نہیں کر سکتیں جتنی دیر وہ دروازے پر رخصت ہوتے وقت پڑ پڑ بولتی رہتی ہیں۔ خدا خدا کر کے ایک وجوہ آپنی کے گلے لگتی کہ نکلے وقت دوسری کو کوئی بات یاد آ جاتی۔ دوسری کی رام کہانی ختم ہوتی تو تیسری کو مڑتے مڑتے کوئی چٹکے یاد آ جاتا۔ میں بے چینی سے ان کے صحن میں ٹھہرا ہوا اور پورے آدھے گھنٹے بعد ان کی وہ تینوں سہیلیاں ”وقت کی کمی“ کا رونا روتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

وجوہ آپنی میری جانب پلٹیں تو میں نے ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تعویذ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ارے..... یہ تعویذ کیسا ہے آدی..... اور تم صبح سے کہاں غائب ہو۔ میں نے تمہاری پسند کی میٹھی پوریاں اور سوئیاں بنا کر رکھی ہیں۔ چلو جلدی سے اندر چلو۔“

میں نے سمجھنا کر کہا۔ ”وجوہ آپنی..... پہلے یہ تعویذ تو گلے میں ڈالیں..... میں اتنی دور سے آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔“

وجوہ آپنی میری بے تابی پہ ہنس دیں۔ ”اچھا بابا..... یہ لو..... پہن لیا..... اب ٹھیک ہے..... اب تو بتا دو یہ تعویذ کس لیے پہنایا ہے مجھے؟“ میں نے عالیہ کے دیئے ہوئے تعویذ کو وجوہ آپنی کے گلے میں پڑے دیکھ کر ایک عجیب سا اطمینان اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ پھر جب میں نے وجوہ آپنی کو اس تعویذ کی تاثیر بتائی تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ انہوں نے پیار سے میرے بال سنوارے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے لیے اتنا فکر مند نہ ہوا کروں کیونکہ جس لڑکی کا مجھ جیسا پیارا اور خیال رکھنے والا دوست موجود ہو اسے دنیا کا کوئی بھی غنڈہ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ بہر حال میں نے پور یوں اور سو یوں کا ایک نوالہ بھی اس وقت منہ میں نہیں رکھا جب تک وجوہ آپنی نے مجھ سے ”پکا والا“ وعدہ نہیں کر لیا کہ وہ اس تعویذ کو اپنے گلے سے تب تک جدا نہیں کریں گی جب تک اس کم بخت انگو کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہو جاتا۔

اس وقت میں کتنا معصوم تھا کہ اتنی سی بات بھی نہیں جانتا تھا کہ بے رحم تقدیر کے لکھے ایسے تعویذوں سے نہیں مٹا کرتے ورنہ دنیا کا ہر شخص اپنے گلے میں ایسے سینکڑوں تعویذ ڈالے پھر تا دکھائی دیتا لیکن یہ بے خبری بھی کتنی بڑی نعمت دی ہے خدا نے اپنے بندوں کو۔ ہمیں آخری لمحے تک یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہمارے مقدر کا کون سا وار اگلے ہی لمحے ہماری زندگیاں تلپٹ کرنے والا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اس وقت مجھے اور وجوہ آپنی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ تقدیر ہماری قسمت کی سختی پر کون سی سیاہی پھیرنے والی ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا جوا

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

عید گزر گئی۔ ابانہ جانے کہاں سے کسی بورڈنگ اسکول کے فارم لے آئے تھے اور سارا دن انہیں پڑھتے رہتے اور اپنے رجسٹر میں کچھ نوٹ کرتے رہتے۔ شاید ان کا ارادہ بڑے بھیا کو بورڈنگ اسکول میں بھجوانے کا تھا۔ ہماری پانچویں کے سالانہ امتحانات کی چھٹیاں ختم ہوئیں اور میں اور راجہ چھٹی جماعت میں ہائی اسکول پہنچ گئے۔ یہ اسکول ہمارے پرانے پرائمری اسکول سے بہت بڑا تھا اور اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس اسکول میں بچوں کے بیٹھنے کے لیے ڈیسک بھی تھے اور اس کی چھت بھی نہیں ٹپکتی تھی اور اس کے تختہ سیاہ (بلیک بورڈ) بھی پکی دیواروں میں نصب تھے، ورنہ ہمارے پچھلے پرائمری اسکول میں تو ہر کلاس میں بلیک بورڈ دو بانسوں کے اسٹینڈ پر کھڑے رہتے اور جماعت کی جگہ اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کبھی باہر صحن میں، کبھی شہوت کے پیڑ کے نیچے اور کبھی برآمدے میں پڑے ملتے تھے۔ سردیوں کی چھٹیوں میں ابانہ مجھے انگریزی کا پہلا قاعدہ بھی دلوایا تھا جس میں میں اے فار ایپل اور بی فار بیٹ پڑھتا رہتا تھا۔ چھٹی جماعت سے ہمیں یہ انگریزی کا قاعدہ بھی شروع کرنا تھا جبکہ راجہ نے تو ابھی سے ”انگلش“ بولنے کی مشق بھی شروع کر دی تھی۔ بالا بھی ”کسی نہ کسی طرح“ چھٹی جماعت میں پہنچ گیا تھا اور ہم تینوں کی جماعت بھی ایک ہی تھی یعنی ششم الف (6th A) جبکہ گڈو، بھنوا اور پو ششم ب اور ج (B & C) میں تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم سب بچے ڈیسک پر بیٹھ کر خود کو کافی باعزت محسوس کرنے لگے تھے حالانکہ سب جماعتوں میں ڈیسکوں کی کمی کے باعث دو ڈیسک جوڑ کر تین تین بچوں کی ٹولیاں بٹھائی گئی تھیں لیکن ہمارے لیے یہ بھی کم غنیمت نہ تھا۔ کم از کم بخ ٹھنڈی یا گرم تپتی زمین پر بیٹھنے سے تو بدرجہا بہتر تھا۔ میں بالا اور راجہ ایک ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ راجہ سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی طرف بیٹھتا تھا لہذا اس کی نظریں سارا دن باہر سڑک پر رہتی تھیں اور وہ ہمیں رواں کنسٹری کے ذریعے باہر کی خبریں سناتا رہتا تھا۔ بالا درمیان میں بیٹھتا تھا بلکہ ڈیسک کے درمیان میں سر رکھ کر سوتا تھا کیونکہ اس کا محبوب مشغلہ کلاس میں سونا ہی تو تھا۔ میری ڈیوٹی یہ تھی کہ ٹیچر کے آتے ہی اسے کہنی مار کر جگا دیتا۔ بالا چند لمحوں تک آنکھیں کھلی رکھنے کی سرواڑ کوشش کرتا اور پھر کتاب نکالتے ہی کچھ ہی دیر میں اس کا سر دوبارہ آہستہ آہستہ رکوع میں جھکتا چلا جاتا۔ میں اپنی کتاب کے ساتھ ساتھ اس کے صفحے بھی پلٹتا جاتا اور جیسے ہی اس کی سبق پڑھنے کی باری آتی میں اس خاص سطر پر انگلی رکھ کر فوراً اسے جگا دیتا اور بالائی تیزی سے بناؤ کے وہیں سے پڑھائی جاری رکھتا جہاں سے پچھلے بچے نے چھوڑی ہوتی۔ مجھے بالے کی اس مہارت پر ہمیشہ رشک آتا تھا کیونکہ جیسے ہی بالاسبق ختم کرتا فوراً بیٹھ کر نیند کا سلسلہ بھی دوبارہ وہیں سے جوڑ دیتا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میں نے بالے سے اس کے بڑے بھائی اٹو کی اس چاند رات والی حرکت کا ذکر بھی کیا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ خود بالا بھی اس

معاملے میں کچھ بھی کرنے سے معذور ہے کیونکہ اس کی اپنی جان اٹکو کے ڈر سے نکلتی تھی۔ البتہ اس نے مجھ سے یہ وعدہ ضرور کیا تھا کہ وہ موقع ملے ہی اٹکو کا گراری دار چاقو کہیں غائب کر دے گا۔ قہراً ہی اس شام کے بعد مزید محتاط ہو گئی تھیں اور انہوں نے چھت پر جانا بھی ختم کر دیا تھا۔ طاہر بھائی اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب ان کی پڑھائی اتنی نکٹھن ہو گئی تھی کہ انہیں قہراً اپنی کو پڑھانے یا ان کی مدد کرنے کا وقت بھی ذرا کم ہی ملتا تھا۔ البتہ اس بات سے خود قہراً پی کچھ الجھی الجھی سی رہتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے کسی کتاب پر سرخ پنسل سے نشان لگا کر مجھے بھی طاہر بھائی کے ہاں بھیجا کہ ان سے کہوں کہ ذرا ان سطروں کا مطلب سمجھا دیں یا تشریح لکھ دیں لیکن میں یونہی باہر سے ایک چکر لگا کر واپس آ گیا کہ طاہر بھائی تو جانے کن موٹی موٹی کتابوں میں سرکھپائے بیٹھے ہیں اور میری طرف تو دیکھتے بھی نہیں۔ یہ سنتے ہی قہراً پی کے گلاب چہرے کا رنگ کچھ بدل سا جاتا اور ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی آ جاتی جسے اس وقت صرف میں ہی محسوس کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے خود پر ہی بے حد غصہ آ جاتا کہ آخر میں نے ان سے جھوٹ کیوں بولا..... کیا تھا اگر میں واقعی طاہر بھائی کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ کر ان سے دو لائسنوں کی تشریح لکھوا ہی لاتا لیکن اسی لمحے میرا ذہن میرے دل کو زوردار جھاڑ پلاتا کہ ”زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں ہے، بھول گئے وہ دن جب اسی طاہر بھائی کی وجہ سے تم اپنا کارڈ قہراً پی تک نہیں پہنچا پائے تھے۔ خبردار..... ان دونوں کے دور رہنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔“

لیکن اگر ایسے فیصلے ہمارے ذہن یا دل کی مرضی کے تابع ہوتے تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ابھی میرے چند دن ہی سکون سے گزرے ہوتے کہ پھر ان دونوں کا کہیں نہ کہیں نگر او ہو ہی جاتا اور پھر سے چند گلے شکوؤں کے بعد وہ دونوں ہنس کر کبھی رنجشیں بھلا دیتے اور میں پھر سے کانٹوں پر لوٹنے لگ جاتا۔

اس دن بھی ایسا ہی کچھ واقعہ ہوا۔ ہم بچے بڑے میدان میں جمع تھے۔ راجہ ہمیں پتے کھیلنا سکھا رہا تھا۔ یہ تاش کے پتوں والا کھیل نہیں تھا بلکہ اس کھیل میں سگریٹ کی خالی ڈبیاں پتوں کا کام دیتی تھیں۔ ہر سگریٹ کے برانڈ کا ایک مختلف نمبر ہوتا تھا مثلاً کے۔ ٹو سگریٹ کا پتہ ایک نمبر کا تھا۔ ”بگلا مارکہ“ سگریٹ دو نمبر کا تھا۔ ”ولز اور ریڈ اینڈ وائٹ“ پانچ نمبر کے پتے تھے۔ ”کیپٹن“ کے دس نمبر تھے۔ اسی طرح پچاس نمبر والی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ ”ایمپسی“ کے سو نمبر تھے اور ”کیمل“ کے پانچ سو۔

یہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں ان دنوں ہمارے لیے جیسے باقاعدہ کرنسی کی حیثیت ہی تو رکھتی تھیں۔ ہم سارا دن اپنے محلے اور اس کے آس پاس سے یہ پتے جمع کر کے اپنے ذخیرے میں اضافہ کرتے رہتے۔ جس بچے کے پاس جتنے زیادہ اور بڑے پتے ہوتے وہ اتنا ہی امیر کہلاتا۔ ہم بچے بڑے لوگوں کی طرح ان پتوں کو کرنسی نوٹوں کی طرح بھناتے بھی تھے مثلاً راجہ سو نمبر کی ایمپسی سگریٹ کی ڈبیاں بالے کی طرف پھینکتا اور کہتا ”بالے یار میں ذرا جلدی میں ہوں۔ داؤ لگا ہوا ہے، ذرا لپک کے کسی سے کیپٹن کی دس پیتاں پکڑ لا۔“ بالافورا ”مارکیٹ“ سے سو کا پتہ بھناتا۔ غریب قسم کے بچے ہاتھوں میں کے ٹو اور بگلا سگریٹ کی ڈبیوں کی ”ریز گاری“ لیے ادھر ادھر چھوٹے داؤ لگاتے نظر آتے اور اگر خوش قسمتی سے کسی بچے کے ہاتھ پانچ سو والی کیمل کی پتی یا ایک ہزاری والی ڈائمنڈ سگریٹ کی ڈبیاں لگ جاتی تو وہ تو گویا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی تو ان پتیوں کی ”بازار“ میں ایسی قلت پڑ جاتی کہ پانچ سو یا ہزاری پتی رکھنے والے ریز گاری کے لیے ہی ترس جاتے اور انہیں مجبوراً کھلے بازار میں اپنا بڑا پتہ اونے پونے بیچنا پڑتا۔ ان دنوں ہم سب بچوں کی

جیسیں سگریٹ کی ایسی درجنوں خالی ڈبیوں سے بھری رہتی تھیں اور کچھ بچوں نے تو بڑوں کی دیکھا دیکھی یہ پتے پھینٹنا بھی سیکھ لیے تھے۔ وہ بڑی مہارت سے گلی میں آتے جاتے یا بڑے میدان سے گزرتے ہوئے ان پتوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کا کرتب دکھاتے جاتے۔

کھیل کا طریقہ یہ تھا کہ سب بچے دو یا تین کی ٹولیوں میں بیٹھ جاتے اور ایک بچہ اپنی جیب سے پانچ یا دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اسے ہوا میں اچھالتا اور زمین پر گر کرنے سے پہلے ہی اپنی ہتھیلی میں دبوج کر اسے یوں زمین پر رکھتا کہ باقی کسی کی نظر سکے کے اس رخ پر نہ پڑ سکے جو ہتھیلی کے نیچے لیکن اوپر کی جانب ہوتا تھا۔ اب باقی بچوں میں سے کوئی ایک اپنی پتوں کی رقم مثلاً بیسی، پچاسی یا کوئی چھوٹا پتہ اٹھا کر دوسرے بچے کے اس ہاتھ کی پشت پر رکھ کر داؤ لگاتا جس کے نیچے سکہ چھپا ہوتا تھا۔ داؤ لگانے والا بچہ دوسرے بچے کو اس کی ہتھیلی کے نیچے چھپے سکے کا رخ بتاتا مثلاً چاند تارہ یا مینار پاکستان، مسجد یا اکا مہندسہ (Head or Tails) اور اگر نیچے چھپے سکے کا رخ وہی ہوتا جو پتے لگانے والے بچے نے بتایا ہوتا تو سکہ چھپانے والے بچے کو تائی ہی مالیت کے پتے داؤ لگانے والے بچے کو دینے پڑتے تھے اور اگر بوجھنے والا سکے کا رخ غلط بوجھتا تو اس کے لگائے ہوئے پتے سکہ چھپانے والے بچے کے ہوجاتے۔

محلے کے بڑے میدان میں ہمارا پتوں کا کھیل جاری تھا۔ راجہ اس دن کافی ”رقم“ ہار چکا تھا اور اب تقریباً فلاح ہونے کے بعد اس نے مجھے اپنے پتے نکالنے کا اشارہ بھی کر دیا تھا لیکن ہم سب اس بات سے بے خبر تھے کہ کافی دیر سے کچھ فاصلے پر اٹو اور اس کے چند دوست جن کا حلیہ بالکل فلمی بد معاشوں کی طرح تھا ہمارے کھیل کو وہیں سے کھڑے کھڑے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اٹو اور اس کے دونوں دوست آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارے سروں پہ کب آ کھڑے ہوئے اس کی ہمیں خبر ہی نہ ہوئی اور ہم سب تب اچھلے جب اٹو کی کرخت آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

”ابے داؤ لگانا تو سیکھ گیا ہے اب اگلے کی آنکھیں پڑھنا بھی سیکھ لے۔ اگلے کی آنکھوں میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ نیچے چاند تارہ چھپا ہے یا مینار پاکستان۔“ ہم سبھی کا تو جیسے سارے جسم کا خون ہی سوکھ گیا ہو۔ ہمارے منہ سے آواز تک نہیں نکل پائی۔ اٹو نے گڈو کے ہاتھ سے سکہ لے کر ہوا میں اچھالا اور پھر ہتھیلی میں دبوج کر اپنی دوسری ہتھیلی کی پشت پر جما کر چھپا دیا اور پھر اپنے دوست سے پوچھا۔

”کیوں بے سینڈو..... بتا کیا ہے..... چاند یا مینار.....؟“

سینڈو نے اپنے دانتوں کی نمائش کی اور جیب سے دو روپے کا نوٹ نکال کر اٹو کی ہتھیلی کی پشت پر رکھا اور بولی لگائی۔

”چاند ہے..... خدا قسم۔“

اٹو نے ہتھیلی اٹھائی..... نیچے سے سکہ مینار کے رخ پر پڑ ملا۔ اٹو نے ایک قبچہہ لگایا اور دو روپے اپنی جیب میں ڈال لیے پھر اس نے دوسری بار سکہ ہوا میں اچھالا اور دوبارہ چھپا کر اپنے دوسرے دوست سے پوچھا۔

”چل بھی سلطانے..... اب تیری باری ہے..... چاند یا مینار.....“

سلطانے نے کچھ وقت لیا اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اٹو کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

”سلطانے نے بھی کچی گوئی نہیں کھیلی..... مینار ہے..... چل ہاتھ کھول۔“

اُٹو نے ہتھیلی ہٹائی تو نیچے سے چاند جھلک رہا تھا۔ اُٹو نے پھر زوردار قہقہہ لگایا اور پانچ کانوٹ سلطانے کی انگلیوں سے اچک لیا۔ سلطانہ غصے میں بڑبڑایا.....

”دھت تیرے کی..... پر لگتا ہے تو نے یاروں کے ساتھ کوئی گیم کی ہے اُٹو جانی۔“ اُٹو نے سکھ دو بارہ گدو کی طرف اچھال دیا۔

”نہیں میری جان..... کوئی گیم نہیں کھیلی میں نے..... صرف تھوڑا سا دماغ چلایا ہے اپنا اور بس..... یہ سارا بھیجے گا ہی تو کھیل ہے۔“

پھر اُٹو نے راجہ سے کہا کہ وہ سکھ ہوا میں اچھال کر زمین پر اپنی ہتھیلی کے نیچے چھپا لے۔ راجہ نے ایسا ہی کیا۔ اب ان تین دوستوں نے راجہ کے ہاتھ کے نیچے چھپے سکے پر داؤ لگانا شروع کر دیا۔ کبھی اُٹو جیت جاتا اور کبھی اس کے دوست۔ ہم سب بچے دم سادھے لیکن دل چسپی سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے اور ہم سب میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہم سب ان جانے میں اُٹو اور اس کے دوستوں کے ساتھ اس جوے میں شریک ہو چکے ہیں کیونکہ وہ لوگ رقم بھی ہمارے ہاتھ میں دے کر بولی دیتے۔ اُٹو پانچ کانوٹ میرے ہاتھ میں دے کر کہتا ”چل بھئی مٹے..... لگا دے یہ پنجی چاند تارے پر۔“

وہاں سے اک کا دوست نھو کے ہاتھ پر پیسے رکھتا۔

”جانی..... تو بھی دل بڑا کر کے چپکا دے مینارے پر۔“

یہ میری زندگی کا پہلا جوا تھا جو اس روز میں نے انجانے میں کھیلنا تھا۔ اس کے بعد بھی میں نے زندگی میں کئی جوئے کھیلے اور ہمیشہ مات ہی میرے مقدور کا حصہ بنی۔ میں شاید پیدا ہی ہارنے کے لیے ہوا تھا لہذا زندگی کا ہر جواب ہارنا ہی چلا آیا لیکن شاید سب سے بڑی مات ابھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہم اپنے کھیل میں مشغول تھے کہ اچانک سینڈو نے اُٹو کو کہنی مار کر کہا۔

”اوئے اُٹو..... تیری تانگے والی.....“

سلطانے نے بھی ٹھنڈی سی آہ بھری۔

”قسم شاہ جی کے مزار کی..... یہ تو پٹا خد ہے پٹا خد..... پوری کی پوری نفو ہے۔ اپنا تو دل آ گیا ہے اس پر.....“

ہم بچوں نے بھی چونک کر آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ و جو آپنی اپنے تانگے سے محلے کے پھاٹک پر اتر کر پیدل گھر کی جانب سر جھکائے روانہ تھیں۔ اُٹو اور اس کے دوست ہم بچوں کو وہیں بیٹھا چھوڑ کر اس بیچ رستے میں کھڑے ہو گئے جہاں سے و جو آپنی نے گزرنا تھا۔ و جو آپنی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتیں سر جھکائے بے خبر چلی آ رہی تھیں۔ سینڈو نے انگلی منہ میں ڈال کر ایک زوردار سیٹی بجائی۔ و جو آپنی نے بے خبری میں سر اٹھایا اور ان تینوں کو اپنی راہ میں یوں قدم گاڑے کھڑے دیکھ کر خود ان کے قدم ڈگر گئے۔ وہ شاید اپنے کالج سے واپس لوٹ رہی تھیں کیونکہ ان کے کاندھے پر ان کا بیگ ابھی تک لٹکا ہوا تھا۔ کبھی کبھار جب ان کا پریکٹیکل ہوتا تھا تو وہ یونہی کالج سے دیر سے لوٹی تھیں۔

میں نے گہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ میدان دور در تک سنان تھا اور کوئی بڑا بوڑھا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ و جو آپنی نے کئی کاٹ کر نکل جانا چاہا لیکن اُٹو قدم بڑھا کر ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور سر راتے لہجے میں بولا۔

”دو گھڑی کبھی ہماری طرف بھی دیکھ لیا کرو سرکار..... ہم میں کیا کائنات جڑے ہیں.....؟ ساری مہربانیاں کیا اس اکیلے پڑھا کوڈا کٹر کے لیے ہیں۔“

غالباً اٹکو طاہر بھائی کا طعنہ دے رہا تھا۔ سینڈ اور سلطانہ زور سے ہنسے۔ وہ دونوں دزدیدہ نظروں سے ڈھو آپی کے سراپے کو سر سے پیر تک مسلسل گھورے جارہے تھے۔ غصے سے میری کنپٹیوں کی رگیں ابھر آئیں اور میں نے انجانے میں اپنی مٹھیاں زور سے بھینچ لیں۔ ڈھو آپی نے دھیرے سے لیکن شدید غصے اور نفرت بھری آواز میں کہا۔

”راستہ چھوڑو میرا.....“

سلطانہ نے دانت نکالے۔

”ارے استاد..... خدا قسم..... یہ تو بولتی بھی ہے..... قربان جاؤں۔“

اب میری برداشت کی حد جواب دے چکی تھی، میں بھول چکا تھا کہ میں ایک کم زور سا بچہ ہوں اور ڈھو آپی کے سامنے تین ہٹے کئے جوان مشتمل سید تانے کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک کے نیپے میں چاقو بھی ہے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے گڈو کو زور سے دھکا دیا اور بے تحاشہ ان تینوں کی جانب سر پٹ بھاگا۔ میرا ارادہ تھا کہ پوری قوت سے بھاگتے ہوئے جا کر اٹکو کے پیٹ میں اپنے سر سے ٹکرا دوں گا۔ میری ٹکڑ سے وہ اپنی جگہ سے وہ کم از کم ایک پل کے لیے ہی سہی پرل تو جائے گا اور اتنی دیر ڈھو آپی کے لیے وہاں سے آگے نکل جانے کے لیے بہت ہوگی پھر آگے جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ راجہ میرا ارادہ بھانپ کر زور سے چلایا۔ ”رک جا آدی۔“

لیکن وہ جانتا تھا کہ میں اب رکنے والا نہیں ہوں لہذا وہ بھی پتے پھینک کر میرے پیچھے دوڑا۔ وہ کبھی بھی مجھے خطرے میں دیکھ کر پیچھے کھڑا نہیں رہ سکتا تھا چاہے انجام کچھ بھی ہو۔ راجہ کو میرے پیچھے بھاگتے دیکھ کر گڈو، ننھو اور پوپو بھی خود کو روک نہیں پائے اور سبھی شور مچاتے راجہ کے پیچھے بھاگے لیکن میں ان سب سے کافی آگے تھا، میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کو بے قرار تھے، ان غنڈوں کی یہ مجال کہ وہ میری دُجو آپی کا راستہ روکیں؟ میری رفتار تیز ہو گئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں، پیچھے سے مجھے راجہ اور باقی دوستوں کے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے اپنی مضبوط بانہوں میں پکڑ کر ہوا میں معلق کر دیا ہو۔ میں خلا میں معلق اپنی ٹانگیں ہی چلاتا رہ گیا اور کسی نے چند لمحوں کے بعد مجھے واپس زمین پر رکھ دیا۔ میرے پیچھے بھاگنے والے راجہ اینڈ کمپنی کا شور بھی یک دم ہی بند ہو گیا۔ میں نے جلدی سے حیرت کے مارے آنکھیں کھول دیں۔ اٹکو اب بھی وہیں اپنی جگہ اپنے دوستوں سمیت کھڑا تھا اور دُجو آپی بھی اپنی جگہ موجود تھیں۔ میں فوراً پلٹا اور طاہر بھائی کو اپنے پیچھے چٹان کی طرح سیدھا ایستادہ پایا۔ طاہر بھائی نے ہی مجھے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے پکڑ کر اٹھالیا تھا۔ کچھ فاصلے پر میرے باقی دوست بھی اس طرح رک گئے تھے جیسے ہم ”برف پانی“ کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو مچھو کر ”برف“ کہہ کر جمادیتے تھے۔ لگتا تھا طاہر بھائی نے ان سب کو بھی مچھو کر برف کہہ دیا ہے۔

چند لمحوں کے بعد طاہر بھائی اور اٹکو گینگ ایک دوسرے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توتا رہا۔ اتنے میں ڈھو آپی کے گھر کی جانب سے فضلہ بابا اپنی لالچی میٹے اور کھانتے ہوئے آئے نظر آئے اور ڈھو آپی کو دور سے ہی دیکھ کر چلائے۔

”ارے ڈھو بی..... اتنی دیر کہاں لگا دی..... چھوٹی دلہن آپ کے لیے پریشان ہوئی جاتی ہیں۔“

دو آپ جلدی سے آگے بڑھ گئیں۔ فضلو بابا پورا ماجرہ سمجھ ہی نہیں پائے اور ان کو لیے آگے چل پڑے۔ اٹو گینگ نے اپنے دانت پیسے اور طاہر بھائی کے جانب بڑھ کر ان کے آمنے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مجھے طاہر بھائی نے پہلے ہی میرا بازو پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر دیا تھا۔ اٹو نے طاہر بھائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”تو اپنی حکمت چلانے کی سوچ بابو..... اٹو کے ساتھ ماتھا بھڑائے گا تو ساری ڈاکٹری بھلا دوں گا۔“
طاہر بھائی نے سکون سے جواب دیا۔

”تم اس محلے میں نئے آئے ہو اس لیے شاید یہاں کے ریت رواج سے واقف نہیں ہو۔ آئندہ اس محلے کی کسی لڑکی کا راستہ کاٹنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ.....“

سینڈو نے طاہر بھائی کی بات آدھے میں ہی کاٹ دی اور آگے بڑھ کر ان کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا اور جھککادے کر بولا۔
”ورنہ..... ورنہ کیا اوئے..... دھمکی دیتا ہے ہم کو۔“

طاہر بھائی نے اس کا ہاتھ ایک جھٹکے سے علیحدہ کیا اور گریبان جھٹک کر بولے۔

”ورنہ بہت برا ہو گا۔“

وہ تینوں شدید طیش میں آچکے تھے اور قریب تھا کہ تینوں ہی طاہر بھائی سے بھڑ جائیں کہ اتنے میں غیاث چچا اور محلے کے چند اور بزرگ عصر کی نماز کے لیے مسجد جانے کے لیے گلی سے میدان کی جانب نکل آئے اور انہوں نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ سب جلدی سے ہماری جانب بڑھ آئے اور غیاث چچا نے وہیں سے آواز بھی لگا دی۔

”کیا بات ہے طاہر میاں..... سب خیر تو ہے نا.....؟“

اٹو اور اس کے ساتھ محلے کے بڑوں کو اپنی جانب آتا دیکھ کر پدک گئے لیکن جاتے جاتے بھی اٹو نے جیسی آواز میں طاہر بھائی کو دھمکی

دے دی۔

”تجھے تو دیکھ لوں گا سارے حکیم کہیں کے.....“

غیاث چچا اور باقی لوگوں کے ہم لوگوں تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہاں سے ہوا ہو چکے تھے۔ طاہر بھائی نے غیاث چچا کو ٹال دیا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی بس یونہی ایک چھوٹی سی بحث ہو گئی تھی اٹو سے، لیکن غیاث چچا کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ طاہر بھائی کی بات سے مکمل مطمئن نہیں ہو پائے تھے اس لیے وہ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک طاہر بھائی اپنے گھر کے دروازے تک نہیں پہنچ گئے۔

اٹو اور طاہر بھائی کی یہ پہلی باقاعدہ جھڑپ تھی لیکن اس وقت ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑائی آگے چل کر ایک ایسا رخ اختیار کر لے گی کہ ہم سب کی زندگیوں میں طوفان آجائے گا۔ اس روز محلے والوں کو تو خبر نہ ہو سکی لیکن میں یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ دو آپ جلدی اور طاہر بھائی کی نظروں میں چھپے پیغامات کو صرف میں نے ہی محسوس نہیں کیا، اٹو بھی اس راز سے اچھی طرح واقف ہے اور اس روز اٹو کے تیوروں نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اب یہ راز زیادہ دنوں تک راز نہیں رہ پائے گا۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی قربانی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن اسکول میں راجہ نے مجھے زبردست جھاڑ پلائی کہ میں کل شام کیا کرنے چلا تھا۔ میں چپ چاپ اس کی اور بالے کی ڈانٹ سنتا رہا لیکن میں کرتا بھی کیا؟ کوئی جو آپنی کو تنگ کرے اور میں چپ چاپ بیٹھا دیکھتا رہوں.....؟ ایسا تو کبھی ہونہیں سکتا تھا۔ بالے نے بھی اپنے بڑے بھائی کو خوب سست سنائیں کہ جانے کب ان کی اس مصیبت سے جان چھوٹے گی۔ بالے کا کہنا تھا کہ کل اگر اسے وقت پر اطلاع مل جاتی تو وہ کم از کم سینڈ وا اور سلطانے میں سے کسی ایک کو تو گرا ہی لیتا۔ بالاکل شام اس ”جائے وقوعہ“ پر موجود نہیں تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ کچ رہا تھا۔ اسے اگر ہم سب کے ساتھ اپنے بھائی سے بھی لڑنا پڑتا تو وہ کبھی نہ چوکتا۔ اس نے مجھے اور راجہ کو مشورہ دیا کہ اب ہم تینوں کو بھی ایک ایک چاقو خرید کر اپنے بستوں میں رکھ لینا چاہیے تاکہ اگلی بار ایسا کچھ ہو تو ہم بھی پوری طرح ”مسلم“ ہوں۔ ہم تینوں یہی باتیں کرتے ہوئے اسکول سے واپسی پر محلے میں داخل ہوئے تو فضلوا بانظر آئے جو مجھے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ کہنے لگے کہ جو آپنی کا حکم ہے کہ کھانا کھا کر سیدھا ان کے گھر حاضری دوں۔ میں نے بستہ وہیں پر راجہ کے حوالے کر دیا اور خود اسی وقت جو آپنی کے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔

جو آپنی گھر کے صحن میں ہی پھولوں کی کیاری میں اپنے پسندیدہ کالے گلاب کے پودے کے پاس آرام کر سی ڈالے متفکری بیٹھی تھیں۔ وہ گھر کے عام کپڑوں میں ملبوس تھیں، اس کا مطلب تھا کہ وہ آج کالج بھی نہیں گئی ہوں گی؟ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے انہیں اور جلدی سے میری جانب لپکیں۔

”آدی..... تم ٹھیک تو ہونا.....“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”ارے..... مجھے کیا ہونا ہے..... بھلا چنگا تو ہوں.....“

پھر جانے انہیں کیا ہوا۔ انہوں نے میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور تقریباً رو دینے والے لہجے میں بولیں۔

”کل کیا ہو گیا تھا تمہیں..... یہ کیا بے وقوفی تھی ہاں..... جانے نہیں وہ کتنے گندے لوگ ہیں..... تمہیں کچھ ہو جاتا تو.....؟“

مجھے غصہ آ گیا ”جو کوئی بھی میری جو آپنی کو ستائے گا..... میں اس سے بھڑ جاؤں گا..... پھر چاہے جو بھی ہو.....“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

جو آپنی کی آنکھوں میں اب باقاعدہ آنسو آ گئے۔

”نہیں آدی نہیں..... ابھی تم بہت چھوٹے ہو..... تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے..... تم پہلے خوب پڑھ لکھ کر بڑے ہو جاؤ پھر تمہاری جو آپنی کو

کوئی تنگ نہیں کرے گا لیکن تب تک آدمی صرف پڑھائی کرے گا..... اور کچھ نہیں..... بولو وعدہ.....“

ڈو آپی نے حسب عادت مجھ سے وعدہ لینے کے لیے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ میں کچھ ہچکچایا۔ ڈو آپی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”آدمی کی دوست اس سے وعدہ مانگ رہی ہے لیکن وہ وعدہ نہیں کر رہا.....“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

مجبوراً میں نے بھی ان کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اچھا وعدہ.....“

ڈو آپی مسکرائیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

”ہاں..... پکا..... پورا پکا۔“

پھر جب میں نے ڈو آپی کو بتایا کہ ان کی مدد کے لیے صرف میں ہی نہیں بلکہ راجہ، گڈو، ننھو، پوسھی کیے بعد دیگرے میرے پیچھے بھاگے تھے تو وہ ہلکے سے ہنس دیں اور انہوں نے مجھ سے میرے تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کو کہا اور ان سب کے لیے بہت سی ایرانی ”ٹیک“، بیل گم بھی دیں۔ میں نے انہیں ان کے جانے کے بعد اٹو اور طاہر بھائی کے درمیان ہوئی مختصر سی جھڑپ کے بارے میں بھی بتایا۔ اس دن زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے خود ان کے سامنے طاہر بھائی کا ذکر کیا تھا۔ جانے کیوں جب طاہر بھائی نے مجھے دوڑتے ہوئے اچک لیا تھا اور خود اٹو کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے اسی لمحے سے میرے دل میں ان کے لیے ایک ان جانی سی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ اس دن میں نے شاید یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ ڈو آپی کی حفاظت کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں اور جب تک میں بڑا ہو کر خود ڈو آپی کی ڈھال نہیں بن جاتا تب تک کے لیے مجھے اس بات کا اطمینان ہو گیا تھا کہ طاہر بھائی ان کی حفاظت کے لیے موجود ہیں۔

لیکن ڈو آپی طاہر بھائی اور اٹو کے درمیان ہونے والا مکالمہ سن کر جانے کیوں بہت زیادہ پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے پہلے مجھے زبانی طاہر بھائی کو پیغام دینے کا کہا کہ وہ اپنی حفاظت کریں اور اٹو کی جانب سے ہوشیار رہنے کی کوشش کریں لیکن پھر انہیں زبانی پیغام پر بھی اطمینان نہیں ہوا تو جلدی سے اندر کمرے سے اپنی کاپی اور پین اٹھالائیں اور سفید ورق پر تیزی سے دو سطریں لکھ دیں۔

”آپ ان لوگوں سے دُور رہیے گا۔ دو ماہ بعد آپ کے فائل ایئر کے امتحانات ہیں۔ خدا کے لیے کسی جھگڑے میں خود کو ملوث نہ کیجیے

گا، یہی میری آپ سے التجا ہے..... آپ کی شاگرد۔“

ڈو آپی نے جلدی سے وہ صفحہ کاپی سے علیحدہ کیا اور میرے حوالے کر کے تاکید کی کہ میں گھر جانے سے پہلے خود طاہر بھائی کے ہاتھ میں یہ رقعہ تھما کر جاؤں اور میری زندگی میں یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں نے ڈو آپی کا پیغام ٹھیک ٹھیک طاہر بھائی تک پہنچا دیا تھا۔ طاہر بھائی نے رقعہ کھول کر پڑھا اور ہلکے سے مسکرا کر میرے گال بھینچے۔

”اپنی ڈو آپی سے کہنا کہ جس کا تم جیسا بہادر دوست موجود ہوا ہے دنیا میں کسی سے بھی ڈرنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان

سے کہہ دینا کہ میں احتیاط کروں گا۔“

طاہر بھائی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میرے کندھے فخر سے چوڑے ہو گئے۔ طاہر بھائی اتنے بُرے بھی نہیں تھے جتنا میں آج تک انہیں سمجھتا رہا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس دن وہ مجھے کافی ”معقول“ شخص نظر آئے۔

وہ جو آپنی نے اس دن کے بعد گھر سے اکیلے یا فضلہ بابا کے ساتھ نکلنا بالکل ختم کر دیا۔ پتہ نہیں انہوں نے گھر میں کیا عذر پیش کیا ہو گا لیکن اب وہ کالج کے وقت اور کالج سے واپسی پر بھی غیاث چچا کے ساتھ ہی نکلتیں۔ یوں اٹکو کا ان کے گھر کے ارد گرد منڈلانا بھی کافی حد تک کم ہو گیا کیونکہ غیاث چچا کے غصے سے کبھی واقف تھے۔ وہ تو محلے کے عام نوجوانوں کو بھی گھر کے پاس یا میدان میں خالی اور خامخواہ کھڑا دیکھ کر خود ان سے پوچھ بیٹھتے تھے۔

”کیوں میاں..... خیر سے کھڑے ہو یہاں.....؟ کوئی کام وغیرہ نہیں ہے کیا کرنے کو.....؟“

اس لیے سبھی ”فارغ“ قسم کے نوجوان انہیں گھر سے نکلتے یا محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر خود ہی یہاں وہاں کھسک جاتے تھے۔

بہت سے دن یونیورسٹی گزر گئے۔ ہمارے ششماہی امتحان ہو چلے تھے اور طاہر بھائی کی ڈاکٹری کا فائنل امتحان چل رہا تھا۔ اٹکو بھی بہت دن سے محلے میں آوارہ گردی کرتے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے ہم نے بھی کچھ اطمینان کی سانس لی..... لیکن اگلے دن ہی پتہ چلا کہ ہمارا یہ اطمینان عارضی ہے۔

اس شام بالاجھے اور راجہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سیٹھ گردھاری مل کی درمیانی بیٹی کلپنا دیوی بُری طرح سے اس پر عاشق ہو چکی ہے لیکن چونکہ وہ ایک انتہائی ”مشرقی“ لڑکی ہے اس لیے وہ خود اپنے منہ سے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار نہیں کر سکتی۔ اس وقت مجھے اور راجہ کو اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں کیونکہ اس وقت میں اور راجہ دونوں ہی ”مشرقی“ لڑکیوں کے اوصاف سے ناواقف تھے۔ بالے نے اس دن میرے متعلق بھی یہ فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ میں آگے چل کر انتہائی سچا عاشق ثابت ہوؤں گا کیونکہ اسے میرے اندر وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی تھیں جو اس ”منصب شاهی“ کے لیے ضروری ہو سکتی ہیں۔ ابھی ہم بالے سے ”علم ودانائی“ کا یہ عظیم خزانہ سمیٹنے میں مصروف تھے کہ اٹکو اپنے دوستوں سمیت محلے میں داخل ہوا۔ ہم تینوں نے اٹکو کو یوں آتے دیکھ کر گھبرا کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا لیکن اٹکو گینگ نے ہم بچوں پر کوئی خاص توجہ ہی نہیں دی۔ بس ایک اچھتی سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ سچ پوچھتے تو یہ دیکھ کر مجھے اور راجہ کو ذرا سی سبکی کا احساس بھی ہوا، گویا اٹکو اور اس کے دوست ہمیں کسی کھاتے میں شمار ہی نہیں کرتے تھے؟ اور کچھ نہیں تو انہیں ایک لمحے کے لیے رک کر مجھ سے اور راجہ سے یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ اس دن ہم ان کی طرف کیوں بھاگے تھے۔

ہم نے بالے کو ان کی ٹوہ لینے کے لیے بھیجا۔ بالاجھپلی جانب سے دیوار ناپ کر ان کے بالکل بچھلی جانب کی دیوار کے پیچھے جا چھپا اور واپس آ کر اس نے جو کچھ ہمیں بتایا اسے سن کر میرے اور راجہ کے ہوش اڑ گئے۔

وہ تینوں طاہر بھائی سے لڑنے کے ارادے سے محلے میں آئے تھے۔ اٹکو کا ارادہ یہ تھا کہ گھر سے نکلتے ہی طاہر بھائی کو وہ تینوں بے خبری میں دھریں گے اور ان کو اچھی طرح سبق سکھانے کے بعد وہ تینوں شہر سے باہر جانے والی کوئی بھی بس یا ٹرین پکڑ کر کچھ دن کے لیے روپوش ہو جائیں گے۔

ہم تینوں دم سادھے بیٹھے طاہر بھائی کے گھر کے دروازے کی جانب دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر یہ دعا مانگتے رہے کہ طاہر

بھائی گھر سے نہ نکلیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی نے بھی خود جا کر طاہر بھائی کو گھر سے نکلنے سے منع کیا تو وہ ضرور باہر آئیں گے لہذا اس وقت ہم سوائے دعا مانگنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

آخر ہماری دعائیں رنگ لائیں اور طاہر بھائی شاید اپنے اگلے دن کے پرچے کی تیاری میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں گھر سے باہر نکلنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اگو اور اس کے دوست پہلے تو آگیا کر سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے رہے پھر تنگ آ کر وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چل پڑے لیکن ان کے ارادوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ موقع ملنے پر دوبارہ یہ کوشش ضرور کریں گے۔

راجہ نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے یہ سب کچھ ڈو آپی کو بتادینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی بہتر ترکیب ہو اس مصیبت سے بچنے کی۔ ڈو آپی کے نام پر بالے نے مجھے معنی خیز لگا ہوں سے دیکھا اور مسکرا کر راجہ سے کہنے لگا ”میری باتوں پہ تو تم دونوں خوب ہنستے ہو۔ پر یہ آدی خود جو بھی کرتا پھرے، اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔“

میں نے حیرت سے بالے کو دیکھا ”کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟“

بالے نے ٹھنڈی سی آہ بھری اور راجہ کی طرف دیکھا۔

”لو جی..... یہ ہم سے پوچھ رہا ہے کہ اس نے کیا کیا ہے..... سچ بول راجہ..... کیا تجھے بھی نہیں پتہ.....؟“

راجہ کی سمجھ میں شاید بالے کی بات کچھ کچھ آگئی تھی لہذا اس نے ہنس کر بات ٹالنے کی کوشش کی۔

”جانے دے یا ربالے..... یہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی ہے.....“ لیکن اب میں اڑ گیا۔

”نہیں نہیں..... مجھے بھی تو پتہ چلے میں نے کیا کیا ہے.....؟“

راجہ نے بات ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن میں بالے کی جان کو آگیا کہ جب تک وہ بات نہیں بتائے گا ہم تینوں میں سے کوئی بھی گھر واپس

نہیں جائے گا، ورنہ دوستی ختم۔ آخر کار بالے نے دھیرے سے بات کھول ہی دی۔

”سچ بتا آدی..... تجھے تیری ڈو آپی کیسی لگتی ہے.....؟“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”بہت اچھی.....“

راجہ اور بالا دونوں ہی میرے انداز پر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

بالے نے راجہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس..... ہم بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ تجھے تیری ڈو آپی دنیا میں سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اتنی کہ تو اس کی خاطر تین جوان کڑیل

بندوں سے لڑنے کو بھی تیار ہو گیا تھا تو پھر جا کر اپنی ڈو آپی کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہیں.....؟“

میں بالے کی بات سن کر جھینپ سا گیا۔

”ارے..... اس میں بتانے کی کیا بات ہے.....؟ وہ تو خود پہلے ہی سے جانتی ہیں کہ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“

بالے نے زور سے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

”اس کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بے وقوف جب کوئی لڑکی اچھی لگتی ہے تو اسے خاص طور پر بتانا پڑتا ہے کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔ اس دن ”کبڑا

عاشق“ دیکھی تھی ناراحت ٹاکیڑ میں..... رنگیلا بے چارہ صرف اس لیے مارا جاتا ہے کہ وہ وقت پر شہزادی کو بتائیں پاتا کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔“

اب مجھے بالے کی بات کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی لیکن اب بھی میں پوری طرح اس کا مطلب سمجھ نہیں پایا تھا۔ بالا ابھی مجھے یہ ”اہم نکتہ“ سمجھانے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ اتنے میں بڑے بھیا فاران مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آگئے اور مجھے فوراً اپنے ساتھ گھر چلنے کو کہا کیونکہ ابا مجھے کوئی بڑی خوش خبری دینا چاہتے تھے۔ مجبوراً مجھے اٹھ کر ان کے ساتھ چلنا پڑا۔ سارے راستے میں سوچتا رہا کہ ایسی کون سی خوش خبری ہے جو ابا مجھے دینا چاہتے تھے۔ نئی سائیکل دلوانے سے تو انہیں نے پچھلے مہینے ہی منع کر دیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مجھے ان کی سہراب سائیکل پر ہی اپنا ہاتھ صاف کرنا چاہیے جبکہ مجھے ان کی پرانی سائیکل محلے میں نکالنے سے ہی بڑی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی سائیکل اتنی اونچی تھی کہ میں اس کی گدی پر بمشکل ہی پہنچ پاتا تھا اور گدی پر بیٹھنے کے بعد پاؤں پیڈل تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ اس سائیکل کو چلا کر محلے میں سب کے مذاق کا نشانہ بننے سے بہتر تھا کہ میں بنا سائیکل ہی گزارہ کر لوں۔ انہی سوچوں میں گم میں اور بھیا گھر میں داخل ہوئے تو ابا صحن میں ہی انگوڑی تیل کے نیچے ٹھیلے ہوئے مل گئے۔ ان کے چہرے سے خوشی پھوٹی جا رہی تھی اور ہاتھوں میں چند کاغذ تھے جنہیں وہ بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے امی کی جانب پلٹ کر خوشی سے کہا۔

”لو بھئی..... آگیا تمہارا فوجی بیٹا۔“

میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا لیکن صحن میں تو اور کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں شک نے پیر پھیلایا۔ ”ہوں..... اس کا مطلب ہے اتنے دن تک ان سب نے مجھ سے یہ بات چھپا کر رکھی تھی کہ ابا کا ایک بیٹا اور بھی ہے جو فوجی بھی ہے.....“

لیکن کچھ ہی لمحوں میں یہ عقدہ بھی کھل گیا۔ ابا نے فوراً مجھے پیار سے گلے لگا لیا۔ مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کیونکہ ابا نے کبھی یوں ”گھل“ کر مجھے پیار نہیں کیا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ میرا داخلہ کسی فوجی کالج (کیڈٹ کالج) میں ہو گیا ہے۔ اتنے ہفتوں سے ان کی جس بھاگ دوڑ کو میں بڑے بھیا کے لیے سمجھ رہا تھا وہ دراصل ان کے لیے نہیں بلکہ میرے داخلے کے سلسلے میں تھی۔ عمارہ، بڑے بھیا اور امی سب ہی مجھے مبارکباد دے رہے تھے، پیار کر رہے تھے، خوشی سے شور مچا رہے تھے لیکن میں گم سم سا کھڑا ابا کے ہاتھ میں پکڑے اپنے داخلے کے کاغذ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ میری قید کا پروانہ ہو لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ایک ڈیڑھ سال پہلے مجھے خود بھی کیڈٹ کالج کی بورڈنگ میں جانے، فوجی لباس پہننے اور پریڈ کرتے ہوئے سیلوٹ کر کے گزرنے کا جنون تھا۔ میں اخباروں سے ایسے کیڈٹس کی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپنی کاپیوں پر چپکا تارہتا تھا۔ خاص طور پر لڑکا جہاز اور پائلٹ تو میری کم زوری تھے۔ ابا نے میرے اسی شوق کو دیکھتے ہوئے مختلف جگہوں پر درخواستوں کے انبار بھجوا رکھے تھے اور آج دو سال بعد ان کی محنت رنگ لے ہی آئی تھی۔ ابا کی اپنی تنخواہ تو اتنی نہیں تھی کہ وہ میرے بورڈنگ کے اخراجات برداشت کر سکتے لیکن میرا داخلہ حکومت کے

خرچے پر منظور ہو گیا تھا۔ ابا کی بے تحاشا خوشی کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں اپنے خاندان کا پہلا بچہ تھا جسے اتنا بڑا ”اعزاز“ حاصل ہوا تھا۔ سب خوش تھے، میری دھوم دھام سے ”رخصتی“ کے منصوبے بنا رہے تھے لیکن جانے کیوں خود میرا اپنا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ میرے لیے یہ احساس ہی سوہان روح تھا کہ مجھے اپنے گھر، امی اپنے دوستوں اور اپنے محلے کو چھوڑ کر سینکڑوں میل دور ایک انجانی جگہ پر رہنا پڑے گا۔ اس لمحے میری اداسی کا یہ عالم تھا کہ مجھے عمارہ اور بڑے بھیا سے دور جانا بھی عذاب لگ رہا تھا۔ مجھے ان دونوں پر بھی ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی تو صرف ایک بار یہ ابا کے سامنے کہہ دے کہ ”نہیں ہم اپنے آدمی کو اتنی دور پڑھنے کے لیے نہیں بھیجیں گے۔ ہم اس کے بغیر اداس ہو جائیں گے“ لیکن افسوس ان میں سے کسی تک بھی میرے دل کا یہ پیغام نہیں پہنچ سکا۔

اور پھر دُجو آپنی.....؟ وہ بھی تو یہیں رہ جائیں گی۔ میں ان کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا وہاں.....؟ اور پھر آج کل تو انہیں سب سے زیادہ میری ”ضرورت“ بھی تو تھی۔ اگر میرے پیچھے اس بد معاش اٹو نے پھر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو.....؟ نہیں نہیں..... میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ میرے ذہن نے اسی لمحے اس ”کیڈٹ کالج کی مصیبت“ سے جان چھڑانے کے منصوبے بنانا شروع کر دیے۔ راجہ کو ”چانک بیمار پڑنے“ کے بہت سے نسخے معلوم تھے۔ میں نے سوچا کہ راجہ سے کہوں گا کہ کوئی ایسا نسخہ بتائے جس سے میں کم از کم تین چار ہفتوں کے لیے بستر پر جا پڑوں۔ پھر مجھے دادی جان کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ان کے سامنے جا کر خوب رونا دھونا ڈالوں گا کہ یہ سب مل کر آپ کے سب سے لاڈلے پوتے کو آپ سے دور کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ دادی مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں وہ تو میری جدائی تو بالکل برداشت نہیں کر پائیں گی.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے کل ہی دادی کے گھر جا کر انہیں اپنی مظلومیت کی داستان سنا دینی چاہیے۔

میرا ذہن ساری رات اسی قسم کے منصوبے بناتا رہا۔ جانے کیوں ایک دم ہی مجھے اپنے گھر کی اور آس پاس کی ہر چیز پہ اتنا ٹوٹ کے پیار آنے لگا تھا کہ میں نے آدھی رات کو دو مرتبہ اٹھ کر اپنے پرانے بستے کو چوم کر دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا۔

صبح ہوئی تو سارے محلے میں یہ چرچا عام تھا کہ آدمی کا داخلہ ملک کے سب سے بڑے اور اعلیٰ کیڈٹ کالج میں ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے استانی خالہ امی کو مبارکباد دینے آئیں اور پھر تو محلے داروں اور ابا کے جاننے والوں کا ہمارے رشتہ داروں سمیت تانتا بھی بندھ گیا۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دادی کے گھر جاتے ہی ان کے گلے میں بائیں ڈال کر ٹسوے بہانا شروع کر دیئے کہ ”اب تو آپ کے آدمی کو دیکھنے کو آپ کی آنکھیں ہی ترس جائیں گی۔ خوب جی بھر کے مجھے دیکھ لیں کیونکہ چند دنوں میں مجھے یہاں سے بہت دور چلے جانا ہے۔“

دادی نے ہڑبڑا کر جلدی سے اپنا پاندان بند کیا۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے تو آدمی..... کہاں جا رہا ہے تو اپنی دادی کو چھوڑ کر۔“ میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً اپنے چہرے پر اڑلی معصومیت اور آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر کر دادی کو اپنے داخلے کے بارے میں بتایا کہ کس طرح گھر میں میری روانگی کی پر جوش تیاریاں بھی شروع ہو چکی ہیں اور تو اور میرے لیے تو انہوں نے ایک نیا سوٹ کیس بھی خرید لیا ہے جس میں میری وہ ضرورت کی چیزیں بھری جا رہی ہیں جو بورڈنگ والوں نے اپنے خط میں لانے کو لکھی تھیں۔ دادی کا پارہ حسب توقع فوراً ہی آسمان کو چھونے لگا۔ انہوں نے فوراً ماشکی کو حکم دیا کہ جا کر میرے ابا کو دادی کے حضور

فوراً پیش ہونے کا حکم سنا آئے۔ چند ہی لمحوں بعد ابا بھی اپنی سائیکل گھسیٹے ہوئے دادی کے گھر آ پہنچے۔ دادی نے انہیں دیکھتے ہی واویلا شروع کر دیا کہ ”انہیں ذرا خیال نہ آیا مجھ معصوم کو گھر سے اتنی دور بھیجنے کا سوچتے ہوئے.....؟“ اور یہ کہ ”خبردار جو کسی نے آدی کو فوجیوں کے اسکول بھیجنے کی بات بھی کی تو، پتہ نہیں وہاں فوجی بچوں سے کیسی مشقت کرواتے ہوں گے؟ اور ہمارا آدی تو پہلے ہی اتنا نازک سا ہے۔ وہاں اس کے کھانے پینے کا دھیان کون رکھے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔“

ابا خاموشی سے دادی کی تمام تقریر سنتے رہے پھر انہوں نے دادی کو دھیرے دھیرے بورڈنگ کی تمام خصوصیات گنوانا شروع کیں تو لگاتار آدھا گھنٹہ بولتے ہی چلے گئے اور پھر آخر میں انہوں نے وہ ترپ کا پتہ پھینکا جو ہمیشہ سے دادی کی کم زوری تھا۔ انہوں نے انتہائی جذباتی لہجے میں دادی کو یہ بات یاد دلانی کہ آج اگر مرحوم دادا زندہ ہوتے تو وہ اپنے پوتے آدی کو اتنے بڑے ادارے میں داخلہ ملنے پر پورے شہر کا منہ بیٹھا کروادیتے اور ایک دادی ہیں کہ بجائے فخر کرنے کے خود اپنے ہاتھوں ہمارے خاندان کو ملنے والے اتنے بڑے اعزاز سے محروم کرنا چاہتی ہیں۔

دادا کا ذکر آتے ہی دادی کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ ابا کو یاد دلانے لگیں کہ دوسری جنگ عظیم کے وقت جب لوگ گاؤں میں چھپتے پھرتے تھے کہ گورے انہیں ”لام“ پر نہ بھیج دیں، دادا نے خود اپنے آپ کو بھرتی کے لیے پیش کر دیا تھا۔

میں دور بیٹھا کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور دکھاوے کے طور پر ابا کی سائیکل کی چین ٹھیک کر رہا تھا۔ دادی کی رام کہانی سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ میں انہیں کیا سمجھا کر آیا تھا اور وہ کس زمانے کے قصے لے کر بیٹھ گئیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں دادی خود ابا کو مشورے دے رہی تھیں کہ آدی کے لیے آم کا اچار تو وہ خود اپنے ہاتھ سے بنا کر بھیجا کریں گی۔ جانے وہاں اسکول میں فوجیوں کو آم کا اچار بنانا آتا بھی ہوگا یا نہیں.....؟ اور باقی تمام مقوی مرے وغیرہ تو ہمیشہ ان کی الماری میں پہلے سے تیار ہی پڑے ہوتے تھے۔ وہ سب تھوڑے تھوڑے پیک کر دیں گی جنہیں ابا میرے جانے سے پہلے ضرور اٹھاتے جائیں۔

دادی سے مزید کوئی امید باندھ رکھنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ پوری طرح ابا کے ”جھانے“ میں آچکی تھیں اور اب میری آخری امید راجہ کے کارآمد نسخے تھے۔ راجہ نے میری کیڈٹ کالج جانے کی بات سن رکھی تھی اور وہ پہلے ہی سے حواس باختہ تھا۔ بالے اور ننھا ایک طرف بیٹھے میری عقل کا ماتم کر رہے تھے کہ انہوں نے مجھ سا بے وقوف آج تک نہیں دیکھا جو خود اپنی آزادی کا دشمن ہو۔ گد اور پچو نے ایک دوسری ہوش ربا خبر سنا کر میری رہی سہی سانس بھی کھینچی لی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں ”باوثوق“ ذرائع سے پکی خبر ملی ہے کہ ایسے بورڈنگز میں غلطی کرنے والے بچوں کو آدھی رات کو صرف ایک نیکر میں میدان میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

میں نے فوراً راجہ کو زور سے گلے لگا کر جھنجھنچ لیا اور بھیگی آنکھوں سے اپنے تمام دوستوں سے التجا کی کہ خدا کے لیے مجھے ان ”وحشیوں اور جنگلیوں“ کے چنگل میں نہ جانے دیں۔ ان سب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور ان سب نے مل کر مجھ سے وعدہ کیا کہ ورتے مر جائیں گے لیکن میرا ”مستقبل“ یوں برباد نہیں ہونے دیں گے۔ راجہ نے جلدی جلدی مجھے فوری بخار چڑھنے کے چند آزمودہ نسخے بتائے جو وہ اسکول سے چھٹی کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا مثلاً برف کا بڑا سا ٹکڑا دس منٹ تک سر پہ رکھنا۔ آدھی رات کو اٹھ کر نچ ٹھنڈے پانی کی پوری بالٹی اپنے اوپر انڈیلنا، گھر والوں سے

چھپ کر رات کو نیم گرم پانی سے نہا کر جلدی سے کمرے میں آ کر پوری رفتار سے پکھلا چلا کر اس کے نیچے صرف ایک تولیہ لپیٹ کر سو جانا وغیرہ۔ میں نے یکے بعد دیگرے یہ تمام نسخے آزما لیے لیکن ایک دو دن بخار میں تنے کے بعد میں بھلا چنگا ہو جاتا اور اب تو ویسے بھی امی ایک دو مرتبہ بخار چڑھنے کے بعد میری خصوصی دیکھ بھال کرنے لگی تھیں لہذا چھپ کر یہ سب کرنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے مستقل بیمار رہنے کا طریقہ نہیں مل پارہا تھا اور دن تھے کہ پرلگا کر اڑے جا رہے تھے۔ میرے سامان کا سوٹ کیس بھرتا جا رہا تھا۔ میرے لیے نئے کپڑے بنوائے جا رہے تھے۔ نئے جوتے، نیا ٹوتھ برش، نیا ٹوتھ پیسٹ اور وہ بھی صرف میرے لیے جبکہ اس سے پہلے میری، عمارہ اور بڑے بھیا کی ایک ہی ٹیوب ہوتی تھی اور ہماری اس پر خوب لڑائی ہوتی تھی۔ اس لیے میں ہمیشہ ٹیوب رات ہی کو چھپا دیا کرتا تھا۔ نئی کنگھی، نیا شیشہ، نیا جوتا پالش کرنے والا برش اور پتہ نہیں کیا کیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں خوشی سے پھٹ ہی جاتا اور ساری رات اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے جاگتا رہتا کہ کہیں عمارہ اس میں سے کوئی چیز چرانہ لے لیکن ان دنوں میری راتوں کی نیند جذباتی کے احساس سے ہی اڑی ہوئی تھی۔ ساری رات میں بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔ لمحہ بھر کو آنکھ لگ بھی جاتی تو خواب میں میں اپنے آپ کو صرف ایک نیکر میں ایک بڑے سے میدان میں کھڑے پاتا اور فوراً ہڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ یہاں میرا پریشانی اور اداسی سے یہ حال تھا کہ میری بھوک، پیاس اور نیند سبھی اڑ چکے تھے اور دوسری جانب قہقہے آتی تھیں کہ انہیں جب میرے بورڈنگ میں داخلے کا پتہ چلا تو اسی لمحے ہمارے گھر دوڑی چلی آئیں۔ غیاث چچا بھی ان کے ہم راہ تھے جنہوں نے ابا کو بہت مبارک باد دی اور مجھے بھی خوب پیار کیا۔

قہقہے آتی مجھے اپنے ساتھ ہی واپسی پر اپنے گھر لے گئیں۔ شاید انہوں نے میرا اترا ہوا چہرہ اور اداسی محسوس کر لی تھی۔ وہاں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیڈٹ کالج جانے پر دل سے خوش نہیں ہوں اور میں یہیں رہ کر پڑھنا چاہتا ہوں اپنے سب دوستوں کے ساتھ اور قہقہے آتی کے پاس..... میری بات سن کر قہقہے آتی کسی گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے انہیں وہ سب کچھ سن کر شدید صدمہ ہوا ہو۔ کچھ دیر ماحول پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر قہقہے آتی دھیرے سے بولیں۔

”آدی..... تم جانتے ہو کیڈٹ کالج میں پڑھنے کا موقع پورے ملک میں سے صرف چند بچوں کو ہی ملتا ہے۔ مجھے اپنے لڑکانہ ہونے کا افسوس صرف ایک اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ میں لڑکی ہونے کی وجہ سے کیڈٹ کالج نہیں جا پائی۔ اگر میں لڑکا ہوتا تو کیڈٹ بننے کے لیے کچھ بھی کر جاتی کیونکہ مجھے کیڈٹس بے حد پسند ہیں جب مجھے پتہ چلا تھا کہ میرا دوست آدی کیڈٹ کالج جا رہا ہے کیڈٹ بننے کے لیے تو تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر خوش ہوئی تھی صرف یہ سوچ کر کہ اب میرا آدی کیڈٹ یونیفارم میں اپنی بڑی سی تصویر مجھے بھیجے گا جسے میں اپنے کمرے میں لگاؤں گی اور اپنی سب دوستوں پر رعب جماؤں گی کہ دیکھو..... یہ پیارا سا سمارٹ کیڈٹ میرا دوست آدی ہے..... لیکن تم نے تو میرے سارے خواب ہی توڑ دیئے..... چلو خیر ہے..... میں نے تو سوچا تھا کہ آدی کیڈٹ بن جائے گا تو محلے کے ان بد معاشوں کی کبھی ہمت نہیں ہوگی اس کی قہقہے آتی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی..... لیکن..... اب اور کیا کہوں..... بس جس میں تمہاری خوشی.....“

قہقہے آتی تو یہ سب کچھ کہہ کر چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے اندر اپنے کمرے میں چلی گئیں لیکن مجھے ایک بہت بڑی مشکل میں چھوڑ گئیں۔ قدرت نے مجھے کیڈٹ بن کر قہقہے آتی کے قریب آنے کا ایک بہترین موقع فراہم کیا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ کیڈٹ بن کر میں طاہر بھائی کا پتہ آرام سے

کاٹ سکوں گا لیکن ان سب کو چھوڑ کر جانا بھی تو ایک بہت بڑا اور سب سے کڑا امتحان تھا۔ میں وہیں دھوا آپی کے برآمدے میں سر جھکائے جانے لگتی دیر بیٹھا رہا۔ برآمدے کی ساری دھوپ سرک کر چھت کی منڈیر تک چلی گئی تھی اور شام کو اپنے گھروں کی جانب لوٹتے ہوئے پرندوں کی چہکار سے آگن گونجنے لگا تھا۔ میرا جسم شام کی سردی سے کپکپانے لگا تھا۔ دھوا آپی اپنے کمرے سے کسی کام سے باہر نکلیں تو مجھے ابھی تک وہیں بیٹھے دیکھ کر چونک سی گئیں۔

”ارے آدی..... تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہو..... گھر کیوں نہیں گئے.....؟“

میں نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ دھوا آپی نے بڑی سی کالی شال لپیٹ رکھی تھی جس میں حسب معمول ان کا گلہابی چہرہ دکھ رہا تھا۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے..... میں کیڈٹ کالج جاؤں گا پڑھنے کے لیے۔“

خوشی سے دھوا آپی کا چہرہ کھل اٹھا اور انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے سارے بال بکھیر دیئے اور زوردار نعرہ لگایا ”آدی زندہ باد۔“ میں اور ورتو آپی دونوں ہی زور سے ہنس دیئے۔ ساری کائنات ہمارے ساتھ ہی ہنس پڑی۔

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول..... مقید خاک..... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیر خیز داستان۔
ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا..... یوسف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روجوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... یوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مریا قس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسم خاک میں مقید تھی..... شبنم:- ایک بے گناہ، بے شکستہ، بے صد ہوا، بے انزیم، بے تاش تھی.....

کتاب گھر کی پیشکش پہلا الوداع

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

راجہ، بالا، گدو، نھو اور پوپ، سب ہی دم سادھے کھڑے تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں نے کیڈٹ کالج جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم سب کالونی کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب کھڑے قادر ماما کے آلو چھولے کے ٹھیلے کے ساتھ لگے لکڑی کے بیچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ان کی پلیٹیں اور چمچ یونہی ساکت رہ گئے تھے۔ ٹھیلے پہ لگے ریڈیو سے عالمگیر کی آواز فضا میں تان بکھیر رہی تھی۔

”یہ شام اور تیرانا م..... دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں.....“

تیرانا م نہیں لوں گا..... بس تجھ کو شام کہوں گا.....“

لیکن یہ شام میرے دوستوں کے مزاج سے بالکل مختلف ثابت ہو رہی تھی۔ شام بہت خوب صورت تھی لیکن ان سب کے چہرے اترتے جا رہے تھے۔ خود میرے دل کے اندر بھی اداسی کا طوفان اُٹ رہا تھا لیکن میں نے بڑی مشکل سے اس طوفان کو اپنے چہرے تک آنے سے روکا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی کمزوری دکھائی تو یہ سب میری جان کو آ جائیں گے۔ بالآخر پوپ کے منہ سے خرخراتی سی آواز نکلی۔

”لیکن..... یہاں پیچھے ہمارا کیا ہوگا۔ سالانہ امتحانات میں بالے اور راجہ کو نقل کون کروائے گا.....؟ اور ابھی جوئی کرکٹ ٹیم بنائی ہے اس کو کون سنبھالے گا۔ سائیکل کی ریس کس سے لگائیں گے۔“

میرے پاس ان کے ان سب سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس میں انہیں اتنا ہی بتا پایا کہ دو دن بعد اب مجھے شام کی گاڑی سے لے کر روانہ ہو جائیں گے۔ کل اسکول میں میرا آخری دن تھا۔ مجھے اپنے ہیڈ ماسٹر سے ایک ٹیوٹوریل لینا تھا کہ میری اپنی چھٹی جماعت میں پوزیشن اتنی اچھی تھی کہ میں با آسانی سالانہ امتحانات پاس کر کے ساتویں جماعت میں جاسکتا تھا۔ کیڈٹ کالج میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا تھا۔ میں سر جھکائے ان سب کی جھاڑ سنتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں بھیکتی گئیں اور پھر سب سے پہلے راجہ نے میرے آنسو دیکھے اور وہ جلدی سے اپنی پلیٹ پھینک کر اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔

”اُوئے آدمی..... گدھے..... رو کیوں رہا ہے؟“

راجہ کی بات سننے ہی میرے اندر کے سیلاب کا باندھ ٹوٹ گیا اور میں اسے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ بس پھر کیا تھا پھر تو یکے بعد دیگرے راجہ اور باقی سب بھی میرے ساتھ ہی رونے لگے۔ قادر ماما نے ہم سب کو یوں کورس میں روتے دیکھا تو وہ گھبرا کر جلدی سے بھاگتے ہوئے ہماری جانب آیا۔

”اوائے کھوتو..... رویوں رہے ہو..... پیسے نہیں ہیں تو خیر ہے..... موجدال کرو..... پیسے تم کھوتوں سے اچھے تھوڑی ہیں.....؟“

قادرے کی بات سن کر ہم سب ٹپکتے آنسوؤں سمیت کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ دور پہاڑوں کی اوٹ میں ڈوبتا سورج بادل کی اوٹ سے نکل کر ہمیں دیکھ رہا سا مسکایا اور پھر غروب ہو گیا۔

اگلے دن میں اسکول میں اپنے تمام ہم جماعتوں اور اساتذہ سے فردا فردا مل کر ان سے رخصت لیتا رہا۔ میرے سارے استاد میرے داخلے سے بے حد خوش تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے تو صبح ترانے کے بعد اسمبلی میں مجھے اسٹیج پر بلا کر سب کے سامنے شاباش دی کہ میں نے ان کے اسکول کا نام روشن کر کے ان سب کا سر فخر سے اونچا کر دیا ہے۔ سچ ہے کہ ہم اپنا سر کٹا کر ہی اپنوں کا سرو اونچا کر سکتے ہیں۔ اسکول میں ہی میں نے آخری مرتبہ اپنے پیارے ڈیسک پر بیٹھے بیٹھے ڈوآپی کے لیے ایک کارڈ بھی بنایا جس میں ایک کیڈٹ جھنڈے کو سلامی دے رہا ہوتا ہے۔ اسی کارڈ کے نیچے میں نے صرف دو جملے لکھے ”آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں..... آپ کا آدمی۔“

یہ مشورہ راجہ کا ہی تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج سے روانگی سے پہلے و ”جو“ آپنی کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دینا چاہیے تاکہ میری غیر موجودگی میں اور میرے واپس آنے تک طاہر بھائی یا کوئی اور انہیں رجھانے کی کوشش کرے بھی تو کامیاب نہ ہو سکے۔ ویسے تو و ”جو“ آپنی نے آج دیر شام کو مجھے اپنے گھر آنے کا کہا تھا تاکہ وہ مجھے وہ ساری چیزیں اور تحفے دے سکیں جو انہوں نے میرے کیڈٹ کالج جانے کے سلسلے میں جمع کر رکھی تھیں مثلاً ”انگل سرگم“ اور ”ہیگے“ والے لکٹ آؤٹ، ”نوئی پا“ کی شکل والی جیومیٹری، رنگوں کا بڑا سا ڈبہ، شیک چیونگم کا پورا پیکٹ اور پینتہ نہیں ایسی کتنی اور بہت سی چیزیں لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی و ”جو“ آپنی سے جا کر مل کر اپنے ”دل کی بات“ انہیں سنا دوں گا کیونکہ راجہ کہتا تھا کہ ایسے معاملات میں دیر اچھی نہیں ہوتی لیکن مجھے دیر ہو ہی گئی۔ گھر پہنچا تو تمام محلے کی عورتیں ”میری بلائیں“ لینے کے لیے ہمارے صحن میں جمع تھیں۔ سبھی کچھ نہ کچھ میرے لیے لے کر ہی آئیں تھیں۔ ان سب سے نپٹے نپٹے اور اپنی ”بلائیں“ دیتے دیتے مغرب کا وقت ہو گیا۔ گھر میں ایک ہنگامہ سا چا ہوا تھا۔ میرے کل کے جانے کے سلسلے میں اور سفر کے لیے پکوان بنائے جا رہے تھے۔ امی نے شروع میں تو کافی ہمت دکھائی تھی لیکن اب جب میرے جانے کی گھڑی قریب آتی جا رہی تھی تو ان کی آنکھیں بات بات بھگنے لگی تھیں۔ صبح سے جانے کتنی مرتبہ چھپ کر رو چکی تھیں۔ انہوں نے آج تک کبھی مجھے اپنے آپ سے ایک رات کے لیے بھی جدا نہیں کیا تھا اور کہاں آج انہیں پورے چھ سال کے لیے مجھے بورڈنگ بھیجنا پڑ رہا تھا۔ ابا آتے جاتے انہیں ان کی ہمت بندھی رکھنے کی تاکید کر رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں کسی نہ کسی بہانے پھٹک ہی پڑتی تھیں کیونکہ میں ان کا سب سے نازک مزاج بچہ تھا اور وہ جانتی تھیں کہ جس جگہ مجھے بھیجا جا رہا ہے وہاں کی زندگی اس قدر سخت اور کھردری ہے کہ مجھ جیسا ناز و نعم میں پلا ان کا ”شہزادہ“ وہاں جا کر بالکل ہی کملا جائے گا۔ ان کا بس چلتا تو شاید آخری وقت میں مجھے روک ہی لیتیں لیکن ابا کے غصے کے خوف سے وہ دل پر پتھر رکھ کر چپ تھیں۔

خدا خدا کر کے مبارکباد دینے اور مجھے الوداع کہنے والوں کا ہجوم چھٹا تو میں نے جلدی سے اپنے بستے سے ڈوآپی کے لیے بنایا ہوا کارڈ نکالا اور سب سے نظر بچا کر گھر سے نکل آیا۔ شام کا ملنگھا اندھیرا چھا چکا تھا اور محلے کے میدان کا اگلو تا لپ پوسٹ بھی جل چکا تھا۔ بڑا میدان سنسان پڑا تھا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا ڈوآپی کے گھر تک جا پہنچا۔ دو تین مرتبہ دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا کیونکہ خلاف معمول دروازہ بند تھا۔ شاید سیکنہ

خالہ لوگ گھر میں نہیں تھے۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں شدید مایوسی کے عالم میں پلٹا ہی تھا کہ اچانک چھت کے اوپر کسی کے ہلکے سے ہنسنے کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔ اوہ مطلب گھر والے چھت پر تھے، اسی لیے دروازے کی دستک اندر سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا اور چند لمحوں میں دیوار پھانڈ کر اندر کود گیا۔ دو آپی صحن میں ہوتیں تو مجھے میرے اس ”کرتب“ پر بہت ڈانٹیں کیونکہ انہیں مجھے چوٹ لگنے کا خوف لگا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میں انہیں ڈرانے کے لیے ان کی دیوار پر چڑھ بیٹھتا اور چپ لگانے کی دھمکیاں دے کر انہیں تنگ کیا کرتا تھا لیکن اس وقت صحن بھی بالکل سناں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ آج یہ سارے کے سارے چھت پر کیا کر رہے تھے؟ باہر برآمدے کی روشنی بھی نہیں جلائی ہوئی تھی۔ اوپر سے اب بھی کسی کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے صحن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت کی جانب بڑھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر دو آپی بھی اوپر ہوئیں تو انہیں پیچھے سے اچانک جا کر ڈراؤں گا۔ وہ اس طرح پہلے تو بہت ڈر جاتیں تھیں لیکن بعد میں ہم دونوں ایسی باتیں یاد کر کے خوب ہنستے تھے۔ میرے ہونٹوں پہ آنے والے لمحات کو سوچ کر خود ہی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اب بالکل چھت کی منڈیر تک پہنچ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر دو آپی پر ہی پڑی جو کسی سے مسکراتے ہوئے بات کر رہی تھیں۔ دو آپی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ میں نے ان کے لبوں سے نکلتے جملے کے آخری چند لفظ ہی سنے۔

”..... میں کیا کہہ سکتی ہوں، یہ سارے فیصلے تو والدین کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ فی الحال تو آپ مجھے اپنے پاس ہونے کی خوشی منانے دیں۔ ایسے پیغامات بڑوں کے ہاتھ بھیجے جاتے ہیں۔ نہ کہ کوئی خود لے کر آتا ہے۔“ دو آپی کے چہرے اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ لیکن ان کے مقابل کون تھا اس کی واضح جھلک مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ دو آپی کو جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا اور وہ اٹھ کر وہاں سے جانے لگیں۔

”آپ بیٹھیں..... امی جاتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کرنے کا کہہ گئیں تھیں۔ واپس آ کر سب سے پہلے پوچھیں گی کہ آپ کو چائے کا بھی پوچھایا نہیں، میں دروازہ بھی دیکھاؤں اور آپ کے لیے چائے بھی لیتی آؤں گی۔“

دو آپی نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ کسی کے ہاتھ نے ان کا گلابی ہاتھ جکڑ لیا اور آواز ابھری۔

”ایسے تو ہم نہیں جانے دیں گے آپ کو..... پہلے میرے سوال کا جواب دیتی جائیں۔ اگر میرے گھر والے آپ کا رشتہ مانگنے آئیں تو آپ کا کیا جواب ہوگا اور مجھے صرف وجہ کا جواب سننا ہے۔ اس کے ماں باپ کا جواب تو میرے والدین سن ہی لیں گے۔“

دو آپی لہرا کر شرم سے بل کھا کر رہ گئیں۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ہاتھ پکڑنے والا شخص بھی کھڑا ہو چکا تھا اور اب اس کا رخ بھی میری طرف ہی تھا اور وہ کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود طاہر بھائی ہی تھے۔ میرے اندر اچانک ہی بہت کچھ چھنا کے کی آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا۔ دو آپی اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہی تھیں۔

”طاہر..... خدا کے لیے میرا ہاتھ تو چھوڑیں..... میں نے کہا نا امی ابا جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔“

”اور میں نے بھی کہا نا کہ مجھے صرف وجہ کا فیصلہ سننا ہے۔“

وہاں ان دونوں میں ہاتھ پکڑے رکھنے اور چھڑانے کی کش مکش جاری تھی اور یہاں میرے ذہن و دل میں طوفانوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آخر طاہر بھائی نے میری پسند یہ ڈاکہ مار ہی دیا تھا لیکن مجھے ڈو آپی سے ہرگز یہ امید نہیں تھی۔ وہ بھی ان سے مل چکی تھیں۔ ابھی دودن پہلے ہی تو انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میرے کیڈٹ بن جانے کے بعد ان کی حفاظت کا ذمہ صرف میرا ہوگا۔ میری آخری امید اب بھی ڈو آپی کے جواب سے بندھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ طاہر بھائی سے صاف کہہ دیں گی کہ وہ آدی سے ہمیشہ کی دوستی کا وعدہ کر چکی ہیں لیکن اگلے ہی لمحے میرا یہ آخری بھرم بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی ہمیشہ کے لیے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وجہ یہ آپی کا گلابی چہرہ جو طاہر بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے کرتے شرم سے سرخ انگارہ بن چکا تھا جھکا ہوا تھا، انہوں نے دھیرے سے پلکیں اٹھائیں اور آہستہ سے لب کھولے۔

”وجیہہ کی طرف سے ہاں ہے.....“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے زمین مجھ پر پلٹ دی ہو یا پھر آسمان خود میرے سر پہ آگرا ہو۔ آنسو میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ بہنے لگے تھے اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چیخوں کہ یہ زمین یہ آسمان سب پھٹ جائے۔ میرے ہاتھ سے میرا کارڈ جانے کب کا گر چکا تھا۔ میں جلدی سے منڈیر سے پلٹا اور ایک ہی جست میں تین چار سیزھیاں اترتا ہوا، تیزی سے دوڑتا ہوا وہاں سے باہر کی جانب بھاگا۔ میری آنکھیں میرے بہتے آنسوؤں سے دھندلائی جا رہی تھیں اور مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے میں نے محن کا دروازہ کھولا اور کس طرح میں باہر نکلا۔ میں دوڑتا جا رہا تھا اور آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر میرے دامن کو بھگوتے جا رہے تھے۔ پتہ نہیں راستے میں کس کس نے مجھے یوں روتے ہوئے دیوانہ وار دوڑتے ہوئے دیکھا ہوگا لیکن اس وقت مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور سیدھا جا کر اپنے بستر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ ساری رات میرے آنسو میرے تکیے کو بھگوتے رہے۔ جس لڑکی کی خاطر میں نے اپنے ماں باپ، بہن بھائی، اپنا گھر، اپنے سارے دوست چھوڑ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا تھا آج اسی نے میرے دل کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ساری رات میں بستر میں منہ چھپائے ہڑکتا رہا اور جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن وقت یوں پر لگا کر اڑا کہ پتہ ہی نہیں چلا اور سہ پہر کے تین بج گئے۔ ابا نے میرا سوٹ کیس اور اپنا بیگ سنبھالا۔ امی صحن میں برآمدے کے قریب کھڑی اپنے آنسو ہم سب سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی اماں، نانی اماں سب کزنز صحن میں جمع تھے۔ گلی میں میرے دوست یوں افسردہ سی شکل بنائے کھڑے تھے جیسے کو توالی سے کوئی حوالدار میری گرفتاری کے لیے آیا کھڑا ہو۔ امی نے مجھے گلے لگا کر آخری بار پیار کیا اور ہزار دفعہ کی کی ہوئی نصیحتیں پھر سے دوبارہ دہرائیں کہ وہاں تیز سے رہنا، کسی سے جھگڑنا نہیں، کھانا وقت پر کھالینا، اداس نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ جب کہ اس وقت وہ خود سب سے زیادہ اداس تھیں۔ آخر میں ضبط نہیں کر سکا اور جب انہوں نے مجھ کو خود سے جدا کرنا چاہا تو میں پلک کر رو پڑا۔ امی ارے ارے کرتیں اور میرے آنسو صاف کرتے کرتے خود بھی رو پڑیں ساتھ کھڑی عمارہ بھی جو جانے کب سے میرا ہاتھ تھامے کھڑی تھی وہ بھی رو پڑی۔ بڑے بھیا بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور وہ بھی سکھنے لگے۔ اب منظر یہ تھا کہ امی مجھے پلٹائے رو رہی تھی اور عمارہ اور فاری بھیا مجھ سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے عمارہ اور فاری بھیا سے اور انہیں مجھ سے کس قدر پیار تھا۔ ہم تینوں تو ایک جسم کی طرح تھے اور قدرت

ہمارے ساتھ ایسا کیوں کر رہی تھی، وہ اس جسم کا ایک حصہ ان سے دور کیوں لے جانا چاہتی تھی۔ میرا بس چلتا تو میں قیامت تک کسی بھی بچے کو اس کے بہن بھائیوں سے جدا نہ کرنے دیتا اس بے رحم تقدیر کو، لیکن افسوس قسمت کی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہی کب ہیں۔ انہیں ہلانے والا تو کہیں اور بیٹھا ہوتا ہے اور شاید اسے ہمارے بہن بھائیوں، دوستوں اور ماں کے جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔

بڑی مشکل سے ابانے مجھے امی سے علیحدہ کیا۔ عمارہ اور بھیا نے ضد پکڑ لی کہ وہ دونوں بھی مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے جائیں گے۔ گلی میں تانگہ آچکا تھا لہذا ابانے میرا سامان تانگے پر رکھوایا۔ محلے کے چند بڑے پہلے ہی ریلوے پر بوگی میں میری اور ابا کی نشست پکڑنے کے لیے اسٹیشن پہنچ چکے تھے۔ راجہ، بالے، گدو، پپو اور ننھو وغیرہ اپنی اپنی سائیکلیں سنبھالے گلی میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ امی نے دروازے میں کھڑے کھڑے میری جانب الوداع کا ہاتھ بلایا۔ ان کی آنکھوں سے اب بھی آنسوؤں کی بوچھاڑ جاری تھی جسے وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے پونٹھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ تانگہ مڑنے سے پہلے میں نے گلی کے کنارے آخری مرتبہ امی کی جانب دیکھ کر ہاتھ بلایا اور پھر امی میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اسٹیشن پر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی میرے دوستوں کا جھوم پھینچ چکا تھا۔ ٹرین جانے کو تیار تھی اور اسٹیشن پر ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ راجہ اور باقی سبھی اپنے اوپر بہت ضبط کر کے کھڑے تھے لیکن جب میں ان سے گٹھل کر ٹرین پر چڑھنے لگا تو ان میں سے کوئی بھی اپنی آنکھیں خشک نہ رکھ سکا۔ راجہ نے آخری دفعہ میرے کان میں کہا۔

”مت جایا رادی، چل، ہم سب یہاں سے بھاگ چلتے ہیں۔“

میں نے دھیرے سے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔ بالے کو میں نے دھیرے سے کہا کہ جب کبھی کوئی نیا برانڈ پی کر کش لگائے تو مجھے ضرور یاد کرے۔ پپو اور گدو کو تسلی دی کہ میں وہاں سے بھی ان کے لیے نقل کے ”بھڑے“ بنا کر بھیجتا رہوں گا۔ ننھو ان سب میں سب سے زیادہ کم زور دل تھا اور باقاعدہ سو سوں کر کے رو رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھ سے وعدہ کرے کہ آئندہ جب غفور پچا کی ”مرغیاں اڑائے گا“ تو کبھی چھوٹے چوزوں کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ننھو نے روتے روتے وعدہ کیا۔ عمارہ نے آگے بڑھ کر اپنی مٹھی کھولی اور اپنا سپر مین کی شکل والا سب سے پیارا شاپر میری جیب میں ڈال دیا۔ یہ وہ پنسل تراش تھا جسے عمارہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ اسے پار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کامیابی نصیب نہیں ہو سکی تھی اور آج عمارہ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ شاپر میری جیب میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی پلکیں پونچھ ڈالیں۔ فاری بھیا بھی میرے لیے اپنا پسندیدہ مفلر لے کر آئے تھے۔ سرخ اور نیلے رنگ کی دھاریوں والا یہ مفلر مجھے اس لیے بہت پسند تھا کیونکہ ایک مرتبہ جب میں فاری بھیا سے چھپ کر یہ مفلر پہن کر وجوآپی کے گھر گیا تھا تو انہیں میرے گلے میں پڑا یہ مفلر بہت اچھا لگا تھا اور انہوں نے خاص طور پر مجھے کہا تھا کہ ”آدی تم اس مفلر میں بہت پیارے لگ رہے ہو۔“

لیکن فاری بھیا نے دوبارہ مجھے اس مفلر کو چھونے تک نہیں دیا تھا اور آج انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر یہ مفلر میرے گلے میں ڈال دیا تھا۔ میرے سارے دوست بھی میرے لیے بہت سی چیزیں لائے تھے جسے راجہ نے کانڈ کے ایک بڑے سے تھیلے میں ڈال کر میرے حوالے کر دیا تھا۔ اتنے میں ٹرین نے آخری سیٹی بجائی۔ ٹرین پہ چڑھنے سے پہلے فاری بھائی کا دیا ہوا مفلر گلے میں ڈالتے ہی مجھے قوآپی کی یاد اس بری طرح سے

آئی کہ میرے قدم ڈمگ سے گئے۔ میں کل رات ان کے گھر سے آنے کے بعد دوبارہ ان کی طرف نہیں گیا تھا۔ راجہ کے لاکھ کہنے پر بھی میں نے آج آنے سے پہلے ان کے گھر کی جانب رخ بھی نہیں کیا تھا لیکن اب جاتے جاتے جانے کیوں دل ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے مچلا جا رہا تھا..... کٹ رہا تھا۔

ٹرین کو ہلکا سا دھکا لگا اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم میری نظروں کے سامنے سے سرکنے لگا۔ ابا بھی اوپر چڑھ آئے۔ سب لوگ پلیٹ فارم پہ کھڑے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ٹرین دھیرے دھیرے کھسک رہی تھی۔ میں اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو خود سے دور جاتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی مجھے یوں لگا کہ جیسے میری آنکھوں کو کوئی دھوکا ہوا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے دن میں بھی خواب دیکھنے کی عادت ہوتی جا رہی ہے لیکن نہیں، وہ خواب نہیں تھا۔ اسٹیشن کے داخلی راستے سے ڈوآ پی اپنی کالی شال لپیٹے تیزی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ ہاں..... وہی تو تھیں، میں نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑیں۔ ہاں ہاں..... وہ ڈوآ پی ہی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے غیاث چچا بھی ہڑبڑائے اور شپٹائے ہوئے سے تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں شاید اس سامان کا تھیلا تھا جو ڈوآ پی نے میرے لیے خرید خرید کر جمع کیا تھا۔ ڈوآ پی کی اب تک مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی سامنے کھڑے راجہ کے پاس پہنچیں جواب باقاعدہ رو رہا تھا، انہوں نے راجہ سے غالباً میرے بارے میں پوچھا۔ راجہ نے جواب میں صرف اپنی انگلی اس ڈبے کی جانب اٹھادی جس کی کھڑکی میں سے میں سر باہر نکالے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ ڈوآ پی سے پہلے غیاث چچا ساری صورت حال کو سمجھ گئے اور انہوں نے بھاگ کر بوگی کے دروازے میں کھڑے ابا کو اپنے ہاتھ میں پکڑا تھیلا تھا دیا اور تیزی سے چلتے چلتے ابا کو چند رخصتی کلمات کہہ دیئے۔ ڈوآ پی کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بے چینی سے میری جانب لپکیں لیکن تب تک ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور ان کے نازک قدم اس بڑھتی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے میری جانب دیکھ کر اپنا ہاتھ بلایا اور دور ہی سے خیالی طور پر میرے بال بکھیر کر اپنی ناک اس طرح دبائی جیسے وہ میری دبا تی تھیں۔ میرے لیے آج وہ خود بلی بن گئی تھیں۔ میری آنکھوں سے ٹپ آنسو گر رہے تھے لیکن میں ڈوآ پی کی جانب دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے بھی اپنا ہاتھ ان کی جانب ہلا دیا۔ ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم چھوڑتے جا رہی تھی۔ ڈوآ پی دور کھڑی ہاتھ ہلاتی میری نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔ میرے دوستوں کا گروپ، عمارہ اور بھیا مزید پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ سب بھی دیوانوں کی طرح میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مجھے الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا الوداع تھا جس نے پہلی مرتبہ ہی میں میری روح کو کاٹ کر جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میری زندگی میں بہت سے ”الوداع“ آئے اور ہر الوداع نے میری پہلے سے تقسیم روح کے مزید پرزے کر دیئے لیکن اس پہلے الوداع کی کاٹ ساری زندگی میرا پیچھا کرتی رہی جیسے کسی بے رحم شکاری کا اندھا تیر کسی گھائل غزال کا پیچھا کرتا ہے۔

ڈوآ پی کی آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں میں شام کے ڈوبتے سورج کی آخری کرن لمحہ بھر کو چمکی۔ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا۔ ڈوآ پی کا ہاتھ ہلاتا سراپا دھیرے دھیرے ایک نقطے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تیز ہوا میرے چہرے کو چھو کر میرے بہتے آنسوؤں کو بھی اڑا کر لے جا رہی تھی اور اس کے تھپڑے شاید میرے آنسوؤں کو واپس اُسی سمت لے کر اڑے جا رہے تھے جہاں میرا دل اب بھی اٹکا ہوا تھا۔ ڈوآ پی کا سراپا اب مکمل

عائب ہو چکا تھا لیکن جانے کیوں مجھے آس پاس ہر چہرے میں انہی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہر آنکھ ان کی بھیگی آنکھوں کی طرح لگ رہی تھی۔ میں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔

جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی

میری آنکھیں ہوں گی

جتنے چہرے اچھے ہوں گے

میرے چہرے ہوں گے

اتنی آنکھیں

اتنے چہرے

کیسے یاد رکھوں گے.....؟

ٹرین تیزی سے دوڑتی ہوئی میرے چھوٹے سے شہر کو پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔

طاہر جاوید غل کے قلم سے جہانی استاد
کی ہنگامہ خیز سرگزشت

پندرہواں حصہ شائع ہو گیا ہے

ثناوان

قیمت فی حصہ 60/- روپے

مکمل ایک تاپندر حصے دستیاب ہیں

﴿اردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی

کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش دُوسرا دور کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش جنٹلمین بسم اللہ

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

ابا جب مجھے لیے کیڈٹ کالج کے گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں۔ بورڈنگ کیا تھا پورا ایک شہر ہی تو تھا، صرف داخلے والی عمارت ہی اتنی بڑی تھی کہ اس میں ہمارے ہائی اسکول جیسے تین اسکول آجائیں۔ بڑی بڑی لمبی اور کشادہ سڑکیں جس کے دونوں اطراف لمبے لمبے درخت اس طرح ایستادہ تھے کہ دھوپ زمین تک پہنچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ ہمارے محلے سے بھی بڑے کئی گھاس کے میدان جن میں بیک وقت کئی مالی کام کر رہے تھے۔ سچ پوچھیں تو ایسی جگہ اس دن سے پہلے میں نے صرف ریگل سینما میں چھپ کر دیکھی گئی انگریزی فلموں میں دیکھی تھی۔ بڑی بڑی سی لمبی لمبی چمکدار راہداریاں جن کے سنگ مرمر کے فرش پر کوئی اپنا چہرہ بھی دیکھنا چاہتا تو اسے مایوسی نہ ہوتی۔ بہت سے لوگ فوجی لباس میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ گھاس کے میدانوں سے گزرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک جانب بہت بڑا سائلا ب تھا جس کا نیلا پانی دوڑ رہی سے جگمگا رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ اسے سوئمنگ پول کہتے ہیں۔ دوڑ ایک میدان میں بہت سے گھڑسوار گھوڑے دوڑانے کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ یہاں گھڑسواری سکھانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ سب سے پہلے ہمیں پرنسپل صاحب کے کمرے میں لے جایا گیا۔ پرنسپل نے ابا کو بہت مبارکباد دی کہ ان کے بیٹے کو ملک کے سب سے اعلیٰ ادارے میں پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے ابا کو یقین دلایا کہ یہاں ان کا لاڈلا بیٹا بہت آرام سے اپنے گھر کی طرح رہے گا۔ کاش مجھے اس وقت پتہ ہوتا کہ پرنسپل صاحب کا ”آرام“ سے کیا مطلب ہے تو میں اسی وقت وہاں سے دوڑ لگا دیتا لیکن اس وقت تو میں پرنسپل کے عالی شان آفس کی چیزوں کو دیکھنے میں ہی اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے ان کی باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ پھر ہمیں کالج کی انتظامیہ اور ہماری ”ہونے والی“ جماعت کا حصہ بھی دکھایا گیا۔ اسمبلی ہال اور اپنی جماعت دیکھ کر تو میری آنکھیں پھٹی ہی رہ گئیں۔ کلاس روم کیا تھا پورا ایک چھوٹا سا سینما ہال ہی تو تھا۔ جس میں کرسیاں بھی سینما کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک بڑا سا اسٹیج تھا جس کی دیوار پر بلیک بورڈ اور ٹیچر کے کھڑے ہونے کے لیے لکڑی کا ایک بڑا سا ڈبہ (روسٹرم) پڑا ہوا تھا۔

اتنی دیر میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ پتہ چلا یہاں کھانے والے کمرے کو میس کہتے ہیں۔ کچھ اور بچوں کے والدین بھی ہمارے ساتھ ہی میس کی جانب چل پڑے۔ میرا خیال تھا کہ میس بھی کوئی بڑا سا کمرہ ہوگا جس میں بڑا سا دسترخوان ڈالا ہوا ہوگا جہاں ہم سب گھر کی طرح بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور شکر ادا کر کے اٹھ جائیں گے۔

لیکن میس میں داخل ہوتے ہی ایک ساتھ بہت سے جلتے ہوئے فانوسوں کی روشنی سے میری آنکھیں چند لمحوں کے لیے یوں چمکھیں

گئیں کہ پہلے تو مجھے کچھ نظر ہی نہیں آیا پھر جب چند لمحوں کے بعد میری بینائی بحال ہوئی تو مجھے یوں لگا کہ میں رنگ و نور کے کسی سمندر میں کھڑا ہوں، وہ اتنا عظیم الشان ہال تھا کہ اس کی چھت دیکھنے کے لیے مجھے اپنا پورے کا پورا سر آسمان کی جانب اٹھانا پڑتا تھا۔ ہال کی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے آخری میز نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ چاروں طرف باوردی بیرے سفید لباس پہنے اور سر پر سرخ پگڑیاں سجائے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے لیے ادھر ادھر مستعدی سے بھاگے پھر رہے تھے لیکن چاروں طرف میز کرسیاں ہی لگی نظر آرہی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم کہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے؟ حالانکہ میس کا سفید فرش دھلے پانی کی طرح شفاف تھا لیکن وہاں دسترخوان کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ یہاں میز کرسی پر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا جاتا ہے۔ مجھے الجھن تو بہت ہوئی لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ میں نے آج تک کبھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ ایک مرتبہ میں اور عمارہ ہوٹل کھیل رہے تھے تو امی نے ہم دونوں کو کھڑے ہو کر دانتوں سے روٹی چبانے پر ایک ایک زوردار دھپ بھی جڑی تھی کہ اس طرح کھانا رزق کی توہین ہوتی ہے لیکن یہاں تو سبھی رزق کی پوری نہیں تو کم از کم آدھی توہین تو کر رہے تھے، کیونکہ ان اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھنا مجھے ”آدھے کھڑے ہونے“ کے برابر ہی لگ رہا تھا۔ اوپر سے ایک اور مصیبت میرے سر پر آکھڑی ہوئی جیسے ہی میں نے پہلا نوالہ توڑا ایک باوردی بیرا میرے بالکل سر کے قریب آکر مڑوب کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میں کسی چیز کی جانب ہاتھ بڑھاتا وہ جلدی سے مجھ سے پہلے اسے اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیتا پھر مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھنے لگتا۔ میں سمجھا شاید یہ بے چارہ بھی بھوکا ہے اور خود اپنے منہ کچھ مانگنے سے شرماتا ہے لہذا میں نے خود آدھی روٹی توڑ کر اور تھوڑا سا سالن رکھ کر اس کی طرف بڑھادیا لیکن اس نے نہ جانے کیوں گھبرا کر منع کر دیا حالانکہ میں نے اسے اشارہ بھی کیا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ چپ چاپ یہیں میز کے نیچے بیٹھ کر جلدی سے کھالے لیکن وہ بے چارہ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اس نے جلدی سے روٹی واپس پلیٹ میں رکھ دی اور مجھ سے کہنے لگا کہ ”سر میں یہاں آپ کی ہیلپ کرنے کے لیے کھڑا ہوں۔“ ”لو بھلا.....“ کھانے میں بھی کسی کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے؟ یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور میں بھاگ کر ابا کے پاس آ گیا جو دوسری میز پر والدین والے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ابا سے بھی اس شخص کی شکایت کی کہ وہ سارا وقت میرے سر پر کھڑا رہا اور اس کی وجہ سے میں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ میں نے ابا سے کہا کہ مجھے باہر کسی ٹھیلے سے کچھ کھانے کو دلوادیں کیونکہ میری بھوک نہیں مٹی تھی لیکن ابا کا جواب سن کر میرے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں ٹھیلے نہیں ہوتے صرف ایک بڑی سی کینٹین ہے کیڈٹس کے لیے جو صرف شام کو کھلتی ہے اور یہ جو شخص میرے سر پر منکر نکیر کی طرح کھڑا تھا اس قسم کے لوگ ہمیشہ کھانا کھاتے وقت میرے سر پر کھڑے رہیں گے کیونکہ یہاں ہر کیڈٹ کے لیے ایک ایسا بیرا مخصوص ہے جو کھانے کے وقت کیڈٹ کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔ میں نے وہیں اپنا سر پیٹ لیا، کیونکہ میں شروع سے کسی کے سامنے کچھ بھی کھانے میں بہت شرم محسوس کرتا تھا۔ وجوہ اپنی بھی جب کبھی میرے لیے کچھ خاص بناتی تھیں تو میں پہلے ان سے آنکھیں بند کرنے کا کہتا اور پھر جلدی سے کھالیتا۔

کھانے کے بعد ہم سب کو بتایا گیا کہ کچھ ہی دیر میں ہمیں ہمارے ہاسٹلز میں لے جایا جائے گا جہاں ہمیں ہمارے ”کٹ نمبر“ اور ”سٹ بیگ“ جاری (Issue) کیے جائیں گے۔ گویا یہاں کا یہ بھی ایک دستور تھا کہ ہر کیڈٹ کا کسی جیل کے قیدی کی طرح مخصوص ایک نمبر ہوتا ہے جو اگلے چھ سال تک اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے اور اسے اس کے نام سے نہیں بلکہ اس کٹ نمبر سے پکارا اور بلایا جاتا ہے۔ کیا بے ہودہ رواج تھا یہ بھی.....

بہر حال کٹ نمبر تو سمجھ میں آ گیا پر یہ ”کٹ بیگ“ کیا ہوتا ہے؟

کچھ ہی دیر میں ہم اپنے اپنے ہاسٹلز میں موجود تھے۔ مجھے ”محمد بن قاسم“ ونگ الاٹ کیا گیا تھا جہاں میری سب سے پہلی ملاقات ایک جابر طبیعت ہاؤس ماسٹر فہد صاحب سے ہوئی۔ انہوں نے میرے ساتھ آنے والے چند اور کیدٹس کو جھاڑ کر ایک جانب بٹھادیا اور خود ہمارے والدین کے ساتھ ضروری کارروائی کے لیے اپنے دفتر چلے گئے۔ ہمیں جس لمبے سے کمرے میں بٹھایا گیا تھا اس میں بارہ بستر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ ہر بستر کے ساتھ ایک میز اور کرسی بھی لگی ہوئی تھی اور بارہ الماریاں بھی دیوار میں نصب تھیں۔ اس لمبے کمرے کو وہاں ”ڈارمیٹری (Dormetry)“ کہتے تھے۔ ہمیں ہمارے بستر الاٹ کر دیئے گئے اور کچھ ہی دیر میں ہماری ڈارمیٹری کا خاص خدمت گار (بٹ مین) کچھ ہی دیر میں ہر لڑکے کے لیے ایک بوری میں بہت سا سامان بھر کے لے آیا۔ پتہ چلا کہ اسی بوری کو کٹ بیگ کہتے ہیں۔ اس کے اندر سے ہمارے فوجی بڑے جوتے، پنی ٹی شوز، ہمارے یونیفارم، نیچرز، بیلٹ، پنی ٹی اور پریڈ کا لباس، بنیا میں، نیکر اور جانے کیا کیا الم غلم برآمد ہوا۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی مزید لباس بھی ملیں گے جن میں شام کو باہر جانے کا لباس (Evening Walking Out) اور رات کو کھانے کے لباس (Dinner Out) اور سونے کے لباس بھی شامل ہیں۔ میری تو یہ سن کر ہی جان نکل گئی تھی کہ یہاں صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے کے وقت تک تقریباً آٹھ لباس بدلنے پڑتے ہیں۔ کالج نہ ہوا گویا کسی درزی کی دوکان ہو گیا۔ وہاں گھر میں تو ہم بمشکل اسکول کی وردی ہی امی کی لاکھ منتوں کے بعد تبدیل کرتے تھے اور وہ بھی تب اگر جی مانتا تو، ورنہ اگلے دن اسکول جانے تک اسی وردی کو چڑھائے رکھتے تھے۔ یہاں کی سب سے بُری بات یہ پتہ چلی کہ یہاں پر اپنے سارے جوتے خود ہی پالش کرنا پڑیں گے۔ میں نے آج تک کبھی خود اپنے جوتے پالش نہیں کیے تھے۔ گھر میں تو امی میرے جوتے پالش کر دیا کرتی تھیں یا پھر عمارہ یا بڑے بھیا کو ڈانٹ ڈپٹ کر میرے جوتے بھی پالش کروادیا کرتی تھیں۔ میں اپنا سر پکڑے اپنے سامنے پڑے کالے، سفید جوتوں کے انبار کو دیکھ رہا تھا۔ ہمارے بٹ مین جس کا نام جمعہ خان تھا، نے ہمیں یہ بات بتا کر مزید ڈرا دیا کہ یہاں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے سینئرز کے جوتے بھی پالش کرنے پڑتے ہیں اور نہ کرنے پر ٹھیک ٹھاک سزا ملتی ہے۔ میرے ذہن میں فوراً جھماکا ہوا اور گڈو کی کبی ہوئی بات یاد آگئی کہ یہاں سزا کے طور پر صرف نیکر پہنا کر باہر کھڑا کر دیتے ہیں۔ میں نے جلدی سے کٹ بیگ میں سے اپنا سفید نیکر نکال کر دیکھا۔ خاصہ ڈھیلا ڈھالا تھا، اس میں تو مجھ جیسے دو مزید آدمی آسکتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ یہاں ہر بچے کو اپنا بستر خود ہی لگانا اور اٹھانا پڑتا ہے۔ کیسی واہیات جگہ تھی یہ؟ گھر میں تو صبح اٹھ کر میں ایک لات مار کر اپنی رضائی یا کیمبل کو ہوا میں اچھال دیتا تھا اور پھر امی بے چاری سارا دن میری بکھرائی ہوئی چیزیں سنبھالتی رہ جاتیں۔

اب شام ڈھلنے کو تھی، میری بئرک کے گیارہ بچے پورے ہو چکے تھے لیکن ایک بستر ابھی تک خالی تھا، بتایا گیا کہ یہ ہمارے پریفیکٹ Prefect کا بستر ہے یعنی وہ سینئر اور اگلی کلاس کا بچہ جو ہم سب گیارہ بچوں کا مانیٹر انچارج ہوگا۔ میں نے دل میں سوچا ”لو جی..... اب یہ ایک اور نئی مصیبت ابھی باقی ہے۔ پتہ نہیں اب یہ کون سا نمونہ ہوگا۔“

اتنے میں ہاؤس ماسٹر نے آکر ہم سب کو حکم دیا کہ ہمارے والدین نے ضروری کاغذات اور فارم وغیرہ بھر دیئے ہیں اور اب ان کے جانے کا وقت ہو چکا ہے لہذا ہم سب باہر والے لان میں آکر اپنے والدین اور پیاروں سے مل جائیں کیونکہ اب ان کے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ

سننے ہی میرا دل ڈوب سا گیا۔ صبح سے اب تک میں ان ہنگاموں میں الجھایہ بھول ہی گیا تھا کہ ابانے واپس بھی جانا ہوگا۔

سب بچوں میں کھلبلی سی مچ گئی اور سب سے پہلے میں باہر کی جانب دوڑا۔ ابا ہوٹل کے باہر گھاس کے کلڑے پر بچے لکڑی کے بنجوں میں سے ایک پر بیٹھے جانے کس سوچ میں گم تھے۔ میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیئے۔ جانے کیوں اس لمحے وہ مجھے بالکل ایک ”نئے ابا“ دکھائی دیئے۔ شاید وہ میری آنکھوں کا واہمہ ہی ہو، پر چند لمحوں کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے میں نے ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے مجھے میرے ہاتھوں سے تھام کر وہیں بچ پر اپنے ساتھ ہی بٹھالیا۔ کچھ دیر ہم باپ بیٹا خاموشی سے بیٹھے رہے پھر ابانے ہلکے سے کھٹکار کر اپنا گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولے۔

”آدی بیٹا..... اب مجھے واپس جانا ہوگا۔“

حالانکہ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ وہ جانے والے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر مٹل دیا ہو، آنسو میرے حلق میں کڑواہٹ بھرنے لگے۔ ابانے مجھے بہت سی باتیں سمجھائیں کہ اب مجھے انہی لوگوں کے درمیان رہنا ہوگا۔ میں وہاں واحد بچہ تھا جو حکومت کے خرچے پر پڑھنے آیا تھا ورنہ باقی سبھی بچے امیر کبیر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ میری طرح اس بوسیدہ ٹرین کی بجائے اپنی اپنی شان دار اور عالی شان گاڑیوں میں وہاں آئے تھے۔ ابا مجھے یہی سمجھانا چاہ رہے تھے کہ میری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور مجھے یہاں رہ کر اپنے آپ کو اتنے مہنگے ادارے میں پڑھنے کا حق دار ثابت کرنا ہوگا کیونکہ اگر میں فیل ہو گیا تو حکومت مجھے واپس گھر بھجوادے گی۔ وہ سب انگریزی میڈیم اسکولوں کے بچے تھے اور ان میں واحد میں ہی ایسا بچہ تھا جو اردو میڈیم اسکول سے آیا تھا اور شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ شاید ابا وہاں آ کر میری اور دوسرے بچوں کی حیثیت دیکھ کر اداس ہو گئے تھے۔ میں ایک چھوٹے سے شہر سے تعلق رکھتا تھا جبکہ وہ سارے بچے بڑے بڑے شہروں سے آئے تھے، بلکہ دو بچے تو ایسے بھی تھے جنہیں بیرون ملک سے یہاں داخلہ دیا گیا تھا۔ ایسی ہی کتنی باتیں اس روز ابانے جاتے جاتے مجھے سمجھائیں لیکن میرا ذہن تو ان کی روانگی میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پہ قابو رکھا ہوا تھا لیکن جب وہ حتمی طور پر جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میری آنکھیں بھیگنے لگیں، میں نے جلدی سے اپنی قمیص کے کف سے اپنی آنکھیں رگڑ لیں تاکہ ابا کو میرے آنسو نظر نہ آسکیں۔ ابانے آخری بار میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر مجھے پیار کیا اور جانے کے لیے پلٹے اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ خود ابا بھی مجھ سے اپنی آنکھیں چھپا رہے ہیں۔ میں نے آج تک انہیں ایک سخت گیر باپ کے روپ میں دیکھا تھا جن کے گھر میں گھستے ہی ہم بچے اپنی آواز دھیمی کر لیا کرتے تھے لیکن اس روز مجھے پتہ چلا کہ ان کے اس سخت خول کے اندر کتنا نرم دل باپ سانس لے رہا ہے۔ ہم بچے اپنے والدین اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو جانتے جانتے جان لیتے ہیں..... پر افسوس تب تک بہت سا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

جاتے جاتے ابانے ہوٹل کے کلڑ پر رک کر مجھے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا، بس یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا اور جیسے ہی ابا ہاتھ ہلا کر اوجھل ہوئے میں ہلکے بلک کر رو پڑا۔ ابا کے مڑتے ہی میں بھاگ کر اس موڑ تک گیا جہاں سے ابا اوجھل ہوئے تھے اور چھپ کر انہیں دیکھنے لگا، ابا اوجھل سے قدموں سے واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان کے سامنے نہ رونے کا بھرم تو کسی نہ کسی طور

جوڑے رکھا لیکن اب مجھے رونے سے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں نے آس پاس دیکھا تو ساتویں جماعت میں داخل ہونے والے بھی بچے اپنے ماں باپ کو جاتا دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ان انگشت میڈیم بچوں کو یوں روتا دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ چلو کم از کم کسی ایک جگہ تو ہم سب برابر تھے۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اس طرح سوز میں صرف ہم اردو میڈیم بچے ہی روتے ہوں گے۔ رفتہ رفتہ کئی بچوں کے والدین کسی نہ کسی ”بہانے“ وہاں سے چلے گئے اور پیچھے ہم سب بچوں کو کورس میں رونے کے لیے چھوڑ گئے۔ ہر بچے نے اپنے رونے کے لیے اپنی پسند کی جگہ منتخب کر لی تھی اور اب کوئی درخت سے لپٹ کر، کوئی بچ کے اوپر، کوئی بچ کے نیچے لیٹ کر اپنی اپنی تان میں رو رہے تھے، کچھ بے شرم قسم کے بچوں نے تو وہیں سڑک پر لیٹ کر ٹانگیں چلانا شروع کر دیں تھیں۔ اکیڈمی کے احاطے میں چھ ہاسٹل تھے اور کبھی کے سامنے اس وقت ”قیامت“ کا سماں تھا۔ تمام ہاسٹل کے پیرے، بٹ مین اور انتظامیہ جو پہلے ہی سے اس قسم کے حالات کے لیے تیار رہتے تھے ان بچوں کو بہلانے کی کوشش کر کے انہیں اندر لے جا رہے تھے۔ میں بھی اپنے بہتے آنسو میٹنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ ایک بچہ کہیں سے دوڑتا ہوا آیا اور کسی اور کو سامنے نہ پا کر مجھی سے لپٹ گیا اور زور زور سے دھاڑیں مارنے لگا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے خود سے علیحدہ کیا اور اسے بتایا کہ میں تو خود متاثرین میں سے ایک ہوں اور ابھی تک تو خود میرا ”رونا پروگرام“ ختم نہیں ہوا۔ وہ اسفر تھا۔ بیرک میں میرے بستر کے ساتھ والا بستر اسی کا تھا۔ بہر حال اس وقت ہم دونوں کا درد مشترک تھا اور اسی درد مشترک نے ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جو آگے چل کر ہماری لازوال دوستی کی صورت میں نمودار ہونے والا تھا۔

کچھ ہی دیر میں رات بھی ہو گئی۔ اب ہمارے سینئرز بھی آچکے تھے۔ ہر ہاسٹل میں ساتویں سے لے کر بارہویں جماعت تک کے سبھی کیڈٹس کے لیے الگ الگ ڈارمیٹریاں (بیرکیں) موجود تھیں اور بارہویں جماعت کے کیڈٹس کے علاوہ باقی سبھی جماعتوں کی بیرک میں ایک سینئر کیڈٹ بطور پرفیکٹ بھی رہتا تھا۔ مثلاً ساتویں جماعت کے لیے آٹھویں جماعت کا کیڈٹ، آٹھویں کے لیے نویں کا اور نویں جماعت کے لیے دسویں جماعت کا کیڈٹ بطور انچارج رہتا تھا۔ ہمارے انچارج پرفیکٹ کا نام اسرار تھا اور وہ آٹھویں جماعت کا کیڈٹ تھا، اس نے آتے ہی ہم سب کے سب گیارہ بچوں کو ایک لائن میں کھڑا کروا دیا اور سب کے نام پوچھے، کچھ دیر خواہ مخواہ کا رعب ڈالنے کی کوشش کی اور ہمیں اکیڈمی کے ”رہنما اصول“ وغیرہ بتائے کہ سینئرز کو سر کہنا ہے اور سب کا حکم ماننا ہے۔ صبح ساڑھے چار بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی اٹھنا ہوگا اور پریڈ ٹی ٹی کے لیے میدان کی طرف دوڑ لگانا ہوگی، کوئی بچہ لیٹ نہیں ہوگا نہ ہی سوتا رہے گا ورنہ اسے سزا ملے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم سب بچے اکتائے ہوئے سے پرفیکٹ سر کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ بچے ابھی تک سو سوں کر کے سڑک رہے تھے۔ اس وقت اگر ہم گیارہ بچوں کا بس چلتا تو ہم سب مل کر اس ”پرفیکٹ“ کے ”بچے“ کو ایسا سبق سکھاتے کہ وہ یاد رکھتا۔ اتنی دیر میں رات کے کھانے کی گھنٹی بج گئی اور ہم سب بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے میس کی جانب چلنے کا ”حکم“ دے دیا گیا۔

اس بار میس کا منظر بھی کچھ اور تھا۔ تمام میس کیڈٹس سے بھرا ہوا تھا اور ہر جانب ڈزرسٹ میں ملبوس سینئر اور جونیئر کیڈٹس اپنی اپنی کرسیوں کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھ سمیت کچھ بچے جو کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے، ان کے پرفیکٹس نے انہیں گھور کر کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور

ہم ہڑا کرواپس کھڑے ہو گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ابھی سب سے سینئر کیڈٹ جنہیں وہاں ایس۔یو۔او (S.U.O) سینئر انڈر آفیسر کہا جاتا ہے اور جو بارہویں جماعت کے کیڈٹ ہوتے ہیں، وہ تشریف لائیں گے اور باقاعدہ کھانے کا اعلان کریں گے تب ہم کھانا شروع کر سکیں گے۔ آخر کار ایس۔یو۔او صاحب تشریف لائے جن کی کرسی چند اور کرسیوں کے ساتھ ہال کے درمیان ایک اونچے اسٹیج پر لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے آکر میز پر پڑا مائیک اٹھایا اور زور سے کہا۔ ”جنٹلمین بسم اللہ.....“ پتہ نہیں ان جادوئی الفاظ میں ایسا کیا اثر تھا کہ سبھی کیڈٹ فوراً کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور کھانا شروع ہو گیا۔

یہ کھانا میرے لیے ایک نیا امتحان تھا۔ میز پر چھری، کانٹے، مکڑی کی پتلی ڈنڈیاں (اسٹک) لمبی لمبی نلیاں (اسٹراز) اور جانے کون کون سے ”اوزار“ پڑے ہوئے تھے اور سبھی کیڈٹس کو انہی ”اوزاروں“ کے ساتھ کھانا کھانا تھا۔ باقی کیڈٹس نے تو بڑی سہولت سے اپنے لیے کھانا نکال لیا اور چھری کانٹوں سے کھانے لگے لیکن مجھے تو ان چیزوں کا استعمال تو دور، انہیں ٹھیک طرح سے پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں تو ہم سب زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے۔ میں ابھی ان چھری کانٹوں اور دیگر سامان کو الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ وہی سینئر کیڈٹ دوبارہ کھڑا ہوا اور اس نے مائیک پر آکر صرف دو لفظ کہے ”جنٹلمین الحمد للہ.....“ اور یہ سنتے ہی سبھی کیڈٹس اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بیٹھا رہا کیونکہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ میرے پریفیکٹ نے دوبارہ مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ یہ جنٹلمین کون تھا جس کی پہلے بسم اللہ اور پھر الحمد للہ بھی ہو گئی تھی۔ میں تو ابھی تک بھوکا ہی تھا۔ جنٹلمین کو اگر جانا تھا تو چلا جائے پر یہ لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ کیوں گھسیٹے لیے جارہے تھے؟ میں لاکھ چینا چلایا کہ میں نے تو ابھی کھانا شروع بھی نہیں کیا ہے لیکن ان خالموں نے میری ایک بھی نہیں سنی اور مجھے دیگر کیڈٹس کی طرح قطار میں کھڑا کر کے دوبارہ ہاسٹل کی جانب ”ہنکا“ دیا گیا۔

ایک تو گھر سے اتنی دوری اور پھر بھوکے پیٹ کی یہ مصیبت.....؟ غصے اور بے بسی سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ واپسی پر پریفیکٹ نے مجھے خوب جھاڑا کہ جب جنٹلمین الحمد للہ کا اعلان ہو گیا تھا تب بھی میں کیوں بیٹھا رہا۔ میں نے غصے میں پریفیکٹ کو دیکھا اور چلایا۔ ”جنٹلمین کی ایسی کی تہی..... اگر اس کی الحمد للہ ہو گئی تھی تو اس میں میرا کیا تصور تھا۔ مجھے تو ابھی کھانا کھانا تھا۔“

میری بات سن کر پریفیکٹ غصے کے باوجود ہنس پڑا۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ میں بھی انہی جنٹلمینوں میں سے اب ایک ہوں اور میں کھانے کے لیے صرف بیس منٹ دیئے جاتے ہیں اور ہم سب جنٹلمین کیڈٹس کو انہی بیس منٹوں میں اپنا کھانا ختم کر کے الحمد للہ سنتے ہی اٹھ جانا لازم ہے۔ آج تو پہلا دن تھا اس لیے سینئر کیڈٹ نے رعایت برتی تھی لیکن آئندہ اگر میں الحمد للہ کے بعد بھی نہ اٹھا تو مجھے سزا بھی مل سکتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے اس بے ہودہ نظام پر لعنت بھیجی۔ یہ اب مجھے کس مصیبت میں ڈال گئے تھے۔ ان کی تو کوئی کل بھی سیدی نہ تھی۔ میں اپنے بستر پر بیٹھا اپنے آنے والے برے دنوں کو رو رہا تھا کہ اچانک پھر سے وہی تیز اور منحوس سیٹی کی آواز سنائی دی۔ تمام سینئر کیڈٹس میں کھلبلی سی مچ گئی اور سب باہر کی جانب بھاگے۔ پتہ چلا کہ اب سب کیڈٹس اپنے اپنے ہاسٹل کے باہر جمع ہوں گے اور ان کی رات سونے سے قبل آخری گنتی جسے وہاں ”نائٹ فالن“ (Night Fallen) کہتے ہیں، کی جائے گی۔ سو بادل خواستہ ہم چھوٹے کیڈٹس بھی گرتے پڑتے ہاسٹل کے باہر والی سڑک پر آ کھڑے

ہوئے۔ ہر ہاؤس (ہاسٹل) کا اپنا ایک سینئر کیڈٹ بھی ہوتا تھا جسے جونیئر انڈر آفیسر کہا جاتا تھا۔ وہی سب کی گنتی کرتا تھا۔ سب کیڈٹس کے کٹ نمبر پکارے جاتے اور وہ با آواز بلند اپنی حاضری ”لیس سر“ کہہ کر لگا دیتے۔ گنتی ختم ہونے کے بعد ہمیں واپس اندر ہاؤس کی جانب دھکیل دیا گیا اور اپنی اپنی بیرکس میں جانے کا حکم نامہ دے دیا گیا۔ ٹھیک رات ساڑھے دس بجے سیٹی کی آواز کے ساتھ ہی تمام ہاؤس کی بتیاں بجھادی گئیں۔ ہماری بیرک میں بھی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ہم سب بچے اپنے اپنے بستروں میں خوف کے مارے سکڑے سسٹے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ میری زندگی کی پہلی رات تھی جو میں اپنے گھر والوں سے ہزاروں میل دور، اس انجان جگہ پر، اجنبی لوگوں کے درمیان گزار رہا تھا۔ اس رات مجھے اندھیرے سے جتنا ڈر محسوس ہوا، اتنا پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ گھر میں میں اور بھیل کر اندھیرے میں عمارہ کو ڈرایا کرتے تھے اور پھر جب عمارہ ڈر کر خوف سے چپنی تھی تو میں اور بھیا خوب زور زور سے ہنستے تھے لیکن آج یہاں خود میرا دل اس اندھیرے کے خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اپنا سرا جھی طرح کمبل کے اندر چھپا لیا اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جیسے میں اپنے گھر کے بستر پہ ہی موجود تھا جہاں آس پاس امی ابا وغیرہ بھی میری حفاظت کے لیے موجود تھے۔ ابھی اس کوشش میں مجھے پوری طرح کامیابی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ اچانک میں ہلکی سی سوں سوں کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے گھبرا کر سر کمبل سے باہر نکالا تو پتہ چلا کہ اس فرمایاں اپنے پسندیدہ مشغلے یعنی آنسو بہانے میں مصروف ہیں۔ اس فر بستر پر اپنے گھنٹوں کے درمیان سردیے بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہوا.....؟ سوتے کیوں نہیں۔“ اس نے سر اٹھایا ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میری امی کو بلوادو۔“

اب میں اسے کیا بتاتا کہ خود میرا بھی خوف کے مارے برا حال ہے۔ میرے ساتھ والے دوسرے بستر پر فیصل کا بستر تھا۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد اس نے بھی آہستہ سے کمبل سے سر باہر نکال دیا۔ اس کے آنسو بھی ٹپکنے کے لیے تیار تھے۔ تیسرے بستر پر سندھی وڈیرے کا بیٹا مجید تھا، پھر موٹا اشتیاق، پھر خالد لمبا، پھر عمر، ثار، الطاف، جن کے بستر ہمارے سامنے والی قطار میں چھ بستروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے کبھی دھیرے دھیرے اٹھ بیٹھے، صرف ہمارے پریفیکٹ کے خرائے اس لمبی بیرک میں گونج رہے تھے، باقی کبھی بچے خاموشی سے ایک ہی سر میں ٹسے بہا رہے تھے۔ ہم کبھی گیارہ کے گیارہ بچے اس رات خوف اور ڈر کے ایسے سانچے درد میں بندھے ہوئے تھے جس کی کاٹ ساری زندگی میرے خون کے اندر موجود رہے گی۔ اس لمحے ہم سب کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بھری دنیا میں ہمارا اپنا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہمیں ساری عمر اسی انجانی اور ویران جگہ میں انہی اجنبی لوگوں کے درمیان رہنا ہوگا۔ غالباً یہی وہ پہلی رات تھی جس نے میری شخصیت کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا تھا جس کا ایک حصہ وہ آدی تھا جسے میں اپنے پرانے محلے میں چھوڑ آیا تھا اور دوسرا حصہ یہ آدی تھا جو دنیا کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سلجھا ہوا کیڈٹ تھا لیکن جس کے اندر پلتے خوف اور درد کو کبھی کوئی محسوس نہیں کر سکا۔ مجھے یاد آیا کہ ایسی اندھیری راتوں میں چپ چاپ امی کے پاس جا کر چھپ جاتا تھا اور وہ تھک تھک کر مجھے سلا دیتی تھیں.....

رات اندھیری، جنگل گھنا ہے

چھوڑ کے مجھ کو، نہ جاؤ ماں

شام ڈھلے کیوں گھر سے نکالا



کیا اتنا ڈر اہوں؟ بتاؤ ماں

سو کھ چلے ہیں سارے آنسو

اب تو چپ کراؤ..... ماں

ہاں ڈر بہت اندھیرے کا ہے

کیسے تمہیں بتاؤں..... ماں

کیوں ڈر کیا ہے خود سے اتنا

گھر لوٹ بھی نہ پاؤں..... ماں

سب جگ مچھوٹا، تم بھی رُوٹھیں

کیسے تمہیں مناؤں..... ماں

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

رابطہ ادبی فورم

پوری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کا مشترکہ پلیٹ فارم

<http://kitaabghar.com>

رکنیت سازی اور معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

ادبی رابطہ انٹرنیشنل کراچی

00 92 333 222 1689

raabtapk@yahoo.com

ادب اور ادیب کا ترجمان ادب کی روشن کرن

ادبی قلمکار

نئے ادیبوں کا رہنما ادارہ جو آپ کی صلاحیتوں کو

مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتا ہے۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

ادبی قلمکار کراچی

0333 222 1689

qalamkar_club@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

راجہ کی کہانی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

آدی کو گئے آج دوسری رات تھی۔ راجہ اب بھی بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ کل جب وہ باقی تمام دوستوں کے ساتھ آدی کو انٹیشن پر الوداع کہنے گیا تھا تب ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ آدی کے ساتھ ہی اس کے جسم اور روح کا آدھا حصہ بھی اسی ٹرین میں کہیں دور جا رہا تھا۔ راجہ سوچ رہا تھا کہ آج کی رات آدی کی کیڈٹ کالج میں پہلی رات ہوگی۔ جانے آدی کو تکلیف کیسا ملا ہوگا.....؟ جانے اس کا بستر آرام دہ ہوگا یا فوجیوں نے اسے بھی اپنی طرح بان کی کھری چار پائی پر سلایا ہوگا۔ آدی کو تو اپنے پسندیدہ پروں والے تکیے پر سر رکھے بغیر نیند بھی نہیں آتی تھی، جانے وہ اپنے تکیے کے بنا رات کیسے گزارے گا۔ آدی نے راجہ کو یہ بھی بتایا تھا کہ جب کبھی عمارہ اور فارسی بھیا دادی جان کے گھر رات رہنے کے لیے چلے جاتے ہیں تو اسے اس کی امی اندھیرے کمرے میں تنہا نہیں چھوڑتیں اور اپنے کمرے میں سلاتی ہیں۔

راجہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ نجانے آج آدی کو وہاں کیڈٹ کالج میں تنہا نیند آ بھی رہی ہوگی یا نہیں..... جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا یہ اس کی زندگی کی دوسری رات تھی جب وہ آدی سے ملے بغیر اور اگلے دن کا کوئی منصوبہ بنائے بغیر سونے کے لیے بستر پہ آیا ہو۔ ایک کل کی رات جب آدی ٹرین میں سفر میں تھا اور دوسری آج کی رات۔ ورنہ ایسا کبھی ہوا نہیں تھا کہ وہ دونوں رات کو اپنے اپنے گھر جانے سے پہلے کسی گلی کے ککڑ پر محلے کے بڑے میدان میں یا کالونی کے پچانک پر دیگر دوستوں سمیت نہ ملے ہوں یا انہوں نے اگلے دن کی کسی شرارت کا پروگرام نہ بنایا ہو۔ آج رات بھی گڈو، پوپنھو، بالاسمبھی تو رات تک اکٹھے ہی تھے لیکن آج ان سب کا من کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ نھو تو آدی کے ذکر پہ دوسرے دن بھی چکا تھا۔ آدی کے بنا انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس شام آسمان کے تیور بھی کچھ بدلے بدلے سے تھے۔ راجہ کو یاد آیا کہ برستی برف کی راتوں میں بھی وہ سب کسی نہ کسی طور آدی کو اس کے سخت مزاج ابا کی نظر سے بچا کر باہر بلا لی کرتے تھے اور پھر وہ سب دوست مل کر محلے کے بڑے میدان میں بڑا سا برف کا پتلا بنا کر اسے کسی گلی میں ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیتے تھے جہاں آتے جاتے راہ گیر رات کو اچانک اپنے سامنے کسی شخص کو سر پہ ٹوپی اور ہاتھ میں پیسل (جو کہ اصل میں راجہ کا کھلونا پستول ہوتا تھا) پکڑے دیکھ کر ایک لمحے کو تو سراپمہ ہی ہو جاتے تھے۔ کئی ایک تو چیختے چلاتے اٹلے پیروں بھاگ جاتے، انہی میں سے ایک سیٹھ گردھاری مل بھی تھے جو ایک رات ایک ایسے ہی برف سے پتلے سے ڈر کر یوں بھاگے تھے کہ انہیں اپنی بڑی سی دھوتی سنبھالنا بھی مشکل ہو گئی تھی اور دُور درخت کے پیچھے چھپے ان سب دوستوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کر بل پڑ گئے تھے۔

یہ سب کچھ یاد کر کے راجہ کے لبوں پر ہنسی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ کل شام جب آدی کی ٹرین پلیٹ فارم سے چھوٹ رہی تھی تب سے لے کر اب تک اس کا دل کٹا جا رہا تھا اور کل پلیٹ فارم پر تو خود قو آ پی بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں تھیں جب وہ پلیٹ فارم پر پہنچیں تو گاڑی چل پڑی

تھی۔ سب سے پہلے راجہ بی کی نظر ان پر پڑی تھی اور وہ بھاگ کر راجہ کے پاس ہی آئیں تھیں۔ تب راجہ کے منہ سے تو کوئی لفظ نہیں نکل پایا تھا لیکن اس نے انگلی اٹھا کر قہقہے کی آواز کی نشان دہی کروادی تھی جس کی کھڑکی میں سے راجہ سر باہر نکالے بیٹھا ان کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ قہقہے کی آواز تو بے چاری ٹھیک طرح سے آدی کی جانب دیکھ کر ہاتھ بھی نہیں ہلا پائی تھیں کہ ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔ تبھی قہقہے کی آواز اسی انداز میں ہو کر وہیں پلیٹ فارم کی کرسی پر جیسے ڈھے سی گئی تھیں اور ان کی آنکھوں سے برکھا کی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ وہ راجہ سے اور آدی کے باقی دوستوں سے بس ایک ہی سوال پوچھ رہی تھیں کہ آدی ان سے ملے بنائی کیوں چلا گیا؟ لیکن اس سوال کا جواب تو خود راجہ سمیت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ قہقہے کی آواز اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ آدی ان سے ملے بنا اتنی دور چلا گیا ہے۔ انہوں نے راجہ کو بتایا کہ وہ کالج سے واپس آئیں تو آتے ہی انہوں نے آدی کے لیے جوڑا سامان اور اس کے ختے جمع کر کے رکھ دیئے تھے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ آدی کی ٹرین شام چار بجے ہے اور قہقہے کی آواز تو ساڑھے بارہ بجے دن ہی کو لوٹ آئیں تھیں لیکن وقت دھیرے دھیرے سرگتار باپھر قہقہے کی آواز سنیں کہ آدی گھر والوں سے رخصت ہو کر ریلوے اسٹیشن کے لیے نکلتے وقت ان سے ملتا جائے گا لیکن جب تین بج گئے تو انہیں تشویش ہوئی اور انہوں نے فضل کو آدی کے گھر کی جانب دوڑایا کہ خبر پوچھ آئیں۔ فضل بابا چند ہی لمحوں میں اگلے پاؤں دوڑے چلے آئے اور خبر دی کہ آدی تو چند لمحے پہلے ہی اسٹیشن کے لیے نکل چکا ہے اور گاڑی کا وقت بھی چار نہیں بلکہ ساڑھے تین بجے کا ہے۔ یہ سن کر قہقہے کی آواز تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے کہ اب کیا کریں۔ تبھی غیاث چچا گھر میں کہیں باہر سے داخل ہوئے تو قہقہے کی آواز نے انہیں تمام ماجرا سنایا اور تبھی غیاث چچا انہیں بھاگم بھاگ اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر اسٹیشن لے آئے تھے پر تب تک آدی کی ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔ غیاث چچا نے بڑی مشکل سے قہقہے کی آواز کو چپ کر دیا اور انہیں باقی محلے والوں سمیت لے کر واپس آگئے تھے لیکن قہقہے کی آواز کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں آدی کے یوں بنا ملے چلے جانے کا بہت افسوس ہے۔ راجہ خود بھی پوری بات نہیں جانتا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ آدی ان سے ملے بنائی اتنی دور چلا گیا تھا جبکہ یہی آدی تھا جو محلے سے باہر جانے سے پہلے بھی دس بار قہقہے کی آواز سے پوچھتا تھا۔ آدی ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ قہقہے کی آواز کو بھی یہی ایک سوال پریشان کیے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہمیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی ایک ہستی پر کس قدر حق جتا کر جی رہے ہوتے ہیں کہ اس ہستی کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، چلنا پھرنا..... سب کچھ ہمارے ایک انجانے اختیار میں ہوتا ہے۔ ایک ایسا اختیار جس کا احساس شاید خود ہمیں بھی تب تک نہیں ہوتا جب تک اچانک کسی ایک دن ہم سے وہ اختیار چھین جاتا ہے تب ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی انمول نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ شاید قہقہے کی آواز کو بھی اس لمحے یہی سب کچھ محسوس ہوا ہو جس نے ان کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں برکھا کی پھوار بھر دی تھی۔

بہر حال اس رات کی اس گھڑی راجہ کے لیے آدی کا یوں قہقہے کی آواز سے ملے بنا چلے جانا ایک سربستہ راز ہی تھا لیکن راجہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ آدی کے نازک دل کو ضرور کسی بات سے ٹھیس لگی ہوگی، ویسے بھی وہ قہقہے کی آواز کے لیے بے حد حساس تھا، انہی سوچوں میں غلطاں راجہ کی نظر دیوار پر لگی گھڑی پر پڑی صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ باہر بادل زور سے گر رہے، راجہ نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی پریڈ

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

رات کے جانے کس پہر ہماری بیک کے سبھی بچوں کا رونے کا کورس مکمل ہوا اور چند گھنٹوں کے لیے ہی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ اچانک یوں لگا جیسے اکیڑی میں بھونچال آگیا ہو۔ ہر جانب سے تیز سیٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں اور چاروں جانب ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ صبح کے ٹھیک ساڑھے چار بج رہے تھے، کچھ دیر تو مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں پر ہوں اور یہ جیل کی بارک نما لمبا سا کمرہ کس کا ہے۔ پھر اچانک ہی ذہن میں جھماکا ہوا۔ میں کیڈٹ کالج میں تھا اور یہ ہماری اس اکیڈمی میں پہلی صبح تھی۔ صبح خاک تھی، ابھی تو آدھی رات ہی تھی اور باہر اندھیرا تھا۔ باہر ہمارے انسٹرکٹریسیاں بجابجا کر ہمیں جگا رہے تھے اور اندر ہمارا پریفیکٹ اسرار چلا چلا کر ہم سب کو ڈانٹ کر اٹھا رہا تھا کہ باہر پریڈ کے لیے فالن (Fall in) ہو رہا ہے۔ بی کوئیک (Be Quick)۔ اس وقت اگر میرا بس چلتا تو میں کہیں سے بڑا سا کوئی کپڑا لے کر پریفیکٹ کے منہ میں ٹھونس دیتا تاکہ اس کی کرخت آواز ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑتی۔

ہمارے بٹ مینوں نے رات ہی کو ہم سب بچوں کی یونیفارم ہماری الماریوں میں کلف لگا کر لٹکا دیں تھیں، اب یہاں ایک دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ ہمیں ایک تولیہ باندھ کر کپڑے بدلنا تھے کیونکہ یہاں کپڑے بدلنے کا کوئی الگ کمرہ تو تھا نہیں لیکن اس بھگدڑ میں کسی کو کسی کی خبر ہی کہاں تھی۔ کچھ بچوں کے تو لیے پتلون چڑھانے سے پہلے ہی گر گئے اور کچھ نے جلدی میں الٹی سیدھی یونیفارم پہن تولی پر کوئی زپ بند کرنا بھول گیا اور کسی کی بیلٹ اتنی ڈھیلی تھی کہ باہر کی جانب بھاگتے ہوئے پینٹ بیلٹ سمیت زمین پر پیچھے پڑی رہ گئی۔ میرے لیے تو یہ پینٹ شرٹ کا یونیفارم ویسے بھی عذاب تھا کیونکہ گھر میں نے کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تھی۔ میں تو وہاں ہمیشہ کرتا شلوار ہی پہنتا تھا۔ بہر حال میں نے بھی آس پاس فیصل اور اسفر کی دیکھا دیکھی خود کو کسی نہ کسی طرح اس کلف لگے اکڑے ہوئے خاکی یونیفارم میں کھینچ کھانچ کر فٹ کر لی۔ سر پہ ٹوپی جمائی اور باہر کی جانب بھاگا۔ ہمارے انسٹرکٹر جنہیں وہاں پی۔ او (پٹی آفیسر) کہتے تھے، نے مجھے تیزی سے ہاسٹل سے باہر کی جانب بھاگتے دیکھا تو وہیں سے زور سے چلایا۔

”جوان..... ڈاکخانہ بند کرو اپنا۔“

میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ ”یہ اب کس ڈاکخانے کی بات کر رہا ہے۔“ وہ پھر چلایا۔ ”جوان..... کلوز یور پوسٹ آفس۔“ Close your post office۔ جلدی کرو۔“

اب کی بار میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو میں اپنے پتلون کی زپ جلدی میں بند کرنا بھول گیا تھا۔ ”اوہ.....“ میں نے جلدی سے بھاگتے بھاگتے ہی زپ چڑھا لی۔

ہم ساتویں کے چھوٹے بچوں کے لیے علیحدہ پریڈ سکھانے کا انتظام موجود تھا۔ ہمیں دوڑاتے ہوئے اُسی منہ اندھیرے اور ”آدھی رات“ کے وقت پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا جہاں باقی سینئر ایک جانب پریڈ کر رہے تھے اور سی۔ پی۔ او (چیف پیٹی آفیسر) کو سلامی دے رہے تھے۔ ساری فضا ”چپ، راس، چپ، راس (Left, right, left, right) کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ ہم میں سے آدھے جونیئر کیدٹس کی آنکھیں اب تلک نیند کے اثر سے بند تھیں اور وہ خواب میں چلنے کی سی کیفیت میں پریڈ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری پیٹی آفیسر کا نام طالب تھا (جسے بعد میں ہم نے چونسٹا آم کا خطاب دے دیا تھا)۔ طالب نے ہم سب جونیئر کیدٹس کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا اور سب سے پہلے ہمارے یونیفارم چیک کیے جن بچوں کے بیلٹ ڈھیلے تھے ان کے بیلٹ کو زور زور سے کھینچ کر ان بچوں کو جھٹکے دیئے۔ چند ایک بچوں نے رونے کی کوشش کی تو انہیں زوردار کاشن (Caution) کی آواز نکال کر ڈرا کر چپ کروا دیا۔ پتہ چلا کہ ابھی کچھ دیر میں چیف پیٹی آفیسر محمد بخش صاحب خطاب کریں گے۔ سی۔ پی۔ او ایک انتہائی ڈراؤنا اور کرخت قسم کا انسان تھا جسے ہم کیدٹس نے کچھ عرصہ بعد بخشو کا خطاب دے دیا تھا۔ محمد بخش صاحب نے اسٹیج پر چڑھ کر پہلے چند عجیب و غریب قسم کی آوازیں نکالیں اور پھر ٹرک دار آواز میں ہم سب ”معصوموں“ کو یاد دلایا کہ اب ہم ملک کی سب سے بہترین اکیڈمی میں ہیں لہذا اپنی ماؤں کی گود کا خیال ذہن و دل سے نکال دیں اور سخت دل اور سخت جان بن کر جنس پھر انہوں نے جونیئر کیدٹس کے پیٹی آفیسر کو صرف پندرہ دن کا وقت دیا کہ وہ ہمیں ڈرل میں اس قدر رطاق کر دیں کہ دو ہفتے کے بعد ہم نئے کیدٹس بھی اپنے سینئرز کے ساتھ مل کر پوری کمپنی کے ساتھ پریڈ کر سکیں۔ سی۔ پی۔ او (C.P.O) نے یہ دھمکی بھی دی کہ جس بچے نے پریڈ سکھنے میں زیادہ وقت لیا تو وہ اسے الٹا ناگ دے گا۔ ہم سب بچوں نے گھبرا کر پریڈ گراؤنڈ میں ادھر ادھر دیکھا لیکن ہمیں وہاں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں ہمیں الٹا ناگ جاسکتا۔ مجھے فوراً اپنے گھر کی بقر عید یاد آگئی جب قصائی آکر ہمارے کمروں کی قربانی کے بعد ان کی کھال اتارنے کے لیے انہیں باہر گلی میں لگے ایک بڑے سے لوہے کے کنڈے سے الٹا ناگ دیتا تھا۔ مجھے اس لمحے بخشو ایک سفاک قصائی کے روپ میں دکھائی دیا جو ہم بچوں کو کمروں کی طرح الٹا ناگ کران کی کھال اتارنے کے لیے اپنی چھریاں تیز کر رہا ہو۔

کچھ ہی دیر میں طالب ہم سب جونیئر کیدٹس کو ہانک کر مرکزی پریڈ گراؤنڈ سے ملحق ایک اور چھوٹے گراؤنڈ میں لے آیا۔ وہاں ایک عجیب سا شخص لمبا سا کوٹ پہنے سامنے ایک کالا بکس (صندوق) رکھے بیٹھا تھا۔ قریب ہی ایک لمبا سا اسٹول پڑا ہوا تھا۔ میں نے دیر سے سے فیصل سے پوچھا جو میرے ساتھ ہی بے زار سا کھڑا تھا۔

”یہ کیا بلا ہے؟“

فیصل نے ایک لمبی سی جمائی لی۔

”مجھے تو یہ کوئی جگہ ل (Jaggular) دکھائی پڑتا ہے۔ ہمارے پرانے سکول میں اس قسم کے نمونے مہینے میں ایک آدھ مرتبہ آکر تماشہ دکھا جاتے ہیں۔ تم دیکھنا یہ اب ہم سب بچوں سے پیسے مانگے گا۔“

لیکن ہماری توقعات کے برعکس اس شخص نے اپنا اسٹول سیدھا کیا اور اپنے صندوق میں سے ایک بڑا سا کالا کپڑا نکالا۔ طالب پی۔ او اچانک زور سے دھاڑا۔

”کیڈٹ ٹوپی اتارے گا..... کیڈٹ ٹوپی..... ی ی ی..... اتار۔“

اس نے ٹوپی..... ی ی ی..... پر اس قدر زور دیا اور لفظ کو اتنا کھینچا کہ ہم سب نے گھبرا کر ٹوپیاں اتار کر باقاعدہ اس کے قدموں میں پھینک دیں کہ ”لو بھئی اپنی ٹوپی، ہم نے کب کہا تھا کہ ہمیں چاہیے؟“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پہلی آنیفسر دوبارہ چیخا۔ ”ٹوپی اٹھا۔“

یا اللہ یہ کیا ڈرامہ ہے؟ کبھی کہتا ہے ٹوپی اتار کبھی کہتا ہے ٹوپی اٹھا۔ پھر پی۔ اونے ہمیں خود ڈیمانسٹریٹ (Demonstrate) کر کے بتایا کہ ٹوپی کو کس طرح کندھے پر لگے بغل میں پھنسا یا جاتا ہے۔ ہم میں سب سے دائیں جانب اسفر کھڑا تھا۔ پی۔ اونے اس کو دو قدم آگے آنے کا کہا۔ اسفر گھبرا کر کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ طالب نے اسے جھاڑ کر دو قدم پیچھے جانے کا کہا۔ اس بار اسفر ہم سے بھی پیچھے چلا گیا۔ پی۔ اونے جھنجھلا کر اسے اس کے ہیلت سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے اسٹول تک لے گیا اور اسٹول پر بٹھا دیا۔ جادو گرنے اپنے صندوق میں سے اپنے ”اوزار“ نکالے اور تب ہمیں سمجھ آیا کہ یہ تو حجام ہے۔ میں نے گھور کر فیصل کو دیکھا۔ فیصل آہستہ سے بڑبڑایا ”کمال ہے..... میں تو سمجھا تھا کہ اب یہ کرتب دکھائے گا۔“ اور پھر اس حجام نے واقعی کرتب دکھانا شروع کر دیئے۔ گیارہ بچے تو صرف ہم ”قاسم ہاؤس“ والے تھے جبکہ اسی طرح باقی ہر ہاؤس کے ساتویں کلاس کے گیارہ گیارہ بچے یعنی کل ملا کر چھ ہاٹلز کے چھیاسٹھ (۶۶) بچے تھے جن کے سر سے بال اتارنے میں اس کم بخت نے کل چھیاسٹھ (۶۶) منٹ بھی نہیں لیے۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا پیالہ لے کر آیا تھا جو بد قسمتی سے ہم سب بچوں کے سر پر مکمل فٹ آتا تھا۔ وہ پیالہ ہمارے سر پر رکھ کر اس پاس مشین پھیر دیتا اور پھر پیالہ اتار کر ”باقی ماندہ“ سر پر اپنی بے رحم فینچی اس طرح چلاتا کہ کچھ ہی دیر میں ہم سب کی شکلیں بھی پچیانی نہیں جاری تھیں پھر طالب پی۔ اونے ہم سب کے سینوں پر ہمارے کٹ نمبرز کی پٹیئیں لگا دیں اور بتایا کہ آج سے ہماری پچیان یہی نمبرز ہیں۔ میرا کٹ نمبر 8336 تھا جسے ہمارا پی۔ او بڑی لے میں ”تراسی چھتی“ کہتا تھا۔ اب اگلے چھ سال کے لیے میں تراسی چھتی تھا۔ میں نے حجام کے ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا شیشہ دیکھا جسے وہ ظالم حجام بال کاٹنے کے بعد ہم بچوں کو دکھا کر ڈرانے کا کام لیتا تھا۔ میرے دل نے ہلکے سے مجھ سے سرگوشی کی۔ ”آؤ بیٹا..... یہ کن وحشیوں کے ٹو لے میں آن پھنسنے ہو۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر انہوں نے اگر تمہارا یہ حال کر دیا ہے تو نہ جانے آگے چل کر کیا کیا نہ ہوگا۔“

دفعۃً پھر سے وہی منحوس سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پتہ چلا کہ پریڈ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ ہمیں پھر سے بھگاتے ہوئے پی۔ او کی معیت میں ناشتے کے لیے میس بھجوا دیا گیا۔ ناشتے کی میز پر پھر سے وہی مسئلہ۔ اپنے گھر میں تو امی تندور کی خشک روٹی پر مجھے تھوڑا سا مکھن یا اصلی گھی لگا کر دے دیتی تھیں اور میں چائے کے پیالے کے ساتھ ناشتہ کر لیتا تھا۔ سردیوں میں ہم سب بچے کمرے میں کونسلے کے اسٹوپ کے گرد جمع ہو کر بیٹھ جاتے اور اس کے چینی کی طرف جاتے پائپ کے اوپر اپنی اپنی روٹی رکھ کر گرم کر کے اور مکھن لگا کر مزے سے کھاتے جاتے اور اوپر سے امی کے ہاتھ کی بنی گرم گرم چائے کے گھونٹ..... آہ..... تب زندگی کتنی حسین تھی لیکن یہاں تو میز پر ہی چھری کاٹنے، بوائے انڈوں کے مخصوص کپ، مارجرین، مایونیز، توس، فریج ٹوسٹ اور ان سب کو کھانے کے لیے سب ہی اپنے گلے میں رومال باندھ چھری کاٹنے اٹھائے بڑی نفاست سے کاٹ پیٹ کر اور کانٹوں میں پروپر وکر حلق سے اتار رہے تھے۔ میں نے رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس لیے جلدی سے ڈبل روٹی توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو

اسرار پرفیکٹ نے (جو ہماری میز کا انچارج تھا) گھور کر مجھے دیکھا اور چھری کا نئے استعمال کرنے کا کہا۔ میرا دل چاہا کہ وہیں سے ایک ابلا ہوا انڈہ اٹھاؤں اور اس کے سر پر دے ماروں۔ فیصل جو گزشتہ رات بھی میری مصیبت کا مشاہدہ کر چکا تھا اب سمجھ گیا تھا کہ مجھے ان اوزاروں کی کلپری کے ساتھ کھانے کی عادت نہیں ہے۔ اس نے تیزی سے جام اور مکھن لگا کر ایک توس بنایا اور درمیان میں آلیٹ کا بڑا سا کلزار کھ کر میز کے نیچے ہی سے کہنی مار کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے بناء کسی توقف کے فوراً توس حلق سے پار کر دیا اور فیصل کو اشارہ کیا کہ خدا کے لیے یہ ”بیرونی امداد“ جاری رکھے۔ وہاں کی چائے کا انتظام بھی انتہائی بے ہودہ تھا۔ گرم پانی الگ تھا، پتی کے پیکٹ الگ دھرے تھے اور دودھ اور چینی کسی تیسرے کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ پہلے پہل تو میں نے تھرماس سے جب کپ میں اپنی جانب سے چائے انڈلی تو اس میں سے صرف گرم پانی نکلتے دیکھ کر میری تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔ ”بڑے مہذب بنے پھرتے ہیں اور اپنا حال یہ ہے کہ تھرماس میں چائے کی بجائے بھول کر صرف گرم پانی ڈال کر بھیج دیا ہے۔“ میں نے اپنے سر پر کھڑے منکر نکیر سے کہا کہ یہ گرم پانی لے جا کر کہیں پھینک دے اور مجھے اس میں چائے لادے۔ منکر نکیر نے بخسیدگی سے مجھ سے پوچھا۔ ”سر میں آپ کے لیے چائے بنا دوں؟“

میں نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا لیکن مجھے آس پاس کہیں کوئی چولہا نظر نہیں آیا جس پہ وہ میرے لیے چائے بنا سکتا۔ بہر حال میں چپ ہی رہا۔ تب اس بلٹر نے میرے سامنے ہی یہ ساری چیزیں ادھر ادھر سے جمع کر کے میرے کپ میں ڈال دیں اور کچھ دیر بلانے کے بعد وہ چائے نما چیز میرے سامنے رکھ دی اور انتہائی مؤدب انداز میں ”ٹی سر.....“ (Tea Sir) کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے حیرت سے اپنے کپ کی جانب دیکھا۔ لگتی تو چائے ہی تھی لیکن نہ تو اس نے پتی چینی اور دودھ ڈال کر اسے امی کی طرح تین چار بابالیاں دیں تھیں اور نہ ہی اس پر جھاگ بننے دی تھی جس سے چائے کی اصل خوشبو فضا میں بکھرتی ہے۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ ارے یہ کیا؟ مجھے زور کی ایک ابکا کی آئی اور میں نے بڑی مشکل سے اپنے سامنے ہی بیٹھے اسفر کا چہرہ چائے سے رنگین ہونے سے بچایا۔

یہ چائے تھی یا کاڑھا.....؟ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ بد مزہ چائے آج تک نہیں پی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ باقی کیڈٹس مزے لے لے کر یہی کاڑھا اپنے حلق سے اتارے جا رہے تھے۔ میں نے غصے سے چائے کے کپ کی جانب دیکھا۔ گویا اب یہی چیز چائے کے نام پر مجھے یہاں پینی پڑے گی؟ لعنت ہو ابی زندگی پر جس میں انسان کو ڈھنگ کی چائے بھی پینے کو نہ ملے۔ اس لمحے مجھے امی کے ہاتھ کی چائے بے تحاشا اور اس قدر شدت سے یاد آئی کہ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں تب چونکا جب فیصل نے پھر سے مجھے کہنی ماری اور توس میز کے نیچے سے میرے حوالے لے کیا۔ اس مرتبہ توس کے میٹھے جام کے ساتھ میرے آنسوؤں کی کڑواہٹ بھی میرے حلق سے نیچے اتر گئی۔

کچھ ہی دیر میں وہی سینئر کیڈٹ اٹھا اور اس نے اپنا پیٹ بھر جانے کے بعد بنایہ دیکھے کہ ہم معصوم بچوں نے ابھی تک اپنا ناشتہ ختم نہیں کیا۔ زبردستی مائیک پر آ کر جنٹلمینوں کی الحمد للہ کروادی۔ پرفیکٹس اپنی پلیٹوں سے ابھی تک چپکے ہوئے جونیئر کیڈٹس کو کھینچ کھانچ کر کھڑا کرنے لگے۔ اب یہاں سے ہم سب کو اپنی اپنی کلاس کی جانب جانا تھا۔ میں نے میس کی گھڑی کی جانب دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔

کتاب گھر کی پیشکش

محافظ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

راجہ کی اماں زور سے چلائیں۔

”لا کے تو آج میری بات کیوں نہیں سنتا۔ صبح کے آٹھ بج گئے ہیں۔ تجھے اسکول نہیں جانا آج۔ اب آدی نہیں آئے گا تجھے اپنے ساتھ لے جانے۔ چل جلدی کر۔“

راجہ نے ماں کی مسلسل چھٹی مرتبہ ڈانٹ سنی اور برا سامنہ بناتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر ماں کے پاس باورچی خانے میں آ گیا۔

”اماں..... آج میرا من نہیں ہے اسکول جانے کو۔“

اس کی ماں نے جلدی جلدی راجہ کا پر اٹھا تو بے سے اتارا اور انڈے کی پلیٹ راجہ کی جانب بڑھائی۔

”جانتی ہوں تیرا من آدی کے بغیر کہیں نہیں لگے گا اب۔ کاش تو آدی سے ہی کچھ عقل ادھار لے لیتا۔ کیسا ہونہار بیٹا نکلا وہ اپنے اماں باوا کا۔ کتنے بڑے فوجی اسکول میں داخلہ ہو گیا اس کا۔ کل کو بڑا افسر بن کر آئے گا تو پورے محلے کی شان بڑھائے گا اور تو اور تیرے باقی نکلے دوست بیٹھے رہنا یونہی۔ ارے تم لوگوں کو تو آدی تب اپنا چڑا ہی بھی نہ لگائے گا۔“

راجہ کی ماں جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہی۔ ناشتہ کرتے ہوئے راجہ سوچنے لگا کہ کیا واقعی آدی بڑا افسر بننے کے بعد اپنے دوستوں سے منہ پھیر لے گا؟ پھر خود ہی اس نے اپنی سوچ کو زور سے سر جھٹک کر پرے کر دیا۔ ”نہیں نہیں۔ آدی ایسا کبھی نہیں کرے گا بلکہ راجہ کو پورا یقین تھا کہ آدی بڑا افسر بننے کے بعد اپنے سارے دوستوں کو بھی اپنے ساتھ ہی اپنے بنگلے میں رکھ لے گا۔“ اتنے میں باہر دھواں آئی کے تانگے کے بھونپو کی آواز گونجی۔ دفعۃً یہ آوازیں راجہ کے ذہن میں زور سے ایک جھماکا ہوا۔ آدی نے جانے سے پہلے راجہ کو سختی سے تاکید کی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ ہمیشہ ڈو آپی کے کالج جانے اور واپس آنے کے وقت محلے کے پھاٹک پر یا بڑے میدان میں موجود رہے تاکہ کوئی دوبارہ ڈو آپی کو تنگ نہ کر سکے۔ راجہ نے اپنی بھلکڑی طبیعت کو کوسا اور بستہ اٹھا کر باہر کی جانب بھاگا۔ اس کی ماں اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی کہ اپنا ناشتہ تو ختم کرتا جائے لیکن اب راجہ کو کسی اور بات کا ہوش ہی کہاں رہ گیا تھا۔

راجہ تیزی سے دوڑتے ہوئے بڑے میدان تک پہنچا اور یہ دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بڑے میدان میں ڈو آپی کے گھر کے باہر ان کا تانگہ ابھی تک کھڑا تھا جس کا مطلب تھا کہ ڈو آپی ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلی ہیں۔

راجہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ آس پاس کوئی مشکوک شخص تو موجود نہیں لیکن میدان سناں تھا۔ اتنے میں طاہر بھائی دور سے اپنے

گھر سے اپنے مخصوص انداز میں اپنا سفید کوٹ اور کانوں کو لگانے والا آلہ اپنے ہاتھ میں پکڑے نکلے اور ایک اچھتی سی نگاہ ڈھوپنی کے تانگے پر ڈالتے ہوئے محلے کے پھانک کی جانب بڑھ گئے۔ پتہ نہیں کیوں راجہ کو آدی کے جانے والے دن سے ہی اندر ہی اندر کہیں یہ یقین ضرور تھا کہ آدی کے یوں ڈھوپنی سے ملے بنا چلے جانے کی وجہ طاہر بھائی ہی ہیں۔ اتفاق سے طاہر بھائی کے پھانک تک پہنچنے سے پہلے ہی ان کی بس محلے کے گیٹ پر آ کھڑی ہوئی اور زور زور سے ہارن بجانے لگی۔ طاہر بھائی نے ایک لمحے کو پلٹ کر دیکھا اور پھر جلدی سے بس میں سوار ہو گئے۔ بس کے آگے بڑھتے ہی ڈھوپنی کے گھر سے فضلو بابا نکلے اور کھانتے کھانتے ڈھوپنی کا بیگ وغیرہ تانگے پر رکھوانے لگے۔ اچانک اسی وقت کسی گلی کے کنارے سے آٹو گلی میں اپنا مخصوص رومال باندھے برآمد ہوا، شاید وہ فضلو بابا کے نکلنے کا ہی انتظار کر رہا تھا اور اس نے طاہر بھائی کو محلے سے نکلتے دیکھا ہی نہیں تھا ورنہ یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ ان کی راہ نہ روکتا لیکن اس کی ساری توجہ اس وقت گھر سے سر جھکا کر نکلتی ڈھوپنی کی جانب تھی۔ راجہ کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ آٹو تو جان ہی کو آ گیا تھا۔ راجہ نے آس پاس کسی بڑی اینٹ یا پتھر کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر آٹو نے آج ڈھوپنی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ بنا کچھ مزید سوچے اسی پتھر سے آٹو کا سر پھوڑ دے گا۔ راجہ نے اپنی پوزیشن سنبھالی۔ آٹو نے ڈھوپنی کی جانب بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اتنے میں ڈھوپنی کے پیچھے ہی گھر سے غیاث پچا بھی برآمد ہوئے۔ وہ اپنے اسکوٹر پر تھے۔ راجہ اور آٹو دونوں کو ہی بیک وقت ہی جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ڈھوپنی تانگے پر بیٹھ گئیں۔ غیاث پچا تانگے کے پیچھے پیچھے گیٹ تک اپنے اسکوٹر پر چل دیئے۔ پھر تانگہ ایک جانب اور غیاث پچا دوسری جانب مڑ گئے۔ راجہ نے ایک گہری سی سانس لے کر پتھر پھینک دیا۔ آٹو جو دور کھڑا راجہ کی اس تمام کارستانی سے بے خبر تھا، وہ بھی بے زاری سے واپس گلی میں مڑ گیا۔ راجہ نے اپنا بستہ اٹھایا اور اسکوٹ کی جانب بھاگ گیا۔

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ اسٹیل کا جسے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حق نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چبچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلا چیلنج

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

مجھے فیصل اور اسفر کو ساتویں الف (7th A) میں جانے کو کہا گیا تھا لہذا ہم سب اس وقت اپنی جماعت کے ڈیسک Desk سنبھال چکے تھے۔ ہماری کتابیں پہلے ہی سے ہمارے ڈیسک میں موجود تھیں۔ میں نے کتابیں دیکھیں۔ سبھی بالکل نئی تھیں۔ جبکہ گھر میں ہمیشہ مجھے عمارہ کی پڑھی ہوئی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں لیکن یہاں پھر ان کیڈٹ کالج والوں سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے ساری کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ لی تھیں لیکن ان میں سوائے ”اردو کی ساتویں کتاب“ کے دوسری کوئی کتاب اردو کی تھی ہی نہیں۔ نہ ہی معاشرتی علوم، نہ سائنس، نہ ہی ریاضی اور دینیات کی کتاب موجود تھی۔ پتہ نہیں کس کس کی کتابیں اٹھا کر میرے ڈیسک میں بھر دی گئی تھیں۔ یہ تو سب کی سب انگریزی میں تھیں اور انگریزی بھی ایسی کہ میرے پلے تو ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ ہم نے اپنے پرانے اسکول میں ابھی زیڈ فار زیڈ Z for Zebra ختم کیا تھا اور جملے بنانا سیکھ رہے تھے بلکہ میں تو باقی جماعت سے کافی آگے تھا اور میں نے تھرٹی کرو ”Thirsty Crow“ بھی شروع کر رکھی تھی لیکن ان ساری کتابوں میں میری والی انگلش گرامر کی کتاب تو کہیں دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ کس سے کہوں کہ میرے پاس غلط کتابیں آ گئی ہیں کہ ایک صاحب بڑا سا کالا چنچ (گاؤن) پہنے اندر داخل ہوئے، سب کیڈٹس ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ پتہ چلا کہ یہ صاحب انوار شاہ ہیں اور یہی ہمارے ٹیچر بھی ہیں۔ انوار صاحب نے اپنے موٹے سے چشمے کے پیچھے سے ہم سب کیڈٹس کو بغور دیکھا اور سب کو اٹھ کر فردا فردا اپنا تعارف کروانے کا کہا۔ تعارف کے بعد سبق دھرائی کا مرحلہ شروع ہوا۔ انوار صاحب خاص انگریزی کے استاد تھے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں ہر مضمون پڑھانے کے لیے ہر پیریڈ میں ایک الگ استاد آئے گا۔ مجھے تو یہ انوار صاحب بھی کافی لائق فائق نظر آ رہے تھے، کوئی حرج نہ ہوتا اگر یہی ہمیں سارے مضمون پڑھا دیتے، خواہ مخواہ اکیڈمی والوں نے اتنی ”فضول خرچی“ کی۔ کیڈٹ مطیع کے بعد میرا نمبر آ گیا اور مجھے ٹیچر نے انگلش کی کتاب نکالنے کا کہا۔ میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ یہاں تو ساری کتابیں ہی انگلش کی ہیں، کون سی والی نکالوں، میں اپنے ڈیسک کو کھنگال ہی رہا تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے اسفر نے جلدی سے ایک کتاب ورق پلٹ کر میرے حوالے کر دی۔ چلو پہلا مرحلہ تو سر ہو گیا پر اب آگے کیا کروں.....؟

انوار صاحب نے دوبارہ ذرا جھڑک کر کہا کہ ”بوائے..... فرسٹ لیسن (First Lesson) سے شروع کرو۔“ اب میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے تو ابھی یہ بھی نہیں پتہ کہ L.E.S.S.O.N کیا ہوتا ہے.....؟ اس موقع پر پھر اسفر نے میری مدد کی اور جلدی سے اٹھ کر صفحہ پلٹ کر میری انگلی تیسرے صفحے پر ایک سبق پر رکھ دی۔ میں نے سچے جوڑ کر شروع کرنے کی کوشش کی لیکن بہت کوشش کے بعد بھی لفظ نہیں جوڑ پایا۔ انوار صاحب اور پوری کلاس مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اب انوار صاحب زور سے گرجے۔

”تم پڑھنا شروع کیوں نہیں کر رہے۔ وائے ڈونٹ یو اشارٹ ریڈنگ؟“ میری سمجھ میں اس وقت اور کچھ نہیں آیا اور میں نے فوراً رونا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے چھوڑ کر اگلے بچے کی جانب بڑھ جائیں گے۔ مجھے روتا دیکھ کر اگلی لائن میں بیٹھے اشتیاق موٹے اور عمر نے بھی رونا شروع کر دیا۔ شاید انہیں بھی میری طرح سبق نہیں آتا تھا۔

انوار صاحب ہمیں روتا دیکھ کر بوکھلا سے گئے اور انہوں نے حیرت سے مجھ سے پوچھا کہ میں رو کیوں رہا ہوں؟ کیا میں ہوم سکنس (Home Sicknes) فیل کر رہا ہوں؟ اس وقت میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ ہوم سکنس کیا بلا ہوتی ہے۔ میں نے انہیں روتے روتے بتایا کہ یہ کتابیں میری سمجھ سے بالکل باہر ہیں اور میں نے آج تک کبھی اتنی ساری انگریزی کی کتابیں اکٹھی نہیں دیکھیں۔ ہماری توانگش کی کتاب میں بھی سامنے اردو میں اس انگریزی لفظ کے جیسے لکھے ہوتے تھے جبکہ یہاں تو صفحے کے صفحے انگریزی میں کالے کئے ہوئے تھے۔ یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ٹیچر حیرت زدہ سے میری داستان سنتے رہے اور پھر انہوں نے فوری طور پر مجھے اپنے ساتھ چلے کا کہا۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے لیتے ہوئے اکیڈمی کے دوسرے حصے میں لے آئے اور تب میں نے دیکھا کہ ہم پرنسپل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ میں کل بھی ابا کے ساتھ اس کمرے میں آچکا تھا۔ اس پر کل بھی وہی کمانڈر علی احمد اسرار کی حتمی لگی ہوئی تھی۔ انوار صاحب نے کاغذ کی چٹ پر کچھ لکھ کر اندر بھیجا اور چند لمحوں میں ہمیں اندر بلا لیا گیا۔ پرنسپل صاحب اپنی بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے کچھ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور ٹیچر سے پوچھا۔

”یس مسٹر انوار..... اپنی پرابلم“ Yes Mr. Anwar, Any Problem۔ انوار صاحب نے پرنسپل کو ہجان خیز انداز میں بتایا کہ یہ بچہ غلطی سے ہماری اکیڈمی میں آ گیا ہے۔ یہ تو اردو میڈیم ہے اور اس نے ابھی اے۔ بی۔ سی ختم کی ہے جبکہ یہاں تو ساتویں جماعت میں آکسفورڈ سٹینڈرڈ کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور تو اور یہ تو ابھی معاشقہ علوم، دینیات اور ریاضی کے پھیر سے ہی باہر نہیں نکلا۔ اسے تو ان مضامین کے انگریزی ناموں کا بھی پتہ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ ان مضامین کو انگریزی میں پڑھنے اور سمجھنے کی قابلیت رکھنا؟ انوار صاحب نے پرنسپل کو پورے یقین سے کہا کہ یہ بچہ باقی کلاس کے ساتھ نہیں چل پائے گا۔ انہیں تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ مجھے اس اکیڈمی میں داخلہ کیسے مل گیا کیونکہ یہاں داخلے کے لیے ہر بچے کو ایک بہت سخت امتحانی ٹیسٹ اور زبانی سوال جواب (انٹرویو) سے گزرنا پڑتا تھا۔

پرنسپل نے بڑے غور سے ان کی ساری بات سنی۔ مجھے ان دونوں کی گفتگو کا صرف وہی حصہ سمجھ میں آیا جو انہوں نے درمیان میں کہیں کہیں اردو میں بولا تھا لیکن میں ان دونوں کی گفتگو کا لب لباب سمجھ گیا تھا۔

پرنسپل نے ٹیچر کو بتایا کہ میرا چناؤ فیڈرل گورنمنٹ نے بطور فیڈرل سکیم کے امیدوار کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مرکزی حکومت ملک کے چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں سے ہر سال چند ایسے بچوں کو چنتی تھی جن کا اپنے اسکول میں تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہو لیکن وہ ایسے مہنگے اور دور دراز کے کیڈٹ کالج اور اکیڈمیز کی پڑھائی کا خرچہ خود برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ حکومت کی ایک خاص ٹیم ہر علاقے میں جا کر خود ایسے بچوں کا چناؤ کر کے ان بچوں کو اپنے خرچے پر ان دور دراز کے کیڈٹ کالجز میں بھجواتی تھی۔ لہذا ہو سکتا ہے کہ یہ بچہ آکسفورڈ کے معیار کی کتاب

نہ پڑھ سکتا ہو لیکن بہر حال اپنے اسکول کا ایک ہونہار طالب علم ہو گا تبھی اسے اس کیڈٹ کالج میں بھیجا گیا ہے۔ لہذا اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اس بچے کو باقی بچوں کے معیار کے برابر لایا جائے۔

انوار صاحب نے مایوسی سے سرفی میں ہلایا کیونکہ ان کے خیال میں یہ ناممکنات میں سے تھا۔ مجھ جیسے اردو میڈیم بچے کو چند دنوں میں آکسفورڈ لیول کی تعلیم دلا کر سب کے برابر لانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں خود بھی اس وقت انوار صاحب کی بات سے متفق تھا۔ بھلا مجھ جیسے گنوار کے لیے چند دنوں میں ان انگریزی کتابوں کے انبار کو گھول کر پنی جانا ناممکن نہیں تو اور کیا تھا؟

پرنسپل نے انوار صاحب کو مجھے ایک ہفتہ "انڈر ریزرویشن" رکھنے کا کہا اور چلتے چلتے انہوں نے انوار صاحب کو انگریزی میں ایک جملہ کہا جس کا مطلب میں اس وقت تو نہیں سمجھ پایا لیکن آگے چل کر میری زندگی کی کئی نئی راہیں متعین کرنے میں اس جملے نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو پیچھے سے پرنسپل صاحب کی آواز سنائی دی۔

"مسٹر انوار..... ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے بی ویری کیرفل اباؤٹ داسیلف ریسپیکٹ آف داکلڈ"

"Be very carefull about the self respect of the kid."

مجھے اس لمحے ان کی انگریزی میں کہی ہوئی یہ بات سمجھ نہیں آئی اور جب بہت عرصے بعد میں کمانڈر صاحب کا یہ جملہ سمجھنے کے قابل ہوا تب مجھے احساس ہوا کہ ان کا یہ جملہ ہی آگے چل کر کہیں نہ کہیں میرے کردار کی بنیاد بن چکا تھا۔

انوار صاحب نے پرنسپل کی بات سن کر اثبات میں سر ہلایا اور مجھے پرنسپل کے آفس سے لے کر نکل آئے۔ اس دن کلاس میں مجھ سے پھر کسی دوسرے ٹیچر نے کچھ نہیں پوچھا نہ ہی کچھ پڑھنے کو کہا۔ بس سب ہی ٹیچر مجھے یہ سمجھاتے رہے کہ میں دوسرے کیڈٹس کو دھیان سے پڑھتا ہوا دیکھوں اور سنوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سارے استاد کلاس میں بچوں سے انگریزی میں بات کرتے تھے اور ان کی باتیں میرے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔

اس مرحلے پر بھی اسرافر فیصل میرے کام آئے اور ان دونوں میں سے کوئی نہ کوئی مجھے اردو میں ان باتوں کا ترجمہ ٹیچر سے نظر بچا کر بتا ہی دیتا تھا۔ خدا خدا کر کے پہلے دن کی کلاس ختم ہوئی اور ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے میس جانے کا موقع مل گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے آس پاس موجود فیصل اور اسفر کی مدد سے کسی نہ کسی طور زہر مار کر ہی لیا۔ اب دو گھنٹے کی بریک تھی اور پھر شام ساڑھے چار بجے ہمیں کھیل کے میدان میں پہنچنا تھا۔ عجیب

زبردستی تھی۔ میرا دل سونے کو چاہ رہا تھا لیکن پھر سے وہی منحوس سیٹھوں کا عذاب اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ بار بار لباس تبدیل کرنے کی فٹیگ (Fatigue) بھلا اس غدر میں کس بچے کا دل کھیلنے کو چاہ رہا ہو گا؟ لیکن نہیں جناب، زبردستی سب کو کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کی ٹیموں میں تقسیم کر کے کھیلنے کا حکم دے دیا گیا۔ کھیل کے فوراً بعد سب بچوں کو شاور لینے کی ہدایت کی گئی اور پھر شام کی "چیل قدمی" کا لباس پہننے کا حکم دیا گیا۔ پتہ چلا

کہ اب شام کی چائے پیش کی جائے گی۔ چائے.....؟ ہونہ..... چائے کے نام پر پھر وہی بد مزہ محلول ہمیں پینے کے لیے دے دیا گیا۔ ابھی اس محلول کی کڑواہٹ حلق میں موجود تھی کہ ساڑھے چھ بجے کے قریب پھر سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ یا خدا اب کیا مصیبت آگئی؟ بتایا گیا کہ اب ہر بچہ اپنی اپنی میز کرسی پر بیٹھ کر ایک گھنٹہ پڑھے گا اور اسکول کا کام کرے گا۔ اس مرحلے کو ایوننگ پریپ (Evening Prep) کا نام دیا گیا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد

دوسری سیٹی بجی اور ہمیں ڈزسوٹ پہن کر میس جا کر رات کا کھانا کھانے کا حکم دے دیا گیا۔ کیا بے ہودہ نظام تھا۔ بھلا رات آٹھ بجے بھی کو کوئی رات کا کھانا کھاتا ہے؟ مجھے شدت سے اس وقت راجہ اور غفور چچا کی ٹی وی کی یاد آئی۔ میں نے سوچا اس وقت راجہ، ننھو، پو، گڈو، بالا اور مٹی، میرے سارے دوست غفور چچا کے گھر بیٹھ کر مزے سے ڈرامہ دیکھ رہے ہوں گے اور ایک میں بد قسمت ہوں کہ یہاں یہ عجیب قسم کا لباس پہنے ان جوکروں کے درمیان پھنسا رات کا کھانا کھانے ”لے جایا“ جا رہا ہوں۔ رات کو کھانے کے لباس میں مجھے سب سے زیادہ مشکل ٹائی باندھتے ہوئے ہوئی۔ مجھے ہرگز پتہ نہیں تھا کہ بظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا یہ گلے کا رومال، اس قدر مشکل سے باندھا جاتا ہوگا۔ اس کا حل مجھے لندن سے آنے والے بچے آصف نے نکال کر دیا اور میرے گلے میں یہ پھندا بنا کر ڈال دیا اور مجھے سکھایا کہ میں اتار تے وقت اسے پورا نہ کھولوں اور ذرا سا ڈھیلا کر کے گلے سے اتار لوں اور جب کبھی دوبارہ پہننی ہو تو گلے میں ڈال کر اس کی گرہ کھینچ لوں۔ چلو..... فی الحال یہ مسئلہ تو حل ہوا۔ فیصل کے پاس اس کا اور بھی آسان حل موجود تھا۔ اس کے پاس ایسی دو ٹائیاں تھیں جن کی گرہ پہلے سے بنی ہوئی تھی اور پہنے کے لیے ان میں الاسٹک کی ربڑ جڑی ہوئی تھی۔ نہ گرہ بنانے کی زحمت نہ بار بار اتارنے کی۔ بس گلے میں ربڑ کا ہار ڈال کر کالر کے پیچھے چھپا لو لیکن فیصل نے مجھے بنائی ٹائی دیتے وقت خاص تاکید کی کہ اس پر بیفیکٹ نامی مصیبت سے اسے بچا کر پیہنوں کیونکہ یہاں اکیڈمی میں ایسی ٹائیاں پہننے کی اجازت نہیں تھی۔ گویا ان اکیڈمی والوں نے طے کر لیا تھا کہ ہم بچوں کو ایک سانس بھی سکون سے نہیں لینے دیں گے۔ رات کے کھانے سے پہلے بھی کچھ بچوں نے اپنے اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رونے کا فریضہ پورا کیا کیونکہ سارا دن تو ان بے رحم اکیڈمی والوں نے ہمیں اس قدر مصروف رکھا تھا کہ ہم میں سے کسی کو بھی رونے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی۔ اب جو چند لمحے ملے تو ہم سب نے ہی تھوڑے تھوڑے آنسو بہا کر اپنے سنہرے دنوں کو یاد کیا اور اپنی اپنی ”اسیوں“ کی یاد میں کچھ آہیں بھر کر رات کے کھانے کے لیے چل دیے۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ تھا جس میں چند کیڈٹ نماز وغیرہ پڑھنے اور چند ہاسٹل میں موجود تفریح کے کمرے میں ٹی۔وی دیکھنے یا ٹیبل ٹینس اور کیرم وغیرہ کھیلنے کے لیے چلے گئے لیکن میرا دل نماز پڑھنے کو چاہتا تھا اور نہ ہی کسی تفریح میں حصہ لینے کو۔ مجھے راجہ کی یاد بری طرح ستا رہی تھی لہذا میں ہاسٹل کی راہداری میں لگی جالی کے سامنے کھڑا ہوا آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھنے لگا اور یہ سوچتا رہا کہ کیا یہی چاند اس وقت ہمارے محلے کے اوپر بھی چمک رہا ہوگا۔ پھر اچانک ہی چاند کو دیکھتے دیکھتے مجھے وجہ آپنی کی یاد آگئی۔ یہی چاند تو جو آپنی کی چھت پر بھی اپنی چاندنی پھیلا رہا ہوگا۔ میں اور وجہ آپنی اکثر ایسی چاندنی راتوں میں ان کے چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر شمالی ستارہ ڈھونڈا کرتے تھے۔ مجھے ہر بار وہ شمالی ستارہ جنوب یا مشرق میں کہیں ملتا اور میرا ہمیشہ وجہ آپنی سے اس بات پر جھگڑا ہو جاتا کہ وہ ہر بار کسی نئے تارے کو شمالی ستارہ بتاتی تھیں۔ وجہ آپنی کی یاد نے تو مجھے اداسی سے نڈھال ہی کر دیا۔ میں نے بہت بُرا کیا۔ کیا ہوتا اگر میں ان سے مل کر آ جاتا؟ ساری شرارت تو طاہر بھائی کی تھی۔ وہ تو بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ آپ میرے ماں باپ سے بات کر لیں۔ وہی ان کی جان نہیں چھوڑ رہے تھے اس لیے مجبوراً انہیں ہاں تو کہنا ہی تھی اور پھر اسٹیشن پر انہیں یوں بھاگ بھاگ اپنی تلاش میں آتے دیکھ کر تو میرا دل بالکل ہی ہیچ گیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اب تو میں ان سے اتنا دور تھا کہ یہاں تک آنے میں ٹرین نے بھی پورا ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کیا تھا۔ پتہ نہیں اگر پیدل جانا ہو تو شاید مبینہ بھر سے زیادہ لگ جائے چلتے چلتے.....

میں انہی سوچوں میں گھرا، رو دینے کی حد تک اداس سا کھڑا راہداری کے جنگلے سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں وہاں سے دو سینئر کیڈٹ

اور اس کے سارے کپڑے سرک کی گرد سے اٹ چکے تھے۔ اب میں سمجھا ”فرنٹ روڑ“ یہاں کی زبان میں قلابازی کھانے کو کہتے تھے۔ میرے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے مجبوراً میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اگر یہ دونوں میرے محلے میں کہیں مجھے ملے ہوتے تو میں ان دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلادیتا۔ جب میں نے انکو جیسے غنڈے کی کوئی پرواہ نہیں کی تو پھر بھلا یہ دو جوزے کس کھیت کی مولیٰ تھے لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس وقت ان کی سلطنت میں اور اس اکیڈمی میں تھا جہاں کا ہر اصول ہی نرالا تھا لیکن ابھی میں گھٹنوں کے بل جھکا ہی تھا کہ زور سے سیٹی بجنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں مجھے یوں ہی گھٹنوں کے بل بیٹھا چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گئے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں کیڈٹس بھاگتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں اپنی میز پر جا بیٹھے۔ کہیں سے فیصل بھاگتا ہوا آیا اور مجھے بھی راہداری میں رکوع میں جھکے جھکے ہی کھینچتا ہوا اپنی ڈارمیٹری میں لے گیا۔ پتہ چلا کہ یہ رات کی دوسری پڑھائی یعنی 2nd Prep کا وقت ہے جب ہاؤس ماسٹر صاحب ہر بیرک کا خود انسپکشن کرتے ہیں اور ہر بچے کو پڑھتا ہوا دیکھنے کے لیے فردا فردا سب کے پاس جاتے ہیں۔ وہ دونوں سینئر کیڈٹس بھی اسی لیے مجھے پوری سزا دیئے بنا ہی بھاگ گئے تھے کیونکہ انہیں ہاؤس ماسٹر کے آنے کا ڈر تھا۔

رات کی پڑھائی کا دورانیہ بھی ایک گھنٹہ تھا اور ہاؤس ماسٹر نے سرسری طور پر ہر بیرک کو چیک کیا کہ کیڈٹ پڑھ رہے ہیں یا نہیں۔ ہماری ساتویں جماعت والی بیرک میں زیادہ تر کیڈٹ میز پر سر رکھے سو رہے تھے اور ان میں سے کچھ کی نیند میں بند آنکھوں کے کناروں سے بھی جگمگاتے آنسوؤں کی لڑی صاف نظر آرہی تھی۔ سینئر پریپ کے ختم ہوتے ہی دوبارہ سیٹی بجی اور ہم سب کیڈٹس کو دوبارہ رات کی گنتی کے لیے نیچے جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ گنتی کے بعد ہمیں کل صبح کے لیے یونیفارم وغیرہ تیار کرنے کے لیے اور جوتے پالش کرنے کے لیے پندرہ منٹ کا وقفہ دیا گیا۔ ہمیں ”جو کچھ“ بھی کرنا تھا اسی پندرہ منٹ کے وقفے میں کرنا تھا کیونکہ ٹھیک ساڑھے دس بجے یعنی پندرہ منٹ کے بعد بتیاں بجھانے کی سیٹی بج جاتی تھی اور پھر مکمل اندھیرا چھا جاتا تھا۔

یوں ہمارا اکیڈمی کا پہلا دن اپنے اختتام کو پہنچا۔ ہم سب بچوں کے جسم درد اور تھکن سے ٹوٹ رہے تھے لیکن ابھی آگے پہاڑ جیسی ایک اور رات منہ کھولے ہمارا راستہ دیکھ رہی تھی کیونکہ نیند ہم میں سے کسی کی بھی آنکھوں میں دور دور تک نہ تھی۔ آخر ٹھیک ساڑھے دس بجے ہمارے پریفیکٹ صاحب کہیں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے زوردار کاشن میں ہم سب بچوں کو اپنے بستروں میں دبک جانے کا حکم دیا۔ ہم سب اپنے بستروں کی جانب یوں بھاگے جیسے فوجی حملے کے وقت خندق کی جانب بھاگتے ہیں۔ چند لمحوں تک پریفیکٹ نے بجلی کے سوچ کے پاس کھڑے ہو کر اطمینان کیا کہ ہم سب بستروں میں گھس چکے ہیں۔ اس کے بعد اس نے سوچ آف کر دیا۔ چاروں جانب یکا یک گھپ اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔ ہم سب کے دلوں کے اندر چھپا خوف پھر سے اچھل کر باہر آ گیا اور ڈارمیٹری کی چھت اور دیواروں پر عجیب و غریب ڈارونی شکلیں بننا بنا کر ہماری جان نکالنے لگا۔ میں نے کمبل پوری طرح اپنے اوپر لے کر اپنے آپ کو اس اندھیرے سے بچانے کی کوشش کی لیکن اس کمبل کے اندر دیکے ہوئے بھی میں آس پاس کے بچوں کے رونے کی آواز اور سسکیاں سن سکتا تھا۔ خود میری آنکھیں بھی امی، عمارہ اور بھیا کو یاد کر کے بھیکتی گئیں اور میں نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

پہرہ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی اور اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راجہ اور بالے سمیت باقی سارے دوست بڑے میدان میں برگد کے پیڑ کے نیچے جمع ہو چکے تھے۔ ان کا ارادہ ”چھین چھپائی“ کھیلنے کا تھا لیکن راجہ نے سب سے پہلے انہیں صبح کی ”ہوتے ہوتے رہ گئی واردات“ کے بارے میں بتایا کہ آج انکو نے پھر صبح سویرے ہی ڈواڑی کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی لیکن غیاث چچا کو دیکھ کر وہ بدگ گیا۔ گڈواور پپو نے مشورہ دیا کہ ان سب کو فوراً مل کے ایک خط لکھ کر آدی کے نام بھیج دینا چاہیے تاکہ وہ فوراً واپس لوٹ آئے لیکن راجہ نے سختی سے اس بات کی مخالفت کی کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ آدی وہاں نہ جانے ”ظالم فوجیوں“ کے گھیرے میں پھنسا عذاب جھیل رہا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گا کہ اس کے دوستوں سے اک ذرا سا کام بھی نہ ہو سکا؟ جو کچھ بھی کرنا تھا خود ان لوگوں نے کرنا تھا اور یہیں کرنا تھا۔ طے یہ پایا کہ کل سے، صبح سے لے کر رات تک اسکول کے اوقات کو چھوڑ کر باری باری سبھی ڈواڑی کے گھر کے باہر پہرہ دیں گے اور کسی صورت میں بھی ڈواڑی کے دروازے کو بالکل خالی نہیں چھوڑا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی بچہ وہاں آس پاس ضرور موجود رہے گا اور کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ سیٹی بجا کر اپنے باقی دوستوں کو بھی خبردار کر دے گا۔ انہوں نے اسی وقت مل کر اس مخصوص سیٹی کی دھن بھی منتخب کر لی۔ یہ اس سیٹی سے کافی مختلف تھی جو وہ عام طور پر ایک دوسرے کو گھر سے بلانے کے لیے بجاتے تھے۔ یہ خاص سیٹی تھی جو انہیں صرف خطرے کے وقت تین مرتبہ بجاتی تھی۔ راجہ نے ان سب کو یہ تاکید بھی کی کہ ایسی تین سیٹیوں کی صورت میں ہر گھر سے آتے وقت اپنی ہاکی، بلا یا جو چیز بھی ہاتھ لگے اٹھاتے لائیں کیونکہ آگے معاملہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے مل کر بالے کو بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ چونکہ اس معاملے میں براہ راست اس کا بڑا بھائی ملوث ہے اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ بالا اس جھگڑے سے دور رہی رہے لیکن بالے نے زور سے نفی میں سر ہلایا، بلکہ وہ تو ان سب سے باقاعدہ روٹھ ہی گیا۔ بالے کی آنکھیں ان سب کو یہ بتاتے ہوئے بھیگ گئیں کہ اس سے آج تک اس کے گھر میں بھی کبھی کسی نے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ جتنا پیارا سے آدی اور ان سب دوستوں سے ملا ہے اس کا تو اس نے کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔ تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اب اس مشکل مرحلے پر ان کا ساتھ چھوڑ کر گھر میں چھپا بیٹھا رہے؟

اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کی حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہے، نہ صرف وہ بلکہ اس کے تمام گھروالے بھی شدید نالاں ہیں۔ وہ لوگ انکو کی حرکتوں کی وجہ سے پہلے بھی مختلف محلوں سے نکالے جا چکے تھے اور اس بار تو انکو کے ابا نے انکو کو آخری وارنگ دے دی تھی کہ اگر یہاں بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے گھر بدر کر دیں گے۔ آخر کار ان سب کو یہی بالے سے معافی مانگنی پڑی اور اسے منانا پڑا۔ کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ بالا اپنی ضد کا کتنا پکا ہے۔ ایک بار روٹھ جائے تو پھر روٹھ ہی جاتا ہے۔ لہذا طے ہو گیا کہ وہ ڈواڑی کو کسی بھی

خطرے کی صورت میں وہ سارے کے سارے مل کر ان کے لیے لڑیں گے۔

اگلے دو دن تک وہ سب مکمل پہرہ دیتے رہے لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ بالے نے بتایا کہ پچھلے دو دن سے اٹو گھر بھی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے گھر والوں کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ اسی طرح کام کے بہانے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا تھا لیکن تیسرے دن وہ انہونی ہو کر ہی رہی جس کی تدبیر وہ سارے دوست جانے کب سے کر رہے تھے لیکن ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس بار اس کا نشانہ ڈھو آپی نہیں بلکہ طاہر بھائی ہوں گے۔ وہ ڈھو آپی کا لُج سے اپنے وقت پر ہی آگئی تھیں۔ غیث چچا بھی ان کے ہم راہ تھے لہذا راجہ جو اس وقت پہرے پر وہاں بڑے میدان میں موجود تھا، بے فکر ہو کر گھر کے لیے پلٹ گیا لیکن ابھی وہ اپنے گھر میں داخل ہو کر اپنی اماں کے سامنے سر میں تیل ڈلوانے کے لیے دو گھڑی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک باہر محلے میں حملہ مچ گیا۔ راجہ کی اماں تیل سے چڑے ہاتھ لیے چلائی رہ گئیں لیکن راجہ دوسرے ہی لمحے ان سے دامن چھڑا کر بڑے میدان کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہاں لوگوں کا جھوم جمع تھا اور سبھی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔

پتہ چلا کہ اٹو اور طاہر بھائی آپس میں بھڑ گئے اور طاہر بھائی کو کافی چوٹ بھی آئی ہے۔ راجہ بدحواس ہو کر طاہر بھائی کے گھر کی جانب دوڑا، راستے میں کانوں میں پڑتی خبروں سے اسے پتہ چلا کہ جیسے ہی ڈھو آپی گھر میں داخل ہوئیں تبھی طاہر بھائی بھی محلے میں داخل ہوئے تھے اور اپنے گھر کی جانب بڑھ ہی رہے تھے کہ اٹو ان کے راستے میں آکھڑا ہوا۔ کچھ دیر دونوں میں کسی بات پر تکرار ہوئی پھر اچانک اٹو نے اپنے دامن ہاتھ میں پینے ہوئے آہنی مکے سے طاہر بھائی پر حملہ کر دیا۔ طاہر بھائی نے جھکائی دے کر اپنا چہرہ تو اس آہنی مکے کی ضرب سے بچا لیا لیکن اٹو کا ترچھا وار سیدھے ان کے سر پر جا لگا اور اگلے لمحے ہی خون کا فوارہ ان کے سر سے ابل کر ساتھ والی دیوار کو رنگین کر گیا۔ طاہر بھائی کا اپنے بچاؤ میں اٹھا ہاتھ کچھ اس طرح سے اٹو کے چہرے پر پڑا کہ اٹو کی بھی نکسیر پھوٹ گئی۔ اس کے بعد دونوں سخت گھبراہٹ ہو گئے لیکن اتنی دیر میں آس پاس سے گزرتے محلہ دار لپک کر دونوں کی جانب بھاگے اور انہیں علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن تب تک دونوں ہی کے کپڑے خون سے تر ہو چکے تھے۔ اٹو تو دوسرے ہی لمحے وہاں سے کہیں چھپت ہو گیا اور طاہر بھائی کو لوگوں نے ان کے گھر پہنچا دیا۔ محلے کے لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے ان میں سے کسی نے اٹو کے منہ سے ڈھو آپی کا نام بھی سنا تھا۔ سب ہی پریشان تھے کہ خدا جانے کیا ماجرا ہو گیا؟ لیکن راجہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی۔

راجہ جب طاہر بھائی کے صحن میں داخل ہوا تو اس وقت تک طاہر بھائی کے ابا اور اماں ان کا سردھلوا کر اس پر پٹی وغیرہ باندھ چکے تھے اور طاہر بھائی صحن میں ہی پڑی کرسی پر بیٹھے اپنے اماں ابا کو تسلی دے رہے تھے کہ صرف سر کی جلد پٹی ہے اس لیے اب اتنا گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آخر وہ خود بھی ڈاکڑ ہیں اپنے زخم کے بارے میں جانتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں غیث چچا اور محلے کے دیگر بزرگ بھی طاہر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ غیث چچا کی وجہ سے محلے والوں نے کھل کر طاہر بھائی سے جھگڑے کی اصل وجہ نہیں پوچھی لیکن خود غیث چچا بھی کچھ اچھے اچھے سے نظر آرہے تھے۔ طاہر بھائی نے سب کو یہی بتایا کہ غالباً اٹو کو ان کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی لہذا اس نے ان کا جواب سنے بغیر ہی ان پر حملہ کر دیا۔ انہیں خود نہیں پتہ کہ اٹو کے ذہن میں کیا حاسن سایا ہوا ہے لیکن محلے کے سارے بزرگ اس بات پر مصر تھے کہ اب وہ اٹو کو مزید اس محلے میں برداشت

نہیں کریں گے۔ غفور چچانے بنا کسی کو بتائے اپنا ”اثر و رسوخ“ استعمال کرتے ہوئے علاقہ ایس ایچ او کو بھی اطلاع کر دی تھی۔ طاہر بھائی نے بڑی مشکل سے سب کو کسی نہ کسی طور مطمئن تو کر دیا لیکن وہ خود بھی جانتے تھے کہ بات اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ وہ اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے کہ لوگ اسے معمول کا ایک واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں اور اس کے اثرات کے چھینٹے و جوڑ پی کے پاک دامن تک نہ پہنچنے پائیں لیکن بات اب شاید ان کے بس سے بھی باہر ہو چکی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں

طارق اسماعیل ساگر کے چشم کشا مضامین کا مجموعہ..... جن میں پاکستان کو لاحق تمام اندرونی و بیرونی خطرات و سازشوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 4 اگست 2009 کے موقع پر، پاکستانی نوجوانوں کو باشعور کرنے کی کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش..... درج ذیل مضامین اس کتاب میں شامل ہیں: پاکستان پر دہشت گردوں کا حملہ، 20 ستمبر پاکستان کا نائن الیون بن گیا، دھماکے، وطن کی فکر کرنا دان!، پاکستان عالمی سازش کے نرغے میں، حکمت عملی یا سازش، طالبان آرہے ہیں؟، مملاتی سازشوں کے شکار، ابھی تو آغاز ہوا ہے!، بلیک وائر آر می، اکتوبر سر پرانز اور ”کشمیری دہشت گرد“، سازشی متحرک ہو گئے ہیں!، وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!، پاکستان کے خلاف ”گریٹ گیگ“، حمیت نام تھا جس کا..... آئی ایم ایف کا پچھندہ اور لائن آف کامرس، آئی ایس آئی اور ہمارے ارباب اختیار، ڈاکٹر عافیہ صدیقی کا اغواء، مکمانڈو جنرل بالآخر عوام کے غضب کا شکار ہو گیا، انجام گلستاں کیا ہوگا؟، خون آشام بھیڑیے اور بے چارے پاکستانی، عالمی مالیاتی ادارے، چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر! APDM، سکے جمع کرنے کا شوق، اب کیا ہوگا؟، الیکشن 2008ء اور تلخ زمینی حقائق، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟، آمریت نے پاکستان کو کیا دیا، ہم کس کا ”کھیل“ کھیل رہے ہیں! نئی روایات قائم کیجئے، نیا پنڈورا باکس کھل رہا ہے، قوسے فروختند و چہ ارزاں فروختند!، خوراک کا قحط!، 10 جون سے پہلے کچھ بھی ممکن ہے؟، پہنا گئی درویش کو تاج سردار!، کالا باغ ڈیم منصوبے کا خاتمہ، بے نظیر کا خون کب رنگ لائے گا؟، صدر کا مواخذہ، صدر کو!، ہم مسائل کا سامنا ہے، جناب صدر! پاکستانیوں پر بھی اعتماد کیجئے!، نیا صدر..... نئے چینلج اور سازشیں، 23 مارچ کا جذبہ کہاں گیا؟، امریکہ، امریکہ کی عسکری اور بھارت کی آبی جارحیت، امریکی عزائم اور ہماری بے بسی، پاکستانی اقتدار اعلیٰ کا احترام کیجئے!، امریکہ کی بڑھتی جارحیت، ہماری آنکھیں کب کھلیں گی؟، وقت دعا ہے!، امریکی جارحیت کا تسلسل، جارحانہ امریکی یلغار اور بھارتی مداخلت، وزیر اعظم کے دورے، عالمی منظر نامہ بدل رہا ہے، باراک اوباما، ممبئی لرز اٹھا، بھارت خود کو امریکہ سمجھ رہا ہے، بھارت سے ہوشیار، مقبوضہ کشمیر میں آزادی کی نئی لہر

اس کتاب کو پاکستان کی تاریخ اور حالات حاضرہ سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چرچ

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

اگلا ایک ہفتہ بھی اکیڈمی میں اسی قسم کے مختلف غذاؤں سے نبرد آزما ہوتے گزر گیا۔ ہماری روٹین میں تھوڑی بہت تبدیلی اُس دن آئی جب ہمیں شام کو کھیل کے میدان کی بجائے سوئمنگ پول تیراکی سکھانے کے لیے لے جایا جاتا۔ ہفتے کے چھ دنوں میں سے ہر دن ایک ہاؤس کے لیے مخصوص تھا۔ قاسم ہاؤس کی باری جمعرات کو آیا کرتی تھی۔ پہلے دن جب ہمارے انسٹرکٹر نے ہمیں پانی میں اتارنے کی کوشش کی تو ہم گیارہ کے گیارہ اس طرح رسیاں تڑا کر بھاگے جیسے کوئی قربانی کا بکرا قصائی کے ہاتھوں سے نکل کر بھاگتا ہے لیکن اُس پاس موجود دیگر سینئر کڈز نے ہمیں اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ ایک بار تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نیچے سے اوپر آئی نہیں پاؤں گا۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ پانی کے اندر رہتے ہوئے چلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بہر حال رفتہ رفتہ ہمارا پانی سے ڈر ختم ہونے لگا۔ ہماری پریڈ بھی اب کافی بہتر ہو گئی تھی اور اب راستے میں کسی جو نیئر کڈز کی پتلون بھی شاذ و نادر ہی اتر آتی تھی۔ اب ہفتے میں دو مرتبہ ہمیں گھڑ سواری سکھانے کے لیے بھی لے جایا جاتا۔ اسفر کو گھوڑوں سے بہت ڈر لگتا تھا لہذا گھوڑوں نے بھی طے کر لیا تھا کہ جب بھی موقع ملے وہ اسفر کو زمین پر ضرور پٹھیں گے جبکہ مجھے اور فیصل کو ایک مرتبہ گھوڑے لے کر ”بھاگ“ گئے تھے نہ جانے اچانک ہم دونوں کے گھوڑوں کو کیا ہوا اور وہ جنگلا پھلانگ کر اچھلے اور ہمارے لاکھ پیچھے چلانے کے باوجود وہ دو گھاس کے میدانوں کی جانب بھاگتے چلے گئے۔ ہمارے پیچھے ہمارے انسٹرکٹروں نے گھوڑے دوڑائے اور جانے کتنی دور سے ہمیں گھوڑوں سمیت پکڑ کر واپس لائے۔ بعد میں کلاس کے دوران مجھے فیصل نے بتایا کہ اس نے گھوڑے کے کان میں کچھ ”ایسا“ کہا تھا جس سے وہ ناراض ہو کر بھاگ اٹھا تھا اور میرا گھوڑا اسے دیکھ کر خود پہ قابو چھوڑ بیٹھا تھا۔

پرنسپل صاحب نے انوار صاحب کو مجھے انڈر آبزرویشن رکھنے کے لیے جو ایک ہفتہ دیا تھا وہ بھی گزر چکا تھا۔ لہذا اگلے روز کلاس لگتے ہی وہ مجھے پرنسپل کے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پرنسپل کے سامنے میری مایوس کن رپورٹ رکھ دی۔ میں اب تک اکیڈمی میں استعمال ہونے والے بیشتر انگریزی کے لفظ سمجھ چکا تھا اور بول بھی سکتا تھا۔ مثلاً پریڈ کے تمام کاشن، سینئرز کی ڈانٹ، پیٹی آفیسرز کے مخصوص جملے، بیروں اور بٹلرز کی باتیں لیکن مجھے ابھی تک کورس کی کتابوں میں سے ایک لفظ بھی پڑھنا نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر خود بھی ہر طرح کی کوشش کر کے دیکھ لی تھی لیکن اتنا مشکل کورس اتنے کم عرصے میں سمجھنا میرے لیے ناممکن تھا۔

پرنسپل صاحب نے میری رپورٹ غور سے پڑھی۔ سچ پوچھیں تو میں دل ہی دل میں کہیں اندر اس بات سے خوش بھی تھا کہ یہ لوگ آخر کار خود ہی مجھے اکیڈمی سے نکال دیں گے کیونکہ میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ کمانڈر صاحب نے انوار صاحب سے کہا کہ وہ مجھے ان کے دفتر

میں ہی بیٹھا رہنے دیں اور خود جا کر اپنی کلاس اٹینڈ کریں۔ انوار صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی میز کی دراز سے لسکٹ کا ایک ڈبہ نکالا اور اس میں سے مجھے لسکٹ نکال کر کھانے کو دیئے۔ میں سب سمجھ رہا تھا اب کچھ ہی دیر میں کمانڈر صاحب مجھے یہ خوش خبری سنائیں گے کہ مجھے اکیڈمی سے نکالا جا رہا ہے اسی لیے وہ پہلے مجھے خوش کرنے کے لیے یہ لسکٹ وغیرہ کھلا رہے ہیں تاکہ مجھے زیادہ ”صدمہ“ نہ ہو۔ میں مزے سے لسکٹ کھاتا رہا۔ پرنسپل صاحب میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے میری رپورٹ اٹھائی اور بغور اسے دیکھا اور بولے۔

”ہاں بھی کیڈٹ نمبر 8336 یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ تم نے پچھلے ایک ہفتے میں محنت تو بڑی کی لیکن کلاس میں امپروو (Improve) نہیں کر پائے۔ البتہ تمہاری پریڈکٹیو رائیڈنگ اور سوئمنگ کے علاوہ گیمز کی رپورٹ اے ون ہے۔ ڈیٹس گڈ۔ That's good۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اپنی جانب سے پوری کوشش کر دیکھی ہے لیکن میں خود بھی اس معاملے میں بے بس ہوں۔ پرنسپل صاحب نے گہری سی سانس لی اور بولے۔

”تمہارے ابو نے مجھے تمہاری تعلیم اور اسکول کے مضامین کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دم سے اردو میڈیم سے انگلش میں سوچ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال اب تم بتاؤ آدمی تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

میں ان کی بات سمجھا نہیں۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں خود اپنی زبان سے انہیں کہہ دوں کہ مجھے یہاں سے فارغ کر دیا جائے۔ چلو یونہی سہی۔ مقصد تو اس جیل سے چھٹکارا ہی ہے نا۔ چاہے میں خود کہوں یا وہ مجھے جانے کو کہیں۔

میں نے انہیں کہا کہ میں اپنی کلاس میں بہت شرمندگی محسوس کرتا ہوں کیونکہ میں ان سب کی طرح انگریزی نہیں بول سکتا۔ اپنا سبق یاد نہیں کر سکتا۔ کاپی پر ہوم ورک نوٹ نہیں کر سکتا۔ سارے سینئر کیڈٹ بھی میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرے سامنے ہی مجھے انگریزی میں جانے کیا کچھ سناتے رہتے ہیں لیکن میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ان سب باتوں کی بھی خیر ہوتی اگر میں اپنی کلاس میں ہی کم از کم اتنا تو بہتر ہوتا کہ اگلے آنے والے امتحانات میں پاس ہی ہو جاتا لیکن یہاں تو یہ بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب کو یہ بھی بتایا کہ میں آج تک اپنے اسکول میں کبھی فیل نہیں ہوا تھا بلکہ ہر بار اول یا دوئم ہی آتا تھا۔ اب یہ میرے لیے مکمل ”ذوب مرنے“ کا مقام ہوگا اگر میں اکیڈمی میں فیل ہو جاتا تو میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس بے عزتی سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ مجھے واپس شال کوٹ بھیج دیں۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے میں با آسانی واپس جا کر اپنا ہائی اسکول پھر سے جوائن کر سکتا تھا۔ ہاں البتہ اتنے دن تک جو اکیڈمی والوں نے میری ”مہمان داری“ کی ہے اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کر رہا ہوں گا۔

پرنسپل نے دلچسپی سے میری ساری باتیں سنیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ پڑھائی کے علاوہ مجھے اور کوئی دوسرا مسئلہ تو وہاں درپیش نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اور تو کوئی خاص مشکل نہیں لیکن مجھے میس میں کھانا کھاتے وقت جس عذاب سے گزرتا پڑتا تھا اس کی ساری تفصیل میں نے انہیں الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اب جب میری یہاں سے واپسی کا فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو برائے مہربانی میرے گھر واپس جانے تک میرے ”کھانے پینے“ کا بندوبست کہیں اور کر دیا جائے کیونکہ گزشتہ ایک ہفتے سے میں میس کے ان سخت اصولوں کی وجہ

سے پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھا سکا تھا۔ پرنسپل صاحب میری بات سن کر ہلکے سے مسکرا دیے۔ مجھے اس لمحے وہ بہت بھلے انسان محسوس ہوئے۔ ویسے تو اکیڈمی میں ان کا بہت رعب داب تھا اور چہرے مُہرے سے وہ کافی سخت گیر انسان محسوس ہوتے تھے لیکن آج مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی میرے ابا کی طرح اوپر سے انتہائی سخت گیر جبکہ اندر سے ایک ہمدرد اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ کمانڈر صاحب نے مجھ سے میرا فائل فیصلہ پوچھا۔

”اوکے..... تو کیڈٹ عبادتہم واپس اپنے گھر جانا چاہتے ہو۔ چلو ٹھیک ہے لیکن سب سے پہلے تمہارے ابا جان کو خبر کرنا ضروری ہے کہ وہ خود آکر تمہیں لے جائیں گے یا پھر ہم خود تمہیں یہاں سے بھجوانے کا کوئی بندوبست کریں۔“

پرنسپل صاحب گھوم کر اپنی کرسی کی جانب آئے اور میز پر پڑے ٹیلی فون سے انہوں نے کوئی نمبر ملایا۔ کچھ دیر تک انتظار کرتے رہے۔ میرا یہاں بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا کہ جانے ابا پر یہ خبر سن کر کیا اثر ہوگا؟ لیکن پرنسپل صاحب انہیں یہ بھی تو ضرور بتائیں گے کہ میں نے اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں رکھ چھوڑی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ دوسری طرف سے لائن مل گئی۔ پرنسپل صاحب نے کھنکار کر کہا۔

”جی..... میں کمانڈر اسرار اللہ بول رہا ہوں۔ جی کیا میں رافع اللہ صاحب سے بات کر سکتا ہوں..... جی جی..... بہتر ہے.....“

کچھ دیر تک پرنسپل صاحب انتظار کرتے رہے اور پھر دوسری جانب ابا کے آجانے پر انہوں نے ساری صورت حال ان پر واضح کر دی۔ مجھے ان کی سب سے اچھی بات یہ لگی کہ وہ ہر جملے کے بعد یہ ضرور کہتے کہ ”نہیں نہیں..... عباد تو اپنی جانب سے بہت محنت کر رہا ہے لیکن یہاں کا کورس ہی اتنا مشکل ہے کہ اس بے چارے سے کچھ بن نہیں پارا.....“ جی جی..... اچھا..... اوہ..... یہ تو بہت بری بات ہے..... اچھا.....؟ انہوں نے ایسا کہا..... یہ تو بہت بری بات ہے..... اچھا..... چلیں آپ کہتے ہیں تو یوں ہی سہی.....“

پرنسپل صاحب جانے کیا کچھ کہہ رہے تھے اور یہاں میرا بے چینی سے برا حال ہو رہا تھا۔ آخر یہ دونوں کن لمبی چوڑی کہانیوں میں پڑ گئے تھے۔ جلدی سے فیصلہ کر کے بات ختم کرنی چاہیے تھی۔ آخر خدا خدا کر کے پرنسپل صاحب نے فون رکھا اور میری طرف پلٹے۔

”تمہارے ابا جان راضی ہو گئے ہیں۔“

خوشی کے مارے میرے ہاتھوں سے سکٹ کا ڈبے نیچے گر گیا جیسے میں نے جلدی سے اٹھا کر واپس میز پر رکھا اور جلدی سے پرنسپل صاحب سے پوچھا۔

”وہ ناراض تو نہیں تھے نا مجھ سے.....؟ وہ آپ کی بات تو سمجھ گئے تھے نا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے؟“

”نہیں نہیں..... ناراض تو وہ بالکل نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی ایک الجھن بتائی ہے جسے سن کر میں سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ تمہیں واپس بھجوانے سے پہلے تمہارے کزنز اور چچا زادوں سے کیا بہانہ کیا جائے.....؟“

میں پرنسپل صاحب کی بات سن کر چونک گیا۔ میرے چچا زادوں کا کیا ذکر نکل آیا تھا اس وقت؟

پرنسپل صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے کیڈٹ کالج آنے کے بعد میرے کزنز نے بہت سی باتیں بنائی تھیں کہ دیکھ لینا آدھی ہفتہ دس دن بھی کیڈٹ کالج میں نہیں نکال پائے گا اور انہوں نے میرے بہن بھائیوں سے شرط بھی لگائی تھی کہ آدھی دوسرے ہفتے ہی واپس نہ لوٹ آیا تو جو چور کی

سزا وہ ان کی سزا۔ غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ وہ سب مجھ سے جلتے ہیں۔ یہ ضرور عابد، ساجد اور روبی وغیرہ ہوں گے۔ انہی کو میرے کیڈٹ کالج آنے سے بہت زیادہ تکلیف تھی۔ میں نے جلدی سے پرنسپل صاحب سے پوچھا کہ کیا ابانے یہی تین نام بتائے ہیں۔ کمانڈر صاحب نے جلدی سے سر بلایا اور کہا کہ میرے ابا تک بھی یہ بات پہنچ چکی ہے لہذا اب وہ صرف اس بات سے پریشان ہیں کہ آدی صاحب جب واپس آئے گا تو ان سب خاندان والوں کا سامنا کیسے کرے گا۔ یہ سن کر تو میں خود بھی گہری سوچ میں پڑ گیا کیونکہ واقعی معاملہ سنگین تھا۔ مجھے عابد وغیرہ سے یہ امید ہرگز نہ تھی کہ میرے پیچھے وہ خاندان بھر میں ایسی باتیں کر کے مجھے بدنام کریں گے۔ پرنسپل صاحب نے مجھے گہری سوچ میں ڈوبے دیکھا تو مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر خود ہی بولے۔

”ویسے میرے ذہن میں تمہاری اس مشکل کا ایک حل موجود ہے اگر تمہیں قبول ہو تو.....؟“

میں نے جلدی سے سر بلایا کیونکہ اس وقت میرے آس پاس وہی ایک میرے مسجاتھے۔

”میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنے کزنز کا منہ بند کرنے کے لیے چند ہفتے یہاں مزید ٹھہر جاؤ۔ ایک دم سے واپس جاؤ گے تو وہ سب تمہارا بہت مذاق اڑائیں گے۔ تم یہاں مزے سے رہو اور پڑھائی وغیرہ کی پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی چاہے تو کلاس آیا کرو۔ جی نہ چاہے تو نہ سہی۔ البتہ تمہارے واپس جانے تک تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہونی چاہیے کہ تم وہاں انگریزی بول کر سب کا منہ بند کر سکو۔ ورنہ انہیں شک ہو جائے گا کہ تم کیڈٹ کالج گئے بھی تھے یا نہیں۔“

میں نے ان کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا کیونکہ اصل مسئلہ ہی تو انگریزی کا تھا۔ پرنسپل صاحب نے تفصیل سے مجھے بتایا کہ میرے باقی ماندہ دنوں کے لیے انہوں نے سوچا ہے کہ مجھے اکیڈمی کے پچھلے حصے میں ٹیچرز اور باقی اسٹاف کے چھوٹے بچوں کے لیے جو گرائمر اسکول ہے۔ وہاں کی نرس (Nuns) کے حوالے کر دیا جائے۔ وہاں کی بڑی مدر اور باقی نن سسٹرز مجھے میرے فارغ وقت میں انگریزی زبان اور انگریزی رکھ رکھاؤ اور کھانے پینے کے طریقے بھی اچھی طرح سکھا دیں گی۔ اس طرح جب میں واپس شال کوٹ جاؤں تو وہاں سارے خاندان کے سامنے میری سبکی نہ ہو سکے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی کیونکہ اب اتنی دور آئی گیا تھا تو کچھ سیکھ کر جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے سوچا کہ جب میں ٹھیک طرح سے یہاں کی انگریزی سیکھ لوں گا تو جو آئی کو بھی واپس جا کر پڑھا دیا کروں گا پھر ہم دونوں کو طاہر بھائی کی ”مختاجی“ سے بھی نجات مل جائے گی۔

میں نے پرنسپل صاحب کو کہا کہ مجھے ان کی تجویز منظور ہے۔ انہوں نے خوشی سے چٹکی بجائی۔

”ڈیٹس گڈ۔ That's Good..... میں جانتا ہوں تم ایک بہادر کیڈٹ ہو.....“

پرنسپل نے فون اٹھا کر کسی کو چند ہدایات دیں اور جب میں جانے لگا تو انہوں نے مجھے نصیحت کرنے کے انداز میں کہا کہ انگریزی بھی باقی زبانوں کی طرح صرف ایک زبان ہے۔ میرے آس پاس جو بچے انگریزی لکھ اور بول سکتے ہیں اس کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے آس پاس اور اسکول میں سب کو یہ زبان بولتے سنا تھا اس لیے وہ یہ زبان سیکھ گئے اور اگر میں آج سے دل لگا کر یہ زبان سیکھنے کی کوشش کروں گا تو کوئی وجہ نہیں کہ چند ہفتوں میں میں بھی یہ سب کچھ نہ سیکھ سکوں۔ شرط صرف ان تھک محنت اور زبان سے لگاؤ ہے۔ میں نے ان سے

وعدہ کیا کہ اب جب ہماری ملاقات ہوگی تو وہ مجھ میں واضح تبدیلی محسوس کریں گے۔

پرنسپل کے کمرے سے نکل کر میں واپس اپنی کلاس میں آ گیا۔ فیصل اور اسفر کو مجھ سے سب کچھ جان لینے کی شدید بے چینی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری آزادی کا پروانہ آ گیا ہے اور اب بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے جب میں یہاں سے ”پھر“ ہو جاؤں گا۔ ان دونوں نے وجہ سن کر اپنے سر پیٹ لیے کہ کاش وہ بھی اردو میڈیم ہوتے۔ خواہ مخواہ انہوں نے اپنا سارا بچپن اس فضول زبان کو سیکھنے میں برباد کر دیا اور آج وہی زبان ان کے گلے پڑ گئی ہے۔ اس دن اتنے دنوں کے بعد پہلی مرتبہ دوپہر کے کھانے کے بعد میری اتنی ہمت ہوئی کہ میں نے گھر سے لائے اپنے سامان اور سوٹ کیس کو کھول کر تفصیل سے دیکھا ورنہ پہلے دن ضرورت کی چیزیں نکالنے کے بعد میں نے اپنے سامان کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ کیونکہ جانے کیوں جیسے ہی میں ان چیزوں کو دیکھتا تھا مجھے شدت سے گھر کی یاد ستانے لگتی تھی۔ تبھی میرے بڑے سوٹ کیس کے اندر رکھے اس تھیلے پر بھی میری نظر پڑ گئی جو غیث چچا نے اسٹیشن پر بھاگ دوڑ میں ابا کے حوالے کیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس تھیلے کو کھولا۔ سب سے اوپر جو آپی نے میرے لیے مبارکباد کا ایک کارڈ رکھا تھا جس میں اپنے ہاتھ سے انہوں نے میرے لیے بہت سی دعائیں لکھی تھی۔ میری آنکھیں ایک دم ہی بھینکنے لگی تھیں۔ میں نے جانے کتنی بار اس کارڈ کو پڑھا ہوگا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آپی یہیں کہیں میرے آس پاس ہی موجود ہیں۔ ویسے بھی جب میں نے ان کا دیا ہوا تھیلہ کھولا تھا تو ان کی خوشبو میرے آس پاس ساری ڈارمیٹری میں بکھر گئی تھی۔ کارڈ کے نیچے میری پسندیدہ چاکلیش تھیں پھر کچھ کہانیوں کی کتابیں، جو میٹری بکس، میرے پسندیدہ کارٹونز کے بہت سے اسکرز، آپی کا وہ پین جو مجھے بہت پسند تھا اور بہت سے نئے پین، رنگین پنسلیں اور جانے کیا کیا۔ میری حالت بری تھی۔ میں سامان دیکھتا جاتا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے جاتے۔ یہ تو اچھا تھا کہ اس وقت باقی سارے بچے نیچے گراؤنڈ میں سینٹر کیڈٹس کافٹ بال میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے اور ہیرک خالی تھی۔ ورنہ ان سب کے سامنے مجھے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں جو آپی کی دی ہوئی یہ چیزیں اس کیڈٹ کالج جیسی فضول جگہ پر استعمال کر کے کبھی ان کی ”توبین“ نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ انہیں سنبھال کر اپنے پاس رکھوں گا۔ کچھ ایسا ہی حال میرا اپنے گھر کے سامان کو دیکھ کر بھی ہوا۔ امی، بھیا، عمارہ اور ابا کی دی ہوئی چیزوں کو میں نے نہایت عقیدت سے فردا فردا اپنی آنکھوں سے لگا کر چوما اور سنبھال سنبھال کر واپس رکھتا گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میرے ابا نے کتنی محنت سے پائی پائی جوڑ کر میرے لیے یہ سامان خریدا ہوگا۔ نئی پینٹ شرٹس کے کٹی جوڑے، نئے شلوار کرتے، نئے جوتے، نیا کوٹ، نئے سویٹر، نئے بنیان، نئے رومال، نیا شیشہ، غرض ہر چیز نئی تھی۔ حتیٰ کہ نیل کٹر (ناخن تراش) تک انہوں نے نیا لے کر سوٹ کیس میں رکھوایا تھا۔ مجھے خواہ مخواہ اپنے آپ پر ہی غصہ آنے لگا کہ مجھ جیسے ناکارہ اور فضول لڑکے پر انہیں اس قدر خرچہ کرنے کی آخر ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر اوپر سے ٹرین کے آنے جانے کے ٹکٹس کا خرچہ الگ، میں نے تبھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان میں سے حتیٰ الامکان نئی چیزیں بچا کر رکھوں گا اور گھر واپس جاتے ہی امی کے حوالے کر دوں گا کہ انہیں بازار میں واپس دے کر ابا کے پیسے واپس لے آئیں۔

ابھی میں اپنے انہی مستقبل کے سپنوں میں کھویا ہوا تھا کہ نہ جانے کہاں سے ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب دبے پاؤں چلتے ہوئے ہماری ہیرک میں داخل ہو گئے۔ میں نے ہڑبڑا کر جلدی سے اپنا سوٹ کیس بند کر دیا۔ وہ اپنی آنکھوں پر لگے موٹے سے چشمے کے عقب سے میری

جانب مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ باقی کیدٹس کے ساتھ میچ دیکھنے کیوں نہیں گئے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے لیکن ہاؤس ماسٹرز پر عموماً اس قسم کی باتوں کا اثر کچھ کم ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے فوراً مجھے گیمز ڈریس پہن کر باقی کیدٹس کو جوائن کرنے کا حکم دیا اور تب تک وہیں کھڑے رہے جب تک میں ہاؤس سے نکل نہیں گیا۔

اسی دن شام کو ہمارا ہاؤس بلر جمعہ مجھے اکیڈمی کے اس حصے میں لے گیا جہاں ٹیچرز اور اسٹاف کے بنگلے بنے ہوئے تھے اور جہاں ان کے بچوں کا گرائمر اسکول اور جونیئر سیکشن موجود تھا۔ یہاں پر باقی تمام کیدٹس کا داخلہ ممنوع تھا اور میں نے دیکھا کہ یہ تو ایک الگ ہی دنیا تھی۔ بڑے بڑے خوب صورت بنگلے، پارک، کھانے پینے کی دوکانیں، دیگر ضرورت کی چیزوں کے لیے ایک خوب صورت سی چھوٹی مارکیٹ، بچوں کے لیے پلے لینڈ، جھولے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بنا خوب صورت سا چرچ اور کانونٹ اسکول کی عمارت، مجھے تو جگہ کسی پرستان کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ یہاں نہ تو بیٹی آفیسرز کے کرخت چہرے تھے نہ سینئر کیدٹس کی بک بک اور سزا کا ڈر۔ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ جمعہ میرا ہاتھ تھامے اس سڑک پر چل رہا تھا جس کے دونوں اطراف سرو کے اونچے اونچے درخت موجود تھے۔ ان درختوں کے عقب میں دور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور پرندے اپنے گھروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا تو ہر درخت کی ایک شاخ پر ان پرندوں کے لیے لکڑی کا ایک خوب صورت چھوٹا سا گھر بھی بنا کر رکھا گیا تھا اور ایسے ہر گھر پر ایک نمبر بھی لگا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر میں ہم بل کھاتی سڑک سے ہوتے ہوئے اوپر پہاڑی پر بنے کانونٹ کی عمارت کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چرچ کے سامنے ایک بہت بڑا سا صحن تھا جس میں ترتیب وار اینٹیں یوں لگی ہوئی تھیں کہ دور سے سورج مکھی کا بڑا سا پھول محسوس ہوتی تھیں اسی مناسبت سے اینٹوں پر پیلا اور بھورا رنگ بھی کیا گیا تھا۔

جمعہ نے آگے بڑھ کر چرچ کے دروازے پر لگی بڑی سے گھنٹی ہلائی اور دور کہیں چرچ میں اندر بھی ویسی ہی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس گھنٹی کی ڈوری اندر بھی کسی ایسی ہی چھوٹی لوہے کی گھنٹی سے بندھی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں سفید لباس میں ملبوس ایک مہربان سے چہرے والی عورت نے دروازہ کھولا۔ جمعہ نے اسے بتایا کہ میرا نام کیدٹ عباد ہے اور ہمیں کمانڈر صاحب نے یہاں بھیجا ہے۔ عورت نے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں چرچ کی عمارت میں بنی ایک راہداری سے گزرا کر اس جانب لے آئی جہاں دفاتر بنے ہوئے تھے۔ ایک دفتر میں ہمیں بٹھا کر وہ چند لمحوں کے لیے معذرت کر کے چلی گئی اور پھر کچھ ہی دیر میں ایک ملیح سے چہرے والی بہت گورے رنگ کی ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔ پتہ چلا کہ یہی بڑی مدد رکھتی ہیں جو یہاں کی انچارج ہیں۔ مجھے تو وہ انگریزی ہی لگ رہی تھیں لیکن جب ان کے منہ سے میں نے اردو سنی تو میں حیران ہی رہ گیا۔ انہوں نے مجھ سے میرا نام وغیرہ پوچھا اور میرے لیے چائے رسکٹ بھی منگوائے۔ انہوں نے جمعہ سے کہا کہ پرنسپل صاحب کا پیغام انہیں مل چکا ہے اور وہ کیدٹ عباد کو اپنے کانونٹ میں خوش آمدید کہتی ہیں۔ انہوں نے جمعہ کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ روزانہ شام چار بجے مجھے یہاں چھوڑ جایا کرے اور رات آٹھ بجے یعنی سینکڑ پرپ سے پہلے مجھے واپس لے جایا کرے۔ گویا کل سے روزانہ چار گھنٹے مجھے یہاں گزارنا تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ

ان چار گھنٹوں میں دو گھنٹے میری انگلش اور دیگر مضامین کی ٹیوشن ہوا کرے گی اور باقی دو گھنٹے مجھے اکیڈمی کے دیگر طور اطوار چلنا پھرنا، کھانا پینا اور مختلف مواقع کے مختلف لباس اور رواجوں وغیرہ کے بارے میں سکھایا جائے گا۔

چائے کے بعد انہوں نے جمعہ کو تو واپس بھیج دیا اور خود مجھے لیے کانونٹ اور چرچ کے مختلف حصوں کی سیر کرواتی رہیں۔ پانچ بجے کے قریب انہی کی طرح سفید لباس پہنے ایک خوب صورت سی جونیئرزن ہیلن آگئی۔ مدر کیتھرین نے مجھے بتایا کہ ہیلن ہی میرے تمام مضامین کی ٹیوشن ٹیچر ہوگی۔ انہوں نے ہیلن سے پوچھا کہ شیرل کہاں ہے۔ ہیلن نے بتایا کہ شیرل آج اپنے پاپا کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہے البتہ کل سے وہ بھی اپنے وقت پر آجائے گی۔ پھر ہیلن نے خود ہی مجھے بتایا کہ شیرل پڑھائی کے علاوہ دیگر امور کے لیے میری ٹیچر مقرر کی گئی ہے۔ چرچ میں سبھی لوگ اس قدر ہنس مکھ تھے کہ کچھ دیر کے لیے تو میں اکیڈمی کے کرخت اور بے زار کن ماحول کو بھول ہی گیا تھا۔ مدر کیتھی نے مجھے ہیلن کے حوالے کر دیا اور خود عبادت کے لیے اندر چرچ کی مرکزی عمارت کی جانب بڑھ گئیں۔ ہیلن بہت دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی اور اس نے مجھ سے میرا مکمل تعارف بھی حاصل کر لیا تھا، لہذا اب طے یہ ہوا کہ کل سے میں اپنی تمام کتابیں بھی آتے ہوئے ساتھ لے کر آیا کروں گا۔ اس کے علاوہ جب شیرل ٹیچر کل سے آجائیں گی تو جو کچھ وہ بتائیں مثلاً میرے لباس وغیرہ میں سے کوئی لباس تو وہ بھی مجھے پہن کر آنا ہوگا یا ساتھ لے کر آنا ہوگا۔ مجھے اس شام وقت گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلا اور رات کے آٹھ بجے بھی بج گئے۔ میں اس وقت چونکا جب ہمارا ہاؤس بلٹر جمعہ مجھے لینے کے لیے واپس آ پہنچا۔ میں ہیلن سے رخصت ہو کر جیسے ہی کانونٹ اور چرچ کے رہائشی علاقے سے باہر نکلا اور میں نے اکیڈمی کی طرف جاتی سڑک پر قدم رکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی گہرے خواب سے جاگ کر اٹھا ہوں۔ میرے ہاؤس تک پہنچنے سے پہلے ہی میرے سارے ہم جماعتوں کو میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ وہ سبھی مجھ سے اکیڈمی کی اونچی لمبی اور خاردار تاروں سے ڈھکی ہوئی چار دیواری کے باہر کی دنیا کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ جبکہ چند میٹرک اور فرسٹ ایئر کے کیدٹس بھی ہاسٹل کے دروازے پر مجھ سے یہ پوچھنے کے لیے کھڑے تھے کہ میں نے وہاں کانونٹ میں کتنی لڑکیوں کو موجود پایا۔ ان کے نام کیا تھے اور کیا انہوں نے مجھ سے ”قاسم ہاؤس“ کے سینئر کیدٹس کے بارے میں پوچھا تھا یا نہیں..... اس دن مجھے پتہ چلا کہ اکیڈمی کی چار دیواری کے باہر چرچ والی یہ دوسری چار دیواری تو واقعی سینئر کیدٹس کے سپنوں کی دنیا ہے، کیونکہ وہ سب صبح پریڈ کے وقت اس چار دیواری سے لڑکیوں کی کالج بس کو نکلتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے اور انہوں نے کئی مہرِ رُخوں کو اس بس میں بیٹھے جاتے دیکھا تھا۔ میں پہلا کیدٹ تھا جسے انتظامیہ نے خود اس چار دیواری تک رسائی کی اجازت دی تھی ورنہ کئی کیدٹس تو اس چار دیواری کے آس پاس پھٹکنے کی پاداش میں ہی ہفتوں سزا کھاتے رہے تھے۔ تمام سینئر کیدٹس نے مجھے کسی نہ کسی لٹنی، نائلہ، عینی، پنگی یا ناہید وغیرہ کا پتہ معلوم کرنے کی ”میشن“ کیس۔ یوں اس دن کا اختتام نائٹ فالن کے بعد یوں ہوا کہ آدی ”محمد بن قاسم ہاؤس“ کا سب سے اہم کیدٹ بن چکا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

بوا کی افواہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کہتے ہیں کچھ سرگوشیوں کی رفتار چیخوں سے بھی تیز ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ طاہر بھائی اور انکو کے جھگڑے سے بھی منسلک تھا۔ لوگ تو شاید کسی طور اس واقعے کو بھلا بھی دیتے لیکن شکورن بوا کی کھسر پھسرنے محلے داروں کی یادداشت سے یہ انہونی کبھی مٹنے نہ دی۔ نام تو ان کا شکورن تھا لیکن آج تک کسی نے انہیں کبھی خدا کا شکر ادا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ شکورن بوا آدمی کے محلے کی سب سے قدیم شے تھیں۔ جب آدمی کے ابا دور دراز کے علاقے سے ٹرانسفر ہو کر اس شہر میں تعینات ہوئے تھے اور اس کالونی میں آ کر رہے تھے، شکورن بوا تب سے بھی پہلے کی یہیں آباد تھیں۔ محلے کی جانے کتنی نسلیں ان کے سامنے ہی جوان ہو کر اب بڑھاپے کی دہلیز پہ دستک دے رہی تھیں لیکن شکورن بوا اب بھی ویسی کی ویسی ہی تھیں۔ لگائی بجائی اور ادھر کی ادھر لگانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا، گزر بسر کے لیے انہوں نے گھر ہی میں بچوں کے لیے میٹھی گولیوں، کٹھے میٹھے چورن، پکٹ میں بنداملی، خشک شہتوت اور بیر اور ایسی ہی جانے اور کتنی آتم غلم چیزوں کی دوکان سجا رکھی تھی۔ جب اسکول کی چھٹیاں ہوتیں تو محلے کے بچوں کا پسندیدہ مشغلہ صبح اٹھنے کے فوراً بعد جیب میں چونی اٹھنی ڈال کر شکورن بوا کے ”ڈیپارٹمنٹل سٹور“ کا رخ کرنا ہی ہوتا تھا۔ راجہ اور آدمی بھی شکورن بوا کے مستقل گاہکوں میں شامل تھے۔

اب یہ راجہ کی بد قسمتی تھی کہ وہ طاہر بھائی اور انکو کے جھگڑے کے وقت وہاں موجود نہیں تھا یا پھر شکورن بوا کی خوش قسمتی کہ وہ عین اسی وقت اپنے شٹل کاک برقعے سمیت اپنی دوکان کے لیے خریدا ہوا سامان اٹھائے گزر رہی تھیں جب انکو نے طاہر بھائی کے سر پر اپنی ککے سے وار کیا تھا۔ طاہر بھائی کے سر سے نکلتی خون کی پھوار دیکھ کر حواس باختہ ہو کر جب وہ چنچیں تھیں تب ہی باقی راہ گیر اس جانب متوجہ ہوئے تھے۔ یہ انکشاف انہوں نے ہی سب سے پہلے کیا تھا کہ دونوں لڑکوں میں ہاتھ پائی سے پہلے انہوں نے کسی ایک کے منہ سے وجہ یہ کہ نام خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔ یہ تو غیاث چچا کا رعب داب بھی ایسا تھا کہ انہیں ”گھل“ کر اپنے زیر خیالات کے اظہار کا موقع نہیں مل سکا ورنہ اب تک وہ محلے کے ہر گھر میں اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ چکی ہوتیں۔ کچھ لوگ خود بھی شکورن بوا کی عادات سے واقف تھے اور کچھ غیاث چچا اور ان کے معزز خاندان کا بھی لوگوں کو دھیان تھا اس لیے مردوں نے تو اگر اسے کچھ کہتے سنا بھی تو وہیں جھڑک کر چپ کر دیا۔ رہی بات محلے کی عورتوں کی تو جو آپنی ان کے سامنے ہی بچی سے جوان ہوئی تھیں۔ وہ سب ان کے کردار سے اچھی طرح واقف تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود شکورن بوا کی زبان کو مستقل لگام دینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اب جانے یہ سرگوشیاں غیاث چچا کے خاندان تک اس وقت پہنچ پائی تھیں یا ابھی وہ لوگ ان افواہوں سے لاعلم تھے کہ جب سیکینہ خالہ اور جو آپنی نے طاہر بھائی کی عیادت کے لیے ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ محلے میں ایک دستور عام تھا کہ کسی کے گھر مہمان بن کر جانے سے پہلے کسی

بچے کو بھیج کر اطلاع کروادی جاتی تھی تاکہ اچانک جانے سے کسی کو زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ جھگڑے کے دوسرے دن دُھوآپی نے اپنے گھر کے دروازے سے باہر جھانکا تو راجہ اور گڈو پہلے سے ان کے ”پہرے“ پر موجود تھے۔ دونوں نے چونک کر دُھوآپی کو دیکھا۔ آپی نے اشارے سے ان دونوں کو پاس بلایا اور انہیں طاہر بھائی کے گھر ان کی اماں کو پیغام دینے کا کہا کہ سکیئنہ خالہ اور وجیہہ ان کے گھر آنا چاہتے ہیں۔ راجہ نے گڈو کو وہی آپی کے گھر کے باہر چھوڑا اور خود بھاگتے ہوئے طاہر بھائی کے گھر آ پہنچا اور عزیزہ خالہ (طاہر بھائی کی اماں) کو آپی کا پیغام دیا۔ انہوں نے حسب معمول ”سو بار آئیں، ان کا اپنا گھر ہے“ کا جواب راجہ ہی کے ہاتھ بھجوا دیا جسے راجہ نے دوسرے ہی لمحے دُھوآپی کے گھر جا کر انہیں منتقل بھی کر دیا اور پھر جب دُھوآپی اور سکیئنہ خالہ طاہر بھائی کے گھر کے لیے نکلیں تو راجہ نے ہوشیاری سے گڈو کو بھی ان کے پیچھے طاہر بھائی کے گھر بھیج دیا۔ تبھی شکورن بوا بھی اپنے دروازے پر پڑی چمک اٹھا کر باہر نکل آئیں اور انہوں نے راجہ سے پوچھا۔

”ہے بچے..... ادھر آ..... یہ کون دو (۲) ابھی طاہر میاں کے گھر گھسی ہیں۔“ راجہ نے انہیں بتایا کہ دُھوآپی اور سکیئنہ خالہ ہیں۔ یہ سن کر بوا چمک کر بولی۔

”ہاں ہاں..... وہ کیوں نہ جائیں گی مزاج پر سی کو..... سب ہی جانتے ہیں کہ دونوں لونڈے اپنی وجیہہ بی کی لگائی ہوئی لڑائی ہی تو لڑ رہے تھے۔“

راجہ کو ان کی بات سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ شکورن بوا کا پہلے ہی اتنا مقروض تھا اور ان کے ہاں سے ادھار کی اتنی چیزیں لے کر کھا چکا تھا کہ اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ شکورن بوا جس طرح شتم شتم باہر نکلیں تھیں ویسے ہی فوراً واپس اندر بھی چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر میں گڈو نے آ کر راجہ کو رپورٹ دی کہ گھر میں طاہر بھائی سمیت سبھی موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو سکیئنہ خالہ نے جاتے ہی طاہر بھائی کی بلائیں لیں کیونکہ طاہر بھائی نے ہمیشہ ان کی بیٹی کو بہترین نمبروں سے پاس کروانے کے لیے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھیں پھر انہوں نے بھی چھوٹے ہی وہی سوال کیا جو سارے محلے کی زبان پہ تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ معاملہ اس قدر بڑھ گیا؟ گڈو نے بتایا کہ اس سوال پہ دُھوآپی نے جواب تک سر جھکائے بیٹھی تھیں، نظر اٹھا کر طاہر بھائی کی جانب دیکھا، ان کی نظر میں طاہر بھائی کے نام ایک ایسا تھی کہ اب مناسب بھی ہوگا کہ طاہر بھائی پوری بات کھل کر سب کو بتا دیں لیکن طاہر بھائی نے دُھوآپی کی نظروں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے وہی مخصوص جواب دیا کہ اُکو تو بس خواہ مخواہ ہی ان سے الجھنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے، ورنہ کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ سکیئنہ خالہ نے طاہر بھائی کو مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں سے دور رہنا ہی شریف زادوں کے لیے بہتر ہے۔ آئندہ طاہر بھائی اس راستے سے ہی نہ گزریں جہاں وہ موٹا اُکو ان کا راستہ کاٹنے کے لیے کھڑا ہو۔

اب سکیئنہ خالہ کو یہ بات کون سمجھتا کہ راستہ تو وہ ان کی لاڈلی وجوہ کا نا چاہتا ہے لیکن ہر بار طاہر بھائی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اُکو نے پہلے اس رکاوٹ کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن طاہر بھائی کے سر کی پٹی اتر گئی اور اُس سے اگلے دن ٹانگے بھی کھل گئے۔ علاقہ ایس ایچ او نے دوسرے دن ان کے گھر کے چکر مزید لگائے تاکہ طاہر بھائی اُکو کے خلاف رپورٹ کروانا چاہیں تو وہ درج کرنے کو تیار ہے لیکن طاہر بھائی نے اسے ٹال دیا کہ یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے اور اب وہ غلط فہمی بھی دور ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اُکو ان سے لڑ پڑا تھا لہذا ایف آئی آر

درج کروانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بالے نے اگلے روز راجہ کو بتایا کہ اُٹو رات کے اندھیرے میں کل گھر کے اندر کودتا تھا لیکن اس کے ابا کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے اُٹو کو بہت بے عزت اور ذلیل کرنے کے بعد اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اُٹو اسی وقت ان کے ساتھ چل کر طاہر بھائی اور اس کے گھر والوں سے معافی مانگے لیکن اُٹو نے صاف انکار کر دیا کہ وہ مرتے مرجائے گا لیکن کبھی طاہر سے معافی نہیں مانگے گا۔ اس بات پر بالے کے ابا مزید بھڑک گئے اور انہوں نے اُٹو کو اسی وقت گھر سے نکل جانے کا کہا ورنہ دوسری صورت میں انہوں نے پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ اس پر اُٹو نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ باپ کو درمیان میں ہی ٹوک دیا کہ اسے اچھی طرح خبر ہے کہ وہ نیم حکیم (مطلب طاہر بھائی) بھی آج کل پولیس کے ساتھ بہت راہ و رسم بڑھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو بھی جا کر خبر کر دے کہ اُٹو نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اگر اس نے پولیس میں رپٹ درج کروانے کی غلطی کی تو اُٹو بھی چپ نہیں بیٹھے گا اور سارے شہر میں طاہر کے معاشقے کی خبر پھیلا دے گا۔ بالے نے راجہ کو بتایا کہ شاید اس کے ابا کو تو اُٹو کی دی ہوئی اس دھمکی کی اتنی سمجھ نہ آئی ہو لیکن بالے کے کان اُٹو کی بات سنتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اُٹو کا اشارہ کس طرف ہے لیکن تب تک اُٹو کے ابا اس حد تک پھر گئے تھے کہ انہوں نے خود اُٹو کو ہاتھ سے پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیا۔ بالے نے راجہ کو یہ بھی بتایا کہ گھر سے نکلتے ہی اُٹو بالکل ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس نے وہیں دروازے پر کھڑے کھڑے طاہر بھائی سمیت خود اپنے گھر والوں کو بھی سنگین نتائج کی دھمکیاں دیں کہ اب وہ بھی چین سے نہیں بیٹھے گا ورنہ اپنے گھر والوں کو اور نہ ہی اسے چین سے بیٹھنے دے گا جس کی وجہ سے آج اسے گھر بدر کیا گیا ہے۔ اُٹو بہت دیر تک وہیں دروازے پر کھڑا بکتا جھکتا رہا اور پھر دیگر محلے داروں کے گلی میں جھانکنے اور دروازے کھلنے کی آوازیں سن کر وہاں سے کہیں چلا گیا۔

بالے کی زبانی یہ سارا ماجرا سن کر راجہ اور باقی سارے دوست گہری سوچ میں پڑ گئے۔ انہیں تو صرف دُجواپی کی فکر ہی کھائے جا رہی تھی لیکن یہاں تو طاہر بھائی کی جان کے بھی لالے پڑتے نظر آرہے تھے۔ اب وہ کیا کریں؟ بس یہی اک سوال ان سب کے ذہنوں میں کلہلا رہا تھا۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر راجہ کو آدی کی یاد بہت ستاتی تھی کیونکہ جب ان سب کے دماغ ہتھیار ڈال دیتے تھے تب ایک آدی ہی تھا جس کی عقل ایسے میں کوئی دور کی کورٹی لے کر آتی تھی لیکن آدی تو اس وقت یہاں سے ہزاروں میل دور جانے کن ظالموں کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ کاش آدی یہاں ہوتا..... کاش..... کاش..... راجہ کا ذہن اسی ایک کاش کا ورکر رہا لیکن اسے کون سمجھاتا کہ ہماری زندگیاں ایسے بہت سے ”کاش“ کا مجموعہ ہوتی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک کاش بھی اگر اپنی جگہ سے مٹ پاتا تو شاید ہم سب خود اپنی تقدیر لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں تھا..... کاش یہ ممکن ہو پاتا۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی ٹیوشن

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن ٹھیک وقت پر جمعہ (ہاؤس بیرا) مجھے کانوٹ کے احاطے میں چھوڑ آیا۔ مدرکیتھریں وہیں چرچ کے احاطے میں بنے چھوٹے سے باغیچے میں بیٹھیں خود اپنے ہاتھوں سے پودوں کو پانی وغیرہ دے رہی تھیں، پاس ہی ان کا باغبانی کا سامان بھی پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دوری سے گرم جوشی سے ہاتھ ہلایا اور مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ آج میں اپنی کتابیں بھی ساتھ لے کر آیا تھا اور جمعہ پہلے ہی میری یونیفارم اور دیگر ضروری لباس لکڑی کے بڑے بڑے بیگلرز میں لٹکائے وہاں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ مدرکیتھی نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے گھر میں کس نام سے بلاتے ہیں۔ میں نے بتایا آدی، تو وہ مسکرا کر بولیں کہ میں بھی تمہیں تمہارے گھر والے نام سے پکاروں گی اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ میں ہنس پڑا۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ویسے بھی میرے کان کیڈٹ عباد، کیڈٹ عباد سن کر پک گئے تھے اور پٹی آفسرز کا اپنے کرخت لہجے میں ”ہے یو کٹ نمبر 8336 کہنا یا پھر طالب پی او کا تراسی چھٹی کہنا تو ویسے ہی مجھے سخت ناپسند تھا۔

اس دن کافی دیر تک مدرکیتھی مجھ سے میرے گھر بار اور تعلیم کے بارے میں پوچھتی رہیں اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اس بورڈنگ میں آنے سے پہلے آج تک کبھی پتلون نہیں پہنی تھی تو وہ یہ سن کر بہت دیر تک مسکراتی رہیں۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اس میں ایسی کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ لباس اور زبان انسان ضرورت کے لحاظ سے اختیار کرتا اور چھوڑتا رہتا ہے۔ پھر انہوں نے اپنی مثال دی کہ انہوں نے جو یہ سفید عبا پہن رکھی تھی جو چرچ کی سن کا مخصوص لباس ہوتا ہے، اسے انہوں نے اپنی عمر کے انیسویں سال تک چھوا بھی نہیں تھا لیکن جب ضرورت پڑی تو انہوں نے پہن لی اور پہلے دن انہیں بھی اس لباس میں بہت بے آرامی اور الجھن محسوس ہوئی تھی لیکن اب یہی لباس انہیں دنیا کا سب سے بہترین لباس لگتا ہے۔

اتنے میں ہیلین بھی آگئی۔ مدرکیتھی نے اسے میرے گھریلو نام سے آگاہ کیا اور مجھے ہیلین کے حوالے کر کے خود عبادت کے لیے چرچ کے اندر چلی گئیں۔ ہیلین نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور پوچھا۔

”ہاں تو مسٹر آدی..... کہاں سے شروع کریں؟“

اس نے کے منہ سے اپنا نام مسٹر کے اضافے کے ساتھ سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے اپنی کتابیں ہیلین کی طرف بڑھا دیں۔ ہیلین نے چھان پھٹک کے بعد سب سے پہلے انگریزی کو ہی منتخب کیا اور پہلے مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے پچھلے اسکول میں کہاں تک انگلش پڑھی ہے۔ میں نے فوراً انہیں اپنی گزشتہ ”انگریزی کی استعداد“ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ ہیلین نے اسی حساب سے میرے لیے روزمرہ کا ایک چارٹ تیار کر لیا اور اس میں ہر ہفتے کے لیے مختلف اہداف مقرر کر دیئے اور ٹھیک وہیں سے ابتدا کی جہاں سے میں چھوڑ کر آیا تھا۔

پھر اس نے دیگر مضامین کے بارے میں مجھے مختصر اُتار بتایا کہ یہ سب کچھ وہی ہے جو میں پہلے اپنے پرانے اسکول میں پڑھ چکا ہوں۔ صرف زبان ہی کا فرق ہے۔ مثلاً ہیلین نے ریاضی کی کتاب نکال کر مجھے سوالات دکھائے۔ میں ہندسوں کو تو فوراً سمجھ گیا لیکن ان کے نیچے دی گئی انگریزی کی عبارت کو نہیں سمجھ پایا۔ اس نے مجھے ”جذر“ کے دو سوالات حل کرنے کو دیئے جو میں نے فوراً حل کر دیئے۔ تب ہیلین نے مجھے بہت شاباش دی اور وہی حل شدہ سوالات مجھے میری ہی کتاب کی مشق والے حصے میں دکھائے۔ سب کچھ ہو ہو ویسے ہی حل کیا گیا تھا جسے میں نے کیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دائیں ہاتھ سے شروع کیا تھا اور عبارت اردو میں لکھی تھی جبکہ وہاں کتاب میں وہی سوال بائیں جانب سے حل کیا گیا تھا اور عبارت انگریزی میں تھی۔ ہیلین نے مجھے بتایا کہ یہ انگریزی میں وہی عبارت ہے جسے میں نے ابھی اردو میں لکھا ہے بلکہ وہ یہ بتاتے ہوئے تو زور سے ہنس دی کہ اسے تو اردو میں ریاضی بہت ہی مشکل لگتی ہے اور وہ کبھی اردو میں سوال حل بھی نہیں کر پاتی۔ مجھے ہیلین کی باتیں سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ یہ تو کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا والی بات ہو گئی۔ میں خواخوہ اتنے دن سے ان کتابوں سے ڈر رہا تھا۔ ہیلین نے یکے بعد دیگرے اسی طرح مجھے معاشرتی علوم جسے وہاں سوشل اسٹڈیز کا نام دیا گیا تھا۔ دینیات جسے وہاں اسلامک اسٹڈی کہتے تھے اور سائنس وغیرہ کے بارے میں بڑی سہولت سے بتا دیا کہ آکسیجن کو انگریز بھی آکسیجن ہی کہتے ہیں، صرف لکھتے Oxygen ہیں۔ مجھے یہ جان کر کافی اطمینان ہوا کہ انگریز بھی ہم جیسے ہی ”مسلمان“ ہوتے ہیں اور ان سے خواخوہ مرعوب ہونے کی مجھے قطعی ضرورت نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ انگریز بھی ہماری طرح ہی اردو لکھتے اور بولتے بھی..... پھر تو یہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔ ہیلین نے ان پہلے دو گھنٹوں میں ہی میرے اندر سے انگریزی اور انگریزی پڑھانے والے تمام مضامین کا وہ خوف یوں دور کر دیا جیسے وہ خوف میرے اندر کبھی تھا ہی نہیں۔ بلکہ اس نے میرے اندر آہستہ آہستہ ایک تجسس کی لہر بیدار کر دی تھی کہ جو چیز میرے لیے اردو میں ”سبق“ ہے وہ انگریزی میں Lesson کیسے بن جاتی ہے لہذا مجھے اب اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔

اتنے میں چرچ کے گھنٹہ گھر نے شام کے چھ بجنے کا اعلان کر دیا۔ ہیلین نے مجھے بتایا کہ آج کے لیے میری ٹیوشن ختم اور اب آگے شیرل مجھے یہاں کے رہن سہن کے بارے میں تعلیم دے گی۔ ہیلین پوری ٹیوشن کے دوران مجھے ٹوکتی رہی کہ میں اسے سسٹر ہیلین یا صرف سسٹر کہوں لیکن میرے منہ سے ہیلین ہی نکلتا اور جب وہ گھور کر مجھے دیکھتی تو میں جلدی سے اس کے نام کے آگے سسٹر کا لاحقہ جوڑ دیتا اور وہ ہنس دیتی۔ پہلی ٹیوشن ختم ہونے سے پہلے ہی ہم دونوں کے درمیان کچی دوستی ہو گئی تھی۔ ہم چرچ کی مرکزی عمارت کے اندر ہی موجود ایک بہت کھلے اور اونچی چھت والے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ رہے تھے۔ چھ بجنے کے بعد ہیلین مجھے لیے چرچ کی مرکزی عمارت سے باہر آئی تو سامنے والے باغیچے میں نوکر چائے لگا چکا تھا اور کوئی لڑکی رنگین کپڑے پہنے ہماری جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ہیلین اور میرے قدموں کی آواز سن کر وہ پلٹی اور میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ ہو ہو ہیلین کی دوسری نقل تھی۔ وہ ناک نقشہ، وہی روپ، وہی ہنسی..... دونوں میں اگر فرق تھا تو صرف ان کے لباس کا، ہیلین نن کے سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھی جبکہ اس نے رنگین لباس پہنا ہوا تھا اور لمبے سے فیروزہ رنگ کے اسکرٹ اور کالی دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ ہیلین اور وہ لڑکی میری حیرت دیکھ کر ایک ساتھ ہنس پڑیں۔ ہیلین نے میرا تعارف کروایا۔

”یہ ہے کیڈٹ عباد اور یہ ہے میری چھوٹی بہن شیرل.....“ شیرل نے اپنا ہاتھ ملانے کے لیے میری طرف بڑھایا۔

”چھوٹی ضرور ہوں لیکن اتنی نہیں کہ ہیلین کے رعب میں آ جاؤں۔ صرف چار منٹ ہی چھوٹی ہوں۔“

میں حیران سا کبھی ہیلن اور کبھی شیرل کی طرف دیکھتا رہا۔ تب ہیلن نے مجھے بتایا کہ وہ اور شیرل دراصل جڑواں بہنیں ہیں۔ ہیلن نے میٹرک کے بعد چرچ کی راہبہ زندگی اختیار کر لی تھی جبکہ شیرل اب بھی اپنے باپ کے ساتھ کاننٹ کے پچھلے حصے میں موجود رہائشی کالونی میں رہتی تھی جبکہ ان کی ماں کا انتقال چار سال پہلے اس وقت ہو گیا تھا جب شیرل اور ہیلن اپنے میٹرک کے امتحانات سے صرف دو دن پہلے ہی فارغ ہو کر بورڈنگ سے گھر آئیں تھیں۔ ان کی والدہ خود بھی بے حد مذہبی خیالات کی حامی اور روزانہ چرچ سروس میں شرکت کرنے والی تھیں۔ ہیلن کو چرچ سے بہت محبت ماں سے ہی ورثے میں ملی تھی جبکہ شیرل شروع ہی سے بے حد شرارتی اور چلبلی طبیعت کی حامل تھی لیکن مزاج کے اس تضاد کے باوجود دونوں بہنوں میں مثالی پیار تھا۔ ہیلن مجھے شیرل کے حوالے کر کے اور مجھ سے کل تک کے لیے رخصت لے کر اپنے دیگر امور پھانے چلی گئی لیکن جاتے جاتے اپنی بہن کو انگریزی میں بتا گئی کہ مجھے آدی پکارے جانا اچھا لگتا ہے، تبھی شاید شیرل نے اس کے جانے کے بعد جب مجھے کیڈٹ آدی کہہ کر پکارا تو اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آج ہم یہیں چرچ کے باغچے میں بیٹھ کر ”گپ شپ“ کریں گے جبکہ کل سے مجھے ہیلن سے ٹیوشن کے بعد فارغ ہو کر شیرل کے پاس ان کے گھر آنا ہو گا لیکن کچھ ہی دیر میں مجھے شیرل کی اس ”گپ شپ“ کا مقصد بھی سمجھ آ گیا۔ اس نے اپنے کام کا آغاز اسی دن شام کی چائے سے ہی شروع کر دیا تھا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات میں چرچ کی بیکری سے بنی ہوئی پیسٹری اور کیک وغیرہ بھی موجود تھے اور شیرل نے سب پہلے مجھے کانٹا اور چھری اٹھا کے کیک اور پیسٹری کاٹ کر اپنے لیے پلیٹ میں الگ کرنے کو کہا۔ مجھے جس طرح بھی سمجھ میں آیا میں نے یہ دُشوار فریضہ سرانجام دے ہی دیا۔ پھر شیرل نے بنا کچھ کہے خود پہلے کیک کا ایک حصہ چھری اور کانٹے سے اپنے لیے علیحدہ کیا اور پھر دیگر چیزوں کو کانٹے سے بڑی نفاست سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے میرے سامنے بھی کھانے کے لیے رکھتی گئی، میں، بہت غور سے شیرل کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دن مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کانٹے کے صحیح طریقہ استعمال کے بارے میں پتہ چلا۔ شیرل نے خود اپنے منہ سے مجھ سے نہ کسی بات پر ٹوکا اور نہ ہی خود سے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ بس وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہوئے اور کچھ میرے بارے میں پوچھتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے مجھے سب کچھ سکھاتی رہی۔ شاید اگر وہ شعوری طور پر مجھے سکھانے کی کوشش کرتی تو میں وہ آداب اتنی جلدی نہ سیکھ پاتا۔ ہیلن اپنے انداز و اطوار میں جس قدر سنجیدہ اور مدبر دکھائی دیتی تھی شیرل اتنی ہی زندگی سے بھرپور اور ہر بات کو ہنسی میں اڑا دینے والی شوخ و چنچل تھی۔ پہلی ہی شام اس نے مجھے چائے پینے کے انگریزی آداب سے اچھی طرح روشناس کروا دیا تھا۔ میرے اور انگریزوں کے چائے پینے میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا، بلکہ مجھے اس روز انگریزوں پہ بہت ترس بھی آیا کہ چائے جیسی نعمت کو وہ کس قدر احتیاط اور خود کو پابندیوں میں جکڑ کر پیتے ہیں۔ وہاں ہمارے محلے میں تو میرے اور راجہ کے درمیان باقاعدہ مقابلہ ہوتا تھا کہ کون ایک ہی گھونٹ میں چائے کا بھرا پیالہ ایک زوردار ”سررُڑ.....“ کی آواز کے ساتھ سب سے جلدی ختم کر سکتا ہے۔ جب کہ یہاں شیرل مجھے یوں نفاست سے دھیرے دھیرے اور چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے کر چائے ختم کرنے کا درس دے رہی تھی جیسے وہ چائے کا کپ نہ ہو ”آپ زم“ ہو۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس طرح چائے پینے میں ذرا بھی مزہ نہیں آیا۔ پر مرنے کیلئے نہ کرتا۔ آدی کو کیڈٹ عباد کی طرح برتاؤ کرنے کے لیے یہ سب سیکھنا بے حد ضروری تھا۔ میں شیرل کو دیکھ دیکھ کر اس کی طرح سب کچھ دھرتا رہا اور دل ہی دل میں اس دن کو کوستار ہاجب میں نے دو سال قبل خود ابا کے سامنے ”فوجی کالج“ میں پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش

پابندی

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

اُس رات اٹکو کو گھر سے تو نکال دیا گیا تھا لیکن دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے جو دمکیاں دیں تھیں اور طاہر بھائی اور دُجو آپنی کے بارے میں جو ہر افشانی کی تھی اسے محلے دار بہت دن تک اپنے ذہن سے نہیں نکال پائے تھے۔ رہی سہی کسر شکورن بوا کی قینچی کی طرح چلتی زبان نے پوری کر دی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی بیٹھتی کسی نہ کسی بہانے طاہر بھائی اور اٹکو کے جھگڑے کو زیر بحث لے ہی آتی۔ رفتہ رفتہ اب سبھی محلے کو اتنی خبر تو ہو ہی گئی تھی کہ اٹکو اور طاہر کے جھگڑے کی درپردہ وجہ کچھ اور ہی ہے لیکن پورا محلہ غیاث پچا اور ان کے گھرانے سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھا اور اٹکو کے کرتوت بھی سبھی کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ راجہ اور بالے نے چند ایک دفعہ خود شکورن بوا کی اس افواہ سازی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا تھا اور ہر دفعہ راجہ، بالے، گڈو، پوپا کسی بھی دوست کے ذریعے انہوں نے شکورن بوا کی بات پلٹنے کی کامیاب کوشش کر کے بوا کو اس منظر سے ہٹا بھی دیا تھا مثلاً ایک مرتبہ وہ جنم خالہ کے ہاں دروازے سے باہر بنے چوڑے پردھوپ سینکتے ہوئے جب انہوں نے طاہر اور اٹکو کا ذکر شروع کیا راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اس نے جلدی سے بالے کو اشارہ کیا۔ بالے نے موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا اور بھاگتے ہوئے بوا سے جا کر کہا کہ آپ کے گھر کے باہر مٹی آ پاوا دیا کر رہی ہیں کہ آپ شاید دودھ چو لے پر ہی ابلتا چھوڑ آئی ہیں اور اب بس دودھ چھلکنے کو ہی ہے۔ یہ سنتے ہی شکورن بوا اپنا شٹل کا ک خیمہ نما برقع سنبالتے ہوئے بنایہ سوچے گھر کی طرف دوڑیں کہ دودھ تو انہوں نے آج لیا بھی نہیں تھا کیونکہ ابھی تک دودھ والے کے آنے کا وقت ہی کہاں ہوا تھا۔ دوسری مرتبہ جب راہ چلتے انہوں نے غفور پچا کو روک کر ان سے پولیس میں جھگڑے کی شکایت کا ذکر چھیڑا تو تنھو نے جو قریب ہی راجہ اور دیگر دوستوں کے ساتھ پٹھو گرم کھیل رہا تھا، جان بوجھ کر اس زور سے گیند شکورن بوا کی کمر میں دے ماری کہ شکورن بوا سب بھول بھال اور سب چھوڑ چھاڑ کر لاٹھی لے کر ان سب کے پیچھے دوڑ پڑیں۔ تنھو پارٹی میں سے تو کوئی ان کے ہاتھ نہیں آیا البتہ شکورن بوا اپنی کمر کی سائی اگلے تین دن تک لگا تار کرواتی رہیں لیکن باز پھر بھی نہیں آئیں۔ جانے انہیں طاہر بھائی اور دُجو آپنی کے گھرانے سے خدا واسطے کا بیر کیوں تھا؟ کبھی کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں سارے زمانے سے ہی شکایت تھی۔ محلے کی کچھ بڑی بوڑھیاں اس کی وجہ یہ بتاتی تھیں کہ شکورن بوا گھر میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ماں باپ کی یکے بعد دیگرے ناگہانی موت کے بعد انہوں نے ہی ساتوں بہن بھائیوں کی پرورش کچھ اس طرح سے کی کہ ان کی فکر میں اپنی ساری جوانی ہی جلا کر رکھ کر دی اور جب تک شکورن بوا اپنے فرائض سے فارغ ہوئیں اور سب سے چھوٹی بہن کی ڈولی رخصت کروائی تب تک خود ان کی ڈولی انھیں کی عمر کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ رفتہ رفتہ سبھی بہن بھائی اپنی اپنی زندگی اور گھرانوں کے پھیر میں یوں لچھے کہ شکورن بوا کی طرف سے ان کا دھیان ہٹا گیا اور شکورن بوا چڑی چڑی ہوتی گئیں پھر ایک دن انہوں نے خود ہی سبھی کنبے سے قطع تعلق کر لیا اور

اپنے دروازے بھی پر ہمیشہ کے لیے بند کر لیے۔ تب سے لے کر آج تک انہیں محلے میں جوان ہوئی ہر لڑکی سے بیرہتا تھا۔ وہ کسی کی بھی ڈولی اٹھتے دیکھتیں تو خود ان کے دل میں ایک ایسی ہوک اٹھتی جوان کے اندر کا سارا زہران کی زبان تک لے آتی اور اب تو پورا محلہ ہی ان کی اس زہر انگشتی زبان کا عادی ہو چکا تھا لیکن راجہ، بالے اور دیگر دوستوں کو اور تو سب کچھ منظور تھا لیکن وہ اپنے آدمی کی چیتھی ڈھو آپی کے خلاف کچھ برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ آدمی جاتے ہوئے ان کی ذمہ داری ان سب دوستوں پر ڈال گیا تھا لہذا وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ان کی موجودگی میں ڈھو آپی کے پا کیزہ کردار پر کچھڑا چھالنے کی کوشش بھی کرے لیکن کہتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں دیواروں کے بھی کان نکل آتے ہیں اور کبھی کبھی ہلکی سی آواز میں کی گئی سرگوشی کسی دھماکے کی آواز سے بھی پہلے ان دیواروں میں سرایت کر کے دوسری طرف پہنچ جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ڈھو آپی اور طاہر بھائی کے بارے میں بھی ہو رہا تھا۔

رہی سہی کسر اس ایک واقعے نے پوری کر دی۔ علاقے کا ایس ایچ او بازار میں گشت کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اٹو اور اس کے دو دوستوں پر پڑ گئی۔ اٹو کے خلاف باقاعدہ کوئی ایف آئی آر تو کسی نے درج نہیں کروائی تھی اور طاہر بھائی نے خود ایس ایچ او کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو پولیس میں نہیں لے جانا چاہتے لیکن پھر بھی ایس ایچ او نے سوچا کہ اٹو کو بلا کرو ہیں بازار میں ذرا سختی سے تنبیہ کر دی جائے تو بہتر ہے کیونکہ وہ طاہر بھائی اور ان کے گھرانے کی شرافت سے اچھی طرح واقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اٹو دوبارہ طاہر بھائی سے الجھے یا کوئی اور شرارت کرے۔ ایس ایچ او ملک ریشم خان نے زوردار آواز میں اٹو کو پکارا۔ اٹو اور اس کے دوستوں نے ایس ایچ او کو دیکھا تو جانے کیا سمجھے اور بدک گئے۔ ملک ریشم نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو پکڑ کر حاضر کیا جائے پھر کیا تھا پورے بازار میں اٹو گروپ اور سپاہیوں کی دوڑیں لگ گئیں اور آخر کار اٹو اور اس کا ایک دوست پولیس کے ہتھے چڑھ ہی گیا۔ ملک ریشم نے پہلے تو وہیں بازار میں ان دونوں کی خاطر تواضع کی کہ وہ بھاگے کیوں تھے؟ اٹو سمجھا کہ طاہر بھائی نے ایس ایچ او کو اس کے پیچھے لگا رکھا ہے اور اس نے آؤ دیکھنا نہ آؤ اور وہیں بھرے بازار میں چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی اور طاہر اور ڈوکی ”محبت“ کی داستان پورے زمانے کو سنانے لگا۔ بھیڑ جمع ہو چکی تھی اور ملک ریشم نے جب تک معاملے کی نزاکت کو سمجھا تب تک اٹو کافی بکواس کر چکا تھا۔ ملک کے اشارے پر سپاہیوں نے اٹو کا منہ کپڑے سے باندھ کر اسے پولیس کی ویلیز (willes) جیپ میں لا پیچھا اور تھانے لا کر اسے کافی دیر تک الٹے لٹائے رکھا۔ ایس ایچ او نے اس سے ایک سادہ کاغذ پر حلفیہ بیان بھی لیا کہ آئندہ اگر اٹو یا اس کے دوستوں نے کالونی کا رخ بھی کیا تو جو چور کی سزا وہ ان کی اور شام تک اٹو کو ڈرا دھمکا کر رہا بھی کر دیا۔ کیونکہ ایس ایچ او کا تو پہلے ہی اسے گرفتار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر اٹو بازار میں چپ چاپ آکر ملک ریشم کی بات سن جاتا تو اسے اتنی مار بھی نہ سہی پڑتی لیکن بات بگڑتی ہی گئی۔

ملک ریشم خود بھی بیٹیوں کا باپ تھا اور ایسے معاملات کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے شام ہی کو پولیس لائن سے ایک تانگہ پکڑا اور غیاث پچا کے گھر چلے کو کہا۔ اپنی پولیس کی جیپ میں وہ اس لیے نہیں جانا چاہتا تھا تا کہ لوگ اسے وردی میں یا سرکاری جیپ میں دیکھ کر چونک نہ اٹھیں۔ غیاث پچا کو گھر سے باہر بلا کر اس نے نہ جانے کیا بات پچا سے کہی کہ غیاث پچا کا چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا۔ ملک ریشم وہیں دروازے سے ہی بنا کچھ کھائے پئے پلٹ گیا لیکن جاتے جاتے وہ غیاث پچا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں یہ کہنا نہیں بھولا کہ غیاث پچا اٹو کی زبان سے اگلے

زہر اور اس کی تمام بکواس کا ذرہ بھر بھی ملال نہ کریں کیونکہ وہ ایسے گلی کے معمولی غنڈوں اور لوفروں کی کھال کھینچتا خوب جانتا ہے۔ غیاث چچا ایسے بچے کی بات سن کر اس قدر جھٹکے میں تھے کہ وہ اسے ٹھیک طرح سے خدا حافظ بھی نہیں کہہ پائے اور اس وقت چونکے جب مؤذن نے مغرب کی اذان کی تکبیر بلند کی۔ غیاث چچا ابھی تک اپنے دروازے پر ہی بت بنے کھڑے تھے۔ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے گھر میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے سکیزنہ خالہ کی ان پر نظر پڑی اور وہ ان کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ غیاث چچا نے ان کے لائے ہوئے پانی کے گلاس کو پکڑنے کی بجائے ان سے پوچھا کہ ”وجہ یہ کہاں ہے.....؟“

”اندر اپنے کمرے میں ہوگی۔ صبح کانچ جانے کے لیے اپنا یونیفارم استری کر رہی ہے۔“ سکیزنہ خالہ نے حیرت سے جواب دیا کیونکہ انہیں غیاث چچا کے لہجے میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس ہو گئی تھی۔ غیاث چچا نے چند لمحوں تک خلاء میں گھورنے کے بعد سردی آواز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”اب اس کی کوئی ضرورت نہیں..... وجہ یہ سے جا کر کہہ دو کہ وہ کل سے کانچ نہیں جائے گی۔ میں نے اس کی پڑھائی ختم کروانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ سکیزنہ خالہ کے ہاتھوں سے کانچ کا گلاس زمین پر گر گیا اور چھنکے سے ٹوٹ گیا۔

دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ **دجالیت** کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجال کس طرح اس دنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ **666** کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال ناول کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

پہلی جعل سازی اور جنٹلمین کیڈٹ عباد

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کچھ ہی دنوں میں ہیلن اور شیرل کی مدد سے میں رفتہ رفتہ انگریزی زبان اور انگریزی طور و اطوار میں شدہ بدھ حاصل کرنے لگا تھا۔ سارا دن میں شام کے چار بجنے کا انتظار کرتا رہتا اور مقررہ وقت پر اب میں خود ہی بھاگتے ہوئے چرچ کے احاطے میں جا پہنچتا۔ میرے لیے اکیڈمی کے پچھلے حصے کے گیٹ پر گارڈز کو تاکہ کر دی گئی تھی اور مجھے ایک کاغذی پاس بھی بنا کر دے دیا گیا تھا۔ واپسی پر البتہ چرچ کی انتظامیہ یا جمعہ مجھے لینے کے لیے آجاتا اور میں شیرل سے رخصت ہو کر واپس ہو سٹل آجاتا۔ ہیلن مجھے چرچ میں میری کلاس کے مضامین کی ٹیوشن دیتی اور شیرل مجھے کبھی چرچ یا کانونٹ کے احاطے میں اور کبھی اپنے گھر پہ جنٹلمین کیڈٹ بننے کی تربیت دیتی۔ شیرل کے گھر پہ میری اس کے ابا سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان کا نام ولسن Wilson تھا اور شیرل کی طرح میں بھی انہیں ”سر“ یا ولسن سر Wilson Sir کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ بھاری بدن کے ایک فربہ اندام شخص تھے لیکن سر پہ ہیٹ جمائے منہ میں پائپ دبائے، بڑے گیلکس والی پینٹ پہن کر جب وہ اپنے لکڑی کے برآمدے میں بیٹھے اپنی آرام کرسی پر جھولتے تو مجھے بالکل ایک بڑے بچے کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر نے زیادہ میٹھا کھانے سے منع کیا ہوا تھا لیکن وہ شیرل سے چھپ کر اور کبھی کبھار میری مدد سے بھی کچھ نہ کچھ اپنی پسند کا میٹھا حلق سے اتار ہی لیتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دور سے ہی فوجی انداز میں سیلوٹ کرتے اور چلا کر شیرل کو مطلع کر دیتے کہ

”ہے شیرل..... تمہارا جنٹلمین کیڈٹ عباد آیا ہے۔ اب ہم سب مل کر خوب ہنگامہ کریں گے.....“

اور پھر واقعی خوب ہنگامہ ہوتا۔ شیرل انہیں میٹھا کھانے سے روکتی رہ جاتی اور وہ بڑے مزے سے کبھی ریفریجریٹر سے اور کبھی باورچی خانے سے کسی نہ کسی ڈبے سے کچھ نہ کچھ نکال نکال کر منہ چلاتے رہتے۔ ہفتے کے شام ہیلن بھی اس ہنگامے میں شریک ہو جاتی کیونکہ اتوار کے روز چرچ سروس تک اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ سرولسن شیرل کے قابو میں تو کم ہی آتے لیکن ہیلن کے سامنے ان کی ایک نہیں چلتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی بات منواتی تھی۔ شیرل نے مجھے تمام لباس ٹھیک طرح سے پہننے اور ان کے تمام آداب کے طور طریقے بھی سکھادیئے تھے اور اب تو میں خود ہی ٹائی بھی باندھ لیتا تھا۔ ہمارے یونیفارم میں ہیٹ کہیں بھی شامل نہیں تھا لیکن ولسن سر نے مجھے یکے بعد دیگرے اپنے سارے اقسام کے ہیٹ اور ان کے پہننے کے طریقے بھی سکھادیئے۔ میں جب بھی کوئی نیا لباس پہن کر باہر آتا تو وہ جھٹ سے اپنے کوڈک کیمرے سے میری ایک تصویر بنا لیتے۔ اب مجھے میس میں بھی فیصل یا سفر کی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی اور میں بڑے اعتماد سے باقی سب کیڈٹس کی طرح چھری کاٹنے اور لکڑی کی اسٹکس کی مدد سے نوڈلز، اسٹیک اور دیگر کھانے کھا سکتا تھا۔ شیرل نے مجھے رفتہ رفتہ مختلف تعداد کے کورس کے کھانوں (ڈنر) وغیرہ کے آداب کے

بارے میں بتادیا اور ہر کھانے اور ہر تقریب کے لحاظ سے، لباس کی مناسبت اور رنگوں کے امتزاج کے بارے میں بھی سکھایا تھا کہ کب اور کس موقع پر کون سا انگریزی لباس اور کون سا رنگ بچے گا۔ کبھی کبھی تو میں ان انگریزی طور اطوار سے سخت اکتا جاتا اور ہیلن اور شیرل کے سامنے انگریزوں کو خوب کوستا کہ وہ بھی ہماری طرح سارا دن ایک ہی شلوار کرتے میں کیوں نہیں گزار سکتے تھے۔ اکیڈمی میں ہمیں صرف جمعے کی نماز کے وقت ہی جناح کیپ اور کرتا پاجامہ پہننے کا موقع ملتا تھا ورنہ سارا دن ہم اسی طرح کے ”اوٹ پناٹنگ“ لباسوں میں ٹنگے رہتے جو گئے انگریزوں کی دین تھی۔

مجھے رفتہ رفتہ اکیڈمی میں کچھ سکون آنے ہی لگا تھا کہ ایک دن اچانک ڈاکے نے آ کر گیٹ پر حسب معمول اپنی سائیکل کی گھنٹی زور سے بجائی اور میرا نام پکارا۔ میں نے چونک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے خط کی جانب دیکھا کیونکہ گھر میں سے صرف ابا خط لکھتے تھے اور ان کا خط ابھی دو دن پہلے ہی تو آیا تھا جس میں انہوں نے چار سطروں میں مجھے اپنی پڑھائی پر دھیان دینے اور اپنی صحت کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ ویسے بھی ابا کے خط بہت مختصر ہوتے تھے اور سب ہی کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ کہیں ابا نے ایک ہی خط لکھ کر اس کی بہت ساری نقول تو تیار نہیں کروالیں؟ جنہیں وہ ہر ہفتے مجھے پوسٹ کر دیتے تھے اور جن کا آغاز ہمیشہ بر خوردار عباد سے ہو کر اختتام ہمیشہ ”تمہاری امی، فاران اور عمارہ تمہیں پیار کہتے ہیں“ پر ہوتا تھا۔

لیکن یہ خط ابا کی جانب سے نہیں تھا۔ یہ خط راجہ اور میرے باقی دوستوں نے مل کر مجھے لکھا تھا۔ راجہ کی تحریر دیکھتے ہی میرے اندر کا تمام دکھ اور وہ شدید ادا سی جس پر میں نے اس اکیڈمی میں گزرے اپنے گزشتہ تین ہفتوں کی مٹی ڈال رکھی تھی، ایک دم سے مجھ پر یوں حاوی ہوئے کہ خط کھولتے ہی میری آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ راجہ نے میرے اکیڈمی کے لیے روانہ ہونے والے دن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات خط میں تفصیل سے لکھے تھے۔ پانچ صفحات کے اس خط کو میں نے جانے کتنی بار پڑھا اور ہر بار مجھے ایسے لگا جیسے میں اپنے محلے میں، اپنے دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں۔ راجہ نے طاہر بھائی اور اٹو کے جھگڑے اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا تھا۔ اس کا اور میرے باقی سب دوستوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ جیسے ہی بڑا افسر بن کر واپس اپنے محلے میں پہنچوں تو سب سے پہلے مجھے اٹو کو بمعہ اس کے تمام غنڈے دوستوں کے گرفتار کر وانا ہوگا۔ قوآپی کے ذکر پر تو میری وہ حالت ہوئی کہ بس جیسے ہچکیاں ہی بندھ گئیں۔ یہ میرے کیڈٹ کالج آتے ہی کیا کچھ ہو گیا تھا۔ وہ کتنی پریشان ہوں گی وہ تو اتنی نازک ہیں کہ ان سے کسی کی سخت نظر بھی برداشت نہیں ہوتی تھی پھر اتنی سخت باتیں اور جھوٹے الزامات انہوں نے کیسے برداشت کیے ہوں گے؟ کون انہیں دلا سہ دیتا ہوگا؟ جب بات کرتے کرتے اور اچانک ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں نمی آ جاتی ہو گی تو کون جا کر ان کی بھیگی پلکیں پونچھتا ہوگا؟ ایسے جانے کتنے ہی سوال میرے ذہن میں یوں گردش کرنے لگے کہ شام سے پہلے ہی مجھے کچکی سے طاری ہو گئی اور جب پہلی پریپ کے وقت پریٹیکٹ نے آ کر میرا ہاتھ چھو کر دیکھا تو اٹو لٹے پاؤں بھاگا اور چند ہی لمحوں میں مجھے اکیڈمی کے چھوٹے سے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک ”ڈاکٹر نما“ شخص کا نوں سے آ لگائے نمودار ہوا۔ میرے ذہن میں ابھی تک ڈاکٹر کا خاکہ طاہر بھائی سے ملتا جلتا تھا۔ کلین شیو، صاف ستھری پینٹ شرٹ، سلیقے سے بال بنے ہوئے اور کپڑوں سے اٹھتی مخصوص کلون یا پرفیوم کی خوشبو لیکن یہ تو سراجاڑ، منہ پہاڑ ٹائپ کا کوئی ڈاکٹر تھا جو دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے ابھی سیدھا سوکر بستر سے اٹھا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کی انہی خصوصیات کی وجہ سے کیڈٹس

نے اس کا نام ”ڈاکٹر نو“ رکھ چھوڑا ہے۔ کیونکہ وہ ہر اس بات کو ”نو“ کر دیتا تھا جس کی فرمائش کیڈٹ کرتے تھے۔ اس نے میرے دل کی دھڑکن سنی اور پھر جلدی سے کہا ”نو.....“ ہی از پر فیکلی آل رائٹ۔“ He is perfectly all right. پھر میری طرف مڑ کر کہا ”تم بالکل ٹھیک ہو۔ میں یہ گولیاں دے رہا ہوں۔ صبح تک ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑتے پھر وگے.....“

ڈاکٹر نو نے مجھے کچھ گولیاں کھانے کو دیں اور چند گھنٹہ کسی کڑوی شربت کے پلائے اور پھر جاتے جاتے مجھ سے کہا ”آں ہاں.....“ خبردار..... مجھ سے ریسٹ لینے کی قطعی توقع نہ رکھنا۔ میں ایسے معاملوں میں بہت سٹرکٹ Strict ہوں۔“

میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا کیونکہ میں نے تو کسی ریسٹ کی بات بھی نہیں کی تھی اور مجھے ریسٹ یا آرام دوا سے ملنا تھا نہ کہ ڈاکٹر نو کی ذات سے۔ تبھی میرے بٹ مین نے جو اس روز ہاؤس ڈیوٹی پر تھا اور مجھے ہسپتال لے کر آیا تھا، ڈاکٹر نو سے گڑگڑا کر درخواست کی۔

”سر کیڈٹ عباد نے تو آج تک کبھی ریسٹ نہیں لیا لیکن آج واقعی انہیں بہت تیز بخار ہے۔ برائے مہربانی ایک دن پریڈ سے ریسٹ لکھ دیں۔“ ڈاکٹر نے چند لمحے اس کی درخواست پر غور کیا پھر میری دواؤں کی پرچی پر نیچے ”ون ڈے پریڈ ریسٹ“ (ایک دن کے لیے پریڈ سے آرام) لکھ کر بٹ مین کے حوالے کر دی اور یہ جا اور وہ جا۔ اکرم (بٹ مین) نے پرچی میرے حوالے کی اور چپک کر بولا۔

”یہ لیس سر جی..... کل صبح آرام سے سوئیں اور عیش کریں..... کل آپ کو صبح سویرے پریڈ کے لیے نہیں اٹھنا پڑے گا.....“

میں نے حیرت سے اس جادوئی پرچی کی جانب دیکھا جس میں میری کل کی پریڈ سے چھٹکارے کا پروانہ تھا۔ اوہ..... تو ڈاکٹر نو اس ریسٹ کی بات کر رہا تھا۔ مطلب کیڈٹس بیمار ہو کر اس کے پاس آتے ہوں گے اور اس سے ہاؤس ریسٹ کی ضد کرتے ہوں گے تبھی وہ پہلے ہی سے مجھے انکار کر رہا تھا۔ اگلی صبح جب میری ساری ڈارمیٹری اس منحوس سیٹی کی آواز پر بستروں سے گر گر کر اٹھتی اور باہر کی جانب بھاگتی نظر آ رہی تھی۔ میں آرام سے اپنے گرم بستر میں نیند کے مزے لے رہا تھا۔ ناشتے سے کچھ پہلے مجھے ہاؤس بیراجمہ نے آکر اٹھا دیا اور میں نے مکمل سہولت اور آرام سے گرم پانی کے شاور سے غسل بھی کر لیا۔ ورنہ عام حالات میں ان غسل خانوں میں کیڈٹس کی اس قدر بھڑھڑ ہوتی تھی کہ کئی بار ایک ہی شاور کے نیچے تین تین کیڈٹ جا ٹیکہ پہنے نہا رہے ہوتے تھے۔ میں آرام سے تیار ہو کر اپنی کتابیں اکٹھی کر رہا تھا جب باقی کیڈٹس پریڈ گراؤنڈ سے بھاگتے دوڑتے اور بانپتے کا نپتے ہاشل آہنچے اور جلدی جلدی تو لیے باندھ کر غسل خانوں کی جانب بھاگے۔ میرا بخار تو اتر چکا تھا لیکن میری پرچی ابھی میرے پاس ہی پڑی تھی۔ سب سے پہلے نہا کر واپس آئے فیصل کی اس پر نظر پڑی۔ اس نے پرچی اٹھا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور دھرے سے میرے کان میں کہا کہ اگر ہم 01 کو 07 بنا دیں تو میرا ریسٹ سات دن کا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے چونک کر فیصل کو دیکھا..... کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ ابھی ہم دونوں اسی سوچ میں تھے کہ میس میں ناشتے کی گھنٹی بج گئی اور باہر سے سینئر کیڈٹ کی دھاڑ سنائی دی کہ تمام کیڈٹس فوراً ناشتے کے لیے میس کی جانب مارچ پاسٹ کریں۔ اسی بوکلا ہٹ میں وہ پرچی مجھ سے اور فیصل سے وہیں بیرک کے فرش پر گر گئی اور جب ہم کلاس سے واپس آئے تو سوپر صفائی کے دوران وہ کاغذ بھی فرش سے اٹھا چکا تھا۔ میں نے اور فیصل نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتفاق سے تیسرے ہی دن اسفر کی طبیعت بھی بگڑ گئی اور اسے بھی ڈاکٹر نو کے پاس ہسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے اسفر کو ریسٹ تو نہیں دیا لیکن ہسپتال کی دواؤں کی پرچی اس کے ہمراہ ہم تک پہنچ گئی۔ اکیڈمی کا دستور یہ تھا کہ جن

کیڈٹس کو ڈاکٹر ریٹ دیا کرتا تھا ان کے نام کے آگے سینئر کیڈٹ ”آن ریٹ On Rest“ لکھ کر آرام کے دن لکھ دیتا تھا۔ یہ سب کاغذ کی ایک شیٹ پر تحریر ہوتا تھا جسے ”پریڈ اسٹیٹمنٹ Prade Statement“ کہا جاتا تھا جس کیڈٹ کو ڈاکٹر نے جتنے دن کے لیے پریڈ ریٹ یا کلاس ریٹ یا گیمز ریٹ دیا ہوتا تھا وہ اپنی پرچی اپنے پریفیکٹ کو دے دیتا جو رات کی گنتی کے وقت اسے سینئر کیڈٹ آفیسر کے پاس لے جا کر اور اسے دکھا کر اس کا اندرج پریڈ اسٹیٹمنٹ میں کروا لیتا تھا۔ یوں اگلے دن صبح پریڈ کے دوران پی او اس کی غیر حاضری نہیں لگاتا تھا اور اس کیڈٹ کو ”سک لیو“ (Sick Leave) یعنی بیماری کی رخصت پر شمار کیا جاتا تھا۔ فیصل کا منصوبہ کچھ اور ہی تھا۔ ہم سرشام ہی پہلی پرپ کے دوران ڈاکٹر نو کی لکھائی کو غور سے دیکھ دیکھ کر اس کی مشق کی پریکٹس کرتے رہے۔ اسفورات کے کھانے تک ہماری منتیں کرتا رہا کہ ہم ایسی غلطی نہ کریں اگر ڈاکٹر نو کی تحریر سے ہماری تحریر مل نہیں پائی تو ہم دونوں کا تو پتہ نہیں لیکن ہاؤس ماسٹر اسفر کو زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن فیصل کا کہنا تھا کہ ساتویں کے کیڈٹس پر کسی کا شک بھی نہیں جائے گا۔ اس لیے یہ جو اکیلے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رات کے کھانے کے بعد ہم تینوں انٹرٹینمنٹ روم کے بجائے واپس اپنی ڈارمیٹری میں آگئے اور آخری بار ہم نے ڈاکٹر نو کی تحریر کی مشق کی۔ ڈاکٹر نو کے دستخط بہت آسان تھے لیکن میں اس کے انگریزی میں لکھے الفاظ کو نقل نہیں کر پار ہاتھا جبکہ فیصل لفظ تو لکھ لیتا لیکن دستخط کرتے وقت اس کا ہاتھ بہک جاتا تھا، لہذا طے یہ پایا کہ آرام Rest کرنے کے دن فیصل لکھے گا اور میں نیچے ڈاکٹر کے دستخط کروں گا۔ ہم نے آخری بار بسم اللہ پڑھی اور اسی نیلی روشنائی والے پین سے فیصل نے ”تین دن کے لیے پریڈ سے آرام“ کا جملہ انگریزی میں پرچی پر لکھ دیا۔ کچھ فرق تو آیا تحریر میں لیکن یہ بہت زیادہ غور سے دیکھنے کے بعد ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اب میں نے دل ہی دل میں چند سورتیں پڑھیں اور اسی پین سے نیچے ڈاکٹر نو جیسے دستخط بنا دیے۔ کچھ دیر تک ہم تینوں دم سادھے اسی پرچی کو دیکھتے رہے جس پر ابھی تک ہماری تحریر کی روشنائی خشک نہیں ہوئی تھی۔ فیصل نے اگلے دس منٹ تک ہر طرح سے الٹا، سیدھا، دور اور نزدیک سے اس پرچی کو پکڑ کر دیکھا اور بالآخر فیصلہ دے دیا کہ ہماری اس جعل سازی کو شاید خود ڈاکٹر نو بھی نہ پکڑ پائے۔ اسفر کا ابھی تک برا حال تھا اور خوف کے مارے اسے واقعی بخار سا چڑھنے لگا تھا۔ ہم دونوں نے کسی نہ کسی طرح دلاسہ دے کر رات کی گنتی کے وقت تک اس کے حواس بحال رکھے اور نائٹ فالن کے وقت جب سینئر کیڈٹ نے ہر جماعت کے پریفیکٹ کو سب بیمار کیڈٹس کی سک رپورٹ (Sick Report) لانے کے لیے کہا تو فیصل نے تقریباً دھکا دے کر اسفر کو پریفیکٹ کی جانب دھکیل دیا۔ ورنہ وہ تو خوف کے مارے اپنی جگہ جما ہوا کھڑا تھا۔ پریفیکٹ نے ڈانٹ کر اس سے پوچھا ”کیا ہے؟“ اسفر نے جلدی سے تھوک اپنے حلق سے نگلا اور ہاتھ میں پکڑی اپنی پرچی پریفیکٹ کی جانب بڑھا دی۔ پریفیکٹ نے اسفر کی پرچی کھولی اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ہم سب کے دل یوں دھڑک رہے تھے جیسے ابھی اچھل کر حلق سے باہر آ گریں گے۔ پریفیکٹ نے نظریں اٹھا کر اسفر کو دیکھا۔ اسفر کا رنگ مزید پیلا ہو گیا اور وہ لڑکھڑا کر تقریباً گرنے کو ہی تھا کہ پریفیکٹ نے پرچی باقی پرچیوں کے ساتھ نتھی کی اور پریڈ کرتے ہوئے سینئر کیڈٹ کی جانب اپنی کلاس کی گنتی جمع کروانے چلا گیا۔ سینئر کیڈٹ آفیسر نے سرسری طور پر تمام پرچیوں کا جائزہ لیا اور اسفر کا نام پریڈ اسٹیٹمنٹ میں ”تین دن کے لیے پریڈ آرام Three days rest from prade“ میں لکھ کر رجسٹر بند کر دیا۔ میرے اور فیصل کے منہ سے ایک زوردار خوشی کا نعرہ نکلتے نکلتے رہ گیا اور اسفر کی جان میں بھی جان آئی۔ اوپر ڈارمیٹری میں پہنچتے ہی ہم تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کو گلے لگالیا اور اپنی اس پہلی جعل سازی کی

کامیابی پر دل کھول کر ایک دوسرے کو داد اور مبارک باد دی۔

اگلے تین دن تک اسفر مزے سے صبح سوٹا رہا اور میں اور فیصل اسے سوتا دیکھ کر ہی خوش ہوتے رہے۔ اصل میں یہ ہمارا وہ انتقام تھا جو ہم سب جوئیز کیڈٹ اس سٹی سے لینا چاہتے تھے جو منہ اندھیرے ہمیں زبردستی جگانے کے لیے بجائے جاتی تھی۔ ہم سب ہی کو اس سٹی سے اور یوں سحری کے وقت جگائے جانے سے شدید نفرت تھی لیکن ہم سبھی بے بس تھے۔ مجھے اور فیصل کو اب کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ اب ہمارے پاس اس بے بسی کے توڑ کے لیے ایک ہتھیار موجود تھا اور ہم تینوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہتھیار کو باری باری استعمال کرتے رہیں گے۔

تساؤ کے آدم خور

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

تساؤ کے آدم خور..... شکاریات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور حقائق پر مبنی سچا واقعہ..... یوگنڈا (کینیا) کے دو خونخوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے..... ایک سال کی قلیل مدت میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے **تساؤ کے آدم خور**..... جنہوں نے یوگنڈا میں پچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھلاوہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم **Ghost & The Darkness** بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹر سن (فوجی اور ریلوے لائن کام کا انچارج) کی کتاب **(The Man-Eaters of Tsavo)** کا اردو ترجمہ **کتاب گھر پر شکاریات سیکشن** میں دیکھا جاسکتا ہے۔

گلریا کا آدم خور

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

گلریا کا آدم خور برٹش آرمی کے ایک سابق بریگیڈیئر جمشید راجپوت خان کیانی کی آپ بیتی ہے، جسے عبید اللہ بیگ نے کہانی کی شکل میں تحریر کیا ہے۔ **گلریا کا آدم خور** ۲۰۰۴ کی دہائی کی ایک شکاری مہم ہے جو ایک طرف اُس وقت کے راجھستان اور راجھستانی راجاؤں کی آن بان کی خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف تقسیم ہندوستان اور قیام پاکستان کی راہ میں آنے والی سیاسی ریشہ دوانیوں اور ان دیکھی قوتوں کی پس پردہ سازشوں سے نقاب اٹھاتی ہے۔ اس داستان میں بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جو اس خطہ کے جغرافیائی نقشہ کو کسی اور ہی رخ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول **شکاریات سیکشن** میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

معصوم انتقام

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چچا کے اس فیصلے سے کہ وہ ڈوآپی کو مزید نہیں پڑھانا چاہتے، خاندان بھر میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ کہاں وہ دن تھے کہ غیاث چچا خود زمانے بھر کی لائبریریوں سے ڈوآپی کی پسند کی کتابیں چن چن کر لاتے نہ تھکتے تھے اور کہاں یہ دن کہ خود انہوں نے ڈوآپی پر تعلیم کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈوآپی کی خالائیں، چچا، ماموں، بھپھی اور پھپھا سبھی تو اچنبھے میں تھے کہ آخر ایسا کیا ماجرا ہو گیا ہے کہ غیاث چچا نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا؟ وہ تو اپنی وجہہ کو مقابلے کے امتحان کی تیاری کروانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کی ڈو بی اپنے خاندان کی پہلی سی ایس پی افسر بنے پھر اچانک یہ کیا پلٹ کیسی.....؟

سکینہ خالہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا اور پھر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ان کی عادت تھی کہ جب وہ غصے میں یا پھر انتہائی سنجیدہ ہوتے تو ڈوآپی کو ڈو بی کی بجائے ان کے پورے نام ”وجیہہ“ سے پکارتے تھے۔ اس شام بھی انہوں نے صحن میں بیٹھے بیٹھے ڈوآپی کو اسی انداز میں آواز دی۔

”وجیہہ..... میری بات سنتی جاؤ۔“

ڈوآپی جو نہ جانے کب سے اندر اپنے کمرے میں بیٹھیں، رورو کر اپنی آنکھیں سرخ کر چکی تھیں، جلدی سے اٹھ کر باہر آ گئیں۔ غیاث چچا نے غور سے ان کی سوچی ہوئی آنکھوں اور بیگمی پلکوں کی جانب دیکھا اور یوں بولے جیسے کوئی گھرے کنویں سے دور سے بول رہا ہو۔

”کیا تمہیں میرے فیصلے سے کوئی اختلاف ہے.....؟“

”نہیں ابا..... آپ نے جو بھی فیصلہ کیا ہے میری ہی بھلائی کی خاطر کیا ہوگا.....“

غیاث ابا کے چہرے پر چھایا تکدر کسی حد تک کم ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں تمہیں پڑھنے کا کس قدر جنون ہے۔ تم چاہو تو امتحانات کا وقت آنے پر پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے بی اے کے پرچے دے سکتی ہو لیکن اب ان حالات میں میں مناسب نہیں سمجھتا کہ تم روزانہ کالج کے لیے نکلا کرو۔ فضلہ بابا بھی بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور میں تمہیں خود روزانہ کالج چھوڑنے اور لینے کے لیے آ بھی جاؤں تب بھی سارا دن میرا دھیان تمہاری جانب ہی لگا رہے گا اور پھر دیر سویر تو زندگی کے ساتھ ہی لگی ہے اور اس الجھن میں نہ تم اپنی پڑھائی پڑھیان دے پاؤ گی اور نہ ہی میں ٹھیک طرح سے اپنا کوئی کام کر پاؤں گا۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ تمہاری ریگولر پڑھائی ختم کر دی جائے۔ تم گھر میں ہی بیٹھ کر بی اے کر لو پھر بعد میں آگے کی سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ وہ ڈوآپی نے پھر وہی جملہ دہرایا کہ انہیں غیاث

چچا کی ہر بات ہر حکم دل و جان سے منظور ہے۔ غیاث چچا نے اٹھ کر دوڑ آئی کے سر پہ ہاتھ رکھ کر انہیں دعا دی اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ سیکنہ خالہ جو دور برآمدے میں بیٹھیں یہ سارا ماجرا چپ چاپ دیکھ رہی تھیں انہوں نے جب باپ بیٹی کو یوں ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپاتے دیکھا تو خود بھی اپنے پلو کی اوٹ میں رو پڑیں لیکن کاش کوئی ان باپ بیٹی اور ماں کو بتا پاتا کہ آنسوؤں سے کبھی مقدر کی کالک نہیں دھل پاتی اور مقدر کے گہرے کالے عفریت کا سایہ اب دھیرے دھیرے اس گھرانے کے حصے کی دھوپ کو چاٹنے لگ پڑا تھا۔

اگلے دن راجہ صبح سویرے پہرے پہ ہی موجود تھا جب کرموٹا ننگے والے نے صبح کالج کے وقت حسب معمول اپنا بھونپو بجا یا، وہ اسی وقت چونک پڑا تھا جب اس نے روزانہ کی طرح فضلہ بابا کو ڈوآ پی کا بیگ لیے باہر نکلتے نہیں دیکھا اور ان کی جگہ خود غیاث چچا گھر سے باہر نکل آئے۔ راجہ کا ہاتھ ٹھنکا اور وہ جلدی سے گھوڑے کے گلے میں بندھے گھنگھر دو دیکھنے کے لیے تانگے کے قریب جا پہنچا۔ غیاث چچا کرموٹا رہے تھے کہ آج سے ڈو بی کالج نہیں جائیں گی لہذا کل سے اسے تانگہ لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں البتہ وہ آنے والی پہلی پر آ کر اپنا حساب کتاب کر جائے۔ کرموٹا بوکھلا گیا اور اس نے غیاث چچا سے کہا کہ پیسوں کی اسے کوئی پرواہ نہیں پر خدا نخواستہ ڈو بی کی طبیعت تو خراب نہیں۔ سب ”خیری صلا“ تو ہے نا۔ غیاث چچا نے اسے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ بس آج کل کالج میں پڑھائی برائے نام ہی ہوتی ہے اس لیے ڈوآ پی نے گھر پر ہی بیٹھ کر اپنی مزید تعلیم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کرموٹا ننگے والے کو غیاث چچا کی بات سے اطمینان ہوا یا نہیں، راجہ یہ تو نہیں جان پایا لیکن وہ اپنے مخصوص دیہاتی لہجے میں ڈوآ پی کو ڈھیروں وعائیں دیتا ہوا وہاں سے واپس لوٹ گیا لیکن جاتے جاتے غیاث چچا سے یہ وعدہ لینا نہیں بھولا کہ جب کبھی انہیں کرم دین کی ضرورت پڑی وہ اسے ضرور یاد کریں گے۔ اس کی اداسی بھی اپنی جگہ بجا تھی کیونکہ ڈوآ پی جب ڈو بی بھی نہیں بنی تھیں اور ننھی ڈو تھیں تب سے کرموٹا ننگے والا ہی انہیں اپنے تانگے میں بٹھا کر زسری سے لے کر اب تک اسکول اور کالج لاتا لے جاتا رہا تھا اور ڈوآ پی بالکل اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پیاری تھیں۔ تانگے والا تو چلا گیا اور غیاث چچا بھی واپس اپنے گھر جا چکے تھے لیکن راجہ کے ذہن میں ان گنت سوال کلبلا نے لگے تھے۔ آخر اچانک ایسی کیا بات ہو گئی کہ ڈوآ پی نے کالج جانا ترک کر دیا تھا۔ اسے غیاث چچا کی اس بات پر بھی بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ خود ڈوآ پی نے اپنی تعلیم ترک کر کے گھر پر بیٹھ جانے کا فیصلہ کیا ہو گا۔ بات ضرور کچھ اور ہی تھی..... لیکن کیا؟ اسی بات کا پتہ اب راجہ کو لگانا تھا۔ شام کو جب باقی سارے دوست بھی جمع ہوئے تو مسلسل ایک گھنٹے کی بحث کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ ہونہ ہو یہ شکورن بوا کی لگا لگی بھائی اور کزوی زبان ہی کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے غیاث چچا نے آخر تک آ کر ڈوآ پی کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ بالے نے اسی وقت غصے کے مارے شکورن بوا سے ”انتقام“ لینے کا اعلان کر دیا تھا اور اب سارے سر جوڑے بیٹھ کر یہ سوچ رہے تھے کہ آخر شکورن بوا کو سبق کیسے سکھایا جائے۔ مختلف قسم کی تجاویز سامنے آتی گئیں لیکن پھر وہ خود ہی انہیں رد بھی کرتے گئے مثلاً انھوں نے کہا کہ ان کی ساری مرغیوں کا صفایا کر دینا چاہیے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اتنی بہت سی مرغیوں کے لشکر کو مکمل ہضم کرنے تک چھپا کر کہاں رکھیں گے؟ پو نے مشورہ دیا کہ ان کے دودھ کی پتیلی میں بھرے دودھ کے اندر مردہ چھچکی ڈال دی جائے لیکن اتنی بڑی خطا کے لیے اتنی چھوٹی سرا؟ نہیں نہیں..... پھر کیا کریں.....؟ بالے نے تجویز دی کہ محلے کے برگد کے پیڑ پر غلیل لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے ان کے گھر تمام شیشے توڑ ڈالتے ہیں لیکن اس میں بھی رنگے ہاتھ پکڑے جانے کا شدید خدشہ تھا کیونکہ راجہ پہلے بھی کئی مرتبہ اسی برگد کے پیڑ

سے نشانہ بازی کرتے ہوئے دھرا جا چکا تھا۔

یہاں راجہ گینگ بیٹھا یہ منصوبے بنا رہا تھا اور وہاں سامنے بڑے میدان میں ان سے چھوٹے بچوں کی ”نئی نسل“ آنے والی شب برات کے استقبال کے لیے ابھی پٹاخے بجانے اور رسی کی سوتر والے ”بم“ پھوڑنے میں مشغول تھی۔ سوتر بم ایک ایسی پتلی رسی سے جڑا ہوتا تھا جسے عام فہم میں سٹلی یا سوتر کہا جاتا تھا لمبی سوتر کے آخری سرے پر ایک بڑا سا گیند نما گول پٹاخہ جڑا ہوتا تھا جس میں بچوں کے پٹاخوں والا مصالحہ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھی خاصی گونج دار ہوتی تھی۔ طریقہ یہ تھا کہ لمبی سوتر والے حصے کو کوئی بچہ آگ لگا کر بھاگ جاتا اور باقی بچے دور کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے۔ سوتر کے آخری حصے پر لگی آگ پلک جھپکتے میں مصالحوں والے حصے تک پہنچ جاتی اور بم ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹ جاتا۔ ایسے ہی منصوبے بناتے بناتے اچانک بے خیالی میں راجہ کی نظر سامنے میدان میں بچوں کے اس پسندیدہ شغل پر پڑی اور اچانک اس کے دماغ میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہوئے۔ اس نے فوراً انھوں کو اپنی جیب میں پڑا اٹھ آنے کا سکہ دیا اور اس سے کہا کہ وہ بھاگ کر محلے میں ہی کلز پر موجود جمید پر چون والے سے ایسے چند بم اٹھا لائے۔ کچھ ہی دیر میں انھوں نے تین سوتر بم اٹھائے بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔ راجہ نے جلدی جلدی تینوں بموں کی سوتر کو کاٹ کر ایک لمبی سے رسی بنائی اور اسے تیسرے بم کی سوتر سے جوڑ دیا۔ یوں ایک لمبی سی سوتر والا بم بن گیا جس کا پھٹنے والا حصہ، اس لمبی سوتر سے بہت فاصلے پر تھا اتنا فاصلہ کہ سوتر کو سلگانے والا بچہ تین چار گز دور بیٹھ کر بھی یہ فریضہ ”سر انجام“ دے سکتا تھا۔ شکورن بواروزانہ عصر کے وقت روزمرہ کی اشیائے ضرورت لینے کے لیے بازار اور سبزی منڈی جایا کرتی تھیں اور مغرب سے کچھ پہلے یا پھر مغرب کے وقت واپس لوٹا کرتی تھیں۔ یہ ان کی واپسی کا وقت تھا۔ راجہ نے سب دوستوں کو منصوبہ سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور سبھی اپنے اپنے مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں شکورن بوا کا سائیکل رکشہ محلے کے پھانک پر آ کر رکا اور اس میں سے حسب معمول لدی پھندی سی شکورن بوا اپنے خیمہ نمائش کا کبرقعے سمیت برآمد ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں سبزی کی الگ اور دوسرے سامان کی الگ ٹوکریاں موجود تھیں۔ عام حالات میں محلے کے سارے بچے انہیں محلے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً کہیں رفو چکر ہو جاتے تھے کیونکہ ان کی عادت تھی کہ اپنا سارا سامان بچوں کے حوالے کر دیتیں اور انہیں قلیوں کی طرح اپنے سامان کی ڈھلائی پر لگا کر خود مزے سے سستائی ہوئی گھر تک جایا کرتیں اور جو بچہ ذرا سی آنا کافی کرتا تو اسے وہیں کھڑے کھڑے خوب صلواتیں سنایا کرتی تھیں۔ لہذا بچے اپنی عافیت اسی میں جانتے کہ ان کے محلے میں گھستے ہی سبھی جس کا جس طرف منہ ہوتا، بھاگ اٹھتے لیکن اس دن راجہ اور اس کے دوست دکھاوے کے لیے اپنے کھیل میں مشغول رہے۔ شکورن بوا نے بھی موقع غنیمت جانا اور جلدی سے راجہ اور بالے کو آواز لگائی کہ ذرا اس کا ہاتھ تو بٹاتے جائیں۔ منصوبے کے مطابق بالے اور راجہ سے پہلے ہی پچواڑنھو بھاگتے ہوئے گئے اور شکورن بوا کے ہاتھ سے ٹوکریاں لے کر اس کے آگے آگے چل پڑے۔ بڑے میدان کے وسط میں آتے ہی انھوں نے لڑکھڑایا جیسے اسے ٹھوکر لگی ہو اور دوسرے ہی لمحے سبزی کی ٹوکری میں سے آلو ٹماٹرز زمین پر لڑھکتے نظر آئے۔ شکورن بوا وہیں سے چلا گئے۔

”اے ہئے کم بخت..... یہ کیا کر دیا.....؟ دیکھ کر نہیں چلا جاتا تھا سے۔“

پچواڑنھو جلدی سے ٹوکریاں زمین پر رکھ کر سامان چننے میں مصروف ہو گئے۔ شکورن بوا خود بھی اپنا برقعہ پھیلا کر وہیں بیٹھ گئیں اور سبزی اٹھا

اٹھا کر واپس ٹوکری میں ڈالنے لگ گئیں۔ اب منصوبے کے آخری حصے کو انجام دینے کا وقت آ گیا تھا۔ بالے نے نہایت آہستگی سے سوتر بم کا گیند نما حصہ ان کے شٹل کا ک خیے میں رکھ دیا۔ راجہ جو چند گز دور بیٹھا تھا اس نے آہستگی سے رسی کی سوتر کو تیلی دکھادی۔ شکورن بوا اپنے ہی دھیان میں غرق ہو چلا اور نھو کو کوئی ہونکی اپنی سبزی جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ دفعۃً راجہ نے ایک، دو، تین کہا اور پوپو، نھو، گڈو، راجہ اور بالے سرپٹ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ شکورن بوا نے سر اٹھا کر حیرت سے انہیں دیکھا لیکن ان کی یہ حیرت صرف چند لمحوں کی ہی ثابت ہوئی۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور یوں لگا جیسے شکورن بوا کے شٹل کا ک برقعے میں کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ شکورن بوا زور سے چلا کر اچھلیں اور دوڑ پڑیں۔ ان کے برقعے میں آگ لگ گئی تھی اور وہ بڑے میدان میں یوں گول چکر میں دوڑ رہیں تھیں جیسے کوئی آگ کا گولہ سرکس میں گول دائرے میں لڑھکتا پھرتا ہے۔ وہ دوڑے جاتیں اور چلا چلا کر لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارے جاتیں۔ کچھ ہی دیر میں سامنے والے مکان سے غفور چچا جلدی سے پانی کی بھری بالٹی لیے دوڑتے نظر آئے اور انہوں نے پوری بالٹی شکورن بوا پر بلکہ ان کے شٹل کا ک برقعے پر اندیل دی۔ شکورن بوا کے برقعے کی آگ تو بجھ گئی لیکن ان کی زبان نے جو شعلے اگلا شروع کیے تو ان کی تپش کئی ہفتوں تک ٹھنڈی نہیں ہو پائی۔ ان کا سفید شٹل کا ک برقعہ جگہ جگہ سے جل کر چھلنی ہو چکا تھا اور اس کا رنگ بھی دھوس کی وجہ سے سفید سے گہرا سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ وہ اسی حالت میں کبھی جھکتی سب سے پہلے راجہ اور پھر بالے، پوپو، نھو اور گڈو سبھی کے گھروں میں فریاد لے کر گئیں اور سب ہی گھروں سے انہوں نے نئے برقعے کی رقم وصول کی۔ راجہ کے گھر والوں سمیت باقی سبھی بچوں کے گھر والے رات گئے تک اپنے ”ملزمان“ کو تلاش کرتے رہے اور رات کو جب آخر کار وہ سڑک پار پان والے کے کیمپ کے عقب میں کچھ بچوں پر چھپ کر بیٹھ مل گئے تو ان سب کو گھر لا کر فردا فردا سبھی کے والدین نے اپنے اپنے گھروں میں ان کے جسموں کی وہ سینکائی کی کہ کئی دن تک وہ سبھی اپنے انگ سہلاتے رہے لیکن اس کے باوجود وہ سب خوش تھے کیونکہ انہوں نے شکورن بوا سے اپنی ڈھو آپی کا بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد تین چار دن تک شکورن بوا گھر سے نکلتے کسی کو دکھائی نہ دیں۔ پانچویں دن جب وہ گھر سے برآمد ہوئیں تو ان کے تن پر وہی پرانا، مگر دھلا ہوا شٹل کا ک برقعہ موجود تھا البتہ اب اس میں بڑے بڑے اور بالشت بھر سفید اور مٹیالے رنگ کے پیوند جڑے نظر آ رہے تھے۔ شاید شکورن بوا نے اس ”عظیم سانحے“ کی یاد کو اپنے دل میں ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے اس برقعے کو خود سے کبھی جدا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

قصہ نصف صدی کا

لاکھوں دلوں کی دھڑکن **محی الدین نواب** کے جاؤ قلم سے ایک خوبصورت ناول..... تقسیم ہند (قیام پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی ایک پراثر تحریر..... آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان..... جہاں حالات اور مسائل ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی جیت

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

میں نے جب اس ”سانحہ برقعہ“ کی تمام واردات راجہ کے اگلے خط میں پڑھی تو ہنس ہنس کر میرا برا حال ہو گیا۔ میں نے شام کو ہیلن اور شیرل کو بھی اپنے دوستوں کی اس انتقامی واردات کے بارے میں بتایا اور وہ دونوں بھی بہت محظوظ ہوئیں۔ شیرل تو اس قدر ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس دن میں نے انہیں دھوا آپی کے بارے میں بھی بہت تفصیل سے بتایا۔ ہیلن نے بہت غور سے دھوا آپی کے بارے میں میری ساری باتیں سنیں اور جب میں نے شیرل کو یہ بتایا کہ مجھے اصل میں کیڈٹ کالج جانے پر راضی کرنے والی دھوا آپی ہی تھیں اور میں نے یہ دن یہاں اسی لیے گزارے ہیں کیونکہ میں واپس جانے سے پہلے ساری انگریزی سیکھ لینا چاہتا ہوں تاکہ مستقبل میں میری انگریزی ان کے کام آسکے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ شیرل اور ہیلن دونوں نے اس شام مجھے مزید محنت کرنے کی نصیحت کی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ دونوں اپنی جانب سے ذرا سی بھی کسر نہیں رکھ چھوڑیں گی اور واقعی ان دونوں نے میری تربیت اور تعلیم میں کبھی کوئی رتی برابر کسر بھی نہیں چھوڑی اور چند ہفتوں کے بعد ہی ساری کلاس اس وقت دنگ رہ گئی جب انگلش ریڈنگ کی کلاس کے دوران جب انور صاحب نے Tense (جملے) پڑھاتے ہوئے بچوں سے ایک سوال پوچھا تو سب ہی چپ بیٹھے رہے۔ تب میں نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھا دیا۔ اتنے ہفتوں میں نہ تو مجھ سے کلاس میں کسی نہ کچھ پوچھا تھا نہ ہی میں نے کبھی خود سے کوئی جواب دیا تھا۔ میں پرنسپل صاحب کی ہدایت کے مطابق کلاس میں آتا جاتا تھا لیکن چپ چاپ بیٹھ کر اپنے آس پاس ہوتے سوال جواب سنتا رہتا تھا پھر فیصل اور اسفر کے ساتھ مل کر خالی پیریڈز میں کاغذ کے جہاز بنا کر اڑاتا رہتا تھا اس لیے پوری کلاس کے علاوہ خود انور صاحب کو بھی قطعی مجھ سے یہ امید نہ تھی کہ میں اس مشکل سوال کا جواب دے پاؤں گا لیکن ہیلن نے مجھے پیچھے ڈیڑھ مہینے میں تمام Tenses اتنی اچھی طرح ازبر کروادیے تھے کہ میں نے جھٹ سے ایک لمحے میں انور صاحب کے سوال کا جواب دے دیا۔ ساری کلاس پہلے تو ہکا بکا رہ گئی اور پھر سب اٹھ اٹھ کر مجھے یوں مبارکباد دینے لگے جیسے میں کوئی جج کر کے آیا ہوں۔ انور صاحب نے سب کو ڈانٹ کر اپنی جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی سے مجھ سے ماضی، حال اور مستقبل کے تمام ٹینس یکے بعد دیگرے سنے۔ میں نے فرفر انہیں سارے سنا دیئے۔ ان کا حیرت کے مارے اتنا برا حال تھا کہ پیر ہیڈ ختم ہونے کی گھنٹی بھی انہیں نہیں سنائی دی۔ اس پیریڈ کے بعد آدھی چھٹی یعنی Mid Break تھی اور تمام کیڈٹس بریک فوڈ کھانے کے لیے کینٹین کی طرف دوڑ جاتے تھے لیکن انور صاحب مجھے لے کر پرنسپل صاحب کے دفتر کی جانب بڑھ گئے اور حاضری کا پروانہ ملتے ہی انہوں نے پرنسپل کو انتہائی حیرت کے ساتھ میری بہتری کے بارے میں بتایا۔ پرنسپل صاحب نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے ان کے اس ”انکشاف“ کو سنا کہ میں نے آج کلاس میں اس سوال کا جواب خود اپنی مرضی سے ہاتھ اٹھا کر دیا ہے جس سوال پر ساری کلاس خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔ پرنسپل صاحب نے مسکرا کر انور

صاحب کو شاباش دی کہ یہ سب ان کی ہی ”محنت“ کا نتیجہ ہے۔ انوار صاحب حیرت اور فخر کے ملے جلے تاثرات لیے دفتر سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد کمانڈر صاحب نے میری پیٹھ پھکی اور ہنس کر بولے۔

”ویری ویل کیڈٹ عباد..... تم واقعی اپنی دھن کے کپکے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آنے والے مڈرم امتحان جو اگلے مہینے شروع ہو رہے ہیں اس میں تم سب کو دکھا دو کہ اردو میڈیم اسکول سے تعلق رکھنا کوئی شرم کی بات نہیں ہے اور اردو میڈیم اسکول کے بچے بھی اتنے ہی ہونہار اور ذہین ہوتے ہیں جتنے کسی بھی بڑے انگلش میڈیم اسکول سے تعلق رکھنے والے بچے ہو سکتے ہیں۔“

میرا دل ان کی بات سن کر کچھ سمجھ سا گیا کیونکہ میرا تو خیال تھا کہ آج وہ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں گے کیونکہ میں نے ان کی اور ابا کی شرط پوری کر دی تھی لیکن وہ تو مزید پورا ایک مہینہ مجھے یہاں رکھنے پر مصر نظر آتے تھے۔ کمانڈر صاحب نے میرے اندر چلنے والی جنگ شاید میرے چہرے سے پڑھ لی تھی اسی لیے انہوں نے مجھے آرام سے بیٹھ جانے کو کہا اور پھر مجھے سمجھایا کہ یہ بھی اصل میں میرے ابا کی ہی خواہش تھی کہ میں کیڈٹ کالج سے ایک امتحان پاس کر کے اس کا شوقیلیٹ اپنے ساتھ لے کر آؤں کیونکہ میرے شہر میں تو اب سالانہ امتحانات سر پر تھے اور جب تک میں یہاں سے واپس جاتا تب تک میرے ہم جماعت آٹھویں کلاس میں جا چکے ہوتے، لہذا ضروری تھا کہ میرے پاس یہاں کی ”پاس شدہ“ والی سند موجود ہوتا کہ وہاں مجھے داخلے میں آسانی رہے۔ مجھے پرنسپل صاحب کی بات سمجھ میں آگئی اور میں نے بادل خواستہ مزید دو مہینے اس ”قید خانے“ میں رہنا منظور کر لیا تا کہ امتحان کے بعد اپنا نتیجہ لے کر ہی گھر جاؤں۔

اس وقت میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی اور نہ ہی میں پرنسپل صاحب سے یہ پوچھ سکا کہ ان کی میرے ابا سے اس دن پہلی مرتبہ میرے سامنے اور بعد میں میری غیر موجودگی میں آخر کس فون نمبر پر بات ہوتی ہے؟ کیونکہ ہمارے گھر میں تو کبھی ٹیلی فون تھا ہی نہیں..... نہ ہی ابا کے دفتر میں ان کی میز یا اس کے آس پاس کوئی ٹیلی فون میں نے پڑا دیکھا تھا.....؟ پھر آخر پرنسپل صاحب کو پہلی ہی گھنٹی پر ابا کیسے فون کی دوسری جانب جواب دینے کے لیے حاضر مل جاتے تھے؟

اس وقت میرے چھوٹے سے ذہن کے لیے یہی بات کافی تھی کہ پرنسپل صاحب لگا تار میرے ابا سے رابطے میں ہیں اور میری رفتار سے میرے ابا مطمئن ہیں۔ ہاں البتہ مجھ کو اس بات پر حیرت ضرور ہوتی تھی کہ ابا نے کبھی اپنے خطوں میں بھی پرنسپل صاحب سے اپنے رابطے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی توجیہ اپنے دل میں کچھ یوں سوچ رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے ابا نے گھر میں امی اور بھیا وغیرہ کو اس بات سے آگاہ نہ کیا ہو اور وہ نہ چاہتے ہوں کہ ان کے خط میں لکھی ہوئی ایسی کوئی بات کوئی دوسرا پڑھ لے یا بات خاندان میں پھیل جائے؟ اسی لیے انہوں نے کبھی اپنے اور کمانڈر صاحب کے رابطوں کا ذکر بھی اپنے کسی خط میں نہیں کیا تھا۔

دن گزرتے گئے اور ہم سب ہی جونیئر کیڈٹ پیرا کی اور گھڑسواری میں ماہر ہوتے گئے۔ ہماری پریڈ بھی اب اس قابل ہو گئی تھی کہ ہم باقی پورے ہاؤس کے سینئر کیڈٹس کے ساتھ مل کر پریڈ کرنے لگے تھے۔ پہلا مڈرم امتحان بھی گزر گیا اور میں نے کسی نہ کسی طور اسے پاس بھی کر لیا تھا لیکن بقول پرنسپل صاحب میرا رزلٹ اس قدر ”قابل فخر“ نہ تھا کہ جس کے بل پر میں دوبارہ اپنے اسکول جا کر ”باعزت“ داخلہ لے سکتا۔ واقعی نمبر تو اتنے

خاص نہ تھے لیکن میں کبھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر میں اول یا دوم بھی آجاتا تو کمانڈر صاحب پھر بھی کسی نہ کسی بہانے مجھے روک ہی لیتے۔ جیسا کہ انہوں نے اب ”میرے ابا کے ساتھ مل کر“ یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اب ساتویں جماعت کے مزید تین مہینے ہی تو رہ گئے ہیں تو پھر کیوں نہ میں سالانہ امتحانات دے کر ایک ہی مرتبہ گرمیوں کی لمبی چھٹیوں میں ”ہمیشہ“ کے لیے گھر واپس چلا جاؤں۔

اسی اثناء میں ایک دن فیصل کی سزا کے طور پر ”ایکسٹرا ڈرل“ آگئی۔ پہلے تو میں اور اسفر ڈر ہی گئے کہ شاید ہماری ”پرچی“ پکڑی گئی ہے کیونکہ ابھی پچھلے ہی ہفتے فیصل دو دن کے لیے آرام پر تھا لیکن پھر پتہ چلا کہ یہ کوئی اور ہی بات ہے۔ اس روز ہم سب کو طالب پی او نے پریڈ کے دوران مسلسل دو گھنٹے رانفل اٹھا کر دوڑایا تھا لہذا دوپہر کو ہم سب ہی کھانے کے بعد اپنے اپنے بستروں پر یوں گرے کہ پھر ہمیں اٹھانے کے لیے پریفیکٹ کو باقاعدہ دھمکیاں دینی پڑیں تھیں۔ ہم سب تو اٹھ کر اور کھیل کا لباس پہن کر کسی نہ کسی طرح باہر نکل ہی گئے لیکن نہ جانے فیصل نیند میں تھا یا پھر اس پر کسی کی نظر نہیں پڑی کہ وہ دوبارہ آکر اپنے بستر کے نیچے لیٹ کر لمبی تان کر سو گیا۔ وہاں کھیل کے میدان میں جب گنتی ہوئی تو فیصل غائب تھا لہذا اس کی غیر حاضری لگ گئی اور اگلے دن ”ڈیلی آرڈر“ Daily Order کی رپورٹ میں فیصل کا نام ایکسٹرا ڈرل کی سزا کے خانے میں جگمگا رہا تھا۔ یہ ڈرل سزا کے طور پر دوپہر کو ان کیڈٹس کو دی جاتی تھی جو کسی روٹین سے غیر حاضر رہتے یا پھر کوئی غلطی کرتے تھے۔ ہماری بیرک میں فیصل پہلا کیڈٹ تھا جسے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا ورنہ عام طور پر گیارہویں اور بارہویں جماعت کے کیڈٹس کو یہ سزا ملتی تھی۔ ہم سب نے پورے اعزاز کے ساتھ دوپہر تین بجے فیصل کو رخصت کیا اور ٹھیک شام 5 بجے بخشونی او کے ہاتھوں سے اسے ”وصول“ کیا کیونکہ فیصل کی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر اپنے بستر تک جاسکتا، لہذا اسے وصول ہی کیا جاسکتا تھا۔ فیصل نے حواس درست ہونے کے بعد بتایا کہ ان ظالموں نے تپتی دوپہر میں اسے ہزار بار ڈنڈ لگوائے، فرنٹ رول دیئے۔ رانفل اٹھا کر ایک پاؤں پر کھڑا رکھا اور گورکھا پوزیشن جس میں پاؤں دیوار پر اور جسم دو بازوؤں کے سہارے زمین پر ٹکا رہتا ہے پورے آدھے گھنٹے تک ٹانگے رکھا۔ ہم فیصل کی زبانی یہ سب سن کر دل ہی دل میں لرزتے رہے لیکن پھر یکے بعد دیگرے پہلے اسفر اور پھر مجھے بھی یہ شرف حاصل ہو ہی گیا۔ ہم دونوں کے جوتے اور بیلٹ اسمبلی کے وقت ٹھیک طرح سے چمکتے ہوئے نہیں پائے گئے تھے لہذا ہمیں بھی اس ”کالا پانی“ کی یا تر اکرنی ہی پڑی۔ ایکسٹرا ڈرل کے لیے اکیڈمی میں ہی موجود دوسری جنگ عظیم میں استعمال شدہ ایک رن وے کو بطور گراؤنڈ استعمال کیا جاتا تھا اور وہیں پر کیڈٹس کو سزا دینے کے تمام لوازمات موجود تھے۔

عجیب بے ہودہ اور ہولناک قسم کی جگہ تھی۔ اوپر سے بخشو (سی۔ پی۔ او) کے ہولناک نعرے اور کاشن..... آدھے گھنٹے میں ہی میرا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا اور ٹانگیں لرزنے لگ گئی تھیں لیکن بخشو نے پورے دو گھنٹے مجھ سمیت باقی کیڈٹس کے جسم کا سارا تیل نکل جانے کے بعد ہی ہمیں وہاں سے جانے دیا۔ واقعی پہلی ایکسٹرا ڈرل کی سزا کے بعد انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ”اسٹریچر“ کہلاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب بات اور بھی ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہمارے دلوں سے اس سزا کا خوف بھی جاتا رہا۔ شاید انسان کو جس چیز سے جتنا ڈرایا جائے اس چیز کا سامنا ہو جانے کے بعد اس کا خوف اتنی ہی تیزی سے ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اکیڈمی کی انتظامیہ ہمیں سزا دینے کے بجائے صرف سزا کا ڈر ہمارے دل میں بنائے رکھتی تو شاید ہم کبھی اپنی حدیں پار نہ کرتے۔ جو نیر کیڈٹس میں سے جو بھی ایکسٹرا ڈرل کی سزا کا

تمغہ سینے پر سجائے گرتا پڑتا ڈار میٹری میں داخل ہوتا، وہ دیگر کیدٹس کی نظر میں ہیرو بن جاتا۔ ہیرو کے درجے پر قائم رہنے کے لیے اس کیدٹ کو مزید ایکسٹرا ڈرل جھیلنی پڑتی اور یوں رفتہ رفتہ اس کی کھال سخت اور اتنی موٹی ہوتی جاتی کہ اس پر کسی سزا، کسی تکلیف کا کوئی اثر بھی نہ ہو پاتا۔ میری کھال بھی موٹی ہوتی جا رہی تھی اور سزا کا خوف میرے دل سے بھی نکلتا جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں ہمارے ٹرینٹل ایگزٹام بھی گزر گئے اور ہمیں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں۔ جب میں ٹرین سے اپنے شہر کے اسٹیشن پر اترا تو میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ مجھے جو آپنی کو دیکھے اور ان سے ملے ہوئے پورے آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔

سونہا گھاٹ کا پجاری

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

سونہا گھاٹ کا پجاری..... بے پناہ پر اسرار قوتوں اور کالی طاقتوں کا مالک جو اپنی موت کے بعد بھی زندہ تھا۔ افضل بیگ..... ایک مسلمان فارست آفیسر جو سونا گھاٹ کے قبر کا نشانہ بنا..... پھر وہ انتقام لینے کے جوش میں اندھا ہو گیا اور اپنا مذہب ترک کر کے جادوؤں کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ایک ایسا ناول جو پر اسرار کہانیوں کے شائقین کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ **سونہا گھاٹ کا پجاری** اپنے انجام تک کیسے پہنچا۔ افضل بیگ گناہ اور غلاظت کی دنیا سے کیسے لوٹا؟ ہندو دھرم، دیوی دیوتاؤں، کالے جادو، بیروں کے خوفناک تصادم سے مزین یہ داستان آپ **کتاب گھر** کے **پراسرار خوفناک ناول** سیکش میں پڑھ سکتے ہیں۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اقبالا

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اقبالا..... تاریک اور پر اسرار بر اعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد ایک غیر مذہب قبیلہ..... جو اقبال نامی دیوی کے پجاری تھے۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد مذہب دنیا کے چند افراد اس قبیلے کے جنگل میں جا بھنسے۔ شوالا..... جنگلی قبیلے کا ایک سردار جسے دیوی اقبال نے تمام حشرات الاراض کا مختار بنا دیا تھا۔ کالاری..... جنگلی قبیلے کا دوسرا سردار جس کی تمام درندوں پر حکمرانی تھی۔ کیا مذہب انسانوں کی اس جنگلی خونخوار قبیلے سے واپسی ممکن ہو سکی؟ انور صدیقی کے جادوؤں بیاں قلم کی یہ طویل اور دلچسپ داستان آپ جلد ہی **کتاب گھر** کے **ایکسٹرا ڈونچر ناول** سیکش میں پڑھ سکیں گے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پہلی محبت کی جونک

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

مجھے کالونی میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سارے پاگل ہی تو ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے بالے کی مجھ پر نظر پڑی۔ وہ محلے کے نکر پر کھڑا شکاپوری قلفی والے کے ٹھیلے سے قلفیاں لے کر کھارہا تھا۔ اس کی عادت تھی وہ ہمیشہ جلدی جلدی قلفیاں نگلتا رہتا اور ایک وقت آتا کہ قلفی والے کو یاد بھی نہیں رہتا تھا کہ اس نے بارہ قلفیاں کھائی تھیں یا پندرہ؟ پھر ایک لمبی بحث ہوتی جس میں آخر کار قلفی والے کو بالے کی تصدیق کردہ گنتی پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ بالا پہلے بھاگ کر میری طرف آیا اور اس نے مجھے ٹٹول ٹٹول کر میرے ہونے کا یقین کیا اور پھر بھاگ کر اس نے باقی سب کو بھی اطلاع کر دی اور میرے گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی راجہ، گڈو، نھو، پپو اور مٹی نے مجھے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے ان سب کو یقین دلایا کہ امی اور باقی گھر والوں سے مل کر میں خود ہی برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچ جاؤں گا۔

میں نے دھیرے سے دروازہ کھولا تو پہلی نظر صحن میں بیٹھی امی اور عمارہ پر پڑی جو بڑی سی تنکوں والی پرات میں رکھے چاول صاف کر رہی تھیں۔ پاس ہی بہت سا گڑ بھی پڑا ہوا تھا جسے ابھی پینا باقی تھا یعنی گڑ والے چاول پکانے کی تیاری تھی لیکن امی کو کیسے پتہ چلا کہ میں آ رہا ہوں۔ گڑ والے چاول تو ہمیشہ امی میری فرمائش پر پکاتی تھیں اور میرے آنے کی تو یہاں کسی کو خبر ہی نہیں تھی۔ میں نے دھیرے سے اپنا بیگ دروازے پر چھوڑا اور بھاگ کر ویسے ہی امی سے ان کی بے خبری میں لپٹ گیا جیسے میں پہلے اپنے اسکول سے آ کر اور اپنا بستہ دروازے پر ہی پھینک کر ان سے چٹ جاتا تھا۔ ان کے منہ سے بھی اتفاقاً وہی جملہ نکلا جو وہ ایسے موقعوں پر مجھے ڈانٹنے کے لیے کہتی تھیں۔

”آدی اب ہٹ بھی جا..... ماں کی ہڈیاں توڑے گا کیا.....؟ پورا گدھا ہو گیا ہے تو بھی.....“

پھر وہ اچانک چونکیں کیونکہ انہوں نے میری گرفت کو محسوس کر لیا تھا۔ عمارہ بھی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ امی کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ میں ہی ہوں۔ وہ میرے چہرے اور باقی جسم کو چھو کر اپنا شک دور کرتی رہیں اور ان کی آنکھیں نم ہوتی گئیں۔ یہ مائیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ پہلے خود ہی اپنے آپ سے دور جانے کا کہتی ہیں اور پھر خود ہی چھپ چھپ کر روتی رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں ابا اور بڑے بھیا بھی آ گئے اور سبھی مجھے گھر میں یوں اچانک پا کر بے حد خوش ہوئے۔ میں نے ابا کو بتایا کہ دو دروازے کے کیدٹس کو انتظامیہ خصوصی طور پر ٹرین کے گارڈ کے حوالے کر دیتی ہے تاکہ وہ لمبے سفر کے دوران ان کا خیال رکھ سکیں اور حفاظت سے انہیں گھر پہنچا دیں۔ میں بھی اسی طریقے سے یہاں تک پہنچایا گیا تھا۔ ابا نے میرے رزلٹ کا پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے سے پہلے نتیجہ گھر بھجوا دیا جائے گا۔ صرف انہی کیدٹس کو واپس بلایا جاتا تھا جو سالانہ امتحانات میں کامیابی حاصل کر پاتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ابا کے دل میں ابھی تک میرے فیصل ہو جانے کا خوف موجود ہے اسی لیے وہ پرنسپل صاحب

سے ہوئے اپنے معاہدے کا ذکر میرے یاد گیر گھر والوں کے سامنے نہیں کر رہے تھے۔ بہر حال میں نے بھی ان سے کچھ نہیں پوچھا کیونکہ نتیجہ آنے پر سب کچھ خود بخود واضح ہو جاتا تھا۔

عمارہ اور بڑے بھیا جواب میٹرک کا امتحان دے چکے تھے، بہت دیر تک مجھ سے اکیڈمی کی باتیں پوچھتے رہے اور امی مجھے دیکھ دیکھ کر یہ غم کھائے جاتی رہیں کہ میں کس قدر کم زور ہو گیا ہوں۔ انہوں نے فوراً میری گرمیوں کی چھٹیوں کے لیے ایک ”منصوبہ صحت“ (Health Plan) تشکیل دے دیا اور اسی اثناء میں شام بھی ڈھلنے لگ گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں میرے دوستوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور باہر گلی سے ان کی سیٹیوں کی آواز چھوٹے چھوٹے قفوں سے مستقل سنائی دینے لگی۔ اس دن مجھے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ امی کو بھی ان سیٹیوں کی حقیقت معلوم ہے کیونکہ کچھ دیر تک وہ میری بے چینی کو نوٹ کرتی رہیں پھر دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔

”آدی..... جا..... جا کر مل آ ان لفٹوں سے..... ورنہ یونہی سر کھاتے رہیں گے گلی میں کھڑے کھڑے..... پر جلدی آ جانا..... میں تیرے لیے گڑوالے چاول بنا رہی ہوں.....“

میں فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جانے ان ماؤں کو ہم بچوں کی ہر بات، ہر راز کا بن بولے ہی کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ برگد کے پیڑ تک پہنچتے پہنچتے تقریباً سارے محلے کو ہی میرے آنے کی خبر ہو چکی تھی لہذا سب ہی سے فرداً فرداً ملنا پڑا جبکہ راجہ اور میرے باقی دوست بار بار یوں کسی کے راہ میں روک لینے سے چڑ کر برے برے منہ بناتے رہے اور مجھے اشارے کرتے رہے کہ میں جلدی ان سب سے جان چھڑاؤں۔

تنہائی ملنے ہی راجہ نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا کہ میری فوجی وردی اور ڈرائیور والی گاڑی کہاں ہے؟ اور میرے مسلح محافظ کہاں ہیں اور یہ کہ میری ڈیوٹی کہاں لگی ہے.....؟

میں اس کی باتیں سن کر ہنس پڑا اور اسے بتایا کہ ابھی وہ مرحلہ آنے میں کافی سال باقی ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب میں ”بہ خیریت“ اکیڈمی سے بارہویں کر کے پاس آؤٹ ہو جاؤں اور فوج میں بھرتی ہو جاؤں تب جب کہ میرا تو فی الحال واپس جانے کا ہی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم سب بہت دیر تک صدیوں سے بچھڑے دوستوں کی طرح جانے کون کون سی بھولی باتیں یاد کر کے ہنستے رہے۔ مغرب کا وقت سر پر تھا۔ اتنے میں میری نظر محلے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوتی ایک جانی پہچانی سی صورت پر پڑی۔ قریب آنے پر میں حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ ارے..... یہ تو اپنے طاہر بھائی تھے..... انہیں کیا ہو گیا تھا۔ چند مہینوں میں ہی وہ اتنے کم زور اور نڈھال سے کیوں دکھنے لگے تھے؟ انہوں نے مجھے دیکھا تو پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ارے..... آدی آیا ہے..... کیسے ہو میرے چھوٹے فوجی آفیسر؟“

”اچھا ہوں۔ آپ کیسے ہیں..... ڈو آئی کیسی ہیں.....؟“

میرے منہ سے اچانک ہی ڈو آئی کا نام نکل گیا اور پھر بعد میں طاہر بھائی کے چہرے پر چھایا سایہ دیکھ کر میں خود ہی پچھتاتے لگا۔ انہوں

نے مسکرا کر مجھ سے کہا کہ سب اچھے ہیں اور دھو آپی ہمیشہ مجھے بہت یاد کرتی ہیں۔ میں پہلی فرصت میں ان سے جا کر مل لوں۔ طاہر بھائی مجھے پیار کر کے آگے بڑھ گئے اور میں نے سوالیہ نظروں سے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے بتایا کہ طاہر بھائی کی شوخی اور مسکراہٹ تو اسی دن ان کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی جس دن انہیں پتہ چلا تھا کہ غیاث چچا نے وجوہ آپی کی کالج کی پڑھائی بند کروادی ہے۔ ”لیکن پھر بھی..... انہیں ہو کیا گیا ہے.....؟“ میں نے زور دے کر راجہ سے پوچھا۔

راجہ نے بتایا کہ اس دن وہ اور بالے فضل و بابا کے ساتھ مل کر دھو آپی کے کبوتروں کا ڈربہ رنگ کروا رہے تھے کہ شام چار بجے کے قریب طاہر بھائی یہ خبر سن کر کہ دھو آپی کا کالج ختم کروا دیا گیا ہے، غیاث چچا کے گھر کی جانب دوڑے چلے آئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ راجہ نے ہی قریب ہونے کی وجہ سے کھولا تھا۔ ابھی راجہ طاہر بھائی سے بات کر ہی رہا تھا کہ اس کے پیچھے پیچھے غیاث چچا بھی دروازے پر آ گئے۔ راجہ اندر چلا گیا اور ڈربے کے لیے مزید رنگ گھولنے لگا لیکن دروازے کی ادھ کھلی جھری سے اسے غیاث چچا اور طاہر بھائی کی باتوں کی آواز دھیمی سی سنائی دے رہی تھی۔ طاہر بھائی کو تبدیلی کا پہلا احساس تو اسی وقت ہو گیا تھا جب غیاث چچا نے حسب معمول انہیں گرم جوشی سے اندر مدعو کرنے کے بجائے وہیں گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنے کو ترجیح دی تھی۔ طاہر بھائی نے غیاث چچا سے پوچھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ یوں اچانک دھو آپی کا کالج جانا بند کروا دیا گیا؟

غیاث چچا ہمیشہ سے بہت صاف اور کھلی بات کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کو ایسے ہی سیدھی سیدھی باتوں کی زبانی ملنے والے پیغام کی ساری تفصیل بتادی کہ کس طرح انکو دھو آپی کو طاہر بھائی کے نام کے ساتھ جوڑ کر بدنام کرنے کے لیے سارے شہر میں افسانے جوڑتا پھر رہا ہے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ طاہر ایک بہت شریف اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے والا لڑکا ہے۔ انہیں اس بات کا بھی یقین ہے کہ انکو کی پھیلائی ہوئی بے سرو پا قسم کی بکواس کا حقیقت سے کہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ دھو آپی کے نام پر کوئی دھبہ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی ایک ہی ایک بیٹی تھی جس کے لیے انہوں نے جانے کتنے سنے دیکھ رکھے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ انکو جیسے کسی فضول غنڈے یا کسی بھی اور وجہ سے ان کے سنے تعبیر پانے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ ہو جائیں اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ فی الحال دھو کو کالج سے اٹھالیں۔

طاہر بھائی سر جھکا گئے غیاث چچا کی ساری بات سننے رہے اور آخر میں صرف اتنا ہی کہہ پائے کہ ”جیسی غیاث چچا کی منشاء..... کیونکہ یہ سب بھلا برا وہی بہتر جانتے اور سمجھتے ہیں۔“ طاہر بھائی واپس پلٹنے لگے تو غیاث چچا نے انہیں آواز دے کر روک لیا۔ طاہر بھائی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ غیاث چچا بھاری قدموں سے طاہر بھائی کے قریب پہنچے اور چند لمحے رک کر بولے۔

”طاہر میاں..... میں نے تمام باتیں اتنی تفصیل سے تمہیں اس لیے بتادی ہیں کہ تم میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ جاؤ اور اپنے دل پہ کوئی بوجھ لے کر واپس نہ جاؤ۔ تمہارے دھو پر ہی نہیں میرے پورے گھرانے پر بہت سے احسانات ہیں اور دھو اپنے تعلیمی میدان میں اتنی آگے تمہاری مدد کی بدولت ہی پہنچ پائی ہے لیکن میری تم سے اب یہی درخواست ہے کہ دھو کی آئندہ زندگی کی خاطر اس سے دوبارہ کبھی نہ ملنا۔ لوگوں کی زبانیں کوئی

نہیں روک سکتا لیکن تم اپنے قدم تو روک سکتے ہو۔ امید ہے تم ہمیشہ کی طرح اپنے غیاث چچا کی یہ درخواست بھی رو نہیں کرو گے.....“

غیاث چچا تو اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئے لیکن طاہر بھائی کے چہرے سے اڑتے رنگ شاید انہیں نظر نہیں آئے لیکن راجہ دروازے کی جھری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ طاہر بھائی نے جلدی سے اپنے اندر چلنے والے طوفانوں پر پردہ ڈال کر غیاث چچا سے وعدہ کیا کہ وجوہ کی عزت انہیں غیاث چچا کی طرح ہی عزیز ہے اور یہ کہ غیاث چچا اس بات کا اطمینان رکھیں کہ طاہر بھائی کی وجہ سے کبھی وجوہ کی جانب کوئی گندی انگلی اٹھانے کی وجہ تلاش نہیں کر پائے گا۔ طاہر بھائی غیاث چچا سے رخصت ہو کر اس دن دروازے سے ایسے پلٹے کہ پھر اس کے بعد آج تک ان کے قدم غلطی سے بھی اس در کی جانب نہیں اٹھے لیکن راجہ کے بقول غیاث چچا اور طاہر بھائی دونوں ہی اس بات سے بے خبر تھے کہ وجوہ آپنی جو اس وقت چھت پر اپنے کمبوتروں کو داند ڈال رہی تھیں انہوں نے غیاث چچا اور طاہر بھائی کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ راجہ نے اپنی آنکھوں سے ان کا پلو لہراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس بات کو تو اب تین ماہ سے بھی زیادہ ہونے کو آئے تھے لیکن اس عرصے میں نہ تو کبھی وجوہ آپنی گھر سے باہر نکلیں نہ ہی طاہر بھائی کو کسی نے بلا ضرورت محلے میں پھرتے دیکھا تھا۔ ان کا ہاؤس جاب شروع ہو چکا تھا اور وہ صبح اپنی ڈوٹوٹی پر جاتے اور رات گئے واپس لوٹا کرتے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً اُٹو کے لیے سوال کلبلا یا لیکن میرے پوچھنے سے پہلے ہی بالے نے بتایا کہ اُٹو کو تو پولیس نے اس کی ایس ایچ او سے مڈ بھیڑ کے تیسرے دن ہی گرفتار کر لیا تھا کیونکہ اُٹو نے کسی فرنیچر کے شوروم کے گلے سے پیسے چرائے تھے۔ مالک دوکان نے چند دن پہلے ہی اُٹو کو مز دوری پر رکھا تھا اور اُٹو نے موقع ملتے ہی شوروم کی تجوری سے پانچ ہزار کے بڑے نوٹ اڑا لیے۔ وہ شہر چھوڑنے کے لیے ٹرین پکڑنے ہی والا تھا کہ ملک ریشم کے اہنی پنچے کی گرفت میں آ گیا۔ اُٹو ابھی تک جیل میں ہی تھا اور عدالت کی پیشیاں بھگتا رہا تھا۔

ابھی ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ فضلہ بابا مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ گئے کہ ”چلو میاں، وجوہ کی ناراض ہو رہی ہیں کہ آدمی اب تک ان سے ملنے کے لیے کیوں نہیں آیا.....“

جانے کیوں میرا دل وجوہ آپنی کے نام سے ہی بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے ان سب سے رات کے کھانے کے بعد پان والے کے کیمین کے سامنے ملنے کے لیے کہا اور خود فضلہ بابا کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وجوہ آپنی صحن میں ہی اپنے پھول پودوں کو پانی دے رہی تھیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ صحن میں قدم رکھا تو وہ پانی کا فوارہ پھینک کر جلدی سے میری جانب دوڑی آئیں۔ ان کے لہجے میں اب بھی وہی کھنک تھی جو میرے آس پاس کے تمام شور کو میری سماعت سے مٹا دیتی تھی۔

”ارے آدمی..... کہاں ہو بھئی..... کتنی بری بات ہے نا..... دوپہر سے آئے ہوئے ہو اور اپنی وجوہ آپنی کے پاس آنے کی اب فرصت ملی ہے تمہیں۔“

میں سر جھکائے ان کے سارے شکوے سنتا رہا۔ جانے کیوں ان کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں جٹا پارہا تھا میں۔ وہ میرا ہاتھ تھام کے اندر کمرے میں لے گئیں جہاں غیاث چچا اور سیکرٹہ خالہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ غیاث چچا نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور سیکرٹہ خالہ نے ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ غیاث چچا نے اسی دن میرے آرمی کٹ بال دیکھ کر میرا نام ”سولجر“ رکھ چھوڑا۔ وجوہ آپنی نے کچھ ہی دیر میں میرے سامنے میری پسند کی

کھانے کی چیزوں کے انبار لگا دیا۔ میں چور نظروں سے غیث چچا کو اکیڈمی کے بارے میں بتاتے ہوئے و جو آپنی کو یہ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان کے گلابی رنگ میں ہلکی سی پیلاہٹ کی آمیزش مجھے دور ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ غیث چچا کافی دیر میرے ساتھ بیٹھنے کے بعد کسی کام سے باہر نکل گئے اور سیکڑے خالہ بھی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں تو و جو آپنی نے وہ شکوہ کرنی ڈالا جس سے میں اب تک اپنا آپ پڑا رہا تھا۔

”اچھا آدمی صاحب..... اب آپ یہ بتائیں کہ جاتے ہوئے مجھ سے مل کر کیوں نہیں گئے تھے..... تمہیں پتہ ہے کتنا روٹی تھی میں اس دن پلیٹ فارم پر وہیں بیٹھ کر.....“

میں چپ رہا پھر انہوں نے اپنی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھائی اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر میری نظروں کے سامنے لہرائی۔ میں زور سے چونک گیا۔ یہ تو وہی کارڈ تھا جو اس شام میں کیڈٹ کالج جانے سے پہلے و جو آپنی کو دینے کے لیے ان کے گھر آیا تھا لیکن یہ کارڈ..... یہ تو.....

پھر و جو آپنی نے خود میری الجھن دور کر دی کہ انہیں تیسرے دن سیزھیوں کے نیچے صفائی کے دوران یہ کارڈ پڑا ملا تھا۔ مطلب اس دن جب میں روتے ہوئے سیزھیوں اتر کر بھاگا تھا تو میرے ہاتھوں سے یہ کارڈ وہیں کہیں سیزھیوں کے نیچے گر گیا تھا۔ و جو آپنی نے مجھے بتایا کہ وہ یہ کارڈ دیکھ کر بہت حیران ہوئیں تھیں کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ میں اس دن ان سے ملنے کے لیے آیا تھا تو پھر ملے بنا ہی کیوں واپس چلا گیا تھا؟ میں نے و جو آپنی کو مزید اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور انہیں بتا دیا کہ میں آیا تو تھا لیکن جب میں نے طاہر بھائی کو بھی چھت پر دیکھا تو میں کارڈ وہیں رکھ کر واپس چلا آیا تھا۔ طاہر بھائی کے نام پر و جو آپنی کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے اور میں نے فوراً ہی ان کی آنکھوں میں نمی کی ایک ہلکی سی چمک دیکھی جسے و جو آپنی نے دوسرے ہی لمحے بڑی خوب صورتی سے چہرہ دوسری جانب کر کے چھپا لیا پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ کچھ سمجھ گئی تھیں کہ میں شاید طاہر بھائی کی وجہ سے ہی چھت پر نہیں آیا لیکن وہ پھر بھی مجھ سے ناراض تھیں کہ طاہر بھائی تھے تو بھی کیا تھا۔ مجھے ان سے مل کر جانا چاہیے تھا پھر انہوں نے خود ہی مجھے بتایا کہ طاہر بھائی اب یہاں نہیں آتے کیوں کہ انکو کی وجہ سے غیث چچا نے ان کا کالج جانا بند کر دیا ہے لہذا اب طاہر بھائی کے یہاں آنے کا بھی کوئی جواز نہیں ہے۔ تب ہی بے اختیار ان سے ایک عجیب سا سوال پوچھ بیٹھا۔

”تو کیا آپ اسی وجہ سے اتنی اداس ہیں کیونکہ اب طاہر بھائی یہاں نہیں آتے.....؟“

و جو آپنی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر شاید انہیں میرے چہرے پر وہ جواب بھی نظر آ گیا جسے سن کر میں خوش ہو سکتا تھا وہ دھیرے سے ہنس دیں اور حسب معمول انہوں نے میری ناک دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں اس لیے اداس تھی کہ میرا پیارا دوست آدمی جو یہاں نہیں تھا اب تم آ گئے ہو نا..... تو دیکھو کیسے کھلکھلا کر ہنس رہی ہوں.....“

اور پھر واقعی ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اس شام تو و جو آپنی نے ہنس کر بات نال دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان کی اداسی کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے رجبہ کے ساتھ آج تک جتنی فلمیں بھی چھپ کر دیکھی تھیں ان سب میں ہیر و ہیر وئن ”محبت“ نامی چیز کے ہوتے ہی اچانک ہر طرف سے دکھوں، پریشانیوں اور مختلف قسم

کی مصیبتوں میں گھر جاتے تھے۔ دوست دشمن بن جاتے تھے اور وہ باقی فلم میں پھر اسی طرح اداس رہتے تھے جیسے اس شام میں نے طاہر بھائی اور ورجو آپی کو دیکھا تھا۔ تو کیا ان دونوں پر بھی اسی ”محبت“ نامی بلا کا سایہ آن پڑا تھا.....؟ اور اگر یہ محبت ہی تھی تو پھر اس عذاب میں اپنی جان پھنسانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھے یوں لگا جیسے محبت کسی بہت بڑی سی ایک جو تک کا نام ہوگا جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہوگی۔ اس کے پیاسے ہونٹ اس وقت تک ان معصوم انسانوں کی شرگ سے پیوست رہتے ہوں گے جب تک ان کے جسم کا آخری قطرہ بھی نہ نکل جاتا ہو تبھی تو وہ آپی اور طاہر بھائی کے چہرے اتنے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ محبت کی جو تک دھیرے دھیرے ان کا خون چوس رہی تھی اور وہ دونوں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔

یتنی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آتی تھی۔ ایک **یتنی (برفانی انسان)** کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے ایکشن ایڈیٹر ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

دوسری فصل

اکثر خواب سچے ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو نیند میں اس کی بھولے ہوئے ماضی بلکہ مستقبل کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ خواب میں وہ ماضی میں گم شدہ اپنی شخصیت کی شناخت بھی کر سکتا ہے۔ قدرت کبھی کبھی انسان کو ایسے موقع فراہم کرتی ہے۔ علیم الحق حقی نے ایک بار پھر ایک نہایت منفرد موضوع پر قلم اٹھایا اور تخلیق پائی یہ کہانی..... دوسری فصل، جسکی بنیاد ہندوؤں کے عقیدہ آواگون (دوسرا جنم) پر رکھی گئی ہے۔ ناول دوسری فصل کو ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلی قیامت

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

میری چھٹیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ ہم سب کا پسندیدہ مشغلہ سارا دن آوارہ گردی اور شرارتیں کرنا تھا۔ ایسے میں محلے کی مخصوص فضا میں تھوڑی بہت تبدیلی اس وقت پیدا ہوتی جب محلے میں کوئی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی۔ اس شام بھی غفور چچا کی منجھلی بیٹی شنو کی منگنی کی تقریب تھی اور غفور چچا خود جا کر اور بہت اصرار کے ساتھ سکی نہ خالہ اور جو آپنی کوڈھولک کی تقریب میں اپنے ساتھ لے کر آئے تھے وہ نہ جو آپنی نے تو بالکل ہی گھر سے نکلتا چھوڑ دیا تھا۔ جو آپنی تو آج بھی گھر میں ہی چھپی بیٹھی رہتیں اگر غیاث چچا خود ان کے کمرے میں جا کر ان سے تیار ہونے کا نہ کہتے۔ غفور چچا محلے کے سبھی دکھ درد میں ہمیشہ سب سے آگے ہوتے تھے پھر ایسے خوشی کے موقع پر انہیں نہ کہنا غیاث چچا کو بالکل بھلا نہ لگا اور یوں سکی نہ خالہ کے ساتھ مہینوں بعد جو آپنی بھی گھر سے نکل آئیں۔

اب یہ ان دونوں کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی..... لیکن سب سے پہلی ملاقات ہی لڑکے والوں کے استقبال کے لیے دروازے پر وہاں کھڑے، اجڑے اجڑے سے طاہر بھائی سے ہو گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سکی نہ خالہ کو آداب کہا سکی نہ خالہ نے حسب معمول ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔ جو آپنی سکڑی سکڑی سی سکی نہ خالہ کے پیچھے کھڑی تھیں۔ طاہر بھائی نے اخلاقا ان سے بھی ان کا حال پوچھا۔ میں اور راجہ اس وقت شنو کے دیئے ہوئے موہیے کے گجرے پانی کی پراتوں میں ڈالنے کے لیے دروازے سے نکل ہی رہے تھے۔ طاہر بھائی کے حال پوچھنے پر جو آپنی نے اپنی زخمی نگاہیں اٹھائیں۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی دو لوگوں کی نظر ملتے ہی چنگاریاں سی اڑتی محسوس کی تھیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان چنگاریوں کو شاید میرے، طاہر بھائی اور جو آپنی کے علاوہ اور کوئی نہیں دیکھ پایا۔ چند لمحوں کے لیے میرے قدم وہیں زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ یا خدا یہ کیا ماجرا تھا۔ آس پاس پھرتے یہ سبھی لوگ اس آگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اگر انہیں یہ سب کچھ نظر نہیں آ رہا تو پھر ان دونوں کے درمیان اس سلگتی تپش کا صرف مجھے کیوں احساس ہو رہا تھا.....؟

دوسرے ہی لمحے راجہ نے میرا ہاتھ کھینچا اور مجھے وہاں سے دور لے گیا لیکن ساری تقریب میں میرا دھیان انہی دونوں کی جانب ہی رہا۔ طاہر بھائی کو غفور چچا نے کچھ ایسے کام سونپ رکھے تھے کہ انہیں بار بار زنانے کی طرف آنا جانا پڑتا تھا اور جتنی بار بھی وہ اس جانب گئے ان کی نظر، آنکھیں جھکائے بیٹھی جو آپنی پر ضرور پڑ جاتی تھی۔ اس شام جو آپنی کا روپ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ اس پر کسی کی بھی نظر ٹھہر سکتی تھی۔ وہ کالے دوپٹے اور کالے سفید کس رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس تھیں۔ لڑکے والوں نے آنے میں بہت دیر کر دی تھی لیکن جب وہ لوگ آ گئے تو ان کی ہر عورت ایک دوسرے سے جو آپنی کے بارے میں پوچھتی رہی کہ یہ پری کون ہے۔ لڑکے والوں کے ساتھ مہندی لے کر آئے لڑکے بھی کسی نہ کسی بہانے جو آپنی کی

ایک جھلک دیکھنے کے لیے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ہم سب ہی دوست تقریب میں ادھر سے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ صرف بالائی نہیں تھا جو گزشتہ شام اپنی اماں کے ساتھ اپنی خالہ کی طرف رات رہنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ کاش اس روز بالائی اپنی خالہ کے گھر نہ جاتا تو ہمیں یہ پتہ چل جاتا کہ انگو گزشتہ رات ہی جیل سے چھوٹ کر گھر آچکا ہے۔ بالے کے ابا سرکاری دورے پر افسروں کے ساتھ تین دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ورنہ وہ کبھی انگو کو گھر میں قدم نہ دھرنے دیتے۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے، لہذا بالے کی اماں کا دل بھی انگو کی برباد حالت، بڑھی ہوئی شیو اور میلے کپڑے دیکھ کر پینج گیا اور انہوں نے انگو کو گھر میں بلا لیا۔ اکوکل سے اپنے گھر میں ہی پڑا تھا اور ہم سب دوست اس آفت ناگہانی سے بے خبر تھے۔ رات کے جانے کس پہر ڈھول ڈھما کے اور موسیقی کی آواز سن کر انگو بھی گھر سے باہر نکل آیا اور اس نے دور سے ہی کھڑے کھڑے غفور چچا کے گھر کی تقریب کا جائزہ لیا۔ تبھی شاید اس کی نظر بار بار گھر کے اندر جاتے طاہر بھائی پر بھی پڑ گئی ہوگی۔ میں اندھیرے میں ٹھیک طرح سے پہچان تو نہیں سکا لیکن میں نے خود اپنی آنکھوں سے بالے کی چھت پر کسی کو تیزی سے منڈیر کی طرف آتے اور پھر غفور چچا کے صحن کی جانب جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ بالے کے ابا ہیں جو چھت پر کھڑے منگنی کی تقریب کا نظارہ کر رہے ہیں لیکن مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ انگو ہے۔ کاش..... کاش مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتا کہ وہ انگو تھا جو اپنی چھت پر کھڑا اندر اس وقت صحن میں بیٹھی و جواپی پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور بار بار صحن میں آتے جاتے طاہر بھائی کو دیکھ کر اس کے اندر کا خون جانے کتنے ابال کھا رہا تھا۔

تقریب ختم ہوتے ہوتے بہت دیر ہو گئی، سیکنہ خالہ اور جواپی غفور چچا سے اجازت لے کر گھر لوٹے لگیں تو غفور چچا نے انہیں پیش کش کی کہ رات کافی بیت چکی ہے، وہ کہیں تو غفور چچا خود انہیں گھر کے دروازے تک چھوڑ آئیں لیکن سیکنہ خالہ نے انہیں روک دیا کہ اپنا محلہ ہی تو ہے اور پھر انہیں کون سا سات کوں پار جانا ہے۔ بس یہی دو گئیں تو پار کرنی ہیں لہذا وہ دونوں خود ہی چلی جائیں گی لیکن غفور چچا نے باہر کھڑے نوجوانوں کو آواز دی کہ ان میں سے کوئی بھی سیکنہ خالہ کو گھر تک چھوڑ آئے۔ طاہر بھائی دانستہ پیچھے ہٹ گئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کا جانا قطعی مناسب نہیں ہوگا میں اور راجہ بھی دور کھڑے بچی کچھی شُرشُریوں کے فیتے کو آگ دکھا رہے تھے ورنہ ہم میں سے ہی کوئی ان کے ساتھ چلا جاتا لہذا سامنے کھڑے مولوی سعید کے بڑے بیٹے کمال نے ہامی بھری۔ کمال بڑے بھیا کا کلاس فیلو تھا اور اس نے بھی ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بھیا کے ساتھ ہی میٹرک پاس کیا تھا لہذا اس کا شمار محلے کے نوجوانوں میں کیا جاسکتا تھا۔ کمال جواپی اور سیکنہ خالہ کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔ باقی سب لوگ بھی غفور چچا سے رخصت ہو کر پہلے ہی اپنے گھروں کو پلٹ چکے تھے۔ میں اور راجہ بھی آخری فیتے کو آگ دکھا کر پلٹے اور پھر اچانک ہی فضا میں ایک دلخراش چیخ گونجی۔ میں لاکھوں آوازوں میں یہ آواز پہچان سکتا تھا۔ یہ جواپی کی آواز تھی لیکن میرے علاوہ وہاں ایک شخص اور بھی تھا جس کی نبض اسی آواز کی لے پر دھڑکتی تھی..... ہاں..... طاہر بھائی..... جیسے ہی چیخ کی آواز گونجی طاہر بھائی نے سرا سیمہ ہو کر سر اٹھایا اور پھر مجھ سے اور راجہ سے بھی پہلے اس طرف دوڑ پڑے جہاں سے آواز آئی تھی۔ دوسرے نمبر پر میں اور راجہ بھاگے لیکن ہم ایک تو پہلے ہی ان سے بہت پیچھے کھڑے تھے اور پھر طاہر بھائی کی رفتار بھی ہم سے سو گنا زیادہ تھی لہذا وہ چند ہی لمحوں میں اندھیرے میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور پھر ہم ابھی آدھے راستے میں ہی تھے کہ جواپی اور سیکنہ خالہ کی ہدایاتی چیخوں نے آسمان سر پراٹھا لیا۔ محلے کے ہر گھر کا دروازہ کھلا اور کوئی نہ کوئی اس میں سے نکل کر چیخوں کی آواز کی جانب دوڑا لیکن

سب سے پہلے میں اور راجہ اس گلی کے ککڑ پر پہنچے جہاں طاہر بھائی سینے سے اچلتے خون کے فوارے کو ہاتھوں سے دبا کر روکنے کی کوشش میں اوندھے منہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پہلی جھلک میں ہی دھواں کو آخری چیخ مارتے اور پھر چکر کر بے ہوش ہو کر گرتے دیکھا۔ سیکینہ خالہ ابھی تک ہدیانہ انداز میں چیخ رہی تھیں اور لوگوں کو بلارہی تھیں تاکہ کوئی آگے بڑھ کر طاہر بھائی کی مدد کرے۔ چند ہی لمحوں میں یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں اور راجہ سخت سراسیمہ ہو گئے اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی آس پاس قریب کے مکانوں سے قدوسی صاحب، شا کر پچا اور جانے کتنے اور لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ چند ہی لمحوں میں طاہر بھائی کو مہندی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئی اس آخری گاڑی میں ڈال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا جو چند لمحوں کی مزید تاخیر کی صورت میں محلے کے پھانک کو کراس کر گئی ہوگی۔ دھواں کو بھی محلے کی عورتوں کی مدد سے اسی بے ہوشی کے عالم میں ان کے گھر پہنچا دیا گیا۔ جب میں اور راجہ وہاں بھاگتے ہوئے پہنچے تھے تو ہمیں کمال بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لوگ ہانپتے کانپتے کمال کو بھی نہ جانے کس گلی سے اٹھالائے۔ تب اس پھیلی کی پہلی گرہ کھلی کہ کمال سیکینہ خالہ اور دھواں کو لیے ہوئے جیسے ہی بڑے میدان کو نکلتی گلی کے ککڑ تک پہنچا تو اچانک ہی کسی نقاب پوش نے گلی کے کونے سے نکل کر دھواں کو ہاتھ اس تیزی سے جھپٹ کر پکڑا کہ بے اختیار خوف کے مارے دھواں کو اپنے منہ سے چیخ نکل گئی کیونکہ نقاب پوش نے انہیں باقاعدہ کھینچ کر اندھیرے میں غائب ہونے کی کوشش کی تھی۔ کمال گھبرا کر پلٹا اور اس نے چلا کر نقاب پوش کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس نقاب پوش میں کچھ ایسی بجلی بھری تھی کہ اس نے دوسرے ہی لمحے کمال کا سر پکڑ کر اس زور سے دیوار میں مارا کہ چند لمحوں کے لیے تو کمال زمین پر پڑا ہی رہ گیا اور جب اس کے حواس سنبھلے تو اس نے اسی شخص کا ہیولہ اندھیری گلی کے کونے پر غائب ہوتے دیکھا، دوسری نظر اس کی زمین پر پڑے تڑپتے طاہر بھائی پر پڑی اور وہ بدحواس ہو کر چلاتے ہوئے اس نقاب پوش کے پیچھے بھاگا جس کا نقاب اسی گلی کے کونے پر پڑا رہ گیا تھا۔ کمال نے لاکھ کوشش کی لیکن سر کی چوٹ کی وجہ سے وہ پہلے ہی چکرار ہاتھ لہذا چند ہی لمحوں میں حملہ آور کسی پھلاوے کی طرح محلے کی اندھیری گلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

درمیان کی کہانی سیکینہ خالہ نے یوں بتائی کہ جیسے ہی نقاب پوش نے دھواں کو اپنی جانب کھینچا تو دھواں کو اپنے اس زور سے سیکینہ خالہ سے ٹکرائیں کہ خالہ کی نظر کا چشمہ زمین پر گر کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ دھندلی نظر سے انہیں رات کے اندھیرے میں بس اتنا ہی نظر آیا کہ دھواں کو کوئی اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کر رہا ہے اور پہلے تو کمال اس سے بھڑ گیا ہے لیکن پھر انہوں نے کمال کو چلا کر زمین پر گرتے دیکھا۔ اس اثنا میں حملہ آور کی دھواں کو کے ساتھ کھینچا تانی جاری تھی اور دھواں کو زور زور سے چلا رہی تھیں۔ حملہ آور نے سیکینہ خالہ کو بھی زور سے دھکا دیا اور وہ دھواں کو پر قابو پانے میں تقریباً کامیاب ہوئی چکا تھا کہ دور سے طاہر بھائی لاکارتے اور چلاتے ہوئے دوڑتے نظر آئے۔ انہوں نے آتے ہی حملہ آور نقاب پوش پر دھاوا بول دیا۔ شاید انہی کے ساتھ دھینکا مشتی میں حملہ آور کا نقاب اس کے چہرے سے کھل کر گر گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا میں کوئی دھار پل بھر کوچکی اور اگلے ہی سیکنڈ طاہر بھائی سینہ تھا سے زمین پر گر کر تڑپتے نظر آئے۔ خنجر عین ان کے سینے میں دسے تک گڑ چکا تھا اور دھواں کو کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ اتنی دیر میں آس پاس کے لوگوں کے بیدار ہونے کے شور اور شاید پہچان لیے جانے کے خوف نے حملہ آور کو دھواں کو ہاتھ چھوڑ کر اندھیرے میں فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے کمال کو بھی ہوش آ گیا اور وہ بھاگتے ہوئے حملہ آور کے تعاقب میں سرپٹ دوڑ پڑا لیکن اسے پکڑنے میں کامیابی حاصل نہ کر

سکا۔ چند ہی لمحوں میں ہمارا وہ محلہ جہاں کچھ دیر پہلے خوشی کے شادیاں بچ رہے تھے اب وہاں چاروں جانب سوگ نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ سبھی کے ذہنوں میں بس ایک ہی سوال ڈنک مار رہا تھا کہ آخر ایسی گھٹاؤنی واردات کا ارتکاب کرنے والا کون ہو سکتا ہے اور واردات بھی کیسی.....؟ چاقو گھونپنے کی.....؟ اور وہ بھی ہمارے محلے میں.....؟ جہاں گزشتہ تیس پینتیس سالوں سے سبھی محلے دار ایک جڑے ہوئے گھرانے کی طرح رہ رہے تھے۔ جہاں آپس میں اس قدر لگاؤ اور اپنائیت تھا کہ ہم بچے رات پڑنے پر کسی بھی آنگن میں پڑ کر سو جاتے تھے اور ہمارے ماں باپ کو ذرہ برابر بھی اس بات کی فکر نہیں ہوتی تھی کہ ان کے بچے سارا دن اور ساری رات کس گھر کے صحن میں دھماچوکڑی مچاتے رہے ہیں.....

ڈاکٹروں نے طاہر بھائی کو فوراً آپریشن تھیٹر میں منتقل کروادیا۔ یہاں وہ جو آپنی ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ بڑی لیڈی ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا کہ انہیں خوف اور دہشت کے مارے شدید صدمہ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ شاک میں چلی گئی ہیں۔ طاہر بھائی کے گھائل ہونے کی خبر ان کے ڈاکٹر دوستوں اور باقی ہسپتال کے عملے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سینئر اور جونیئر ڈاکٹروں اور میڈیکل کالج کے طالب علموں کا جھوم پورے ہسپتال میں جمع ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کی جیپ بھی محلے میں تفتیش کے لیے پہنچ گئی اور انہوں نے سب سے پہلے کمال کا بیان لیا۔ ملک ریشم ایس ایچ اونی معمول کی کارروائی اور روزنامہ تیار کروایا۔ اسی اثنا میں صبح کی اذانیں بھی شروع ہو گئیں۔ وہاں آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے اور یہاں پورا محلہ ان کی جان کی سلامتی مانگنے کے لیے سجدے میں پڑا ہوا تھا لیکن شاید کچھ سجدے ہمیشہ رائیگاں ہی جاتے ہیں۔ یہاں وہ جو آپنی نے پوری رات کی بے ہوشی کے بعد چند لمحوں کے لیے پلکیں کھولیں اور وہاں طاہر بھائی نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ ہم سب کو یہ خبر سن کر جیسے سکتے سا ہو گیا۔ طاہر بھائی کی اماں، خالہ عزیزہ یہ سنتے ہی آپریشن تھیٹر کے باہر یوں گریں کہ الٹا انہیں دل کے دورے سے بچانے کے لالے پڑ گئے۔ طاہر بھائی کے ابا، چچا شکور نے وہیں اپنا سر دیوار میں دے مارا۔ پورے ہسپتال پر چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا جیسے سبھی کی روح چند لمحوں کے لیے قبض ہو گئی ہو۔ محلے کی مسجد سے اعلان نشر ہوا۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون.....“ اور پھر چند لمحوں بعد ہی ہسپتال عملے اور ڈاکٹروں کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کچھ ہی دیر میں سارے شہر کے ڈاکٹر ہسپتال کے سامنے والی بڑی سڑک پر جمع ہو چکے تھے اور ان کے نعروں سے پورا شہر گونج رہا تھا۔ وہ سب قاتل کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کر رہے تھے ورنہ اڑتالیس گھنٹے بعد انہوں نے شہر کے ہر ہسپتال میں ہڑتال کرنے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ محلے داروں کو سمجھ نہیں آ رہا کہ وہ طاہر بھائی کا ماتم کریں، خالہ عزیزہ کی دل کے وارڈ میں دیکھ بھال کریں یا پھر شکور چچا کو قابو میں رکھیں جو پہلے ہی دیواروں سے سر ٹکرا کر لہو لہان ہو چکے تھے۔ غیاث چچا بھی ایک جانب یوں گم سم سے بیٹھے تھے جیسے ان کی قوت گویائی عرصہ قبل چھن چکی ہو۔ اب یہ ایک باقاعدہ قتل کا کیس تھا جس کی شنوائی کے لیے ان کی لاڈلی بیٹی اور رفیق حیات کی گواہی اور بیان بھی لازمی بنتا تھا کیونکہ کمال کے بیان کے مطابق اس نے قاتل کو پہلے نقاب میں اور پھر بھاگتے ہوئے پشت کی جانب سے دیکھا تھا۔ سیکنہ خالہ کا بیان ہو بھی جاتا، تب بھی ان کی گواہی کافی نہ ہوتی کیونکہ وہ بھی قاتل کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ پائی تھیں۔ سواب لے دے کر آخر میں دھواں آپنی ہی بچتی تھیں جن کی گواہی پر سارا دار و مدار تھا۔

لیکن اس سے پہلے ابھی اور بہت سے عذاب ہم سب کو اپنی جان پر جھیلنے تھے۔ طاہر بھائی کی میت محلے میں پہنچا دی گئی تھی۔ ان کے ماں

باپ میں سے کوئی بھی اس وقت اس قابل نہیں تھا کہ وہ ان کے کفن و دفن کے انتظامات کروا سکتا، آس پاس کے قریبی رشتہ داروں اور خالو خالوں نے یہ فریضہ سنبھال لیا۔ شام تک قبر کشائی کے علاوہ دیگر انتظامات بھی مکمل ہو چکے تھے لیکن اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جب تک ماں باپ طاہر بھائی کا آخری دیدار نہ کر لیں انہیں منوں مٹی تلے کیسے دفن کیا جائے؟

پھر اچانک ہی خبر ملی کہ طاہر بھائی کی اماں نے بے ہوشی سے آنکھیں کھول دی ہیں، جانے یہ ماں کی ماما کے کرشماتی سحر کا اثر تھا یا کچھ اور جس نے اس بے ہوشی میں بھی انہیں یہ احساس دلادیا کہ ان کا لاڈلا بیٹا ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے کے انتظار میں ان کے صحن میں سفید لباس میں لپٹا پڑا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہسپتال کی ہی گاڑی میں شکور چچا، عزیزہ خالہ کو لیے کالونی میں داخل ہوئے۔ دونوں بدنصیبوں نے آخری بار بیٹے کے ماتھے پر الوداعی بوسہ دیا اور طاہر بھائی کا کارواں انہیں اپنے کندھوں پر اٹھائے چل پڑا۔ میرے ہوش و حواس میں آنے کے بعد ہمارے محلے میں یہ کسی کی پہلی موت تھی اور ہم سب دوستوں نے اس موت کو پل پل خود پر اترتے محسوس کیا تھا۔ اس دن مجھے یہ پتہ چلا کہ سوسال کی خوشی پر ایک دن کا غم زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ شاید ہم انسانوں کے خمیر میں ہی غم کی مٹی شامل ہوتی ہے تبھی غم پلٹ پلٹ کر ہمارے پاس آتا ہے۔ طاہر بھائی کی موت والے دن سے ہی میری غم سے دوستی ہو گئی تھی۔ خوشی مجھے بے چین کر دیتی تھی جبکہ غم میں مجھے سکون کا احساس ہوتا تھا۔

لوگ جب طاہر بھائی کو دفن کروا پس لوئے ٹو رات بیت چکی تھی۔ پورے محلے کے کسی بھی گھر میں چولہا نہیں جلاتا تھا پھر سب سے پہلے غفور چچا کو ہی حسب معمول دنیا داری کی رسم یاد آئی اور رات گئے نہ جانے کہاں سے وہ نمکین اور بیٹھے چاولوں کی چند دیکیں اٹھالائے لیکن اس وقت کسی کو کچھ کھانے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ غفور چچا کے بے حد اصرار پر بمشکل سبھی نے ایک آدھ نوالہ لیا اور ساری دیکیں یتیم خانے کو بھیج دی گئیں۔ ڈوآ آپنی ابھی تک مکمل ہوش میں نہیں آئی تھیں۔ ملک ریشم دو مرتبہ غیاث چچا کے گھر کا چکر لگا چکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا معاملہ سنگین ہوتا جا رہا تھا کیونکہ صبح کے اخبارات اس واردات کی خبروں سے بھرے پڑے تھے اور ہر خبر میں ڈاکٹروں کے الٹی میٹم کا ذکر تھا جو انہوں نے ہسپتال کے لیے دے رکھا تھا۔ معاملہ حکومت کے بڑوں تک پہنچ گیا تھا اور پولیس کے اعلیٰ حکام کو خصوصی طور پر جلدی اور نہایت احتیاط سے تفتیش مکمل کرنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ ایس ایچ او کی پریشانی کی وجہ بھی یہی تھی کہ گھوم پھر کر سارا دباؤ اس کے اوپر آ رہا تھا کیونکہ علاقہ براہ راست اس کے زیر انتظام تھا اور وہی تفتیشی افسر بھی تھا لیکن ظاہر ہے جب تک ڈوآ آپنی کو مکمل ہوش نہیں آ جاتا تب تک علاقہ ایس ایچ او بھی مکمل بے بس تھا۔

غیاث چچا مسلسل کل رات سے ڈوآ آپنی کے سر ہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اور کسی کو بھی ڈوآ کے کمرے میں آنے سے منع کر رکھا تھا اور بھیڑ بھاڑ کو بھی ان کے کمرے سے بہت دور روک رکھا تھا۔ اسی لیے جب ڈوآ آپنی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول کر دوسری مرتبہ ہوش و حواس کا دامن تھا تو صرف وہاں غیاث چچا ہی تھے جن کو یہ خبر تھی کہ ڈوآ آپنی مکمل ہوش میں آ چکی ہیں۔ انہوں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور خوف سے آنکھیں پٹ پٹاتی ڈوآ کو پانی کا گلاس تھا کر تسلی دی کہ وہ محفوظ ہیں اور اپنے ہی گھر میں ہیں۔

ڈوآ آپنی نے ایک ہی سانس میں سارا پانی حلق سے نیچے اتار لیا اور گھبرا کر غیاث چچا کی جانب دیکھا اور ایک دم اٹھ بیٹھیں۔

”ابا..... وہ طاہر بھائی..... وہ..... وہ ٹھیک تو ہیں نا.....“

غیاث چچا نے دھیرے سے انہیں بتایا۔

”اس کی حالت کچھ ٹھیک نہیں ہے..... ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں تم مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا تھا.....؟“

دو آپی نے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دو آنسو ان کی بچھنی ہوئی آنکھوں سے نکل کر ٹپک گئے۔ انہوں نے زیر لب ہی کوئی دعا پڑھی لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ وہ جس کے لیے یہ دعا پڑھ رہی ہیں انہیں اب زندگی دینے والی کسی دعا کی ضرورت نہیں رہی۔ غیاث چچا غور سے دو آپی کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے گزر جانے کی اطلاع دو آپی کو اسی لیے ایک دم سے نہیں سنائی تھی کیونکہ اس طرح سے دو آپی کی حالت دوبارہ بگڑ جانے کا خدشہ تھا۔ دو آپی کو اپنا آپ سمیٹنے میں بہت دیر لگی۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے غیاث چچا کو اس منحوس رات میں ہوئی اس گھناؤنی واردات کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کس طرح کمال انہیں لیے ان کے آگے آگے چل رہا تھا کہ اچانک گلی کے ٹکڑے سے ایک نقاب پوش کوڈ کران کے سامنے آ گیا اور اتے ہی اس نے دو آپی کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ کمال تو بچہ ہی تھا ابھی، اس نے روکنے کی کوشش کی تو ایک ہی وار میں نقاب پوش نے اس کا سر دیوار میں دے مارا اور اسی اثناء میں طاہر بھائی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی نقاب پوش ایک دم ہی بچھ گیا اور وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دفعۃً چھینا جھپٹی میں نقاب پوش کے چہرے سے نقاب اتر گیا۔ پہچان لیے جانے کے خوف اور طیش نے حملہ آور کو دیوانہ کر دیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے نیٹے سے اپنا چمکدار دھار والا چاقو نکالا اور طاہر بھائی کے سینے میں گھونپ دیا اور اپنا آپ چھڑا کر وہاں سے بھاگ گیا.....

دو آپی اتنا ساسی سنانے کے بعد یوں ہانپنے لگی تھیں جیسے جانے کتنے میل کا فاصلہ بھاگ کر طے کر کے آئی تھیں۔

غیاث چچا کی آواز بھی بیٹھنے لگی تھی۔ انہوں نے دو آپی سے یوں پوچھا جیسے انہیں اپنے سوال کا جواب پہلے ہی معلوم ہو۔

”کون تھا وہ نقاب پوش.....؟“

دو آپی کے منہ سے سسکتی ہوئی آواز نکلی۔

”اٹو.....“

اور غیاث چچا نے یوں سر تھام لیا جیسے ڈوبے کا آخری سہارا اتنا بھی اس کی نظروں کے سامنے بہہ جائے۔ ساری صورت حال سمجھ لینے کے باوجود ان کے دل میں ابھی تک کہیں نہ کہیں امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی کہ شاید حملہ آور اٹو نہ ہو..... یا پھر..... یا پھر دو آپی ہی نے کم از کم اسے نہ دیکھا ہو۔ ان کے اندر کا باپ اپنی لاڈلی بیٹی کو مزید مشکلات سے بچانے کے لئے ایسی باتیں سوچ رہا تھا تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں تھی۔ دو آپی نے پھر بے قراری سے غیاث چچا سے سوال کیا۔

”ابا..... طاہر تو ٹھیک ہیں نا..... اٹو کے وار سے وہ بری طرح زخمی ہو گئے تھے..... ان کا تو بہت سارا خون بہہ گیا ہوگا..... آپ انہیں دیکھنے ہسپتال گئے تھے.....؟“ غیاث چچا نے پھر ٹوٹے دل سے دو آپی کو تسلی دی کہ انہیں امید ہے کہ ڈاکٹر طاہر بھائی کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر انہوں نے دو آپی کے سر ہانے بیٹھ کر بڑی مشکل سے ٹوٹے لفظوں میں دو آپی کو یہ بتایا کہ شاید کچھ دیر میں ایس ایچ او ان کا بیان لینے کے لیے آجائے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ دو آپی ایس ایچ او کے سامنے اپنے بیان میں اٹو کا ذکر نہ کریں، بس اتنا ہی کہہ دیں کہ اندھیرے کی وجہ

سے وہ حملہ آور کو پہچان نہیں سکیں اور ویسے بھی ان کے بے ہوش ہونے تک حملہ آور نقاب کی اوٹ میں تھا لہذا وہ کچھ نہیں بتا سکتیں کہ طاہر بھائی پر حملہ کرنے والا نقاب پوش کون تھا۔

ڈوآپی حیرت سے اپنے ابا کو دیکھتی رہیں کیونکہ آج تک غیاث چچا نے ہمیشہ اور زندگی کی ہر مشکل میں انہیں سچ بولنے کا ہی درس دیا تھا پھر وہی باپ آج اچانک انہیں جھوٹ بولنے کا مشورہ کیوں دے رہا ہے؟ اور پھر جھوٹ بھی ایک ایسے معاملے کے بارے میں جس میں ان کا محسن اپنی زندگی اور موت کے درمیان سرحد پر پڑا اپنی سانسوں کی جنگ لڑ رہا تھا۔

غیاث چچا نے ڈوآپی کے اندر امدتے سوالوں کے طوفان کو محسوس کر لیا اور سر جھکائے ڈوآپی کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ پولیس کیس ہے اور معاملہ جانے آگے کب تک کورٹ پکھری اور وکیلوں کی بحث میں کھچے گا۔ بات اگر ان کی اپنی ہوتی یا پھر ڈوآپی کی جگہ اگر ان کا کوئی بیٹا ہوتا تو وہ خود جا کر پولیس میں انکو کے خلاف رپٹ درج کروا آتے لیکن ڈوآپی ان کی بیٹی تھیں اور کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو عدالتوں کے چکر لگاتا نہیں دیکھ سکتا اور خاص طور پر تب جب بیٹی کنواری بھی ہو۔

پتہ نہیں ڈوآپی کو غیاث چچا کی بات پوری طرح سمجھ میں آئی یا نہیں لیکن وہ اپنے پیارے ابا کے چہرے پر پریشانی کی ایک لکیر بھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں لہذا انہوں نے غیاث چچا کی خاطر ہامی بھری اور جب تک ملک ریشم اور ان کے منشی کی آہٹیں برآمدے میں گونجیں تب تک وہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس جھوٹ کے لیے تیار کر چکی تھیں۔ غیاث چچا نے پہلے ہی ایس ایچ او سے درخواست کر رکھی تھی کہ ڈوآپی کی حالت کے پیش نظر فی الحال انہیں طاہر کی موت کے بارے میں نہیں بتایا گیا ہے لہذا وہ بھی اگر اپنے سوالات کی ترتیب یوں رکھیں کہ جس سے طاہر کی موت کا ذکر نہ نکلے تو ان پر بڑا احسان ہوگا کیونکہ وہ جو ڈوآپی کو اس حالت میں مزید صدمہ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتے۔

ملک ریشم کمرے میں داخل ہوا تو ڈوآپی نے جلدی سے انہیں سلام کر کے سر پہ دوپٹہ درست کیا۔ ملک کی نظریں جو ڈوآپی کے مضحل سراپے سے ہوتی ہوئی ان کے مٹیچ چہرے پر جم گئیں۔ وہ پولیس والا تھا لیکن ایک باپ بھی تو تھا۔ اس کے گھر میں بھی ایسی ہی ایک نازک اور کالج کی گڑبادیسی وجوہیسی ہوئی تھی۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے۔ اپنی نوکری بچانے کے لیے اس لڑکی پر سختی کرے اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے مجرم کا نام اگلو الے اور اپنی نوکری بچالے جو گزشتہ چوبیس گھنٹوں کے دوران اعلیٰ حکام کے بے انتہا دباؤ کی وجہ سے شدید خطرے میں پڑ چکی تھی یا پھر چپ چاپ اپنی طرح کے ایک دوسرے باپ کی کی ہوئی درخواست پر عمل کرتے ہوئے لڑکی کا سیدھا سادھا بیان لے کر معاملہ داخل دفتر کر دے۔ اس کی زندگی ایسے مقدمات کی تفتیش میں گزری تھی اور وہ غیاث چچا کی پریشانی دیکھ کر بھی سمجھ گیا تھا کہ ان کی بیٹی نے اصل مجرم کو پہچان لیا تھا لیکن ایک باپ نے اپنی بیٹی کو رسوائی سے بچانے کے لیے اسے غلط بیانی پر مجبور کر دیا ہے۔

ایس ایچ او کے اندر کا پولیس افسر جاگ چکا تھا لیکن وہ اس کے اندر موجود ایک باپ کی روح سے زیادہ بیدار نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کی ہی سنی اور چپ چاپ ڈوآپی سے بیان لے کر اور چند ضمنی سوالات کر کے کاغذ کے نیچے ڈوآپی کے دستخط لے لیے۔ منشی محرز نے حیرت سے اپنے سخت گیر افسر کو دیکھا جو ایسے معاملات میں بال کی کھال نکالنے کے لیے مشہور تھا لیکن اس دھان پان سی لڑکی کے سامنے یوں سر جھکائے بیان لے رہا تھا

جیسے اسے تفتیش کی الف، ب سے بھی واقفیت نہ ہو۔

ملک ریشم جو آپنی کے کمرے سے باہر نکلا تو غیاث چچا نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ملک نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور انہیں کہا کہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنی بیٹی کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ کیونکہ آج نہیں تو کل اسے یہ حقیقت پتہ چل ہی جائے گی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ محکمہ یہ تفتیش صرف علاقہ ایس ایچ او پر ہی چھوڑ دے۔ ان کی ناکامی کی صورت میں معاملہ کسی دوسرے افسر کے حوالے بھی کیا جاسکتا ہے جو شاید ان کی طرح نرمی نہ برتے۔

ایس ایچ او چلا گیا لیکن اپنے پیچھے غیاث چچا کے لیے ان گنت سوچیں چھوڑ گیا۔ آنے والے دنوں کا تصور ہی ان کا سارا سکھ چین لوٹ لینے کے لیے کافی تھا۔ شام تک وجوہ آپنی کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی اور ان کی آنکھوں کی بے چینی سے صاف ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ اس انتظار میں ہیں کہ سکینہ خالہ یا خود غیاث چچا انہیں طاہر بھائی کے گھر مدد دینے کے لیے چلنے کا کہیں تو وہ جلدی سے اپنی چادر اوڑھ کر ان کے ساتھ نکل پڑیں کیونکہ اگر ہسپتال نہیں تو کم از کم انہیں طاہر بھائی کے گھر تو جانا ہی چاہیے تھا لیکن ان کی توقعات کے برعکس شام سے رات ہو گئی لیکن ان کے ماں باپ میں سے کسی نے بھی انہیں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے اماں ابا کے عجیب سے رویے نے بھی شدید الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ہی جو آپنی سے کچھ چھپا رہے ہوں۔ نظریں نہ ملا پارہے ہوں۔ دوسری طرف ملک ریشم نے وجوہ آپنی کا پہلا بیان شامل تفتیش تو کر لیا تھا لیکن اس نے احتیاطاً شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر دی تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور لاری اڈے پر بھی پولیس کے اہل کار سادہ لباس میں تعینات کر دئے تھے کیونکہ اس کی پولیس والی حس کسی بھی قسم کے حالات میں اپنے فرض سے غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لہذا وہ ایسے میں کسی قسم کی بھی کوتاہی مول نہیں لے سکتا تھا۔

آخر دوسری صبح جو آپنی کا صبر جواب دے ہی گیا اور انہوں نے خود سکینہ خالہ سے طاہر بھائی کے گھر چلنے کے لیے کہہ دیا۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ جس کی مزاج پر سی اور عیادت کے لیے چلنے کو کہہ رہی ہیں اس بد نصیب کے گھر میں آج اس کا سوئم ہوگا اور اس کے قل پڑھے جارہے ہوں گے۔ سکینہ خالہ نے بمشکل اپنی آنکھوں کو جو آپنی کے سامنے بھیکنے سے روک رکھا اور انہیں سہہ پہر تک کے لیے ٹال دیا کیونکہ وہ غیاث چچا کی غیر موجودگی میں خود کچھ بھی کہنے سے بالکل قاصر تھیں لیکن کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کچھ فیصلے تقدیر، تدبیر سے پہلے ہی کر رکھتی ہے۔ ابھی دوپہر کا سورج سوانیزے پر ہی تھا کہ اچانک دھڑ سے صحن کا دروازہ کھلا اور شکورن بواہڑ بڑائی ہوئی سی اندر داخل ہوئیں اور آتے ہی بنا سوچے سمجھے وہیں صحن میں کھڑے کھڑے سکینہ خالہ کو آوازیں دینی لگیں۔

”اے بہو..... سنتی ہو..... چلنا نہیں ہے کیا اپنی عزیزہ کی طرف.....؟ پچھلے دو دنوں سے سبھی تمہارا پوچھ رہی ہیں..... اے میں تو کہتی ہوں کہ انسان شادی بیاہ میں کسی کی خوشی میں شریک ہو یا نہ ہو پر موت کے غم میں اسے سب سے پہلے پہنچنا چاہیے..... اور پھر آج تو سوئم بھی ہے نا اپنے طاہر میاں کا.....“

شکورن بوا حسب معمول نان اسٹاپ ٹرین کی طرح بولتی جا رہی تھیں اور سکینہ خالہ کے دوڑ کر ان تک پہنچنے اور ان کے منہ پر ہاتھ رکھنے سے قبل

ہی وہ اتنا کچھ بول چکی تھیں کہ برآمدے میں سے کچے چاولوں کی چھلنی ہاتھ میں لیے گزرتی و جو آپنی کے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیل گئیں۔ و جو آپنی نے صرف ایک لمحے میں موت کا تذکرہ اور سیکینہ خالہ کو شکورن بوا کے ہاتھ جوڑ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ان کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ ان کے ہاتھ سے چاولوں کی پرات چھوٹی اور وہ خود بھی کسی کچے چاول ہی کی طرح لہرا کر زمین پر گر گئیں۔ سیکینہ خالہ اور شکورن بوا دونوں ہی بوکھلا کر ان کی طرف دوڑیں لیکن و جو آپنی اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ سیکینہ خالہ تو بالکل ہی حواس باختہ ہو کر دھاڑیں مار کر رونے لگیں لیکن شکورن بوا نے اپنے ہوش و حواس کا دامن تھامے رکھا اور بھاگ کر باہر موجود کسی محلے دار کو بڑے ہسپتال کے لیے رکشہ لانے کا کہا۔ جانے ان کی بوڑھی بڑیوں میں اس وقت اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ خود انہوں نے ہی آپنی کو اٹھا کر رکشے میں ڈالا اور ہسپتال کی ایمرجنسی تک پہنچا کر ہی دم لیا، ورنہ ڈاکٹروں کے بقول کچھ دیر مزید ہو جاتی تو و جو آپنی کو مہ میں چلی جاتیں۔ تین دن اور تین راتیں ڈاکٹر صبح شام ان کے سر ہانے کھڑے انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے رہے جب شکورن بوا و جو آپنی کو لے کر ہسپتال کی جانب دوڑ پڑیں تھیں تبھی غیاث چچا کے لیے بھی پیغامبر دوڑا دیا گیا تھا اور چند ہی لمحوں میں غیاث چچا بھی ایمرجنسی میں آن موجود ہوئے تھے اور تب سے لے کر اگلے تین دن تک وہ اور سیکینہ خالہ بنا پلک جھپکے ان کے کمرے کے باہر بیٹھے رہے۔ میں اور راجہ اپنے تمام دوستوں سمیت تینوں دن صبح سے شام تک وہیں ان کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر بھاگ کر کوئی کام کر سکیں۔ ایک وقت درمیان میں ایسا بھی آیا کہ ڈاکٹروں نے بالکل ہی جواب دے دیا کہ اب کوئی دوا اثر نہیں کر سکتی لیکن جہاں دوا کا اثر ختم ہو رہا ہوتا ہے وہیں سے دعا اپنا اثر دکھانا شروع کرتی ہے اور پھر و جو آپنی کے لیے دعاؤں کی کون سی کی تھی۔ محلے کے ہر گھر میں چھوٹے، بڑے، بوڑھے سبھی ان کے لیے جائے نماز پر بیٹھے ہوئے تھے اور آخر کار اس بار تقدیر کو ہماری بے بسی پر رحم آ ہی گیا، تیسری رات ساڑھے گیارہ بجے و جو آپنی نے آنکھیں کھول دیں پر لگتا تھا کہ سکتے نے ان کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی ہے۔ ان کے منہ سے صرف ایک ہی جملہ نکلا کہ وہ پولیس کو اپنا بیان ریکارڈ کروانا چاہتی ہیں اور اس مرتبہ ان کے لہجے میں اور لفظوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ غیاث چچا بھی صرف ایک لمبی سی سانس لے کر رہ گئے۔ ویسے بھی پچھلے پورے ایک ہفتے سے ان کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ تھا۔ جتنی مرتبہ بھی انہوں نے طاہر بھائی کے بوڑھے باپ کی مزید جھکی ہوئی کر دیکھی یا بوڑھی ماں کی آہیں اور سسکیاں سنیں، ہر بار انہیں یوں لگتا تھا جیسے وہ طاہر بھائی کے ان بے بس والدین کے مجرم ہیں، ایک ایسا مجرم جو اپنی اولاد کی بہتری کے لیے خود غرض بن چکا ہو۔ اتنے دن سے وہ ٹھیک طرح سے طاہر بھائی کے ابا سے نظر بھی نہیں ملا پائے تھے۔

کچھ ہی دیر میں ملک ریشم اپنے عملے سمیت ہسپتال میں موجود تھا۔ اس نے غیاث چچا کو بتایا کہ کل صبح سے اعلیٰ حکام کے سامنے اپنی فاضل رپورٹ اور اس جواب طلبی کا جواب داخل کروانا ہے جو اتنے دن تک تفتیش آگے نہ بڑھنے کے سبب محکمے کی طرف سے اسے جاری کی گئی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ کل محکمہ دباؤ کے تحت اسے ملازمت سے عارضی طور پر معطل بھی کر دے۔ غیاث چچا نے انہیں بتایا کہ اب اس بات کی نوبت نہیں آئے گی۔ ان کی بیٹی اپنا بیان دوبارہ سے ریکارڈ کروانا چاہتی ہے، انہوں نے ملک ریشم سے اس بات کی معافی بھی مانگی کہ اس سے پہلے انہوں نے خود ڈھوکو پولیس کو ٹھیک بیان دینے سے منع کیا تھا۔ ملک ریشم نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی کہ وہ پہلے ہی یہ بات سمجھ گیا تھا لیکن اگر وہ بھی غیاث چچا کی جگہ ہوتا تو بالکل وہی کرتا جو غیاث چچا نے کیا تھا۔

اس نے فوراً ہی منشی کو اشارہ کیا کہ ڈھوآپی کے بیان سے پہلے چند سطریں احتیاطاً مزید جوڑ لے کہ پہلا والا بیان چونکہ صدے کی حالت میں دیا گیا تھا لہذا اس وقت ذہنی دباؤ کے تحت کچھ اہم باتیں رہ گئی تھیں جن کا اندراج بے حد ضروری تھا لہذا جو اس دوسرے بیان میں شامل کی جا رہی ہیں۔ ملک ریٹیم نے اپنی نظروں کا زاویہ کچھ ایسا رکھا کہ ڈھوآپی کو اپنی گزشتہ غلط بیانی پر زیادہ شرمندگی نہ ہو۔ چند ہی لمحوں میں بیان درج ہو گیا اور ملک ریٹیم نے وہ پوری رات اٹکو کے مکہ تھکانوں پر چھاپے مارتے ہوئے گزاری۔

ڈھوآپی کا وہ بیان شاید ان کی زندگی میں آخری ایسا موقع تھا جب انہوں نے ایک ساتھ اتنی ساری باتیں کرنے کے لیے اپنے لب کھولے تھے۔ اس کے بعد ڈھوآپی کو ایسی چپ لگی کہ لوگ ان کی آواز سننے کو ترس بھی جاتے تب بھی ان کے منہ سے ہاں یا نہ کے علاوہ کچھ نہ نکلتا۔ غیاث چچا اور سیکرٹ خالہ یوں جوان اور اکلوتی بیٹی کو دھیرے دھیرے اور پل پل مرتے دیکھ، خون کے گھونٹ پیٹے لیکن کچھ کر نہ پاتے۔

ڈھوآپی کے بیان کے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر ہی ملک ریٹیم نے اٹکو کو ریلوے اسٹیشن کے ڈاکٹر میں پرانی اور متروکہ بوگیوں کے گودام میں ایک پرانی بوگی میں چھپے ہوئے گرفتار کر لیا۔ اس جگہ کی مخبری اٹکو کے پرانے فرنیچر کی دوکان والے ایک کارگر نے کی تھی۔ آگے کی کہانی بہت سیدھی سی تھی۔ پولیس نے کیس مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیا اور جس روز ڈھوآپی کی گواہی تھی اس روز پورا محلہ عدالت کے کچا کچھ بھرے ہوئے احاطے میں موجود تھا۔ اٹکو نے حوالات اور جیل کے درمیانی عرصے میں بھی غیاث چچا کو دھمکانے کے لیے کچھ حربے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور مگنام خطوط وغیرہ کے ذریعے اس نے غیاث چچا کو پیغام بھجوایا تھا کہ اگر ڈھوآپی نے اسے عدالت میں شناخت کرنے کی ”غلطی“ کی تو ان کے خاندان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا لیکن غیاث چچا نے اس کی بکواس پر مزید کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ وہ پہلے ہی جو کچھ بھگت رہے تھے اس سے زیادہ قسمت کی ان پر مزید ستم ظریفی کیا ہو سکتی تھی۔ ان کی سات پردوں میں پٹی بڑھی، لاڈلی شہزادی آج عدالتوں کی خاک چھانٹی پھر رہی تھی وہ جس کی جھلک جوان ہونے کے بعد کسی غیر نے نہیں دیکھی تھی آج اس کی خبریں شہر کے سارے اخبارات میں چھپ رہی تھیں۔ عدالت کے احاطے میں بھی اخباری فوٹو گرافروں اور رپورٹروں کا جھوم موجود تھا۔ ایک جانب ڈاکٹروں کا جلوس کیس کی شنوائی کے لئے نعرے لگاتا عدالت کی جانب بڑھ رہا تھا اور دوسری جانب اٹکو کو قیدیوں کی گاڑی میں سے احاطے میں اتارا جا رہا تھا۔ اٹکو نے گاڑی سے قدم باہر رکھے تو اس کی پہلی نظر دور برآمدے میں کھڑی ڈھوآپی اور غیاث چچا پر پڑی جو ہم سب دیگر محلے داروں کے ساتھ ہی عدالت آئے تھے۔ اٹکو کی نظروں سے ہی اس کے ارادے صاف ظاہر ہو رہے تھے لیکن وہ زیادہ دیر تک ڈھوآپی کو گھر نہیں پایا کیونکہ سنتری نے اس کی ہتھکڑی کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اسے کھینچتے ہوئے عدالت کے اندر لے گئے۔ کچھ ہی دیر میں کیس لگ گیا اور دفتری نے عدالت کے دروازے سے دربان کو آواز لگانے کا اشارہ کر دیا۔

ڈھوآپی عدالت میں داخل ہوئیں تو وہ لڑکھڑاہی تھیں اور غیاث چچا نے انہیں تھام رکھا تھا۔ غیاث چچا کا کوئی بھی۔ گایا رشتہ دار عدالت ان کی ہمت بندھانے نہیں آیا تھا کیونکہ وہ اپنے خاندان کی ”عزت“ کو یوں عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے اور رلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے لہذا انہوں نے اپنی بیٹیوں کا ”مستقبل“ بچانے کے لیے غیاث چچا کے گھرانے کا بایکٹ کر دیا تھا۔

مخالف وکیل نے جرح شروع کی تو ڈھوآپی نے بڑے اطمینان سے اس کے ہر سوال کا جواب دیا۔ وکیل نے انہیں پریشان کرنے کے لیے

ان پر کچھ غلیظ قسم کے الزامات بھی لگائے کہ ان کا دراصل پہلے ہی سے طاہر بھائی سے کوئی چکر چل رہا تھا جبکہ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے انکو سے بھی ”دوستی“ کا تھکھکی تھی لہذا اس بات پر دونوں کا پہلے بھی جھگڑا ہوا تھا اور پھر دوسرے جھگڑے میں بات اتنی بڑھ گئی کہ انکو نے طیش میں آکر چاقو نکال لیا اور پھر جو کچھ بھی ہوا وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔

مجھے اس انکو کی دم وکیل پر اس کی یہ سب بکواس سن کر شدید غصہ آیا۔ میں اور راجہ نجوم کی وجہ سے اندر عدالت کے ہال میں گھس نہیں پائے تھے لہذا ہم دونوں دروازے پر ہی لوگوں کی ٹانگوں میں سے سر نکالے کھڑے تھے۔ میں نے راجہ کو دھیرے سے کہا کہ اس وکیل کے بچے کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا پڑے گا جو انہوں نے شکورن بوا کے ساتھ کیا تھا لہذا اگلی پیشی پر وہ نھو سے کہہ کر رسی ہم ساتھ ہی لیتا آئے۔

اس سے پہلے وکیل نے جَوَآپی کو اس طرح گھیرنے کی کوشش کی تھی کہ دراصل انکو تو اس رات وہاں تھا ہی نہیں اور انہیں اندھیرے کی وجہ سے مغالطہ ہوا ہوگا کہ وہ انکو ہے لیکن جَوَآپی نے بڑے سکون اور اعتماد سے بھری عدالت میں انکو کی طرف ہاتھ اٹھا کر جج کو بتا دیا تھا کہ وہ حملہ آور کے اتنے نزدیک کھڑی تھیں کہ رات کے اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے انکو کو طاہر بھائی پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ لہذا عدالت کو ماننا ہی پڑا کیونکہ چشم دید گواہ کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مخالف وکیل نے جب یہ پینتیرا چلنے نہیں دیکھا تو پھر اس نے بھری عدالت میں جَوَآپی کے کردار پر کچھ اچھا لکھ کر عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ غیاث چچا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے اور وہ اپنی لاڈلی کی رسوائی کا تماشہ دیکھتے رہے لیکن جَوَآپی کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا اور وہ بڑی ہمت سے وکیل کے ہر حملے کا جواب دیتی رہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ انکو کے لٹنگے دوستوں نے اپنی اور انکو کی حرام کی کمائی سے یہ بوڑھا ”گدھ نما“ وکیل کیا تھا جس کی وجہ شہرت ہی اس کی بدنامی تھی۔

اس وکیل نے محلے میں گھوم پھر کر کہیں نہ کہیں سے الٹی سیدھی خبریں بھی جمع کر لی تھیں اور اس نے اگلی پیشی پر شکورن بوا کو بھی گواہی کے کٹہرے میں بلا لیا۔ سارے محلے دار حیرت سے اچھل ہی تو پڑے کیونکہ سب جانتے تھے کہ شکورن بوا کی زبان پر خود ان کا اپنا کنٹرول نہیں رہتا لہذا اب تو کیس بگڑا کہ بگڑا..... گدھ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ انکو اور طاہر بھائی کی پہلے بھی ایک لڑائی جَوَآپی کی وجہ سے ہو چکی تھی، جس میں طاہر اور انکو دونوں ہی زخمی بھی ہو گئے تھے۔ وکیل نے شکورن بوا سے پوچھا کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ اس وقت قریب سے گزرتے ہوئے شکورن بوا نے ان کی کیا باتیں سنی تھیں۔ ہم سب دم سادھے شکورن بوا کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ شکورن بوا کی ذرہ سی بھی غلطی سے پورے کیس کا رخ پلٹ سکتا تھا۔

شکورن بوا نے اطمینان سے گلے میں رکھا پان نگلا اور پھر جو انہوں نے گدھ وکیل کے لئے لینے شروع کیے تو جج بھی انہیں خاموش نہیں کروا سکا۔ انہوں نے وکیل سے کہا کہ اسے شرم آنی چاہیے ایک شریف زادی پر یوں کچھڑا اچھالتے ہوئے۔ کیا اس کے گھر میں اس کی اپنی ماں بہنیں نہیں ہیں؟ جو وہ دوسروں کی بیٹیوں کے لیے ایسی باتیں کرتا پھرتا ہے.....؟ بوا نے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہ سنی نہ دیکھی کیونکہ جَوَآپی کی پاکیزگی کی گواہی زمین تو کیا سورج، چاند، ستارے بھی دے سکتے ہیں اور رہی بات انکو کی تو وہ جَوَآپی کے علاوہ محلے کے ہر آتی جاتی لڑکی اور عورت کی تمیز کیے بغیر ان پر فقرے کستا رہتا تھا اور اس کی وجہ سے محلے کی ہر شریف زادی کا جینا محال ہو چکا تھا۔ انہوں نے جج سے درخواست کی بلکہ

اسے حکم دیا کہ اٹو جیسے موذی جانور کو تو ایک بار نہیں، سو بار پھانسی کی سزا دینی چاہیے۔

بڑی مشکل سے جج کے اشارے پر عدالت کے ہر کارے انہیں گواہی کے کٹہرے سے اتار کر نیچے لے گئے ورنہ شکورن بوانے تو طے کر ہی لیا تھا کہ آج ہی جج سے فیصلہ لے کر واپس گھر جائیں گی۔ سارے محلے کی آنکھوں میں شکورن بوا کے لیے محبت کے آنسو تھے۔ جانے ان کی یہ کیا پلٹ کب کیوں اور کیسے ہو گئی تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے اس ایک بیان پر محلے والوں نے ان کی کچھلی ساری زندگی کی خطائیں معاف کر دی تھیں۔ چند پیشیاں اور چلیں، گدھ وکیل نے اپنی جانب سے پورا زور لگایا لیکن آخر کار عدالت نے اپنا فیصلہ اٹو کے خلاف سنا دیا۔ اٹو کو عدالت کی جانب سے موت کی سزا سنائی گئی۔ آخری دن تک اٹو عدالت میں اکڑے کھڑا رہا تھا لیکن جج کے منہ سے اپنے لیے موت کی سزا کے الفاظ سن کر آخر کار اس کے قدم بھی ڈگمگاہے گئے۔ اسے شاید ڈوآ پی کی جانب سے اتنی ہمت اور بہادری کی توقع نہیں تھی نہ ہی کبھی اس نے محلے داروں کی جانب سے اس قدر استقامت کی امید کی ہوگی۔ بہر حال عدالت نے انصاف کے پلڑے میں اس کی موت ڈال کر ظاہر کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا جب تک یہ کیس عدالت میں چلتا رہا اور ڈوآ پی کی عدالت میں پیشیاں ہوتی رہیں وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹی رہیں اور کسی نے کبھی انہیں پریشان یا فتنہ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جس دن عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا اس دن گھر آتے ہی وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئیں کہ شاید زندگی میں پہلے کبھی نہ روئی ہوں گی۔ سکیڑ خالہ، شکورن بوا، میری امی خالہ عزیزہ اور استانی خالہ سبھی انہیں تسلی دیتے دیتے خود بھی ایک ساتھ ہی رو پڑیں۔ ہم باہر کھڑے بچوں کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ظاہر بھائی کی آج ہی موت ہوئی ہو۔

اس کے بعد ہم سب نے ڈوآ پی کو کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ میری چھٹیاں ختم ہونے میں بس چند دن ہی رہ گئے تھے، میں گھنٹوں ان کے پاس ان کے کمرے میں یا شام کو چھت پر زبردستی اپنے ساتھ لے جا کر بیٹھا رہتا۔ انہیں خوش کرنے کے لیے اکیڈمی کے جھوٹے سچے قصے سناتا رہتا اور وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی ہوں ہاں کرتی جاتیں۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ میں انہیں بتاؤں کہ اس دفعہ میرا واپس اکیڈمی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اب میں ان کا دل دکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اوپر سے ابانے بھی جیسے چپ رہنے کی قسم ہی تو کھا رکھی تھی۔ بھول کر بھی انہوں نے اپنے اور پرنسپل صاحب کے درمیان مجھے گھر واپس بھجوانے کے معاہدے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میرے نتیجے کو دیکھ کر وہ پھسل گئے تھے جو گزشتہ ہفتے ہی بند لٹافے میں اکیڈمی سے موصول ہوا تھا۔ میں ٹھیک ٹھاک نمبروں سے پاس ہو گیا تھا اور کوئی موقع ہوتا تو میں اپنی اس کامیابی پر اپنا سر پیٹ لیتا کیونکہ مجھے پوری امید تھی کہ میں فیل ہو جاؤں گا اور اکیڈمی سے ایک سرخ لفافہ ابا کے نام آئے گا جس میں درخواست کی گئی ہوگی کہ خدا کے لیے اپنے لاڈلے کو وہیں گھر پر روک لیں کیونکہ آپ کا صاحب زادہ کلاس میں فیل ہو گیا ہے لیکن میری امیدوں کے برعکس میں پاس ہو گیا تھا لہذا میں اب اگلی کلاس میں جانے کا حق دار تھا اور میرے پاس اکیڈمی واپس نہ جانے کا کوئی بہانہ نہیں بچا تھا۔ اس وقت مجھے پرنسپل صاحب کی ”تمام سازش“ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے مجھے ایک سال اکیڈمی میں گزارنے پر نہ صرف راضی کیے رکھا تھا بلکہ ہیلن اور شیرل کی مدد سے مجھے اس قابل بھی بنادیا تھا کہ اس چھوٹے سے شہر کے ایک اردو میڈیم سکول کا طالب علم اکیڈمی کے آکسفورڈ سٹینڈرڈ کے مشکل ترین کورس کے امتحان کو نہ صرف پاس کر گیا تھا بلکہ اس نے اپنے پہلے بڑے امتحان میں اچھے خاصے کیڈٹس کو پیچھے بھی چھوڑ دیا تھا۔ میرے

زلزلے کے ساتھ پرنسپل صاحب کی طرف سے ابا کے لیے ایک مبارکباد کا خط بھی تھا۔ جس کے بارے میں ابا نے مجھے اس وقت نہیں بتایا تھا۔ بہر حال اس وقت جب ابا نے میرا زلزلے مجھے لا کر دیا تو میرے ذہن میں تب یہ ساری کچھڑی پکنا شروع بھی نہیں ہوئی تھی اور زلزلے ملتے ہی میرے ذہن میں صرف ایک ہی دھن سوار ہو گئی تھی کہ کس طرح جلد از جلد جا کر جھوآ پی کو اپنے پاس ہونے کی خبر سنا سکوں اور انہیں اپنا زلزلے کا رڈ دکھا کر ان کے چہرے سے صدیوں کی کھوئی ہوئی مسکراہٹ کی ایک جھلک پانے میں کامیاب ہو سکوں۔

<http://kitaabghar.com>

لہذا دوسرے ہی لمحے میں اپنے زلزلے سمیت جھوآ پی کے گھر ان کے کمرے میں موجود تھا۔ وہ اپنی پرانی کتابوں میں سے کوئی رجسٹر نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ یہ وہی نارنجی رنگ کا بڑا سا رجسٹر تھا جس میں طاہر بھائی انہیں ٹیوشن دیتے وقت مختلف نوٹس لکھا کرتے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے رجسٹر دوبارہ اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور مجھے اندر داخل ہونے میں جھجکتا دیکھ کر انہوں نے خود آواز دے کر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں نے جلدی سے اپنا زلزلے کا رڈ کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا اور پھر واقعی قدرت نے اپنا کرشمہ کر دکھایا۔ ہفتوں بعد میں نے ان کی آنکھوں میں خوشی کی ہلکی سی چمک دیکھی اور انہوں نے زلزلے پڑھتے ہی مجھے ڈھیروں مبارکباد بھی دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اکیڈمی کی ایک سال کی سختیاں اور صعوبتیں جھیلنے کا صلہ قدرت نے مجھے ایک پل میں ہی دے دیا ہو۔ اس لمحے انہوں نے مجھ سے ایک ایسی فرمائش بھی کر ڈالی جس نے میرے اکیڈمی واپس جانے پر ہمیشہ کے لیے مہر ہی ثبت کر دی۔ وجوہ آپی نے میرا زلزلے کا رڈ بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولیں۔

”آؤ..... میرے لیے اکیڈمی سے اپنی یونیفارم میں سلامی والی بڑی سی تصویر بھیجو گے نا.....“

میں نے جلدی سے یوں سر ہلایا جیسے مجھے اگر کچھ دیر ہو گئی تو وجوہ آپی پھر سے بولنا بھول جائیں گی۔ جانے کتنے ہفتوں بعد آج ان کے منہ سے میں نے کوئی بات کوئی فرمائش سنی تھی میرے بس میں ہوتا تو وہیں محلے میں ہی یونیفارم میں تصویر کچھوا کر انہیں دے جاتا۔

اگلے ہی ہفتے جب میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں ٹرین میں بیٹھا ایک مرتبہ پھر اپنے شہر اپنے صوبے سے ہزاروں میل دور واقع اکیڈمی جوائن کرنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ ہم انسان اپنے آنے والے دنوں اور مستقبل کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنا رکھتے ہیں، صدیوں کی منصوبہ بندی کر کے بیٹھے رہتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے اگلے پل کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اگلے لمحے ہمارا اٹھنے والا قدم ہمیں کس جانب لے کر جائے گا۔ میں نے کیا سوچا تھا کہ اکیڈمی کا دوبارہ کبھی رخ بھی نہیں کروں گا لیکن آج میں اپنی مرضی سے گاڑی میں بیٹھایہ سفر طے کر رہا تھا۔ کس کے لیے.....؟ جی ہاں..... پھر اپنی جھوآ پی کے لیے جنہیں اکیڈمی کے ماحول میں میری یونیفارم میں سلامی والی ایک بڑی سی تصویر چاہیے تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی بغاوت

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

اکیڑی میں میرا پہلا سال جتنا مشکل اور ڈھیمی رفتار سے گزرا تھا، اگلا سال اسی قدر تیز لیکن سہل گزرا رہا تھا۔ اب ہم سب کیڈٹس ایک کلاس سینئر ہو گئے تھے اور ہم نے کورس میں رونا چھوڑ دیا تھا لیکن اکیلے میں کبھی کبھی ”دل“ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ میرے اندر بغاوت کے جراثیم پلانا شروع ہو گئے تھے۔ ہر لمحے وجود آپنی کا دھیان لگا رہتا تھا کہ وہ کیسی ہوں گی؟ کیا کر رہی ہوں گی؟ ایسے میں کیڈٹ کالج کی روٹین اور ڈسپلن مجھے بہت گھلناتا تھا، ایک ایسی ہی اداس شام میں ڈارمیٹری میں بیٹھا اپنے لانگ پریڈشوز پالش کر رہا تھا کہ مجھ سے ایک جماعت سینئر، نویں جماعت کا ایک کیڈٹ وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے اپنے جوتے پالش کرتے دیکھا تو کچھ ہی دیر میں اپنے پریڈشوز بھی اٹھالایا اور میرے سامنے پھینک دیئے کہ ان پر بھی دو ہاتھ مار دوں۔ پچھلے سال ہم سب نے ایسی بہت سی مشقیں ہنسی خوشی سرانجام دی تھیں لیکن اس وقت ایک تو میرا موڈ بہت خراب تھا اور میں وجود آپنی کی یاد میں اداس بھی بہت تھا لہذا میں نے اسے جواب دیا کہ میں اس وقت اپنے جوتے ہی پالش کر لوں تو میرے لیے بہت ہوگا لیکن وہ اپنے جوتے چھوڑ جائے میں شام تک انہیں بھی پالش کر دوں گا لیکن ان جناب کا تو پارہ ہی آسمان پر چڑھ گیا۔ فوراً تڑک کر بولا۔

"How dare you refuse me?" اور بڑی نخوت سے اپنے سینئر ہونے کا رعب جھاڑتے ہوئے یہ کہتے ہوئے مڑ گیا کہ دس منٹ میں اگر اس کے جوتے پالش نہ ہوئے تو پھر میں خود ہی باہر میدان میں قلابازیاں کھانے کے لیے حاضر ہو جاؤں۔ جانے اس ایک لمحے میں مجھے کیا ہوا۔ میرا خود پر سے قابو ایک دم سے ختم ہو گیا۔ وہ لڑکا ابھی ڈارمیٹری کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا۔ میرے ہاتھ میں جوتے پالش کرنے کا جو برش پکڑا ہوا تھا میں نے پوری قوت سے وہی برش اس کا نشانہ لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار ”کھٹ“ کی آواز سنائی دی اور برش سیدھا جا کر اس کی گلدی پر لگا اور دوسرے لمحے ہی وہ کیڈٹ بھائیں بھائیں کر کے روتا ہوا ہاؤس ماسٹر کے گھر کی جانب بھاگ رہا تھا۔

اسفر اور فیصل جو باہر راہداری میں ٹمبل ٹینس کھیل رہے تھے، اس نویں جماعت کے کیڈٹ کو یوں روتے ہوئے بھاگتے دیکھ کر جلدی سے اندر میری جانب بھاگے اور مجھ سے ماجرا پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نے اسے برش دے مارا ہے۔ فیصل اور اسفر کا رنگ اڑ گیا اور انہوں نے فوراً مجھے مشورہ دیا کہ میں اس ”قاتلانہ حملے“ کے اثرات سے بچ نہیں پاؤں گا لہذا بہتر یہی ہوگا کہ میں فوراً وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن بھاگ کر جاتا کہاں؟ چاروں طرف تو ان کے پہرے لگے ہوئے تھے۔ ابھی میں فرار کے امکانی طریقوں پر غور کر رہی رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں ہاؤس ماسٹر صاحب سینئر کیڈٹ سمیت بدحواس سے ڈارمیٹری میں داخل ہوئے۔ نویں جماعت کے کیڈٹ نے دور ہی مجھے دیکھ کر یوں اپنی انگلی اٹھائی جیسے کہہ رہا ہو کہ ”یہی ہے مجھ پر قاتلانہ حملے کا ملزم.....“ کچھ ہی دیر میں مجھ پہ فرد جرم لگائی جا چکی تھی اور میری سزا بھی سنا دی گئی۔ رات کو نائٹ فالن کے وقت تمام

ہاؤس کے سامنے مجھے تین بار کیننگ Caning کی سزا سنائی گئی۔ ہاؤس ماسٹر کے جانے کے بعد میری ساری ڈارمیٹری نے فردا فردا مجھ سے تعزیت کی۔ رات کو نائٹ فالن کے وقت ہاؤس ماسٹر صاحب ایک نازک سایید اٹھائے تشریف لے آئے۔ ایسے بید میں نے اور راجہ نے پرائمری اسکول میں شرارتوں پر بہت بار کھائے تھے۔ یہ بید تو ان بیدوں کی ”بہن“ لگ رہا تھا۔ تمام ہاؤس کے سامنے عبرت کے لیے میری فرد جرم پڑھ کر سنائی گئی اور پھر ہاؤس ماسٹر صاحب نے میری پشت کے نیچے تین بید رسید کیے اور میری سالانہ رپورٹ میں بھی میری اس ”کھلی بد معاشی“ کا ذکر کرنے کا حکم صادر کیا۔

اس تمام ”تقریب“ کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ نویں جماعت کے کیدٹس نے مجھ پر رعب جمانے کی کوششیں بالکل ہی ترک کر دیں۔ جوئیرز نے اور میری کلاس نے مجھے ”بھائی“ کیدٹ کا خطاب دے دیا۔ ”بھائی“ ان کیدٹس کو اعزازی طور پر کہا جاتا تھا جو اس قسم کے کارنامے سرانجام دے کر پی۔ ٹی آفیسرز کی بلیک لسٹ میں شامل ہو جاتے تھے۔ ایسے کیدٹس کے لیے خاصی مراعات بھی غیر اعلانیہ طور پر میسر کر دی جاتی تھیں مثلاً کلاس کی ڈبریک میں کوئی دوسرا کیدٹ ان کے لیے لائن میں لگ کر بریک فوڈ لے آتا۔ میس کی لائن میں بھی اس کے ہم جماعت اسے جہاں وہ کھڑا ہونا چاہتا وہاں اسے جگہ فراہم کر دیتے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہیلین کو جب میری اس حرکت کا پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہوئی اور اس نے مجھے اس سینئر کیدٹ سے سوری کرنے کا بھی کہا۔ شیرل نے کہا ”بہت اچھا کیا.....“ حالانکہ اب میری کانونٹ کے احاطے والی تربیت ختم ہو گئی تھی لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی بہانے سے ہفتے میں ایک بار اپنی ان دونوں ”سہیلیوں“ سے ملنے چلا ہی جاتا تھا۔ ہیلین اور شیرل کو میں نے وہو آپی پر نیتنے والی آفت کی ساری تفصیلات بھی بتائی تھیں جسے سن کر وہ دونوں بہت افسردہ ہو گئی تھیں۔ ہیلین کو اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے رومال سے اپنی بیگی پلکیں پونچھتی رہی۔

ایکڑمی آتے ہی دوسرے روز میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اپنے ہاؤس کے فوٹو گرافر سے کہہ کر اپنی پریڈ کی سلامی کے دوران ایک تصویر کھجوا کر اسے خوب بڑا کروایا اور کیدٹ کالج کے چھوٹے سے پوسٹ آفس میں جا کر اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کر آیا۔ دوسرا خط اسی دن میں نے راجہ اور اپنے دوستوں کے نام پوسٹ کیا جس میں میں نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ ہر لمحے وہو آپی کا دھیان رکھیں گے اور پل پل کی خبر مجھے خطوط کے ذریعے پہنچاتے رہیں گے۔ راجہ کے خطوط آتے رہتے تھے جن سے وہو آپی کے بارے میں صرف اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا ہے اٹکو کو جس دن عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی اس دن کے بعد سے کسی نے بھی وہو آپی کو گھر کے باہر کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اور ان کی وہ مدھری مسکان بھی ظاہر بھائی کے ساتھ ہی شاید منوں مٹی تلے دفن ہو گئی تھی۔ اب ہر لمحے ان کی پلکیں بیگی بیگی سی رہتی تھیں اور انہوں نے بول چال بھی تقریباً ترک کر دی تھی۔ بس سارا دن اپنے کمرے میں خود کو بند رکھتی تھیں اور گھر آنے والے مہمانوں سے بھی ملنے سے احتراز کرتی تھیں۔ راجہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ پورے محلے میں اس بات کے چرچے بھی ہو رہے ہیں کہ اٹکو کے وکیل نے اس کی سزا کے خلاف بڑی عدالت میں اپیل دائر کر دی ہے۔ اٹکو کے گھر والوں نے خصوصی طور پر ظاہر بھائی کے گھر جا کر ان کے ماں باپ سے اپنے بیٹے کے گناہ عظیم کی معافی مانگی اور غیاث پچا کے گھر بھی گئے تھے اور پھر انہوں نے ہمارا محلہ چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ لوگ شہر کی پرلی جانب چھاؤنی کی آخری حد کے قریب بنے ہوئے کوارٹرز میں رہتے تھے لیکن بالا اب بھی روزانہ شام کو اپنے دوستوں سے ملنے اپنے ابا کی پرانی سائیکل پر آتا تھا۔ بالے نے بتایا کہ اس کی

ماں بھی اب مستقل بستر سے لگ چکی تھی اور اس کی بہن کا رشتہ بھی اٹکو کی سزا کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے سرال والوں نے ایک غنڈے اور قاتل کی بہن سے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ پڑھ کر مجھے بالے کی بہن گڈی پر بے حد ترس آیا۔ وہ قوّا پی ہی کی ہم عمر اور ہم جماعت بھی تھی اور ہم سب دوستوں کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ ان کے گھر میں جب بھی کسی بیتی تھی تو وہ ہمیشہ میرے لیے سلور کا ایک بہت بڑا سا گلاس بالے سے بھی چھپا کر رکھ دیتی تھی اور جب میں شام کو بالے کو کھیل کے لیے بلانے جاتا تو تب مجھے چپکے سے وہ گلاس پکڑا دیتی۔ جانے اتنے اچھے گھرانے میں اٹکو جیسا شیطان صفت انسان کیسے پیدا ہو گیا تھا جس کے کرموں کا پھل اس کے تمام گھر والوں کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا کہ آصف بھٹی جسے ہم ”پیٹ کی بھٹی“ بھی کہتے تھے کیونکہ اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا تھا، منہ لٹکائے ہوئے ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔ فیصل نے اس سے تکلیف پوچھی تو پتہ چلا کہ آج چونکہ منگل ہے اور گوشت کا ناندہ ہے لہذا ہمیں رات کو میس میں سبزی اور دال کھانے کو ملے گی۔ بھٹی کو دونوں چیزیں سخت ناپسند تھیں اور اس سے رات کو بھوک بھی بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اسفر جو دور بیٹھا اس کی ساری رام کہانی سن رہا تھا اس نے چپکی بجا کر کہا کہ اس کے پاس اس پریشانی کا ایک حل موجود تو ہے لیکن اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ بھٹی نے کہا کہ وہ بہتر کھانا کھانے کے لیے بڑی سے بڑی ہمت دکھانے کے لیے تیار ہے، تب اسفر نے سرگوشیوں میں ہمیں بتایا کہ اکیڈمی سے باہر مرکزی گیٹ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھتر ہوٹل موجود ہے جو کچھ ہی دیر میں تازہ مرغی ذبح کر کے چند منٹوں میں اسے فرائی کر کے دے سکتا ہے۔ اسفر نے اس مرتبہ چھٹیوں سے واپسی پر اپنی گاڑی میں آتے ہوئے چند لمحے وہاں رک کر ٹھنڈا پینے کے بہانے ہوٹل والے سے تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ چھتر ہوٹل کے مالک نے ہی اسفر کو بتایا تھا کہ سینئر کیڈٹس کبھی کبھار چھپ چھپا کر رات کو وہاں کھانا کھانے آ جاتے ہیں۔ مرغی فرائی کا نام سنتے ہی بھٹی کے منہ سے لگا تار رال بہنا شروع ہو چکی تھی اور وہ ہم سب کو ایسی ہی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ہم سب بھی بنا ذبح کیے ہوئے مرغی ہوں لیکن واقعی اس کام کے لیے بے حد ہمت کی ضرورت تھی کیونکہ چاروں طرف پٹی آفسر اور حفاظتی عملے کا پیرا الگا ہوتا تھا اور پھر رات کو اکیڈمی سے نکلنے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ پکڑے جانے کی صورت میں ہم سب کے ہاتھوں میں ہمارے بیگ ہوتے اور ہمیں باعزت طور پر گھر کے لیے رخصتی کا پروانہ ہاتھ میں پکڑا دیا جاتا۔

لیکن اسفر کے نمکین اور چٹ پٹی مرغی فرائی کا نقشہ کچھ اس خوب صورتی سے اور مرج مصالے لگا کر ہمارے سامنے پیش کیا تھا کہ ہم چاروں ہی کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ بالآخر فرض اور محبت میں جیت مرغی کی محبت کی ہی ہوئی اور ہم نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے پاس کل ایک گھنٹہ بیس منٹ کا وقت تھا۔ اگر ہم رات کے کھانے پر میس کی طرف جانے کی بجائے چھتر ہوٹل کی جانب دوڑ لگاتے تو رات کے کھانے کے بیس منٹ اور پھر اس کے بعد رات کی دوسری پریپ کی سیٹی بجنے تک اور رات کے کھانے کے بعد کارڈ میانی وقت جوئی۔ وی وغیرہ دیکھنے کے لیے تقریباً ایک گھنٹہ بنتا تھا..... اس وقت کے ختم ہونے سے پہلے ہمیں ہر حال میں واپس اپنے کمرے میں موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ پریپ کی سیٹی بجتے ہی ہاؤس ماسٹر صاحب بذات خود ہر بیرک کا دورہ کرتے تھے اور کیڈٹس کو پڑھتے ہوئے دیکھ کر ہی واپس جاتے تھے۔ ہم نے یہ سوچا تھا کہ وہاں بیٹھ کر کھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ہم مرغی ”پارسل“ کروالیں گے اور رات کو لائٹ آف کے بعد اپنا ”ڈنر“ کریں گے۔

لیکن سب سے بڑا مسئلہ ابھی اپنی جگہ قائم تھا یعنی چار دیواری کا پہرہ..... اور پھر ہمیں یہ بھی پتہ تھا کہ دو گاڑیاں جن میں ڈیوٹی پی۔ او اور دوسرا عملہ سوار ہوتا ہے۔ مغرب کے بعد سے ہی کیڈٹ کالج کی چار دیواری کے گرد گشت (Petroling) شروع کر دیتی ہیں، چار دیواری کے گرد کھڑے محافظوں کے علاوہ ہمیں ان گاڑیوں کی روشنی کے دائرے میں آنے سے بھی بچنا تھا لیکن اس وقت آصف بھٹی کے ساتھ ساتھ ہمارے پیٹوں کی بھٹی بھی صرف بھٹی ہوئی مرغی مانگ رہی تھی اور ہمارے ذہن کسی بھی قسم کے خطرے کو محسوس کرنے سے قاصر تھے۔

آخر خدا خدا کر کے پہلی پرپ ختم ہونے کی سیٹی بجی اور کیڈٹس اپنے ہاسٹلز سے نکل کر قطاروں میں میس کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم چاروں دانستہ پیچھے رہ گئے۔ میس میں ماشاء اللہ اس قدر ”رونق“ اور بھیڑ ہوتی تھی کہ کسی کا ہم چاروں کی غیر حاضری کو نوٹس کرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ویسے بھی کیڈٹس اور کہیں غیر حاضر ہوں تو ہوں پر میس سے غیر حاضر ہونے کی غلطی کوئی نہیں کرتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میس کے سامنے والے گھاس کے بڑے سے قبلا گراؤنڈ میں صرف میں، اسفر، فیصل اور آصف بھٹی کھڑے رہ گئے۔ ہم چاروں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر پوری رفتار سے پریڈ گراؤنڈ کی جانب دوڑ لگا دی۔ فیصل نے بتایا تھا کہ پریڈ گراؤنڈ کے گرد لگی اونچی خاردار تار اس نے چند جگہوں سے اندر کی جانب مڑی ہوئی دیکھی ہے اور ایک آدھ جگہ تو باقاعدہ ایسا لگتا ہے کہ وہاں پر ہم سے پہلے بھی کیڈٹس نے قسمت آزمائی کی ہے، کچھ ہی دیر بعد ہم کیمپس کی جگہ گاتی روشنیوں سے دور نکل آئے اور اب پہلی مرتبہ ہمیں آنے والے خطرے کے خوف نے چوکنا رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی ہم اندھیرے میں کچھ دور ہی چلے تھے کہ اچانک ہی بھٹی زور سے چلایا۔ ”کون ہے.....؟“ ہم تینوں بھی خوف سے اچھل پڑے۔ پتہ چلا کہ بھٹی اپنے ہی سائے کے اچانک سامنے آنے سے ڈر گیا تھا۔ فیصل نے ایک زوردار چپت بھٹی کے سر پر سید کی اور اسے چپ چاپ آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چند ہی لمحوں میں ہم خاردار تار کے قریب لگی بڑی بڑی جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے چند لمحے اپنا سانس درست کیا۔ اسفر جس نے بھٹی ہوئی مرغی کا پسنا سب سے پہلے ہمیں دکھایا تھا، اس مرحلے پر خود اس کے اپنے حواس جواب دے گئے اور وہ ممنعتی ہوئی آواز میں بولا ”یار میری تو ساری بھوک ہی اڑ گئی ہے، میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں۔“ اس بار چپت کھانے کی باری اسفر کی تھی اور مارنے والا ہاتھ میرا تھا۔ کچھ دیر ہم چاروں دم سادھے بیٹھے حالات کا جائزہ لیتے رہے، چند لمحوں بعد پہلے دائیں جانب سے اور پھر بائیں جانب سے دو گاڑیاں مخالف سمتوں میں گزر گئیں۔ پہلی گاڑی کے اندر بخشو سی۔ پی۔ او کو ہم سب نے خود اپنی آنکھوں سے بیٹھے دیکھا اور ہمارا ہاں ہاں ہم بھی جاتا رہا۔ اتنے میں اچانک کسی دوسری جانب سے کسی محافظ نے زوردار سیٹی بجائی اور ہم سب کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔ میں نے اس وقت پر اور اس گھڑی پر لعنت بھیجی جب ہم نے اسفر کی باتوں میں آکر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے کہ آس پاس کوئی محافظ تو نظر نہیں آ رہا۔ کافی دیر تک ہم دور کھڑے جس ہیولے کو گاڑ سمجھ کر دیکر رہے بعد میں وہ کسی سوکھے درخت کا تناٹا نکلا۔ وقت دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھ سے نکل رہا تھا لہذا ہم نے بسم اللہ پڑھی اور سب سے پہلے فیصل نے خاردار تار کا پل صراط اس کے نیچے سے گزر کر پار کر لیا۔ ہم میں سے ایک نے تار کو کھینچ کر پکڑے رکھا اور باقی تین دوسری جانب سرک آئے۔ اب اس جانب صرف آصف بھٹی رہ گیا تھا۔ اس نے جب تار کے نیچے سے سرکنے کی کوشش کی تو درمیان میں ہی انک گیا کیونکہ وہ خود تو شاید نیچے سے نکل بھی آتا لیکن اس کی موٹی توند نے وہاں سے سرکنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہم تینوں نے کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کے اسے دوسری جانب گھسیٹ ہی لیا لیکن اس کوشش کے دوران ہمارے ہاتھوں میں اور بھٹی کی توند میں خاردار تار کے جانے کتنے کانٹے پیوست ہو گئے۔ بھٹی کو گھسیٹنے کے بعد کئی منٹ ہم چاروں ہی زمین پر لیٹے ہانپتے ہوئے اپنا سانس درست کرتے رہے۔

دور کوئٹہ کی پکی سڑک پر رات کو گزرنے والے ٹرکوں کا قافلہ گزرتا نظر آ رہا تھا۔ ہمارا کیڈٹ کالج ایک ایسے ویرانے میں واقع تھا جہاں رات تو کیا، دن کے وقت بھی ٹرک یا بس ڈرائیور تنہا گزرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ اسفر نے جس چھپر ہوٹل کا ذکر کیا تھا وہ دوصوبوں کو آگے چل کر ملانے والی اسی مرکزی شاہراہ پر کہیں واقع تھا۔

کچھ دیر تک تو ہمیں خود بھی یقین نہیں آیا کہ ہم چند لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ سہی لیکن کیمپس کی سخت گیر فضا سے باہر کھلی ہوا میں آزادی سے سانس لے رہے ہیں۔ اس سرشاری کے نشے میں ہم چند لمحوں کے لیے تمام خطرات کو بھلا بیٹھے اور ہم نے آس پاس کی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی آڑ لیتے ہوئے سڑک کی جانب سرپٹ دوڑ لگا دی کچھ دیر بعد ہم روڈ پر تو پہنچ گئے لیکن یہ کیا؟ وہاں تو دور دور تک نہ تو کوئی چھپر تھا اور نہ ہوٹل۔ ہم سب نے قہر آلود نظروں سے اسفر کی جانب دیکھا۔ اسفر ڈر کر قسمیں کھانے لگا کہ اس نے خود اپنی آنکھوں سے وہ ہوٹل یہیں کہیں دیکھا تھا۔ قریب تھا کہ ہم تینوں اپنے جوتے اتار کر اس کی تواضع شروع کر دیتے کہ اچانک کہیں دور سے ریڈیو پر گانے بجنے کی آواز سنائی دی۔ ہم چاروں کے کان کھڑے ہو گئے اور ہم نے آواز کی جانب نظریں دوڑائیں۔ پہلے ہوا بند تھی اور اب اس سمت میں چلنے لگی تھی شاید اسی لیے ہمیں دور بجتے ریڈیو کی آواز سنائی دے گئی۔ دُور ہلکی سی روشنی چمکتی نظر آ رہی تھی جیسے کسی نے کسی بانس وغیرہ کے اوپر لالٹین ٹانگ رکھی ہو۔ ہم نے اس طرف چلنا شروع کر دیا لیکن ہم مرکزی سڑک سے ہٹ کر کچے میں چلتے رہے کیونکہ سڑک پر کوئی بھی کیمپس کی طرف جاتی ہوئی گاڑی سے ہمیں دیکھ سکتا تھا۔

کچھ ہی دیر میں جب ہم روشنی کے قریب پہنچے تو اسفر کی جان میں جان آئی۔ یہی وہ چھپر ہوٹل تھا جس کے بارے میں اسفر نے ہمیں بتایا تھا۔ ہوٹل کے مالک کا نام جانو تھا اور ہم نے اسی دن اس چھپر ہوٹل کا نام ”جانو شیرٹن“ رکھ دیا تھا۔ جانو نے ہمیں دیکھ کر ریڈیو کی آواز کم کی اور چھپر کے باہر پھنچی ہوئی چارپائی سے اتر آیا۔ ریڈیو پر نیرہ نور دعوے کر رہی تھی کہ

”اے جذبہ دل گر میں چاہوں..... ہر چیز مقابل آجائے.....“

لیکن شاید ہمارے جذبوں میں ہی کچھ کمی تھی۔ جانو نے ہمیں بتایا کہ آج تو شہر سے مرغیاں سپلائی کرنے والے ٹرک ہی نہیں آیا لہذا اس کے ہوٹل کے برتن خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک پل میں ہی ہمیں یوں لگا کہ ہمارے سارے سپنے کچی کچی ہو گئے ہیں۔ ہمارے لٹکے چہرے دیکھ کر جانو سے رہا نہیں گیا اور وہ جلدی سے بولا۔

”لیکن کیڈٹ سائیں..... انڈے تو پڑے ہیں، آپ کہو تو ابھی پیا زٹما ڈال کر زبردست کالی مرچ والے تین چار آملیٹ بنا دوں.....؟“

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ چلو مرغی نہ سہی، مرغی کے انڈے ہی سہی۔ کچھ ہی دیر میں جانو نے آملیٹ تیار کر کے فراٹنگ پین (فرائی پان) ہمارے سامنے رکھ دیا۔ اتنی دیر میں تندو والا تندو گرم کر کے گرم گرم پھلکے نکالنا شروع کر چکا تھا۔ ہم نے جانو سے کہا کہ ہمارے پاس یہاں

کھانے کا وقت نہیں ہے لہذا وہ ہمارا کھانا "پارسل" میں بنا دے۔ پہلے تو جانو نے وہیں انکار کر دیا کہ اس کے اس پارسل نامی کوئی ڈش ہے ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے سمجھایا کہ ہمیں کسی چیز میں کھانے دے دے جسے ہم اپنے ساتھ کیمپس لے جا سکیں لیکن اس نے کہا۔

"سائمن..... ابھی تم ادھر سے اتنی دور یہ اندازہ فرائی لے کر جائے گا تو اس کا تو سارا مزہ کر کر اہو جائیں گا۔ وری ادھر ہی بیٹھ کر "منٹ" کرو نہ..... ہم نے تو روٹی بھی لگوا دیا ہے۔"

اس کے کہنے کی دیر ہی تھی کہ اگلے ہی لمحے ہم چاروں چار پائی پر بیٹھے آلیٹ پر ٹوٹ پڑے تھے، کیونکہ خود ہمارا بھوک سے بے حد برا حال تھا۔ جانو نے ہمیں ساتھ کھانے کے لیے اچار اور دوپہر کی بنی ہوئی لسی بھی دی۔ ہم کھانے پر اس طرح ٹوٹے ہوئے تھے کہ ہمیں آس پاس کا بھی کوئی ہوش نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں بھٹی نے اپنے آخری نوالے سے پورا فرائی پین صاف کرتے ہوئے وہیں چار پائی پر اپنی ٹانگیں سیڑھی کر لیں۔ وہ اتنا کھا چکا تھا کہ اب اس سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پیٹ کی بھوک مٹی تو ہمیں کیمپس کا خیال آیا۔ ہم نے جانو کو پیسے پکڑائے اور اپنے کیمپس کی چار دیواری کی جانب دوڑ لگائی۔ بھٹی بار بار پیچھے رہ جاتا اور ہمیں آوازیں دے کر رکنے کی دھانیاں دیتا لیکن ہم کسی نہ کسی طرح اس کے بوجھ کو بھی اپنے ساتھ ڈھوتے ہوئے خاردار تار تک پہنچ ہی گئے لیکن اندھیرے میں ہم سے اندازہ غلط ہو گیا تھا اور یہاں جس جگہ ہم پہنچے تھے، تار بری طرح آپس میں جڑی ہوئی تھی جس کے اندر سے ہمارا پار کر جانا ناممکن تھا۔ ہم چاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم نے جلدی سے خاردار تار کی باڑھ کے ساتھ ساتھ دوڑ لگا دی تاکہ کہیں سے تھوڑی سی بھی اندر جانے کی گنجائش نظر آئے تو ہم کراس کر جائیں۔ اتنی دیر میں دور سے پہرے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکتی نظر آئیں اور پچھلی جانب سے دور کہیں اندھیرے میں دوسری جانب کے گاڑی نے شاید گاڑی کی روشنی دیکھ کر زوردار سیٹی بجائی۔ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ اب ہمارا گاڑی کی روشنی سے بچنا ناممکن تھا۔ آس پاس کوئی اوٹ بھی نہیں تھی اور اگر پچھلی جانب بھاگتے تو وہاں کے گاڑی بھی روشنی دیکھ کر چوکنے ہو چکے تھے لہذا ان کی ہم پر نظر پڑنا لازمی تھی۔ بھاگ کر میدان کی پرلی جانب بھی نہیں جاسکتے تھے کیونکہ درمیانی فاصلے کو پار کرنے سے پہلے ہی ہم کوئی آڑھ نہ ہونے کی وجہ سے پہرے والی گاڑی کی روشنی تلے یا پھر پیچھے دور کہیں موجود گاڑی کی نظروں میں آ جاتے۔ ہمارے پسینے بری طرح سے چھوٹ رہے تھے اور اپنی گرفتاری ہمیں صاف نظر آ رہی تھی کہ اتنے میں اچانک فیصل زور سے چلایا۔

"وہ رہا باڑھ کا سوراخ....."

دراصل کئی ہوئی باڑھ کے آگے پیچھے کسی نے اسے عمل کی نظر سے بچانے کے لیے جھاڑیاں اس طرح کاٹ کر رکھی ہوئی تھیں کہ پہلے ہم اس کے سامنے سے ہی گزر گئے تھے لیکن ہماری اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سب سے پہلے بھٹی کو اس کی توند سمیت پار کروادیا، دوسرے ہی لمحے اسفر پھر میں اور آخر میں فیصل باڑھ کی دوسری جانب سرک چکے تھے اور جیسے ہی بھٹی نے تارا اپنے ہاتھ سے چھوڑی اس لمحے پہرے والی گاڑی (جسے بعد میں ہم نے "چاند گاڑی" کا خطاب دے دیا تھا) ہمارے سامنے سے دھیرے دھیرے سیٹیاں بجاتی گزر گئی۔ ہم چاروں بنا وقت ضائع کیے اگلے ہی لمحے کیمپس کی جانب اڑے جا رہے تھے اور جس وقت ہم کیمپس کی گھبوں سے چھلکتی روشنیوں کے نیچے آئے تب ہم نے اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ اسی وقت دور کہیں رات کی دوسری پرپ شروع ہونے کی سیٹی سنائی دی۔ ہم سر اسیمہ ہو کر ہوشل کی جانب دوڑے اور یہ دیکھ کر ہماری توجہ ان ہی نکل گئی کہ ہمارے

ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کھڑے کسی بات پر چند سینئر کیڈٹس کو ڈانٹ رہے تھے۔ ہم چاروں نے ایک ایک کر کے ان کی پشت سے اندر کھکنے کی کوشش کی۔ سفر اور فیصل تو کامیاب ہو گئے لیکن تیسرے نمبر پر جب بھٹی گزرنے کی کوشش میں تھا تو وہ ہاسٹل کے گرد بنے جنگلے کے اوپر رکھے گملے سے ٹکرا گیا اور اس کے پیچھے میں جو سر جھکا کے اپنی جھونک میں بڑھا چلا آ رہا تھا، بذات خود بھٹی سے زور سے ٹکرایا۔ فہد صاحب چونک کر پلٹے اور غصے میں گرے۔

”یہ کیا جو کروں والی حرکتیں کر رہے ہو تم دونوں..... اور اتنی دیر ہاؤس سے باہر کر کیا رہے ہو..... ادھر آؤ فوراً.....“

میں نے قہر آلود نظروں سے اس موٹے بھٹی کو دیکھا جس کی وجہ سے ہم دونوں کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا پورا انتظام ہو چکا تھا۔ ہم دونوں سر جھکا کے، معصوم سی صورت بنائے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔

”کہاں سے آرہے ہو اس وقت..... اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے.....؟“

بھٹی کے منہ سے کچھ نکلتے نکلتے رہ گیا۔ ”جی وہ دراصل شیرٹن..... وہ جانو.....“

میں نے دل ہی دل میں اناللہ پڑھ لی۔ اس موٹے نے تو ایک ہی جھاڑ میں سارے کا سارا بھانڈا پھوڑ دینے کی ٹھان لی تھی۔ فہد صاحب زور سے گرے۔

”کیا اول فول بک رہے ہو.....؟ یہ جانو کون ہے.....؟“

اتنے میں سامنے کھڑے دسویں جماعت کے سینئر کیڈٹس میں سے ایک منمنایا۔

”سر ہم جائیں.....“

فہد صاحب ہمیں بھول کر ان کی جانب پلٹے۔

”ہاں جاؤ لیکن یاد رکھو کہ خبردار آئندہ اگر کسی نے گیمز ٹائم میں دیر سے پہنچنے کی کوشش بھی کی تو ایجوڈنٹ سے کہہ کر سات دن کے لیے گرم دھوپ میں مرغا بنوادوں گا۔ چلو اندر جا کر پڑھو.....“

سینئر کیڈٹ دم بکا کر اندر بھاگ گئے۔ فہد صاحب ہماری جانب پلٹے، ہمارا خون رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ وہ زور سے گرے۔

”اور تم دونوں ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو..... چلو اندر جاؤ..... پرپ شروع ہو چکی ہے اور خبردار جو آئندہ کسی جانو کے ساتھ اتنی دیر ٹی۔ وی روم میں بیٹھے..... میں تم لوگوں کا ٹی۔ وی دیکھنا بند کر دوں گا.....“

ہم دونوں جو جانے کب سے دل میں جل تو جلال تو کا ورد کر رہے تھے اس تیزی سے اندر کودوڑے جیسے ریس میں گھوڑے فائر کی آواز پر دوڑتے ہیں اور اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر ہم نے دوسرا دم لیا۔

یہ ہماری زندگی کا پہلا ”Bunk“ تھا۔ اس بنک نے ہمیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے چند ایسے گرتا دیئے تھے جو زندگی میں ہمیشہ ہمیں دال سبزی سے نظریں چرا کر فرائی مرغی کی آس میں بنک پر مجبور کرتے رہے۔ ہمارے یہ بنک آج بھی جاری ہیں اور شاید ہم چاروں ہی آج تک زندگی کی حقیقت سے نظریں چرا رہے ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

اپیل

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

طاہر بھائی کے قتل کو چھ مہینے گزر چکے تھے لیکن راجہ کو ابھی کل کی بات ہی لگتی تھی۔ ایسے لگتا تھا اس ایک موت کے ساتھ ہی سارے محلے کی خوشیاں بھی رخصت ہو گئی تھیں۔ آدی بھی اپنے فوجی کالج جا کر پھنس ہی گیا تھا۔ راجہ اسے ہر ہفتے لمبے لمبے خط لکھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی جب 'بوجھ' زیادہ ہی بڑھ جاتا تو وہ ریگل سینما جا کر کوئی انگلش فلم دیکھ آتا یا پھر بالے کے ساتھ مل کر اپنی یا اس کے گھر کی چھت پر بیٹھ کر کسی نئے براؤڈ کا کوئی سگریٹ آزما لیتا۔ لیکن عادی کے بغیر اُسے کہیں بھی مزہ نہیں آتا تھا۔ اس دن بھی اس نے وقت گزاری کے لیے اپنے گھر کے گودام سے وہ سارے لکڑی کے بڑے بڑے نکال کر صحن میں لا کر رکھ دیئے جس میں وہ اور آدی مل کر سردیوں کی چھٹیوں میں کہانیاں خرید خرید کر جمع کرتے تھے تاکہ پھر سارا سال وہ دونوں مل کر وہ کہانیاں پڑھ سکیں۔ ان لکڑی کے بکسوں میں ان دونوں کی پہلی جماعت سے لے کر اب تک کی تمام جمع کردہ کہانیاں پڑی ہوئی تھیں۔

راجہ سب بکس ایک ایک کر کے کھول رہا تھا اور پرانے دن یاد کر رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دھیان اپنے پیچھے برآمدے میں بیٹھیں سیکنہ خالہ اور اپنی اماں کی باتوں کی جانب ہٹا چلا گیا۔ سیکنہ خالہ آج پورے تین مہینے بعد اس کی اماں کے بے حد اصرار پر چند لکھوں کے لیے اپنے گھر سے نکل کر راجہ کے ہاں آئیں تھیں اور راجہ کی اماں کو بتا رہی تھیں کہ وجوہ آپ کی پڑھائی تقریباً بالکل ہی چھوٹ چکی ہے، لاکھ پڑھنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن کچھ پڑھائیں جاتا۔ یہاں پڑھنے بیٹھتی ہیں اور وہ آنسو ٹپ ٹپ اُن کی آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ غیاث چچا کے سارے خواب ایک ایک کر کے مٹی میں ملتے جا رہے ہیں۔ اب تو انہوں نے بھی باقی ہر آس چھوڑ دی ہے۔ ان کی اب بس ایک ہی حسرت ہے کہ ان کی بیٹی خوش رہے۔ سیکنہ خالہ نے یہ بھی بتایا کہ خاندان والوں نے ابھی تک ان کے گھر آنے کا بائیکاٹ ختم نہیں کیا۔ وہ اس سارے واقعے کا ذمہ دار جو آپ کی ذات کو سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے اس پورے خاندان کی عزت عدالتوں میں اُچھالی گئی تھی۔

اٹو کا کیس ابھی تک عدالت میں اپیل کے لیے لگا ہوا تھا۔ سیکنہ خالہ دراصل آج راجہ کی اماں کے پاس غیاث چچا اور جو آپ سے چھپ کر کچھ اور درخواست کرنے بھی آئی تھیں۔ انہوں نے راجہ کی اماں سے کہا کہ اب انہیں خاندان سے جو آپ کے لیے کسی مناسب رشتے کے آنے کی اُمید ذرا کم ہی رہ گئی تھی۔ لہذا وہ چاہتی تھیں کہ اگر راجہ کی اماں کی نظر سے کوئی بھی اچھا خاندان یا اچھا لڑکا گزرے تو جو آپ کو ضرور اپنے دھیان میں رکھیں۔ یہ سب کہتے ہوئے سیکنہ خالہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ راجہ کی اماں نے جلدی سے اٹھ کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور انہیں تسلی دی کہ وجوہ صرف خالہ کی ہی نہیں، ان کی بھی بیٹی ہے۔ لہذا سیکنہ خالہ کو یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سیکنہ خالہ کو اس بات کا بھی بے حد قلق تھا کہ عدالت اٹو

کے کس میں نہ جانے اچیلوں پر اتنا وقت کیوں لگا رہی تھی۔ کیونکہ ہر پیشی پر انواہوں کا ایک طوفان پھر سے برپا ہو جاتا تھا اور اخبارات اس کس کو پھر سے اس طرح اُچھالتے تھے کہ پہلے سے ہی رستے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ عدالت نے جو بھی فیصلہ دینا ہے اب دے دے تاکہ یہ روز روز کی سوئی جس پر ان کے پورے خاندان کو ہر پیشی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اُس سے تو ان کی جان چھوٹے..... لیکن افسوس قدرت کے فیصلے صرف انسانوں کے چاہنے اور نہ چاہنے کی بنیاد پر ہی ہونے لگتے تو پھر رونا ہی کس بات کا رہ جاتا؟

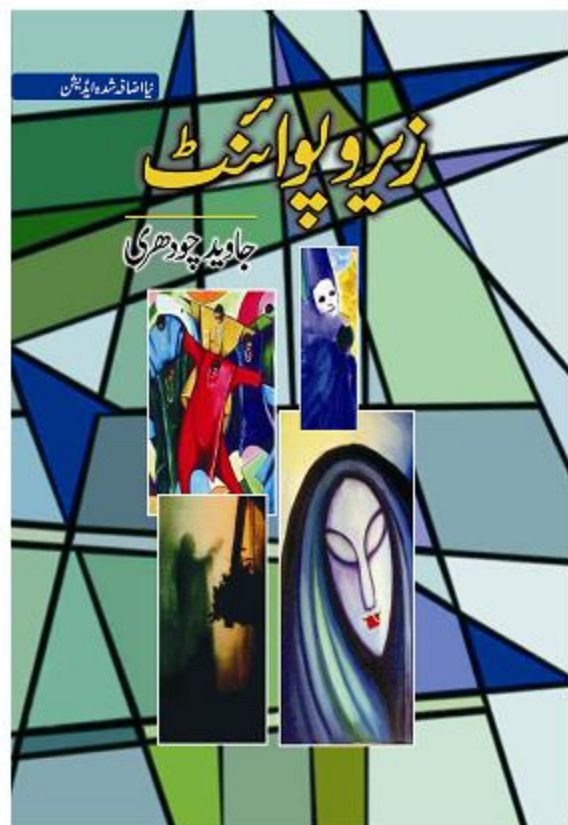
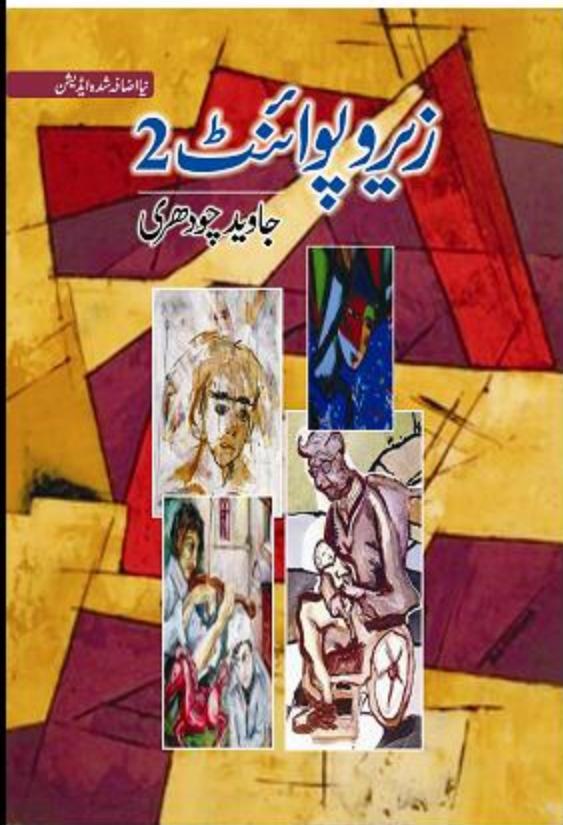
http://kitaabghar.com

وہ آپی کے رشتے کی تلاش کی بات سن کر راجہ کے کان کھڑے ہو گئے اور اُس نے سوچا کہ آج رات ہی بیٹھ کر وہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھ گا کہ وہ آپی کی اماں کے کیا ارادے ہیں۔

شام ہوتے ہی تمام دوستوں کی برگد کے پیڑ کے نیچے ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی جس میں مستقبل کے لائحہ عمل طے کیا گیا اور سب نے یہی طے کیا کہ پہلی فرصت میں راجہ آدی کو ایک تفصیلی خط لکھ کر تمام صورت حال سے آگاہ کرے گا۔ لہذا رات ہوتے ہی راجہ نے کاغذ قلم سنبھالا اور خط لکھنا شروع کر دیا۔

http://kitaabghar.com

”پیارے آدی.....“



کتاب گھر کی پیشکش

پہلا چھاپہ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

اگلے ہفتے جب راجہ کا خط مجھے ملا جس میں اس نے جَوّ آپنی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے والی بات لکھی تھی تو نہ جانے کیوں میرا دل ڈوب سا گیا۔ تو کیا اب وجہ آپنی ہمیشہ کے لیے ہمارے محلے سے دُور چلی جائیں گی۔ کیا ان پر میرا ”حق“ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ نہ جانے ان کا ہونے والا میاں کیسا شخص ہو.....؟ جانے وہ مجھے ان سے ملنے دے یا نہیں.....؟ اس طرح کے جانے کتنے سوال اور جانے کتنے خیال میرے دل و دماغ میں چبھتے رہے اور پھر اس کے بعد راجہ کا جب بھی کوئی نیا خط آتا تو اُسے کھولتے ہوئے میرے ہاتھ لرزنے لگتے کہ اس میں کہیں جَوّ آپنی کی شادی کی خبر نہ ہو۔

لیکن وہ خبر کبھی نہ آئی ہم آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحانات سے گزر کر نویں جماعت میں آچکے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر کی بجائے ہماری پوری کلاس کو شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے بھیج دیا گیا۔ نویں جماعت کے پہلے چھ مہینے مضامین ایک دم سے بدل جانے کی وجہ سے مجھے بہت مشکل ہوئی لیکن اس بار میں اکیلا نہیں تھا۔ پوری جماعت ہی فزکس، کیمسٹری اور بائی، زولوجی کے پھیروں میں پڑی ہوئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ مضامین بھی ہماری گرفت میں آتے گئے۔ درمیان میں ہمارے اکاؤنٹ ”بنک“ اور ڈاکٹر نوکی جلی پرچی بھی خیریت سے ہی چل رہی تھی، لیکن وہ کسی نے کہا ہے ناکہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔“ لہذا ہمارے بُرے دن بھی قریب تھے۔ اور ایک بار پھر ہمارا بھانڈا پھوڑنے والوں میں بھی سرفہرست تھا۔

ہماری پرچی اس وقت تک کراڑے نوٹ کی طرح چلتی رہی جب تک یہ راز میرے، اسفر اور فیصل کے درمیان رہا۔ ہم سب اُس دن کو کوستے تھے جب اسفر نے فیصل اور مجھ سے پوچھے بنا آصف بھٹی پر ”ترس“ کھا کر اسے اپنے راز میں صرف مبلغ دس روپے کے عوض شامل کر لیا تھا۔ اس شام میں اسفر اور فیصل، گیمز Games پیڑڈ کے بعد ہاسٹل کی پہلی منزل پر واقع اپنی ڈارمیٹری کے باہر راہداری میں کھڑے ہو کر نیچے سڑک پر آتے جاتے کیڈٹس کو بیر کھا کر اس کی ٹکلیں مار رہے تھے۔ اتنے میں ہماری نظریں نیچے سے لنگڑا کر گزرتے بھٹی پر پڑی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ فٹ بال کھیلتے ہوئے پیر میں موج آگئی ہے اس لیے ڈاکٹر نو کے پاس گیا تھا لیکن اُس ظالم ڈاکٹر نے صرف دردی دو گولیاں دے کر بھی کوڑا دیا تھا۔ بھٹی اس بات کو رو رہا تھا کہ صبح وہ پیڑڈ پر کیسے جا پائے گا؟؟

اسفر نے بھٹی کو پیش کش کی کہ اگر وہ دس روپے ابھی نقد ہمیں ادا کرے اور کینٹین لے جا کر چائے سمو سے ہماری تواضع کرے تو ہم اس کی یہ مشکل پل بھر میں ختم کر سکتے ہیں۔ فیصل نے اسفر کو گھنی مار کر کئی مرتبہ چپ کروانے کی کوشش کی لیکن اُس نے ہماری ایک نہیں سنی اور آخر کار

ہم پندرہ منٹ بعد کینٹین میں بیٹھے سمو سے اور چائے ”زہر مار“ کر رہے تھے۔ اور اگلے دن موٹا بھٹی پر یڈر جانے کی بجائے اپنے بستر پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسفر کے دل میں لالچ سا گیا تھا۔ اگلے تین دن میں اُس نے ایک دن کے ریٹ Rest کا بھاد دس روپے مقرر کر دیا۔ ہماری نويس جماعت کے کیڈٹ ”جوق در جوق“ ہمارے عطائی کلینک سے پر یڈر ریٹ، گیم ریٹ اور کلاس ریٹ کی پرچی لینے کے لیے آنا شروع ہو چکے تھے اور ہماری شہرت ہمارے ہاسٹل سے نکل کر باقی ہاؤسز میں بھی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ فیصل کوڈاکٹر نوکی تحریر اور مجھے اُس کے دستخط کی اتنی پریکٹس ہو چکی تھی کہ اب ہم آنکھیں بند کر کے ریٹ (آرام) کی پرچی بنا سکتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ہم ”مالا مال“ ہو چکے تھے اور اب ہم شیرٹن والے جانو سے اُدھار مرغیاں کھانے کے بجائے اس کے پاس اپنا باقاعدہ اکاؤنٹ کھلوا چکے تھے جس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پیسے ضرورت سے زیادہ ہی پڑے رہتے تھے۔ زندگی کتنے چین سے کٹ رہی تھی لیکن پھر ایک دن اچانک ہماری ”خوشیوں“ کو کسی کی نظر لگ ہی گئی۔

ہم نے شروع میں ہی طے کر لیا تھا کہ ایک وقت میں پانچ پرچیوں سے زیادہ نہیں بنائیں گے تاکہ بٹی آفسرز کو شک نہ ہو، کیونکہ پر یڈر پر کتنی کر کے رپورٹ سی۔ پی۔ او کے پاس جمع کروانا پانی۔ اوکی بھی ڈیوٹی میں شامل ہوتا تھا۔ لیکن جب ہماری جیبیں دس دس روپے کے نوٹوں سے بھرنے لگیں اور آس پاس کے دیگر ہاسٹلز کے کیڈٹس بھی ہم سے ”تعویذ“ لینے آنے لگے تو ہماری احتیاط بھی دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھوں سے اپنا دامن چھڑانے لگی۔ اور رفتہ رفتہ ہم نے کتنی یاد رکھنا بھی چھوڑ دی کہ ایک دن میں کتنے تعویذ بنائے تھے۔

اسفر اور بھٹی ”کیس“ ڈھونڈ کر لاتے تھے اور میں اور فیصل کلینک سے تعویذ جاری کر دیتے تھے۔ اپنے چلتے پھرتے کلینک کا نام ہم نے ”دلدار کلینک“ رکھ لیا تھا اور یہ ان کیڈٹس کی دلداری کے لیے تھا جنہیں ڈاکٹر نوکی چوکھٹ سے ہمیشہ ڈھکائی ملتی تھی۔

جس صبح چھاپہ پڑا، اس دن صرف ہماری بیرک میں ہی مجھ سمیت چار اور کیڈٹس خراٹے لے رہے تھے۔ جن میں موٹے بھٹی کے علاوہ اسفر، مجید چھوٹو اور نثار روندو بھی شامل تھے۔ اچانک ہی ایسا لگا جیسے ہاسٹل میں بھونچال آ گیا ہو، دروازے کھلنے لگے، شور مچ گیا۔ فہد صاحب کے چیخنے چلانے اور دروازے دھڑ دھڑانے کی مخصوص آوازوں سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ اسفر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بستر سے کود کر ڈارمیٹری کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا اُسی لمحے دروازہ کھلا اور دروازے کے نیچوں بیچ فہد صاحب اوری۔ پی۔ او بخشتو چند دیگر پی۔ او کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔

ہم سب سے پوچھا گیا کہ ہم پر یڈر پر کیوں نہیں گئے۔ ہم سب نے بیک وقت اور بیک زبان بتا دیا کہ ہمیں ڈاکٹر نے ریٹ دیا ہے۔ ہم سب کی پرچیاں ضبط کر کے ہمیں پر یڈر گراؤنڈ پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ فہد صاحب جس دروازے کے سامنے کھڑے احکامات صادر کر رہے تھے، عین اُسی کے پیچھے اسفر چھپا ہوا تھا۔ فہد صاحب پلٹ کر نکلنے ہی والے تھے کہ اسفر کے دائمی نزلے نے کام دکھایا، اس نے اپنی چھینک کو تو کسی نہ کسی طرح گھونٹ دیا لیکن اس کوشش میں دروازہ ہلکا سا بل گیا۔ فہد صاحب کے بایونک کان فوراً کھڑے ہو گئے اور انہوں نے چلا کر کہا کہ دروازے کے پیچھے جو بھی چھپا ہے فوراً باہر نکل آئے لیکن کوئی ہلچل نہیں ہوئی، فہد صاحب دوسری بار چلائے لیکن اسفر پھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، فہد صاحب شدید غصے میں آگے بڑھے اور انہوں نے دروازہ کھولے بغیر اسے اسی جانب زور سے دھکا دیا جہاں پیچھے اسفر چھپا ہوا تھا اور تین چار مرتبہ دروازے کو زور سے دبا کر ایک دم سے اپنی جانب کھولا تو اسفر دروازے کے پیچھے سے یوں سیدھے میدان میں پڑا جیسے کوئی درخت کٹنے کے بعد زمین پر گرتا ہے۔

کچھ ہی دیر میں ہمیں پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا جہاں ہم سے پہلے ہی ہماری ہی پرچی دیئے ہوئے تقریباً اٹھارہ کیڈٹ موجود سر جھکائے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نو کو ایک جانب ایجوڈنٹ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہمارے ہوش پہلے ہی اڑ چکے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ ہماری ”کار میگری“ پکڑی گئی ہے۔ ڈاکٹر نو کو اپنی میڈیکل سلیپس Medical Slips کی تصدیق کے لیے بلایا گیا تھا۔

پتہ یہ چلا کہ جب اچانک ہی کچھ دنوں سے کیڈٹس کچھ زیادہ ہی بیمار پڑنے لگے اور خاص طور پر نویں جماعت کے بیک وقت دو دو درجن کیڈٹ پریڈریسٹ، پر جانے لگے تو انتظامیہ کو تشویش ہوئی اور ڈاکٹر سے دریافت کیا گیا کہ نویں جماعت کے کیڈٹس کے اتنے زیادہ کیڈٹس کوریسٹ دینے کی وجہ کیا ہے تو ڈاکٹر نے بڑی حیرت سے جواب دیا کہ اس نے تو صرف تین کیڈٹس کو کچھلے ایک ہفتے میں پریڈ سے ریسٹ Rest دیا ہے اور ان کے نام بھی ڈاکٹر کے اپنے رجسٹر کے ریکارڈ میں درج تھے۔ انتظامیہ نے اسی وقت ڈاکٹر کو پریڈ گراؤنڈ پہنچنے کا حکم دیا اور تمام چھ کے چھ ہاٹلز سے نویں جماعت کے تمام بیمار کیڈٹس کو اٹھا کر شناخت پریڈ کے لیے پریڈ گراؤنڈ پہنچا دیا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ہماری پرچیاں ڈاکٹر نو کے سامنے رکھ دی گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو ڈاکٹر خود بھی چکرا کر رہ گیا کہ یہ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرچیاں ہیں یا پھر کسی کی بنائی ہوئی نقل۔ وہ کافی دیر تک محذب عدسے کی مدد سے ہماری بنائی ہوئی اور اپنے ہاتھ کی تازہ لکھی ہوئی تحریر کا جائزہ لیتا رہا، پھر اس نے اپنا سراپے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور چکرائے ہوئے لہجے میں بولا کہ اگر اس کے اپنے ریکارڈ کے رجسٹر میں اندراج نہ ہوتا تو وہ ان سب پرچیوں کو ہی اصلی قرار دیتا، لیکن بحال اس کے اپنے ریکارڈ کے حساب سے جناح کے دو اور لیاقت ہاؤس کے ایک کیڈٹ کے علاوہ باقی تمام نویں جماعت کے کیڈٹس کے ریسٹ کی پرچیاں جعلی ہیں۔ ہماری فوجی تربیت کے حصے کا تمام تر کنٹرول آرمی کے کسی سینئر پکٹان یا میجر رینک کے افسر کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ جسے ایجوڈنٹ Adjutant کہا جاتا تھا اور جس کے نیچے سی پی او اور پھر مزید نیچے پی او (s) کی ایک فوج ہوتی تھی جو فوجی تربیت مثلاً پریڈ پی ٹی، ایکسٹرا ڈرل، پریڈ یونیفارم، رائیڈنگ، سوئمنگ اور دیگر روٹین کی نگرانی کرتے تھے۔ عام طور پر کوئی معاملہ سی پی او تک بھی بمشکل ہی پہنچتا تھا کیونکہ پیٹی آفیسر خود ہی کیڈٹس سے نمٹ لیتے تھے لہذا ایجوڈنٹ کے پاس تو کوئی شکایت جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن ہمارا معاملہ سیدھے سبھاؤ ایجوڈنٹ کی عدالت میں بھیج دیا گیا کیونکہ سی۔ پی۔ او اور پی۔ او کی عقل نے ہی جواب دے دیا تھا۔ لہذا اس وقت ہم 23 تیس نویں جماعت کے کیڈٹ ایجوڈنٹ کے سامنے کھڑے تھے اور وہ ہم پر بڑی طرح برس رہا تھا کہ اگر ہم نے اگلے پانچ منٹ میں یہ نہیں بتایا کہ یہ کس کی کار میگری ہے تو وہ ہم سب کو الٹا ناگ دے گا جہاں سے پھر ہمارے گھر والے ہی آکر ہمیں نیچے اتاریں گے۔ ہم سب خاموش کھڑے اس کی دھمکیاں سنتے رہے۔

پھر اس نے ہم سب کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذ اور قلم پکڑوا دیا اور ہم سب سے کچھ لکھنے کو کہا۔ سی۔ پی۔ او نے ایجوڈنٹ کے کان میں کچھ کہا۔ ایجوڈنٹ نے سر ہلایا۔ سی۔ پی۔ او نے جھڑک کر ہم سے کہا کہ ہم تیزی سے دس دس مرتبہ اپنے اپنے کاغذ پر یہ جملہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیں۔ جملہ تھا۔ ”کیڈٹ..... کو بیماری کی وجہ سے 3 دن کا پریڈریسٹ دیا جاتا ہے۔“ ہم سب نے فوراً یہ جملہ لکھ کر سی۔ پی۔ او کے حوالے کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ہماری تحریر کا جائزہ لینے کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے فیصل اس چھاپے میں نہیں پکڑا گیا تھا جس کے ہاتھ کی یہ تحریر ہر پرچی پر موجود تھی۔ میں تو ڈاکٹر نو کے دستخط ثبت کرنے میں ماہر تھا اور اس وقت ان لوگوں کا سارا دھیان صرف تحریر کی جانب تھا۔ کچھ دیر تک

ایجوٹمنٹ اور سی۔ پی۔ اور ہماری تحریروں کا جائزہ لیتے رہے لیکن وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ایجوٹمنٹ کو غصہ آگیا اور اُس نے سی۔ پی۔ کو حکم دیا گیا کہ ہم ساروں کو روزانہ دوپہر تین سے پانچ بجے تک تپتی دھوپ میں اسی پریڈ گراؤنڈ میں رائلز اور کمر پر بندھے بوجھ کے ساتھ اس وقت تک دوڑایا جائے جب تک ہم یہ بتا نہ دیں کہ یہ پرچیاں کس نے جاری کی ہیں۔ اس نے ہمیں یہ لالچ بھی دی کہ جس کیڈٹ نے یہ اطلاع دے دی اس کی سزا معاف کر دی جائے گی۔ کیڈٹس میں سے اگر کوئی چاہے تو وہ خفیہ طور پر سی۔ پی۔ اور کے دفتر میں آکر ٹخری کر سکتا ہے۔

اگلے تین ہفتے شاید ہماری زندگی کے سخت ترین مشقت بھرے دن تھے، ہم سب کوچنگ کے بعد ایکسٹراڈل کی ڈانگریاں پہنا کر پریڈ گراؤنڈ کے سخت پتھر لیے گراؤنڈ میں پہنچا دیا جاتا جو پچاس ڈگری گرم دھوپ سے تپ کر تندور بن چکا ہوتا تھا۔ بیٹی آفیسرز کی فوج ہمیں ”رگڑا“ دینے کے لیے وہاں موجود ہوتی، لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنی سخت سزاؤں کے باوجود تمام کیڈٹس میں سے کسی نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔ ہمارے رنگ دوسرے ہی ہفتے پک کر کندن ہو چکے تھے اور پتھر لیے فرش پر قلابا زیاں کھانے کی وجہ سے جسم کا کوئی حصہ باقی نہیں بچا تھا جہاں پتھروں کے ریزے چھنے کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہنے والے نشان نہ بنے ہوں۔ میں نے اور اسفر نے دوسرے ہفتے فیصلہ کر لیا کہ ہم خود ہی جا کر ایجوٹمنٹ کو بتا دیتے ہیں کہ یہ ساری کارستانی صرف ہم دونوں کی تھی، لہذا باقی کیڈٹس کو ہمارے جرم کی سزا نہ دی جائے لیکن جب ہم جانے لگے تو مونٹے بھیٹی نے باقی کیڈٹس کو بتا دیا کہ ہم جرم کا اقرار کر کے سزا اپنے سر لینے جا رہے ہیں تو ان سب نے ہم دونوں کو گھیر لیا اور یہ وعدہ لے کر ہی چھوڑا کہ چھوٹیں گے تو سب ایک ہی ساتھ چھوٹیں گے ورنہ جب تک یہ سزا ملتی رہے گی سب ایک ساتھ ہی برداشت کریں گے۔ تیسرے ہفتے کالج انتظامیہ کو ہم پر رحم آ ہی گیا اور ایک سخت وارننگ کے بعد ہماری سزا ختم کر دی گئی۔ لیکن ان تین ہفتوں نے ہم 23 تیس کیڈٹس کو دوستی کے ایک ایسے انٹوٹ رشتے میں باندھ دیا کہ آئندہ آنے والی زندگی میں جب کبھی ہم میں سے کسی پہ بھی کوئی مشکل وقت آیا تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی دوسرا اس کی مدد کو ضرور پہنچا۔ ان تین ہفتوں میں ہم نے اپنی کمر پر اتنا بوجھ اٹھایا اور بھاری رائلز کندھوں سے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہم اتنا بھاگے کہ آئندہ زندگی میں ہم آپس میں کسی بھی بھاری سے بھاری بوجھ کو بانٹنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اس سزا نے کیڈٹ کالج میں دی جانے والی ہر سزا کا خوف ہمارے دلوں سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ..... رشتوں کے ریشم..... جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے افسانے سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

رشتہ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

بالآخر انکو کی آخری اپیل بھی سب سے بڑی عدالت سے مسترد ہو گئی۔ یہ خبر سب سے پہلے غفور چچا نے آکر محلے میں سب کو سنائی۔ صدیقی صاحب نے نفرت سے ہونٹ سکڑے ”چلو اچھا ہوا..... خس کم جہاں پاک“.....

یہ سن کر قریب کھڑے راجہ اور گڈو کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اپنا کرکٹ کا کھیل چھوڑ کر سرکتے ہوئے بڑوں کے جھگڑے کے قریب ہو گئے۔ غفور چچا نے لمبی سی سانس بھری ”ہاں..... بڑا ظلم کیا اس کم بخت نے..... لیکن ابھی اس کی چند سانسیں باقی ہیں۔ کیونکہ آخری عدالت کے بعد اب صرف صدر مملکت صاحب ہی اس کی سزا معاف کر سکتے ہیں۔ انکو اپیل لگانے کی درخواست ضرور دے گا..... لیکن ایسے مجرموں کو صدر بھی کبھی معاف نہیں کرتے..... ہاں البتہ کچھ دن مزید مل جائیں گے.....“ بڑے اپنی بحث میں مصروف ہو گئے۔ راجہ اور گڈو وہاں سے دُور چلے آئے۔

راجہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، ابھی کل رات ہی اس کی اماں راجہ کے ابا کو بتا رہی تھیں کہ دُعا آپ کی خاندان سے تو خیر کی کوئی اُمید تھی بھی نہیں..... البتہ باہر سے جو دو چار رشتے آئے تھے وہ بھی طاہر بھائی کی موت کی کہانی سن کر باہر ہی سے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ دُعا آپ کی ماں باپ اندر ہی اندر دن بدن گھلتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو پا رہی تھی۔ آج کل محلے کی رشتے کروانے والی خالہ اپنی سر توڑ کوشش میں مصروف تھیں کہ کسی نہ کسی طرح کوئی اچھا بھرتا آئے تو اس خاندان کی مشکلات کا کچھ ازالہ ہو۔ اُسی رشتے والی خالہ نے آج کل کسی دوسری رشتہ کروانے والی عورت کی نشان دہی پر کسی لڑکے سے بات چلائی تھی۔ سنا تھا کہ لڑکا بالکل اکیلا تھا اور بہت بڑے کاروبار کا مالک بھی۔ سب کچھ اپنی محنت سے بنایا تھا اُس نے۔ ماں باپ بچپن میں ہی ساتھ چھوڑ گئے تھے لہذا گیراجوں میں صبح شام محنت کر کر کے اُس نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو ہی گیا۔ اب تو سنا ہے کہ کاروں کا بہت بڑا شوروم کھول رکھا ہے اس نے شہر کے مرکزی علاقے میں اور صبح شام نئی گاڑی میں گھومتا پھرتا ہے۔ رشتے والی خالہ نے سیکینہ خالہ سے کہا ہے کہ غیاث چچا کے کان میں بات ڈالیں تو بات بڑھے، لیکن سیکینہ خالہ نے فی الحال رشتے والی خالہ سے کہا ہے کہ کچھ ہفتے مزید ٹال جائیں، پہلے یہ انکو والا معاملہ تو کسی صورت ٹل جائے پھر غیاث چچا سے کسی مناسب موقع پر بات کر کے لڑکے کو دکھانے کے لیے کچھ ترکیب بھی ڈھونڈ لی جائے گی۔ لیکن رشتے والی خالہ نے جو عذر پیش کیا وہ بھی بے جا نہیں تھا بھلا اتنا اچھا رشتہ بنا کسی وجہ کے کیونکر ان کی بیٹی کے انتظار میں ٹھہرا رہے گا۔ اور آج کل تو ویسے بھی اچھے لڑکوں کا کھجوا کال ہی پڑ گیا ہے۔ لہذا لڑکے کو روکنے کے لیے کچھ آسرا تو دینا ہی ہوگا۔ سیکینہ خالہ کو اور تو کچھ سوچنا نہیں، بس دُعا اور غیاث چچا سے چھپ کر دُعا کی ایک تصویر رشتے والی خالہ کو دے دی کہ کسی بہانے لڑکے کو دکھا دیں۔ رشتے والی خالہ نے واپس آکر بتایا کہ لڑکے کی تو نظریں ہی تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور اُس نے خود رشتے والی خالہ کے

پاؤں پکڑ لیے کہ کسی طرح سے بھی یہیں بات چلوادیں تو وہ ان کا منہ موتیوں سے بھر دے گا۔ مطلب یہ کہ لڑکا تو اب سال بھر انتظار کرنے کے لیے بھی تیار تھا لیکن مسئلہ غیاث پچا اور فوکی آمادگی کا بھی تو تھا۔

سکینہ خالہ نے رشتے والی خالہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طور یہ معرکہ بھی سر کر ہی لیں گی، اتنے دن بعد خالہ سکینہ نے کچھ پل کے لیے رات کو سکون سے آنکھیں موندھی تھیں۔

سکینہ خالہ کو تو جین آگیا تھا لیکن راجہ کی نیند یہ سب کچھ سن کر ایک مرتبہ پھر اڑ چکی تھی۔ ایک مصیبت ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری اس کی جگہ لینے کو تیار کھڑی ملتی تھی۔ اوپر سے یہ آدی کی فوجی پڑھائی، جانے کب ختم ہوگی۔ راجہ نے اس رات آنکھیں بند کر کے اللہ سے خوب گڑگڑا کر دعا مانگی کہ راجہ جلد از جلد فوجی کالج سے کامیاب ہو کر اپنے محلے میں واپس آ جائے کیونکہ وجوہ آپنی کی حفاظت اب اُس کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

آپریشن بلیو ستار

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا دوسرا ناول **آپریشن بلیو ستار** کہانی ہے ایسے سر پھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کو کچلنے کے لیے کیا گیا بدنام زمانہ فوجی آپریشن جسے آپریشن بلیو ستار کا نام دیا گیا تھا، اسی آپریشن کے بعد ہندوستان کی سابقہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو اسکے اپنے سکھ باڈی گارڈز نے گولیوں سے اڑا دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

عشق کا شین (I)

کتاب گھر پر **عشق کا عین** پیش کرنے کے بعد اب پیش کرتے ہیں **عشق کا شین**۔ عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد..... علیم الحق حق کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین** کتاب گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

پہلی دیر

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

دسویں جماعت میں آتے ہی ہمارا شمار سینئر کیڈٹس میں ہونے لگ گیا تھا۔ ہماری ڈارمیٹری بھی اب اوپر گیارہویں اور بارہویں جماعت کے سینئر کیڈٹس کے ساتھ دوسری منزل پر شفٹ ہو گئی تھی، لیکن اس ”اونچائی“ کا ہمیں بے حد نقصان ہوا تھا۔ جب تک ہم زمینی منزل پر تھے، تب تک رات کو جانو کے شیرٹن ہوٹل آنے جانے میں ہمیں کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتی تھی کیونکہ ہم کھڑکی کی جالی ہٹا کر بھی بیرک کے پیچھے کود جاتے تھے اور اگر زیادہ دیر ہو جاتی تو اُسی راستے سے واپس بھی آ سکتے تھے لیکن اب دوسری منزل پر ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے کھڑکی سے کودنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اور پھر دوسری مصیبت اوپر کی منزل پہ باقی تمام سینئر کیڈٹس کا ہونا بھی تھا۔ ہر وقت جے۔ یو۔ او (J. U. O) کی پہرے دار نگاہوں کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن آصف بھٹی کی پیٹ کی بھٹی ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور دکھتی تھی لہذا ہمیں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی تھا۔

دسویں جماعت میں کالج کے اندر موجود سینما گھر بھی کیڈٹس کے لیے کھول دیا گیا تھا جس میں ہر ایک اینڈ پر رات کو اُردو اور اگلے چھٹی کے دن صبح انگلش فلم دکھائی جاتی تھی۔ جس رات ہم پہلی مرتبہ کالج کے آڈیٹوریم میں فلم دیکھنے کے لیے قطاروں میں اندر داخل ہو رہے تھے تو مجھے راجہ اور اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے شہر میں دیکھی پہلی فلم یاد آگئی۔

اس سینما کے ماحول میں اور کمپس کے اس آڈیٹوریم میں کس قدر فرق تھا۔ یہاں تو مجھے اس نظم و ضبط اور خاموشی سے یوں لگنے لگا تھا کہ جیسے ہم فلم دیکھنے کے لیے نہیں کسی کے ”قل“ پڑھنے کے لیے اس ہال میں جمع ہوئے تھے۔ نہ ہی گانوں پر سیٹھاں بجانے کی اجازت تھی اور نہ ہی ہیر وڈن کے رقص پر سٹے سکرین کی جانب اُچھالے جاسکتے تھے۔ اور تو اور اندر ہال میں نہ تو گنڈیریاں کھائی جاسکتی تھیں اور نہ ہی پھیری لگانے والے بوائے آؤٹس کریم اور سوڈا بیچتے دکھائی دے رہے تھے۔ سارے کیڈٹس یوں انٹینشن بیٹھے ہوئے تھے جیسے ابھی کاشن ملتے ہی ہال کے اندر ہی پریڈ شروع کر دیں گے۔ سچ پوچھیں تو مجھے اس طرح فلم دیکھنے سے شدید الجھن محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اسفر و فیصل مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ گھسٹ کر لے ہی جاتے تھے۔

ہیلن اور شیرل سے اب بمشکل ہی ملاقات ہو پاتی تھی کیونکہ سینئر کیڈٹس کار ہائشی علاقے میں جانا بہت سختی سے منع تھا۔ لیکن میں پھر بھی کسی نہ کسی طور بنک کر کے ہیلن اور شیرل سے مل ہی آتا۔ ہیلن مجھے بنک کرنے پر بہت ڈانٹتی تھی اور شیرل مجھے اس بہادری پر بہت شاباش دیتی۔ مجھے چرچ کے بڑے سے ہال میں پڑے اس پیانو کی کشش بھی ہر ہفتے کھینچ کر چرچ لے ہی جاتی تھی جسے ہیلن بہت سوز میں بجایا کرتی تھی۔ مجھے پیانو سیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن میری کمپس کی روٹین اس قدر سخت تھی کہ میں بمشکل آدھ گھنٹے کے بنک Bunk کا ہی متحمل ہو سکتا تھا اور اتنی دیر میں بھی کئی مرتبہ ہاؤس ماسٹر صاحب ہاسٹل میں میری تلاش اور پوچھ گچھ کر چکے ہوتے تھے۔ لہذا اتنی سی دیر میں صرف ہیلن سے فرمائش کر کے اسے پیانو

بجاتے ہوئے ہی سُن سکتا تھا لیکن میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ زندگی میں جب کبھی مجھے موقع ملا میں پیانو بجانا ضرور سیکھوں گا۔

دسویں جماعت کے امتحانات بورڈ لیتا تھا اور وہ جلدی ہو جاتے تھے۔ باقی جماعتیں مئی اور جون میں سالانہ امتحان میں بیٹھتی تھیں لیکن دسویں جماعت مارچ میں ہی بورڈ کے امتحان سے فارغ ہو کر پانچ ماہ کی چھٹی پر چلی جاتی تھی۔ کالج کی انتظامیہ ان پانچ ماہ میں دسویں جماعت کے کیڈٹس کو تمام ملک کے کیڈٹ کالج کے دورے پر بھجواتی تھی لہذا ہمارے دورے کے انتظامات بھی مکمل کئے جا رہے تھے۔ لیکن جانے کیوں پچھلے چند ہفتوں سے راجہ کے جتنے بھی خط مجھے آتے تھے ان میں اس کی بس ایک ہی رٹ ہوتی تھی کہ میں کب واپس آ رہا ہوں۔ حالانکہ میں بیسیوں بار اُسے جواب دے چکا تھا کہ ہمیں چاروں صوبوں کے کیڈٹ کالجز کو دیکھنے جانا ہے لہذا چھٹیاں شروع ہونے کے بعد تقریباً ایک ماہ تو لگ ہی جائے گا کیونکہ یہ نو تمام دسویں جماعت کے کیڈٹس کے لیے لازمی ہوتا تھا اور کالج کی بڑی والی بس میں تمام کیڈٹس کو پورے ملک میں گھمایا جاتا تھا۔

آخر امتحانات ختم ہو گئے اور اگلے ہی دن صبح سویرے کیمپس کے بڑے گھاس کے میدان میں بڑی والی سرخ بس کا ہارن بجنے لگا۔ ہم سب اپنے اپنے بیگ اٹھائے بھاگ بھاگ بس میں سوار ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں بس چل پڑی اور اگلے ایک ماہ کے لیے ہمارا رابطہ ساری دنیا سے کٹ گیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد جب میں نے ٹرین سے اتر کر اپنے شہر کے ریلوے پلیٹ فارم پر قدم رکھے تو خلاف معمول مجھے گھر سے کوئی بھی لینے نہیں آیا ہوا تھا۔ شاید ٹرین کے پانچ چھ گھنٹے لیٹ ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگ واپس چلے گئے ہوں۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا لہذا میں نے انتظار کرنے کے بجائے یہی مناسب سمجھا کہ اسٹیشن کے باہر سے تانگہ پکڑ کر خود ہی گھر پہنچ جاؤں۔

میں جب محلے کے پھانک سے اندر داخل ہوا تو ایک عجیب سا سناٹا میرے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔ دُور کہیں سے ڈھونکی بجنے کی آواز آرہی تھی لیکن اُس پاس کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو اباحن میں بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ امی اور عمارہ کا پوچھا تو بولے ”بھئی وہ تو تقریب میں گئی ہوئی ہیں تمہارے بڑے بھیا کے ساتھ، تم نہ ہادھو لو تو وہیں جا کر ان سے مل لینا۔“

میں نے بیگ رکھا ”کیسی تقریب.....؟“

”بھئی وہ اپنی وجہ ہے نا..... آج اُس کی مہندی کی رسم ہے..... اچھا ہوا تم بھی آ گئے، جا کر مل آنا اپنی دُو سے..... ہمیشہ تمہارا پوچھتی رہتی ہے.....“

ابا اپنی بات ختم کر کے اُٹھ چکے تھے لیکن میں جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ زمین اور آسمان ایک ساتھ گھوم رہے ہوں۔ اُسی وقت چند لمحوں کے لیے محلے کی بجلی بھی چلی گئی، اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ روشنی رہتی تو ابا میرے چہرے پہ چھائے میری تقدیر کے اس اندھیرے کو دیکھ لیتے جسے میں باوجود بسیار کوشش اس وقت چھپا نہیں پا رہا تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں بجلی تو واپس آ گئی لیکن میرے اندر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو روشن نہ کر پائی۔

میں کافی دیر وہیں بیٹھا اس حقیقت پر یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آج دُو آپنی کی مہندی ہے۔ اور ایک دن بعد وہ ہمیشہ کے لیے اس محلے سے رخصت ہو جائیں گی، لیکن جتنا میں سوچتا، اتنا ہی میرے اندر کا طوفان بڑھتا جاتا۔ اتنے میں ابا کسی کام سے کمرے سے باہر نکلے اور مجھے

ابھی تک یوں صحن میں گم صم بیٹھا دیکھ کر چوٹے۔

”ارے..... تم ابھی تک گئے نہیں..... من نہیں چاہ رہا تو صبح مل لینا..... تمہارے غیاث چچا بھی تمہیں بہت پوچھتے ہیں۔“

میں اب اسے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ تھوڑا سا سستانے کے لیے رُک گیا تھا۔ بس اب جا ہی رہا ہوں۔ میں ٹوٹے ہوئے قدموں کے ساتھ اٹھ کر گھر سے باہر نکل گیا۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

باسکرولی کا آتشی کتا

کتاب گھر آپ کے لئے لایا ہے مشہور سراغ رساں شرلاک ہومز کا ناول ”باسکرولی کا آتشی کتا“۔ یہ ناول مشہور رائٹر سر آر تھر کونن ڈائل کی شہرہ آفاق کتاب ”The Hound of Baskervilles“ کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۰۹ء میں تحریر کئے گئے اس ناول پر اب تک ہالی وڈ کی کئی فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں۔ سر آر تھر نے شرلاک ہومز کا کردار اٹھارویں صدی میں متعارف کروایا تھا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کر لیں کہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار جاسوسی ناول پڑھنے والوں میں آج بھی اتنا ہی مقبول ہے۔ اس ناول کو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ہم سفر

ہم سفر..... فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر لکھی جانے والی تحریر..... زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتماد ڈگمگا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفر کو کچھڑنے نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے..... اولاد..... **ہم سفر** کتاب گھر کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

دوسرا الوداع

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

دُجوا آپی کا گھر اُسی طرح سجا ہوا تھا جیسے کسی بھی ڈولی اُٹھنے والے گھر کو سجا ہونا چاہیے۔ ڈھونکی بجنے کی وہ آواز جو میں نے پچانک سے اندر داخل ہوتے ہوئے سنی تھی وہ دراصل یہیں دُجوا آپی کے گھر سے ہی آرہی تھی۔ سب سے پہلے میری نظر غفور چچا پر پڑی جو گھر کے باہر میدان میں لگے شامیانے کے پاس کھڑے، محلے کے چھوٹے بچوں کو شامیانے کے سوراخوں سے اندر سر ڈال کر جھانکنے سے منع کر رہے تھے اور انہیں وہاں سے بھگا رہے تھے۔ میں آگے جانے کی ہمت نہیں کر سکا اور وہیں دُور سے کھڑا ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ ایک آدھ بار غیاث چچا پر بھی نظر پڑی جو بہت جلدی میں اور کچھ بوکھلائے سے اندر آتے جاتے دکھائی دیئے۔ پھر میری نظر راجہ اور ننھو پر پڑی جو خشک میوے کے بڑے بڑے تھال اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے۔

اچانک غفور چچا کی مجھ پر اندھیرے میں نظر پڑی اور وہ مجھے محلے کا کوئی دوسرا لڑکا سمجھ کر چلائے۔
 ”اوئے لڑکے..... وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ اندر جا کر پوچھو کہ شمشے کے چار درجن گلاس کہے تھے، لیکن یہاں مردانے میں تو صرف دو درجن ہی بھجوائے ہیں..... اتنے سے تو کام نہیں چلے گا.....“ میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آیا تب مجھے پہچان کر وہ وہیں سے چلائے۔
 ”ارے..... یہ تو اپنا آدمی ہے..... اچھا ہوا تو بھی آگیا..... تیری سہیلی تجھے بہت پوچھتی تھی..... رخصتی سے پہلے مل ضرور لینا اس سے.....“ غفور چچا ہمیشہ دُجوا آپی کو میری سہیلی کہتے تھے کیونکہ جب میں بہت چھوٹا تھا تو جب کبھی وہ مجھے دُجوا آپی کے کام بھاگ بھاگ کر کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو مجھے چھیڑنے کے لیے پوچھتے کہ ”ہاں بھئی..... کس کے لیے برف کے ٹیٹھے گولے بنوائے جا رہے ہیں۔“..... میں جلدی جلدی گولے گنڈے والے کے ہاتھ میں پیسے تھماتے ہوئے کہا ”دُجوا آپی کے لیے.....“ وہ پھر مجھے چھیڑتے ”بھئی یہ دُجوا آپی کون ہے؟“..... میں جلدی سے جواب دیتا ”میری سہیلی..... اور میرا جواب سُن کر وہ دیر تک ہنستے رہتے۔

آج میری وہی سہیلی اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائے، مجھ سے..... ہم سب سے رخصت ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی تھی اور میں اُسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اندر گھر میں سبھی کو میری آمد کی خبر ہو گئی اور سب سے پہلے راجہ اندر سے بھاگتا ہوا نکلا اور آ کر میرے گلے لگ گیا۔ اُسے میری اندرونی حالت کا اچھی طرح پتہ تھا اور وہ بار بار مجھ سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کہ میں نے گزشتہ ایک مہینے کے دوران اس کے لکھے ہوئے خطوط کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ راجہ کا لکھا ہر خط واپس اُسی کو مل چکا تھا اور ان خطوط کا پلندہ ابھی تک اس کی جیب میں موجود تھا جس میں راجہ نے دُجوا آپی کے اس ہونے والے رشتے کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ لیکن چونکہ میں اپنی جماعت کے ساتھ ٹور پے تھا اس لیے

میرے پتے پہ اس خط کو وصول کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا لہذا ڈاک والوں نے سب ہی خط کیے بعد دیگرے راجہ کو واپس لوٹا دیئے تھے۔ میرے پاس راجہ کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور پھر اگر مجھے وقت سے پہلے ہی وجوہ آپنی کے اس رشتے کے بارے میں پتہ چل جاتا تو بھی میں کیا کر سکتا تھا؟؟ میں، امی اور باقی گھر والوں سے جو آپنی کے صحن میں مل کر واپس باہر آ گیا کیونکہ جو آپنی کو جس کمرے میں بٹھایا گیا تھا وہاں جانے کی مجھ میں ذرہ برابر بھی ہمت نہیں تھی لیکن کچھ ہی دیر میں عمارہ اندر سے عجلت میں باہر نکلی اور کہا کہ جو آپنی مجھے بلا رہی ہیں۔ میں بیٹھا رہا لیکن راجہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اٹھادیا اور زبردستی اندر دھکیل آیا۔ جو آپنی پہلے جوڑے میں ملبوس، سر جھکائے اپنی سہیلیوں اور رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں یوں بیٹھی ہوئی تھیں کہ ان کے چہرے کے رنگ اور اس پہلے دوپٹے میں فرق کرنا ناممکن تھا، جو اس وقت ان کے سر پر ڈلا ہوا تھا۔ میں دروازے میں ہی رُک گیا۔ پیچھے کارنس پر میری یونیفارم والی تصویر اب تک اپنی اُسی پرانی جگہ پر بچی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر عورتوں نے دعائیں دیں اور وجوہ آپنی کی کسی سہیلی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ وجوہ آپنی نے نظر اٹھائی اور مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائیں۔ ان کی اس زخمی سی مسکراہٹ کے پیچھے کتنے درد چھپے تھے یہ صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ جانے کیوں اس پل مجھے طاہر بھائی کی بہت شدت سے یاد آئی، اور ایک پل کے لیے میرے دل نے سب کچھ بھلا کر خدا سے یہ شکوہ کر ڈالا کہ اگر اس شہزادی کو کسی کے ساتھ رخصت ہونا ہی تھا تو پھر طاہر بھائی ہی کیوں نہیں.....؟ کیوں خدا نے اتنی جلدی انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ جو آپنی اگر آج ان کے ساتھ رخصت ہو رہی ہوتیں تو ان کے چہرے پر اس پیلاہٹ کی جگہ کیسی چاندنی بکھری ہوئی ہوتی؟..... دنیا میں ہمیشہ سب کچھ ویسا ہی کیوں ہوتا ہے جیسا ہم نہیں چاہتے؟؟

میں پلکیں جھپکے بنا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے شور اٹھا کہ لڑکے والے مہندی لے کر آ گئے ہیں۔ سبھی عورتیں اور لڑکیاں جلدی سے اٹھ کر باہر کی جانب پلکیں اور کچھ ہی دیر میں، میں اور وجوہ آپنی کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ سے پوچھا کہ میں اندر اُن سے ملنے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ اُداس سا بیٹھا رہا انہوں نے حسب معمول اپنی انگلی سے میری ناک کو پھسا دیا، لیکن آج میرے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ان کے بنا بہت اُداس ہو جاؤں گا۔ وہ کیوں ہم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ جواب میں انہوں نے اپنی آنکھوں کو بھینسنے سے بڑی مشکل سے روکا اور مجھے تسلی دی کہ ایک نہ ایک دن تو انہیں اس محلے سے جانا ہی تھا، اور پھر وہ کون سا سوکوس دُور یہ شہر چھوڑ کر جا رہی تھیں۔ انہیں تو اسی شہر میں ہی رہنا تھا اور یہ کہ میں جب چاہوں ان سے ملنے کے لیے آ سکتا ہوں۔ وجوہ آپنی نہ جانے کتنی دیر تک ایسی ہی کئی تسلیاں دے کر مجھے بہلانے کی کوشش کرتی رہیں۔ انہوں نے مجھے خوب دل لگا کر پڑھنے کی بھی تلقین کی اور اپنی الماری کی دراز میں سے مجھے وہ سب چیزیں بھی اٹھانے کو کہا جو وہ ہمیشہ کی طرح میرے لیے، میری غیر موجودگی میں جمع کر کے رکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج ان سے جی بھر کر باتیں کر لوں کیونکہ کل سے تو وہ پرانی ہونے والی تھیں لیکن یہ خواہش بھی میرے دل میں حسرت بن کر رہ گئی اور کچھ ہی دیر میں لڑکے والیاں مہندی لے کر اندر کمرے میں آ گئیں اور اتنا رُش ہو گیا کہ مجھے مجبوراً کمرے سے باہر نکلنا پڑا۔

باہر راجہ پہلے سے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ ہم دونوں مہندی کے گیتوں کے اس شور شرابے سے دُور ہٹ کر بیٹھ گئے اور راجہ نے مجھے شروع سے ساری بات بتائی کہ کس طرح رشتے کرانے والی خالہ نے سیکینہ خالہ کو یہ رشتہ بتایا تھا اور پھر جواب میں جو آپنی کی تصویر اس لڑکے کو دکھائی تھی

جو تصویر دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس گواہی دیتا تھا۔

لڑکے کا نام ظفر تھا اور وہ گاڑیوں کے شوروم کا کاروبار کرتا تھا۔ بقول رشتے والی خالہ ”ظفر میاں تو ہر روز ایک گاڑی بیچتے اور دوسری خریدتے ہیں۔“..... اس وقت بھی مہندی لگانے والی خواتین نئے ماڈل کی تین چار کاروں اور ایک بڑی بس میں بھر کر آئی تھیں۔

ظفر کو اب خود اس رشتے کی اس قدر جلدی تھی کہ وہ جلد از جلد اس معاملے کو نپٹانا چاہتا تھا۔ وہاں اُنکو کا معاملہ بھی دن بہ دن لمبا ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور صدر کی جانب سے اُس کی درخواست کا کوئی جواب بھی تین ماہ گزرنے کے باوجود اب تک نہیں آیا تھا لہذا رشتے والی خالہ کے اصرار پر کہ لڑکا اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ سیکنہ خالہ نے سر ہٹھیلی پہ رکھ کر غیاث چچا کے سامنے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ شروع میں تو غیاث چچا نے انتہائی سختی سے منع کر دیا کہ فی الحال انہیں ایسی کوئی جلدی نہیں ہے اور یہ کہ ان کی بیٹی ان پر بوجھ تو نہیں کہ اُسے یوں جلد بازی میں گھر سے رخصت کر دیں لیکن پھر دیر دیر سے جیسے جیسے دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینے میں بدلتے گئے تو رفتہ رفتہ غیاث چچا کے لہجے کی سختی بھی دم توڑنے لگی البتہ دُؤآپی کا جواب اب بھی وہی پہلے دن والا ہی تھا اور انہوں نے ایسے کسی موضوع پر بات کرنے سے ہی صاف انکار کر دیا تھا۔

سیکنہ خالہ نے ہزار کوششوں کے بعد غیاث چچا کو کم از کم اس بات پر تو راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ ایک بار لڑکے سے مل تو لیں۔ اس کی چھان پھنک کروالیں کیونکہ آج نہیں تو کل، آخر کبھی نہ کبھی تو انہیں اپنی بیٹی سے رخصت کرنا ہی ہوگا تو پھر اس کام کی ابتدا کرنے میں کیا حرج ہے؟ اُنکو کے کیس کی وجہ سے جو بدنامی ہو چکی تھی اس کے بعد تو اتنے اچھے رشتے کا آنا ہی کسی غیبی امداد سے کم نہیں تھا لہذا سیکنہ خالہ کی نظر میں اب مزید دیر کرنا خود اپنی جاگی قسمت کو سٹلانے کے مترادف ہوتا۔ آخر کار جو تھے ماہ جا کر غیاث چچا نے اس بات پر آمادگی ظاہر کر دی کہ وہ خود کسی بہانے بازار سے گزرتے ہوئے لڑکے کے شوروم پر دو گھڑی رُک کر اس کا آگاہی چھاد کھیں گے اور اگر انہیں لڑکا مناسب لگا تو پھر اس کے بعد آس پاس سے اس کے متعلق خبر لینے کی کوشش بھی کریں گے کیونکہ لڑکے کا اپنا کوئی بزرگ تو تھا نہیں جس سے بات کی جاسکتی ہو۔

دراصل غیاث چچا معاملے کو اتنے دن تک اس لیے بھی لٹکاتے آ رہے تھے کیونکہ انہیں اب بھی اپنے بھائی کے بڑے بیٹے جاوید کی طرف سے کچھ امید تھی۔ جاوید دواؤں کی کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھا اور غیاث چچا کی عزت بھی بہت کرتا تھا لیکن جب انہوں نے اپنے بھائی محمود سے وِجُو کے لیے آئے رشتے کا سرسری سا تذکرہ کیا تا کہ وہ محمود اور جاوید کی مرضی جان سکیں تو دونوں نے بیک وقت غیاث چچا کو مشورہ دیا کہ اگر رشتہ مناسب ہے تو دیر نہ کریں۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ ان کے بھائی کا گھر انہیں دُؤآپی کو اپنانے کی مزید کوئی خواہش نہیں رکھتا، حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب اسی بھائی کے غیاث چچا کے گھر چکر لگاتے ہوئے جوتے نہ گھستے تھے۔ لیکن اب وہی دُؤآپی ان کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ اتنے واضح اشارے کے بعد غیاث چچا کی کمر بھی ٹوٹ ہی گئی اور انہوں نے سیکنہ خالہ کو اختیار دے دیا کہ وہ جیسے مناسب سمجھیں، پیش رفت کر گزریں البتہ واحد شرط انہوں نے دُؤآپی کی رضا مندی سے مشروط رکھی کیونکہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی مرضی کے خلاف اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔

دُؤآپی کچھ عرصہ تو خون کے گھونٹ پی پی کر اپنی ماں کی پریشانی اور باپ کی دن بدن جھکتی ہوئی کمر کو دیکھتی رہیں لیکن پھر ایک دن جب انہوں نے اپنے بوڑھے باپ کی آنکھوں میں وہ نمی دیکھ لی جس کا باعث وہ صرف اپنی ذات کو ہی سمجھتی تھیں تو اُسی لمحے انہوں نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ

کر لیا اور چپ چاپ سکیں خالہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ غیاث چچا نے اپنے طور پر لڑکے کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل کرنا تھیں وہ پہلے ہی کر چکے تھے اور بظاہر لڑکے کے بارے میں سب اچھا ہی کی رپورٹ تھی۔ لہذا اب مزید دیر کرنے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی جواز۔ لڑکے کو ہری جھنڈی دکھا دی گئی اور ظفر نے اگلے ہی مہینے بارات لانے کی خواہش ظاہر کر دی اور یوں جس کے نتیجے میں آج اس کے نام کی مہندی جو آپ کے ہاتھوں میں سج رہی تھی۔

راجہ یہ تمام داستان سنانے کے بعد خاموش ہو چکا تھا۔ میں بھی خاموش بیٹھا تھا بلکہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ آس پاس سبھی منظر، ہر ذی روح ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہو۔

اگلے دن بارات بھی اپنے وقت پر آ گئی۔ میں نے دُور ہی سے ظفر کو دیکھا۔ کوئی بات بھی تو خاص نہیں تھی اس کی، عام سی شکل و صورت کا ایک تیز طرار سا مرد..... جسے وہاں سب ”لڑکا“ قرار دینے کی اپنی سی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی بڑی سی لنگتی مونچھوں نے اسے میرے نزدیک مزید اسرار بنا دیا تھا۔ لیکن جانے وہاں سب عورتیں اس کے واری صدقے کیوں ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر جو آپ کے مقابلے میں تو بالکل ہی چمار دکھائی دیتا تھا۔ کہاں جو آپ کا چاند سا مکھڑا اور کھلتا گلابی رنگ اور کہاں یہ گہرے سانولے رنگ کا کاروباری سا شخص.....؟

بہر حال جو آپ کی قسمت کا دھاگہ اب ظفر سے بندھ چکا تھا اور رخصتی کے وقت پورے محلے نے فردا فردا جو آپ کی کو دعائیں دے کر رخصت کیا۔ سکیں خالہ قرآن شریف سے نیچے گزارتے وقت جو آپ سے مل کر جو پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو سارے محلے کو آبدیدہ کر گئیں۔ غیاث چچا و جو آپ کو تھامے دو لہے کی گاڑی تک یوں چلتے ہوئے گئے کہ مجھے خود ان کے گر جانے کا دھڑکا لگا رہا۔ میں دُور کھڑا رہا کیونکہ اس الوداع کی ہمت میرے اندر کبھی بھی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ جو آپ نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے روتی ہوئی آنکھوں سے پلٹ کر ہم سب کی طرف دیکھا۔ بے خیالی میں میرا ہاتھ انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ گیا۔ جو آپ کی مجھ سے نظر کرائی۔ میں نے روتے روتے اپنی ناک کو اپنی انگلی سے دبا دیا۔ آنسوؤں کا ایک فوارہ جو آپ کی آنکھوں سے بہہ کر ان کے پورے چہرے کو بھگو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ گاڑی چل پڑی، اندر عورتوں کے درمیان بیٹھی جو آپ نے اپنا ہاتھ بلایا۔ یہ میری زندگی کا دوسرا الوداع تھا جو مجھے خون کے آنسوؤں لارہا تھا۔ میں نے دیر سے سے دل میں کہا۔

”الوداع اے شہزادی..... الوداع.....“

اک دیا جلانے رکھنا

جو چلے تو جاں سے گزر گئے اور میرے خواب ریزہ ریزہ جیسے خوبصورت ناولوں کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت

تحلیق۔ شہرہ آفاق ناول ایک دیا جلانے رکھنا کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

میں شامل تھا جو ”ڈاکٹر نوپرچی کیس“ میں ہمارے ساتھ تین ہفتے تک رگڑا کھاتے رہے تھے۔ اس نے آتے ہی مجھے سرگوشی میں کہا۔

”ہے آدی..... کیا ہماری ساری ٹیم کو آج کی ڈاکٹر نو کے ہسپتال پہنچانے کا ارادہ کر کے آئے ہو..... اب بس کرو یا.....“
 ”ٹھیک ہے..... اپنی ٹیم سے بھی کہہ دو کہ کک فٹ بال کو ماریں..... میرے کھلاڑیوں کو نہیں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”رائٹ..... سیز فائر.....“ میں نے بھی انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کر دیا۔ اگلے ہاف میں صاف کھیل ہوا اور بات پنالتی لکس تک پہنچ گئی۔ لیکن اس معاملے میں ہمارا گول کیپر بھی سب سے آگے تھا۔ اس نے پانچ میں سے تین پنالتی لکس روک لیں اور دوسری جانب میری، فیصل، اسفر اور شار روئندو کی پنالتی سیدھی ان کے گول میں گئی۔ ہم نے ایک گول کے مارجن سے فائل جیت لیا تھا اور قاسم ہاؤس کی پچھلے دس سال میں یہ پہلی فٹ بال فائل کی ٹرائی تھی جو آج ہم اپنے ہاتھوں میں اٹھائے پورے گراؤنڈ کا چکر لگا رہے تھے۔

صرف فٹ بال ہی نہیں بلکہ ہم جب سے بارہویں جماعت میں آئے تھے ہم نے رائیڈنگ، سوئمنگ، بیس بال، باسکٹ بال، جیولن تھرو اور نہ جانے کون کون سی ٹرائی سے فہد صاحب کا آفس بھر دیا تھا۔ ہمارے ہاؤس ماسٹر فہد صاحب کو ہمیشہ ہم سے شکایت رہی تھی کہ ہمارا بیچ ان کے ہاؤس میں آنے والا سب سے زیادہ شرارتی اور نظم و ضبط توڑنے والا بیچ (Badge) تھا لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم نے نظم و ضبط میں اور ڈسپلن میں نہ سہی، لیکن دیگر ہر شعبے میں وہ کارکردگی دکھائی کہ جو پچھلے کئی سالوں میں ہمارے سینئر نہیں دکھا سکے تھے۔ اب ہم ساتویں جماعت کے لاغر اور کم زور بدن والے ڈرے سب سے کیدز نہیں تھے بلکہ اونچے، لمبے اور مضبوط جسموں والے کیدز آفیسرز تھے۔ جن کے بدن ایکسٹرا ڈرل کی مشقتوں اور مہینوں تک بوجھ اٹھا اٹھا کر بھاگنے کی وجہ سے پک کر فولاد بن چکے تھے۔ گیارہویں جماعت تک ہم سزائیں کھا کھا کر اس حد تک ماہر ہو چکے تھے کہ اب پٹی آفیسرز (پی۔ او) کو ہمیں سزا دیتے دیتے پسینہ آ جاتا تھا۔

کئی مرتبہ ہماری شکایت کمانڈر صاحب تک بھی پہنچی لیکن ان کا ایسے معاملوں میں ایک بہت سیدھا اور واضح اصول تھا کہ چاہے شرارت کیسی بھی کیوں نہ ہو، وہ صرف ہماری پڑھائی کے رزلٹ اور کلاس ٹیسٹ کے نتیجے کو سامنے رکھ کر کسی بھی سزا کا فیصلہ کرتے تھے۔ ویسے بھی فوجی تربیت کے معاملات انہوں نے ایجوکیٹ کے حوالے کر رکھے تھے۔ انہیں صرف ہماری پڑھائی سے غرض ہوتی تھی اور ہماری پوری ڈارمیٹری میں سے صرف ایک بار مونٹا بھی دسویں کے مڈرم ٹیسٹ میں بیماری کی وجہ سے فیل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پوری کلاس کا رزلٹ ہمیشہ بہترین آتا تھا، لہذا کمانڈر صاحب کو کبھی ہمارے خلاف حتمی فیصلہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ پرنسپل صاحب کالج سے باہر بنک کے شدید مخالف تھے اور ایسی غلطی وہ کبھی معاف نہیں کرتے تھے لہذا اب تک یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم کبھی جانو کے شیرٹن ہوٹل سے رنگے ہاتھ نہیں پکڑے گئے تھے، حالانکہ سی۔ پی۔ او کو پکا یقین تھا کہ ہم ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت اڑانے کے لیے کیپس سے بنک Bunk ضرور کرتے ہیں لیکن اس کے درجنوں چھاپوں کے باوجود ہم کبھی اس کے ہتھے نہیں چڑھے اور کئی بار تو بال بال بچے۔

(گیارہویں) فرسٹ ایئر کے دوران زندگی اپنے معمول پر ہی رہی تھی اور سوائے شیرل کی شادی کے، دیگر کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔ شیرل، ہیری کے ساتھ بیاہ کر پیا دیں سدھا گئی۔ مجھے شیرل کے خاندان کی طرف سے شادی میں شرکت کی خاص دعوت تھی اور میں چرچ میں سوٹ

میں ملبوس ہیری کو دیکھ کر حیران ہی تو رہ گیا تھا۔ اس لڑکے کو تو میں نے کئی مرتبہ ٹیوشن کے دوران آتے جاتے چرچ کے احاطے کے پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ وہ گیٹ پر آ کر کسی دوسری سن (سسر) کے ذریعے ہیلن کو پیغام بھی بھجوایا کرتا تھا لیکن ہیلن اس سے ملنے نہیں جاتی تھی، کبھی کبھی جب میں ہاؤس ماسٹر سے نظر بچا کر اتوار کے روز چرچ سروس میں ہیلن سے ملنے جایا کرتا تو تب بھی یہی لڑکا ہمیشہ مجھے پیانو کے قریب سب سے پہلی رو میں بیٹھا نظر آتا تھا اور جب کبھی ہیلن کو اس سروس، Quire Service کے دوران پیانو بجاتی تو وہ نہایت انہماک سے ہیلن کو دیکھا کرتا تھا۔ شیرل ہمیشہ اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتی تھی اور کئی مرتبہ وہ دونوں ساتھ ہی واپس اپنے گھروں کو لوٹا کرتے تھے لیکن جاتے جاتے بھی ہیری کی نظریں ہیلن ہی کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ اسی لئے جب میں نے اسے چرچ کے ڈاس پر سفید ڈلہنوں والے لباس میں ملبوس شیرل کے ساتھ کھڑے اور شیرل کو انگلی پھناتے دیکھا تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ ہیلن نے میری آنکھوں میں جھانکتے سوال کو محسوس کر لیا اور نظروں ہی نظروں میں مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

رات کو جوزف نے ہیری اور شیرل کے اعزاز میں ایک بہت شاندار پارٹی کا اہتمام بھی کیا ہوا تھا۔ خوب ہلہ گلا ہوا اور سب ہی نے جوزف کے بجائے ہوئے والکن اور پھر اکارڈین کی دھن پر خوب رقص کیا۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب سب ہی شور شرابے اور کھانے پینے میں مشغول تھے، میں ہیلن کو ہال میں موجود نہ پا کر خود بھی اسے ڈھونڈنے کے لیے باہر باغیچے کی جانب چلا آیا جہاں ہیلن سنگترے کے پیڑوں کے پاس بچے جھولے کے قریب خاموش سی کھڑی آسمان کو تیک رہی تھی۔ شاید وہ بھی ان ستاروں کے جھرمٹ میں اپنی قسمت کا ستارہ ڈھونڈ رہی ہوگی۔ میری آہٹ پا کر وہ چونک کر مڑی اور مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”کوئی سوال مت کرنا آدی..... میرے پاس تمہارے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے.....“

میں چپ ہی رہا اور ہیلن کے قریب ہی جھولے پر بیٹھ گیا اور میں نے ہیلن کو آسمان پر اپنا ستارہ دکھایا، سب سے واضح اور چمکدار..... اور ہیلن سے اس کے ستارے کے بارے میں پوچھا۔ ہیلن کچھ دیر آسمان کو دیکھتی رہی اور پھر اُس نے دُکھ بھرے لہجے میں بتایا کہ اس کا ستارہ کہیں کھو گیا ہے۔ اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل پارہا۔ اس رات ہم دونوں چپ چاپ آسمان کو دیکھتے رہے۔ شیرل بیاہ کر ہیری کے ساتھ کینیڈا چلی گئی اور پھر بہت دنوں بعد ایک دن ہیلن نے اپنے لب کھول ہی دیئے.....

ہیری بہت عرصے سے ہیلن کو چاہتا تھا۔ لیکن ہیلن نے اپنے لیے خدائی راہ اور مذہب کا راستہ اُس کی چاہت سے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا۔ ہیری نے بہت پاڑ پیلے اور بہت سر پٹے لیکن ہیلن کے دل کا پتھر پگھلنا تھا نہ پگھلا۔ ہاں البتہ شیرل ہر اتوار چرچ سروس کے بعد ہیری کے ساتھ گھر آتے جاتے اس کی باتوں میں اس قدر کھوئی کہ کچھ ہی ہفتوں میں اُسے چاروں طرف صرف ہیری ہی دکھائی دینے لگا۔ اور حسب معمول اس نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے یہ راز اپنی سب سے بڑی راز داں ہیلن کو ہی بتایا۔ ہیلن نے نہایت سکون سے اپنی ہم نفس اور پیاری بہن کی بات سنی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے وعدہ کیا کہ ہیری اگر دنیا میں کسی کا ہوگا تو صرف شیرل ہی کا ہوگا۔ یہی وہ دن تھا، جب ہیلن نے پہلی مرتبہ ہیری کو شام کے وقت چرچ کے احاطے کے باہر گھومتے ہوئے خود گیٹ پر بلایا۔ پہلے تو ہیری کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ قسمت آج خود اس پر اتنی مہربان ہے، لیکن جب ہیلن نے اُس سے یہ سوال کیا کہ اگر وہ ہیری سے یہ پوچھے کہ وہ اس کے لیے اپنی کسی قیمتی چیز کی قربانی دے سکتا ہے تو ہیری کا

جواب کیا ہوگا؟

ہیری نے جواباً کہا کہ اس کی ملکیت میں اس کی سانسوں سمیت جو کچھ بھی ہے وہ ہیلن ہی کا تو ہے، لہذا یہ سوال ہی قطعاً بے معنی ہے۔ لیکن ہیلن نے اس سے پھر کہا کہ جواب دینے سے پہلے وہ ایک بار پھر اچھی طرح سے سوچ لے کہ بعض دعوے صرف دعوے ہی ثابت ہوتے ہیں۔ ہیری نے پھر یہی کہا کہ آزمائش شرط ہے۔ تب ہیلن نے اسے شیرل کا ہاتھ ہمیشہ کے لیے تھام لینے کی استدعا کی تو کچھ دیر تک تو ہیری کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔ ہیلن نے اسے خاموش دیکھ کر کہا کہ اگر ہیری چاہے تو وہ اپنا سوال واپس لے سکتی ہے کیونکہ یہ زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ لیکن ہاں کرنے کی صورت میں ہیری کو ساری عمر کے لیے شیرل کو خوشیاں دینے کا وعدہ بھی نبھانا پڑے گا البتہ ”نہ“ کرنے کی صورت میں ہیلن اور ہیری کو وہاں سے اٹھنے کے بعد اس ملاقات کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا۔

ہیری کے لیے شاید یہ زندگی کا سب سے بڑا امتحان تھا لیکن وہ بھی اپنے لفظوں کا پکا نکلا۔ اس وقت تو وہ چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا لیکن اگلے ہی ہفتے شیرل اپنے چہرے پر قوس و قزح کے سارے رنگ لیے بھاگتی ہوئی چرچ کے احاطے میں داخل ہوئی اور آتے ہی ہیلن سے لپٹ گئی۔ ہیری کے گھر والے اسی شام اس کا ہاتھ مانگنے آرہے تھے۔ شیرل جانتی تھی کہ اس معجزے کے پیچھے ہیلن ہی کا ہاتھ ہوگا لیکن وہ یہ کبھی نہیں جان پائی کہ ہیری نے ہیلن کی محبت کے سنگھاسن پر شیرل کی مورت خود ہیلن ہی کے کہنے پر سجائی تھی۔

میں ہیلن کی زبانی یہ ساری کہانی سن کر بہت حیران تھا۔ یہ محبت آخر کس بلا کا نام تھا۔ یہ انسان سے کیا کچھ کروا لیتی ہے۔ شیرل چلی گئی۔ ہم گیارہویں سے بارہویں جماعت میں آگئے۔ اب ہم سینئر کیڈٹ آفیسر بن چکے تھے اور اکیڈمی میں یہ ہمارا آخری سال تھا۔ راجہ کے خط اب بھی باقاعدگی سے مجھے آتے تھے لیکن میرا دل ڈوآپی کی رخصتی کے بعد کبھی محلے میں نہیں لگ پایا۔ بات صرف ڈوآپی کی رخصتی تک ہی رہتی تو شاید مجھے دھیرے دھیرے صبر آ ہی جاتا۔ لیکن ایسے لگتا تھا جیسے تقدیر کو ابھی ڈوآپی اور ان کے خاندان کے مزید کچھ امتحان لینا مقصود تھے۔ ڈوآپی کی رخصتی کو ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ صبح سویرے ایک نئی افتادان کے گھر کے آنگن میں ڈیرہ ڈال چکی تھی۔

آتش پرست

وجیہ سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی ممی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی ممی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی دنیا کو اس منحوس ممی سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے..... آتش پرست

جسے جلدی کتاب گھر پر ایکشن ایڈونچر محکمہ جونئی ناول سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

کتاب گھر کی پیشکش

دھوکہ

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

ڈوآپی کی رخصتی کو آج تیسرا دن تھا اور تیسرے دن تو ویسے بھی دلہن کو ویسے کے بعد رات کو گھر چھوڑنے کے لیے ظفر کو خود آتا تھا لیکن وہ صبح سویرے ہی ڈوآ کو ان کے گھر چھوڑ کر باہر سے ہی واپس لوٹ گیا۔ لڑکی کو یوں اکیلا گھر کے صحن میں کھڑے دیکھ کر ماں باپ کے تو حواس ہی گم ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں عقدہ یہ کھلا کہ ظفر میاں نے ویسے کا سارا بندوبست تو کر رکھا تھا اور انہیں اب صرف اپنی ایک بڑی رقم کی وصولی کا انتظار تھا جو ایک سو دے کے سلسلے میں انہیں آج ہی ہونی تھی، لیکن ”اتفاق“ سے آج پارٹی نے کچھ ایسی مجبوری اور عذر پیش کر دیا تھا کہ خود ظفر بھی ان کے سامنے لا جواب ہو گیا تھا۔ لیکن بہر حال ولیمہ تو کرنا تھا۔ ظفر کے تمام دوست، برادری اور خود ڈوآ کے تمام خاندان کو دعوت نامے بھیجے جا چکے تھے۔ اب ایسے وقت میں ولیمہ منسوخ بھی تو نہیں کیا جاسکتا تھا، لہذا ظفر نے ڈوآپی کو غیاث چچا کے پاس جانے کا کہا تا کہ وہ غیاث چچا سے ویسے کی رقم ”ادھار“ دلوا سکے۔ ظفر نے ڈوآپی سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی اسے سو دے کی رقم ملی وہ غیاث چچا کے پیسے لوٹا دے گا۔ ڈوآپی کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ جا کر اپنے ابا کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔ ڈوآپی جیسی خود دار لڑکی کے لیے یہ سب کچھ کس قدر مشکل ثابت ہوا ہوگا، اس کا اندازہ میں خوب لگا سکتا تھا۔

غیاث چچا نے بنا کوئی دوسرا سوال کیے رقم ڈوآپی کے ہاتھ پر رکھ دی اور فضلہ بابا سے کہہ کر تانگہ منگوا دیا اور ڈوآپی کو فضلہ بابا کے ساتھ ان کے گھر واپس بھجو دیا۔ یوں ڈوآپی کا ولیمہ تو خوب شان و شوکت سے ہو گیا لیکن غیاث چچا کا ماتھا اُسی دن ٹھنک گیا کہ شاید اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں ان سے کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔ ظفر کے چہرے پر ویسے والی رات بھی کسی قسم کے خجالت کے کوئی آثار نہ تھے جیسے اُسے اس بات کی ذمہ داری بھی شرمندگی نہ ہوئی ہو کہ اس کے ویسے کی دعوت کا خرچ بھی اُس کے سُسرال کو ہی اٹھانا پڑا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا قہقہے لگاتا رہا اور ویسے کے شاندار ”انتظام“ پر سب کی مبارکباد اور داد و وصول کرتا رہا۔ رات گئے جب دعوت ختم ہوئی تو اُس نے خود اپنے دوستوں کے ساتھ رُکنے کا عذر کر کے جوگو وہیں سے ان کے ماں باپ کے ساتھ مکھاوے پر تین دن کے لیے گھر بھیج دیا۔

اور پھر اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ ظفر میاں کی اتفاقاً پڑنے والی مجبوریوں کی فہرست لمبی ہی ہوتی گئی، اور غیاث چچا سے ہر بار قرض کے نام پر بٹوری گئی رقم کبھی واپس نہ ملی۔ بلکہ کچھ عرصے بعد تو ظفر نے یہ قرض نام کی دُم لگانے کا تکلف ہی ختم کر دیا اور اب تو وہ اپنے حق کے طور پر ڈوآپی کے ذریعے یا پھر خود ہی باتوں باتوں میں رقم مانگ لیا کرتا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ ڈوآ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ آخر ان کے پاس جو کچھ بھی ہے، ان کی بیٹی کا ہی تو ہے بھلا وہ یہ سب اپنے ساتھ تو لے کر نہیں جائیں گے نا.....؟

غیاث چچا ایک وضع دار شخص تھے اور چپ چاپ اپنے غلط فیصلے کی قیمت چکاتے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں ظفر کے کاروبار کی اصلیت بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ گاڑیوں کا وہ شوروم اس کی ملکیت نہیں تھا بلکہ اس کا ایک دوست جو سال ڈیڑھ کے لیے اپنی قسمت آزمانے دوئی گیا ہوا تھا، وہ اس شوروم کا مالک تھا۔ اس کی قسمت دوئی میں نہیں کھلی اور وہ جلد ہی یہاں باقی سب کی قسمت پھوڑنے کے لیے واپس آن موجود ہوا۔ ظفر اس کے شوروم پر صرف ایک ڈیلر کا کام کرتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں وہ شوروم کا انتظام سنبھالتا تھا۔ انتظام سنبھالتے سنبھالتے ظفر میاں نے یہاں بھی اپنے ہاتھ دکھائی دیئے تھے لہذا دوست نے آ کر جب حساب کتاب کیا تو تقریباً پچاس ہزار روپے کا گھپلا نکلا۔ ظفر کی ملازمت تو جانی ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیاث چچا نے اچھے وقتوں میں زمین کا ایک ٹکڑا جو اپنے بڑھاپے کے لیے لے کر سنبھال رکھا تھا وہ بھی پک گیا کیونکہ اب غیاث چچا کے پاس ظفر کو دینے کے لیے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

اب ظفر بے روزگار تھا لیکن ٹھٹھٹ اس کے اب بھی وہی شاہانہ تھے۔ محنت کر کے روزی کمانا اس نے کبھی سیکھا نہیں تھا اور اُسے ہمیشہ سے شارٹ کٹ استعمال کر کے ایک ہی رات میں لکھ پتی بننے کا جنون تھا۔ اسی ذہن کے خناس کی وجہ سے وہ مختلف جگہوں پر قسمت آزما رہا تھا اور جو کچھ کمانا اس سے زیادہ لدا دیتا تھا۔ مثلاً کبھی پرائز بانڈ کی پرچیوں کے نمبر کا دھندہ شروع کیا تو کبھی مختلف لائبریریوں کے ٹکٹ اس کے گھر میں بکھرے نظر آتے۔ کبھی خلیج کے ممالک کے بروکرز سے مل کر ویزے کا کام شروع کیا تو کبھی جیولرز کے ساتھ مل کر سونے کے بھاؤ لگانا نظر آتا۔ غرض دنیا کا ایسا کوئی مختصر راستہ باقی نہیں بچا تھا، جو ظفر نے جلد دولت حاصل کرنے کے لیے نہ آزمایا ہو۔ لیکن ظاہر ہے، ایسے طریقوں سے اگر کوئی دولت مند بن سکتا تو دنیا اس وقت اُس جیسے کنگوں سے خالی ہوتی۔ اس بے روزگاری نے اُسے مزید چڑچڑا کر دیا تھا اور اب وہ باقاعدہ ڈوآ پی پر چلائے بھی لگا تھا۔ ڈو نازو نم کی پلی ہوئی ایک ایسی لڑکی تھیں، جن کی پرورش میں تہذیب اور ادب و آداب کا لحاظ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ظفر کے اس رویے سے ہم جاتیں اور پُچ کر کے گھر کے کسی کو نے میں سکڑی کسئی سی بیٹھی رہتیں۔ لیکن ظفر کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلتی اور تیسرے دن پھر وہ غیاث چچا کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی ہوئیں۔ گیارہویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد میں جب چند دن کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ان دنوں انہیں وہاں آتے جاتے اکثر دیکھتا رہتا۔ اب ہم بڑے ہو چکے تھے لہذا اب ہمارا اُس بے تکلفی سے سبھی کے گھروں میں گھس جانا، خود ہمیں ہی اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس دن ہم سب محلے کے بڑے میدان میں وکٹیں گاڑے کرکٹ کھیل رہے تھے، میں بیٹنگ کر رہا تھا جب میں نے ڈوآ پی کو فسلو با با سمیت تانگے پر سوار محلے کے پھانک سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ڈوآ پی تانگے سے اتریں تو نہ جانے کیوں مجھے بہت کم زور دکھائی دیں۔ میں نے دُور ہی سے ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا تو وہ ہلکے سے مُسکرا دیں۔ وہی گلابی مُسکراہٹ، جس کا میں بچپن سے ہی دیوانہ تھا۔

ان کے گھر میں جاتے ہی راجہ نے، جو وکٹ کیپنگ کر رہا تھا، ظفر کو ایک موٹی سی گالی دی اور مجھ سے کہا کہ ضرور اُس ظفر نے کوئی نیا مطالبہ دے کر انہیں گھر بھیجا ہوگا۔ ڈوآ پی کی ساری کہانی اب کوئی راز نہیں رہ گئی تھی، کیونکہ ایک آدھ بار جب غیاث چچا وقت پر ظفر کو پیسے نہیں ادا کر پائے تھے تو اس نے ان کے دروازے پر آ کر انہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ اور بہت سی الٹی سیدھی باتیں اس زوردار آواز میں کی تھیں کہ پورے محلے کو پتہ چل گیا کہ غیاث چچا جیسا شریف انسان کس غلط انسان کے چنگل میں پھنس چکا ہے۔

کچھ ہی دیر میں فضلو بابا اندر سے لٹکی ٹیکتے نکلے اور مجھے آکر کہا کہ ”وجیہہ بی کہتی ہیں کہ آدی شام کی چائے ہمارے ہاں پیئیں گے۔“

یہ فضلو بابا کا مخصوص انداز تھا، وہ وجیہہ بی کی بات کو باقاعدہ حکم کی طرح آکر سنا جاتے اور جواب کا انتظار کیے بنا ہی پلٹ بھی جاتے۔ نخوان کی بہت اچھی نقالی کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر فضلو بابا ہوتے تو وہ لٹکی لے کر نگو کے پیچھے بھاگتے اور ہم سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

میں قوآپی کے گھر میں داخل ہوا تو وہ صحن میں ہی چائے کی میز سجائے بیٹھی تھیں، ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جسے وہ بڑے اٹھناک سے پڑھ رہی تھیں۔ میرے دل میں درد کی ایک ہوک سی اٹھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ تقدیر نے اس میری غزل اور خیام کی رباعی جیسی گل اندام لڑکی کو یہ کس جاہل جلا دے کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔ اُسے تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہو کہ درد اور غالب شاعر تھے یا کسی لائری کمپنی کے ٹکٹ فروخت کرنے والے بروکر۔

پتہ نہیں ظفر نے قوآپی کی نثر اور شاعری کی کتابیں بھی باقی رہنے دی تھیں یا پھر انہیں بھی بیچ کر کھا گیا تھا؟

قوآپی نے مجھے دروازے میں کھڑے دیکھا تو آواز دی۔

”اندر آ جاؤ آدی..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....؟“

میں کچھ جھکتے ہوئے اندر داخل ہو گیا اور ان کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ گیا انہوں نے چائے کپ میں ڈالتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے اتنے دن سے..... قوآپی کی یاد نہیں آتی اب کیا.....؟“

”نہیں..... ایسی بات نہیں ہے..... آپ سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے، پر..... کچھ جھجک سی ہوتی ہے۔“

وہ حیرت سے نظریں اٹھا کر بولیں۔

”جھجک..... کیسی جھجک.....؟“

”وہ..... میں اب بڑا ہو گیا ہوں نا..... اس لیے.....“

میرا جواب سن کر قوآپی زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے..... ہمارا آدی اب بڑا ہو گیا ہے..... واقعی بھی..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا..... اماں..... اماں بات سنیں

نا..... آدی کیا کہہ رہا ہے۔“

http://kitaabghar.com

انہوں نے آوازیں دے کر سیکنہ خالہ کو بھی باورچی خانے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور ہنستے ہنستے انہیں بھی میری کہی ہوئی بات بتائی۔ سیکنہ خالہ بھی زور سے ہنس پڑیں۔ میں دم بہ خود انہیں ہنستے ہوئے دیکھتا رہا..... کتنے دنوں کے بعد اس گھر میں قوآپی کی ہنسی کی آواز گونجی تھی۔ مجھے انہیں ہنستے دیکھ کر بہت ہی اچھا لگا اور میں نے اُسی لمحے اپنے دل میں خدا سے گروگڑا کر دعا کی کہ یا میرے مولا! اس معصوم لڑکی کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی سدا کے لیے دان کر دے۔

اس شام انہوں نے بہت دیر تک مجھ سے بہت سی باتیں کیں۔ کیڈٹ کالج کے بارے میں بھی پوچھتی رہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اگلا سال ہمارا اکیڈمی کا آخری سال ہوگا اور میری بہت خواہش ہے کہ کاش وہ بھی میری پاسبانگ آؤٹ پریڈ دیکھنے کے لیے میرے کالج آئیں۔ اس دن میں

نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں صرف انہی کے کہنے پر واپس کیڈٹ کالج گیا تھا لہذا میری پاسنگ آؤٹ سلامی پریڈی کی اصل حق دار بھی وہی ہوں گی۔

یہ سن کر ان کے لمبے چہرے پر اُداسی کا ایک ہلکا سا بادل چھایا پھر وہ جلدی سے مسکرا کر بولیں کہ وہ پوری کوشش کریں گی کہ کسی طرح وہاں آسکیں۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ان کا میری پاسنگ آؤٹ پر اتنی دُور آنا ناممکن ہے۔ لیکن وہ دُور آپی ہی کیا جو کسی کا دل توڑ دیں.....؟ یہ ہنرتو انہوں نے ساری زندگی سیکھا ہی نہ تھا۔ سو اُس لمحے میرے دل کو بھی انہوں نے اُسی خوبصورتی سے جہلا دیا۔

میری چٹھیاں ختم ہو گئیں اور میں کالج چلا آیا۔ لیکن دُور آپی کی اس شام کی باتیں اور بارہویں جماعت کے بارے میں کی ہوئی نصیحتیں بھی میرے سنگ سنگ تھیں۔ جب کبھی میں ذرا سی دیر کے لیے بھی تھکن دُور کرنے کے لیے آنکھیں موندھ لیتا تب وہی گلابی شام کی ملاقات میرے ذہن کے کسی گوشے سے جھم سے میری آنکھوں میں اتر آتی تھی۔

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغ رسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغ رساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغ رساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطرہ**..... جو کتاب گھر کے جاسوسی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغ رسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابن صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش "Bunk" آخری بنک

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

فہد صاحب کو شک ہو گیا تھا کہ ہم رات کو کہیں نہ کہیں غائب ضرور ہو جاتے ہیں۔ لہذا انہوں نے ہاسٹل کے بیرونی جنگلے کے تالے بدل دیئے تھے۔ ہم ویسے بھی اوپر والی منزل پر تھے اور اس کی راہداری کے آخری جنگلے کی ہم نے جمعہ پیرے کی مدد سے چابیوں کی نقل بنا کر رکھی تھی۔ لیکن بارہویں جماعت میں آتے ہی ہم پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ جنگلہ ہی ختم کر کے وہاں مستقل دروازہ لگا کر گارڈ بٹھا دیا گیا ہے۔ اب ہمارے پاس واحد راستہ چھت سے نیچے اترتے ہوئے پانی کے پائپ تھے، جن سے لنک کر ہم رات کو ٹائٹ فالن کے بعد نیچے اتر آتے اور جلو کے شیرٹن ہوٹل سے کبھی کھانا، کبھی چائے اور کبھی کبھار سی کے گلاس غناٹ چڑھا کر واپس انہی پائپوں کے ذریعے چھت تک پہنچ جاتے اور چھت کی سیڑھیوں سے اندر دوسری منزل کی راہداری تک پہنچ کر سو جاتے۔

ہمارے سالانہ امتحانات قریب آ رہے تھے اور ہم آج کل رات کو بہت دیر تک پڑھتے تھے کیونکہ بارہویں جماعت کے لیے لائٹ آف کی پابندی ان کے امتحانات کے قریب ختم کر دی جاتی تھی۔ ایسے میں موٹے بھٹی کو رات بارہ بجے کے بعد بھوک کا ایک آدھ دورہ ضرور پڑتا تھا، اور وہ ہماری جان کے درپے ہو جاتا کہ کچھ کھانے کے لیے چلا جائے۔

اس رات بھی میں اسفر اور فیصل کیمسٹری کے فارمولے رٹ کر ایک دوسرے کو سنارہے تھے۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے کہ اچانک بھٹی کے پیٹ کی بھٹی انگڑائی لے کر جاگ اٹھی اور وہ ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا کہ اُسے فوراً مرغ چھو لے کھانے کو چاہئیں۔ کچھ دیر تو ہم اس کی بک بک نظر انداز کرتے رہے پھر اسفر نے تنگ آ کر کتاب پھینک دی۔

”یار پہلے اس موٹے کا کچھ کرو..... اس کی باتیں سن سن کر تو مجھے بھی بھوک لگنے لگی ہے۔“ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اصل میں ہم سب کا دل بنک کے لیے مچل رہا ہوتا تھا لیکن ہم سب بھٹی کے بولنے کا انتظار کرتے رہے تاکہ کسی مصیبت کی صورت میں ہمیں الزام دینے کے لیے کسی کا کندھا دستیاب ہو۔

ہم نے مجید چھوٹو سے بھی پوچھا کہ کیا ارادہ ہے۔ وہ پہلے ہی سے چھت پر بیٹھا چاند کی روشنی میں ریاضی کے تصورات اپنی موٹی کھوپڑی میں گھسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے فوراً کتاب دُور پھینک دی کہ جب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں جائے گا، وہ کچھ بھی رٹ نہیں پائے گا۔ ہمارا اصول یہ تھا کہ ہم ایک ایک کر کے چھت سے نیچے اترتے تھے۔ سب سے پہلا لڑکا اترنے کے بعد کچھ دیر آس پاس کا جائزہ لیتا اور پھر ہلکی سی سیٹی بجا کر اشارہ کرتا تب دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا اور چوتھا لڑکا پائپ سے لٹکتے ہوئے نیچے اتر جاتا۔ سب سے پہلے مجید چھوٹو نے

آستینیں اوپر کیں اور چھت کی منڈیر پر پاؤں نیچے لٹکا کر پائپ ہاتھوں سے تھام لیا اور نیچے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک اُس کے سنگل کا انتظار کرتے رہے لیکن نیچے سے سوائے ایک ’دھپ‘ کی آواز جو شاید مجید چھوٹو کے کودنے کی آواز تھی، دوسری کوئی آواز نہیں آئی۔ آصف بھی جس کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا اس نے مجید کو کئی صلواتیں سناتے ہوئے کہا کہ وہ پھر سیٹی بجانا بھول گیا ہوگا لہذا بھٹی نے پائپ تھاما اور وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم نے پھر چند ہی لمحوں میں بھٹی کے اترنے کی آواز تو سنی لیکن اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ اب میں، فیصل اور اسفر چھت پر رہ گئے تھے۔ ہم شدید الجھن میں تھے کیونکہ اگر نیچے کسی پیٹی آفیسر وغیرہ نے انہیں بھاگتے ہوئے پکڑ بھی لیا ہوتا تو شور شرابہ تو ہوتا۔ یہ دونوں تو نیچے جا کر بالکل ہی چپ ہو گئے تھے۔ اب فیصل کو غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ضرور یہ دونوں کسی شرارت کے چکر میں ہیں۔ لہذا وہ خود جا کر دیکھتا ہے۔ فیصل اتر ا اور پھر وہی خاموشی..... میں اور اسفر اوپر چند لمحوں انتظار کرتے رہے اور پھر میں نے اسفر سے کہا کہ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ میں نیچے جا رہا ہوں لیکن اگر اگلے پانچ منٹ تک میری سیٹی کی آواز اُسے سنائی نہ دے تو وہ نیچے نہ اترے بلکہ وہیں چھت پر ہمارا انتظار کرے یا پھر نیچے ڈار میٹری میں جا کر ہمارے لیے ”گمک“ کا بندوبست کرے۔

میں نے دل ہی دل میں ان تینوں کو سخت سناتے ہوئے پائپ کو تھاما اور چھت کی منڈیر سے نیچے اتر کر پائپ سے لٹکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ ابھی تین چار فٹ ہی نیچے اترے ہوں گا کہ اچانک مجھے یوں لگا کہ جیسے میں خلا میں تیر رہا ہوں۔ پائپ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں کسی نرم اور لچکالی چیز پر آ کر گر کر، زوردار دھپ کی آواز آئی اور کسی کی ہائے کی آواز کے ساتھ ہی میرا ذہن ڈوب گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے اوپر کوئی بوری آ کر گری اور اس بار ہائے کی آواز نکالنے کی باری میری تھی۔ کچھ دیر تک ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ میرے بازو میں، جو نیچے ٹکرایا تھا شدید درد ہو رہا تھا۔

پھر سب سے پہلے میرے حواس اس وقت یکجا ہوئے جب بھٹی نے زور سے ’ہائے مر گیا‘ کا فریادی نعرہ لگایا۔

ہم پانچوں نیچے زمین پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے اور میرے اوپر گرنے والا بوجھ کسی بوری کا نہیں تھا بلکہ اس احمق اسفر کا تھا جو میری ہدایت کے باوجود چھت سے اترنے کی حماقت کر بیٹھا تھا۔ ہم نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ پائپ جس سے لٹک کر ہم نیچے اترتے تھے، چھت سے تین فٹ کی لمبائی تک نیچے آنے کے بعد یک دم ہی غائب ہو چکا تھا، لہذا خلا میں تیرنے کا جو تجربہ ابھی کچھ دیر پہلے ہم سب ہی کو ہوا تھا وہ اسی پائپ کے اچانک ختم ہو جانے کی وجہ سے تھا۔ ہم پانچوں دوسری منزل سے پائپ ختم ہونے کے بعد ہوا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے سیدھے نیچے زمین پر ”دھپ دھپ“ گرتے رہے اور ہم سب میں سب سے زیادہ بُری حالت مجید چھوٹو کی تھی۔ جو سب سے پہلے چھت سے اتر تھا۔ اُتر آیا تھا کسی ٹوٹے جہاز کی طرح رن وے پر گرا تھا۔ ہم نے بمشکل ادھر ادھر ہو کر اپنے نیچے سے مجید چھوٹو کو ڈھونڈ کر نکالا۔ وہ بالکل ہی بے سُدھ پڑا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم سب نیچے گھدی ہوئی کیاریوں میں سے ایک کے اندر آ کر گرے تھے، ورنہ اگر زمین سخت ہوتی تو شاید ہماری ہڈی پستلی ایک ہو جاتی۔ لیکن اس وقت بھی ہم سب کی حالت انتہائی مخدوش تھی۔ مجید چھوٹو اور بھٹی تو باقاعدہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ جنہیں ہم بڑی مشکل سے گھیٹ گھیٹ کر کیاریوں کو پانی دینے والے فورے سے منہ پر پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لائے۔

ابھی ہم اپنے ہواس بحال بھی نہ کر پائے تھے کہ اچانک ہی چاند گاڑی کی روشنی براہ راست ہمارے اوپر آ کر پڑی۔ ہم میں اس وقت اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر بھاگ ہی جاتے یا کسی درخت یا جھاڑی کے پیچھے چھپ جاتے۔ کچھ ہی دیر میں بخشوی۔ پی۔ او ہمارے سر پر ٹارچ تانے کھڑا حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا کہ یہ آدھی رات ہم پانچوں ان کیاریوں میں لیٹ کر کون سی باغبانی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ رات کو سبزے میں لیٹ کر پڑھنے سے سبق جلدی ذہن نشین ہوتا ہے لیکن اس نے ہماری ایک نہیں سنی اور ہمیں اٹھ کر اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم اٹھ کر چل سکتے تو اب تک جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے جہاں سی۔ پی۔ او کے فرشتے بھی ہماری خبر نہ پا سکتے۔ سب سے پہلے اسفر نے اٹھ کر ”چلنے“ کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے لڑکھڑا کر دوسری کیاری میں زمین بوس ہو گیا۔ اب بخشو کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوا اور کچھ ہی لمحوں بعد ہم سب کو چاند گاڑی میں ڈال کر ڈاکٹر نو کے ہسپتال کی جانب لیجا یا جا رہا تھا۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ اگلے دن ہم پانچوں ہاتھوں اور پیروں پر پلاسٹر چڑھائے ہسپتال کے وارڈ میں ایک لائن سے بستروں پر لٹے ہوئے تھے۔ یہ پلاسٹر اگلے چار ہفتے کے لیے ہمارے جسموں پر منڈھا گیا تھا۔ پتہ چلا کہ گزشتہ شام ہی مزدوروں نے فہد صاحب کے کہنے پر وہ پائپ کاٹ کر علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ دوسری جانب نئے پائپ ڈال دیئے گئے تھے اور اب وہ پرانے پائپ متروک ہو چکے تھے۔ بہر حال یہ ہمارا آخری بینک ثابت ہوا کیونکہ چار ہفتے بعد جب وہ پلستر ہمارے جسموں سے اترا تو دو دن بعد ہمارے سالانہ امتحانات کے پرچے شروع ہونے کی تاریخ تھی اور سالانہ امتحان کے بعد ہماری آخری پابنگ آؤٹ پریڈ ہونا تھی۔ اس رات کے زخموں کے نشان ایک میٹھی یاد بن کر ہمیشہ کے لیے ہمارے جسموں پر ثبت ہو کر رہ گئے تھے، جو ہمیشہ ہم پانچوں کو اس آخری اور نامکمل بینک کی یاد دلاتے رہے۔

کتاب گھر کی پیشکش **حُسنہ اور حُسن آراء**

حُسنہ اور حُسن آراء اور حاضری مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کی 4 تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ایک کہانی حسنہ اور حُسن آراء پہلی بار آپ کے سامنے آرہی ہے۔ عمیرہ احمد کا TV کے لئے یہ پہلا مٹی سیریل بھی تھا اور یہ TV کی تاریخ کے مہنگے ترین مٹی سیریلز میں سے ایک تھا..... اپنی تھیم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متنازعہ لگے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ حیران کن اور متنازع ہے۔ **حُسنہ اور حُسن آراء** کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے ناول سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش

رشتوں کی سولی

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

وَجَوَآپنی کے غموں کی داستان ظفر کی بے روزگاری سے شروع ہوئی تھی یا پھر یہ ان کے درد کی آخری حد تھی۔ اس کا فیصلہ کبھی کوئی نہیں کر پایا۔ تاہم میں آخری کیل اسی روز ٹھونک دی گئی تھی جب ظفر نے جوئے کی پہلی بازی دوستوں کے کہنے پر اس امید پر کھیلی کہ شاید جس دولت کے انبار کی کھوج وہ باہر بازار میں کر رہا تھا، وہ یہاں اس بند کمرے کے دھوئیں بھرے ماحول میں لگی اس بازی کے ذریعے اس کے قدموں میں اپنا ماتھا ٹیک دے۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا ”جواء..... کسی کا نہ ہوا.....“ تو پھر وہی جواء ظفر پر کیسے مہربان ہو سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو کچھ جیب میں تھا وہ ہاتھ کی گھڑی اور سُسرال کی جانب سے پہنائی گئی انگوٹھی سمیت وہیں کمرے کی میز پر چھوڑ کر نکلتا پڑا، ساتھ ہی ساتھ گلے میں اچھے خاصے قرض کا طوق بھی پڑ چکا تھا۔

ظفر نے حسب معمول یہ سارا بوجھ گھر آ کر جَوَآپنی کے نازک کندھوں پر دے ڈالا اور پھر سے انہیں ایک لمبی رقم کی وصولی کے لیے غیاث چچا کے پاس جانے کے لیے کہا، لیکن جَوَآپنی جانتی تھیں کہ اب ان کے میکے کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اپنا زیور اور چند قیمتی چیزیں جو وہ اپنے جہیز میں لائی تھیں، وہ سب کا سب پہلے ہی ظفر کے حوالے کر چکی تھیں۔ لہذا پہلی بار انہیں ظفر کو ناں کہنا پڑا اور یہی ناں ظفر کو آگ بگولہ کرنے کا باعث بن گئی۔ اس نازک سی چھٹانک بھڑلڑکی کی یہ مجال کہ وہ اس کو ناں کہے۔ وحشی پن میں وہ رشتوں کا احترام بھی بھلا بیٹھا اور اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جَوَآپنی کے چہرے پہ اپنا نشان چھوڑ گیا۔

راجہ کے خط مجھے اب بھی اُسی تسلسل سے آتے تھے۔ اور وہ آس پاس کی سنی سنائی اور اپنی آنکھوں دیکھی ہر اہم خبر کی تفصیل مجھے لکھ کر بھیجتا تھا۔ پھر ایک دن اس کے ایک خط نے میرے بہت سے پرانے زخم ادھیڑ کر رکھ دیے۔ راجہ نے لکھا تھا کہ بالآخر ظاہر بھائی کے قتل کے پانچ سال بعد اُنکو کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہوئی گئی اور اس بار یہ حتمی تاریخ تھی۔ کیونکہ اس کی تمام اپیلیں مسترد ہو چکی تھیں۔ ہمارے سالانہ امتحانات سے ٹھیک ایک ہفتہ قبل یعنی بائیس (22) اپریل اس کی پھانسی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔

حالانکہ محلے کے ہر فرد نے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کیا تھا لیکن کوئی ایک ہستی ایسی بھی تھی، جس کا چین اور سکون اس خبر نے لوٹ لیا تھا..... اور وہ بد نصیب تھی اُنکو کی ماں..... جب تک کیس چلتا رہا اور لوگ اس کے بیٹے کے ظلم کی داستانیں بیان کرتے رہے، وہ خود جھولی آسمان کی جانب اٹھا اٹھا کر اُنکو کو بدو عائیں دیتی رہی، لیکن جب حکومت نے اس کی موت کی تاریخ مقرر کر دی تو ماں کا صبر و قناعت ہی لٹ گیا۔ کچھ بھی ہو..... ماں آخر ماں ہی تو ہوتی ہے اُس نے جس اُنکو کو نو ماہ پیٹ میں اور پھر اپنے ہاتھوں کے پالنے میں جھولا جھلا کر بڑا کیا تھا، اسے سولی پر لٹکتا کیسے دیکھ سکتی تھی.....؟

بالے نے راجے کو بتایا تھا کہ جس دن سے اس کی ماں کو انکو کی پھانسی کا پتہ چلا تھا، اسی دن سے وہ راتوں کو اچانک ہی جاگ اٹھتی اور صحن کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس کے اندر کا اضطراب اس کے چہرے سے ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا اور کوئی اس سے بات کرے تو وہ یوں پھونک پڑتی تھی، جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ ہر گزرتا دن انکو کی پھانسی کی تاریخ کو قریب لاتا جا رہا تھا اور انکو کی ماں کے چہرے سے خون کا رنگ مٹتا جاتا اور وہ روز بروز پیلی پڑتی جاتی تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اور پھر آخر کار وہی ہوا جس کے لیے مائیں مشہور ہیں، انکو کی ماں بھی اپنے دل سے ہار گئی اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بالے کے ابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ وہ اس کے ساتھ طاہر بھائی کے اماں ابا کے گھر جا کر ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیں کہ ان کے بیٹے کے اس گناہ عظیم کو بخش دیا جائے۔ انکو کے باپ نے یکسر انکار کر دیا کہ آخر وہ کس منہ سے ایک مقتول بیٹے کے غم زدہ ماں باپ کے زخموں پر مزید نمک چھڑکنے جائے گا۔ ماں نے وہاں بات بنتی نہ دیکھی تو خود ہی اپنی بیٹی کو لیکر عزیزہ خالہ کے در پر جا کر بیٹھ گئی، اس روز سارا محلہ اس کی آہ و بکا سے لرزتا رہا، سبھی محلے داروں کو انکو کی ماں سے ہمدردی بھی تھی لیکن انکو کا جرم ہی ایسا تھا کہ اس ظلم کے آگے ہر ہمدردی بچ تھی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

انکو کی ماں نے اب اپنا یہ وطیرہ بنالیا تھا کہ وہ صبح سویرے طاہر بھائی کے گھر کے باہر آ کر بیٹھ جاتی اور رات گئے تک چپ چاپ بنا کچھ کھائے پیئے وہاں پڑی رہتی اور گھر سے باہر آتے جاتے ہر شخص سے انکو کو معافی دلوانے کی فریاد کرتی۔ رفتہ رفتہ اس کی اپنی حالت بھی لمبے فاقوں کی وجہ سے بگڑنے لگ گئی تھی اور کئی مرتبہ وہ وہیں دروازے کے پاس بے ہوش پڑی ملتی۔ تب انکو کے ابایا کوئی اور ہمدرد اسے اٹھا کر گھر بھجوا دیتے۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ پھر اُسی در پر ہاتھ ٹیکے ہوئی نظر آتی۔ اُس کی حالت ایسی تھی کہ طاہر بھائی کے ابا شکور چچا خود ایک روز اُس پر غصے سے برستے برستے رو پڑے کہ وہ کیوں روزانہ ان کے خاندان کے زخمی دلوں کو مزید گھائل کرنے کے لیے یہاں آ جاتی ہے۔ جب ایک بار اُس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی صورت انکو کو معاف نہیں کر سکتے اور اسے پھندے پر لٹکتا دیکھ کر ہی ان کے زخم کچھ مندمل ہو سکتے ہیں تو پھر روزانہ کی اس بحث سے کیا حاصل.....؟

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

لیکن یہاں مسئلہ صرف انکو کی سولی کا نہ تھا۔ وہ تو سولی پہ لٹک کر ہمیشہ کے لیے نجات پا جاتا اور اگلے جہاں میں اپنے گناہوں کا حساب دیتا پھرتا لیکن اس کے پھندے پر لٹکنے کے بعد یہاں دنیا میں اس کے اپنوں کو مرتے دم تک جس سولی پر ٹنگا رہنا تھا اس کا حساب دینے والا کوئی نہ تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ انکو کے ماں باپ کس قدر بھلے لوگ تھے اور سبھی کا دل ان کی اس اذیت سے کٹتا جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی جس نے جرم کیا تھا وہ تو چند لمحے پھندے پر چھوٹنے کے بعد بڑی ہو جائے گا لیکن جو بے قصور ہیں وہ ساری عمر اُسی سولی پر چھوٹتے رہیں گے۔ یہ کیسا انصاف تھا؟؟

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پھر سب سے پہلے یہ بات طاہر بھائی کے ابا کی سمجھ میں آ گئی کہ پھندہ صرف انکو کے گلے میں نہیں، بلکہ نہ جانے اور کتنی جانوں کو لگے گا، اور شاید ان میں انکو کے خاندان کو عمر بھر پھانسی پر لٹکتے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی لہذا ایک ذہلی شام جب انکو کی ماں اپنی ویران آنکھیں لئے ان کے دروازے کے سامنے، مٹی میں خاک ہوئی پڑی تھی، انہوں نے گھر سے چادر لا کر اس پر ڈال دی اور اسے اٹھا کر اپنے گھر کے صحن میں لے آئے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

عزیزہ خالہ نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا اور اپنے میاں کو دھکی دے دی کہ اگر انہوں نے ان کے بیٹے کے قاتل کو معاف کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو وہ ان کا مرا ہوا منہ دیکھیں گے۔ انکو کی ماں عزیزہ خالہ کے کمرے کے دروازے سے سر بیچ بیچ کر

لہو لہان ہوئی لیکن وہ دروازہ اُس پر کبھی نہ کھلا۔

شکور پچانے بالے کے ابا کو پیغام بھجوایا کہ انہوں نے اپنے خدا کے لیے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا ہے لیکن وہ اُس کی ماں کے ہاتھوں مجبور ہیں، جس کا دل اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھنے کے بعد پتھر ہو چکا ہے۔ لہذا وہ اس دوسری ماں کو آکر سنبھالیں جو اپنے بیٹے کی جان بچانے کے لیے خود اپنا آپ گنوائے دے رہی ہے، اور وہ چاہ کر بھی اُس کے لیے کچھ نہیں کر پار ہے کیونکہ اگر وہ دوسری ماں کا ساتھ دیتے ہیں تو اپنی آخری عمر کے سہارے یعنی اپنی شریک حیات کو ہمیشہ کے لیے کھودیں گے۔

بالے کے ابا بالے کے ساتھ آئے اور نیم بے ہوش سی اٹو کی ماں کو وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے طاہر بھائی کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی کہ یہ بھی انہی کا ظرف ہے کہ اپنے بیٹے کے قاتل کی ماں کو انہوں نے اس قدر عزت دی۔ اگلی صبح اٹو کی پھانسی کی تاریخ مقرر تھی اور وہ رات بالے کے گھرانے پر کس قیامت کی طرح اتری تھی، شاید اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

اگلی صبح چار بجے جیل کے معمول کے مطابق، گاڑی طاہر بھائی کے دروازے پر ان کے اماں ابا کو بطور وارث پھانسی گھاٹ پر پھانسی کی شہادت کے لیے لینے آ چکی تھی۔ خالہ عزیزہ اور شکور پچا چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر جیل کی جانب روانہ ہو گئے جیل کے باہر اندھیرے میں انہیں اٹو کے ماں باپ بھی کھڑے نظر آئے جو اپنے بیٹے کی لاش وصول کرنے کے لیے وہاں خود لاش بنے کھڑے تھے۔ اٹو کی ماں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور اب وہ خالی آنکھوں سے خلا میں گھور رہی تھی۔ جیلر شکور پچا اور خالہ کو لے کر پھانسی گھاٹ پہنچ گیا تھا اور ڈاکٹر، مجسٹریٹ اور جلا بھی اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں اٹو کو کمر پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ دو محافظ لے آئے۔ اٹو کے پیروں میں جان بالکل بھی نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنے محافظوں کے کاندھوں پر بوجھ ڈالے تقریباً لگتا ہوا پھانسی گھاٹ تک لایا گیا تھا۔ اس کا سڈول جسم سوکھ کر کاٹنا ہو چکا تھا اور آنکھوں کی روشنی بچھ چکی تھی۔

شکور پچا اور خالہ عزیزہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جلا دکواٹو کے چہرے پر سیاہ کپڑا ڈھانپتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھانسی کا پھندہ اس کے گلے میں ڈال کر جلا دکڑی کے تختے کا لیور کھینچنے کے لیے اپنی جگہ پر جا پہنچا تھا۔ مجسٹریٹ صاحب کی نظر ان کی گھڑی پر تھی تاکہ وہ ایک سیکنڈ کی بھی جلدی یا تاخیر کے بغیر جلا دکو لیور کھینچنے کا اشارہ کریں۔

جیلر نے آخری مرتبہ عزیزہ خالہ اور شکور پچا کی طرف دیکھ کر تصدیق چاہی اور دونوں کی خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے مجسٹریٹ سے اجازت کی درخواست کی۔ مجسٹریٹ نے وقت پورا ہوتے ہی جلا دکو اشارہ کیا اور جلا دنے لیور کھینچنے کے لیے اپنی طاقت مجتمع کر کے لیور پکڑ لیا۔ مجسٹریٹ نے اپنا رومال ہلا دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک کرب ناک چیخ اُبھری اور دم توڑ گئی۔

عزیزہ خالہ کو آخری لمحے میں جیسے کسی نے نیند سے ٹھنڈے برف پانی کی پوری بالٹی پھینک کر جگا دیا ہو۔ وہ ایک جھرجھری لے کر جا گئیں اور زور سے چیخ پڑی تھیں۔

”معاف کر دیا..... میں نے اسے معاف کر دیا..... میں نے اسے اپنے اللہ کے واسطے اور اپنے طاہر کے صدقے معاف کر دیا.....“

عزیزہ خالہ روتی جاتیں اور یہی گردان کئے جاتیں..... جلاؤ نے جلدی سے اُٹو کے چہرے سے غلاف ہٹایا۔ پھانسی کا قیدی ویسے ہی اودھ مرا ہوتا ہے اور پھر جو قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ کر پھندہ بھی گلے میں ڈلوچکا ہو، اس کے حواس تو بالکل ہی غائب ہوتے ہیں۔ اس لیے اُٹو کو بھی ہوش میں آنے اور یہ یقین کرنے میں بہت دیر لگی کہ اُسے طاہر بھائی کے ماں باپ نے بخش دیا ہے۔ چند لمحوں میں وہ اجنبی اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان سب کو دیکھتا رہا اور پھر جو وہ پتھر ٹوٹ کر رو دیا تو یوں برسا کہ اُس نے اپنے آس پاس کی ہر آنکھ کو ڈبو دیا۔ اُٹو کی فلک شکاف چیخوں سے ساری جیل گونج رہی تھی اور وہ یوں بچوں کی طرح زار و قطار رو رہا تھا کہ جیسے اپنی عمر بھر کے آنسو آج ہی بہا دے گا۔ اس نے اپنا سر عزیزہ خالہ کے قدموں میں رکھ دیا اور اپنا سر زمین پر پٹخ پٹخ کر لہو لہان کر دیا۔ اُس کے اندر کا انسان جاگا لیکن بہت دیر کے بعد.....

باہر جب اُٹو کے ماں باپ کو اس کی زندگی کی نوید ملی تو انہیں سجدہ شکر ادا کرنا بھی یاد نہیں رہا، وہ دونوں سجدے میں تو گرے لیکن تسبیح تک بھول گئے۔ یہ ایک ایسی شادی مرگ کی کیفیت تھی جسے انسانی لفظوں میں بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کا اپنا کوئی جگر کا کٹرا موت کی دہلیز کو چھو کر واپس پلٹنا ہو۔

عزیزہ خالہ نے اُٹو کی جان بخشی کر دی، لوگ ان کی عظمت کے ایسے قائل ہوئے کہ ان کی محبت عقیدت میں بدل گئی۔ چند دن بعد اُٹو کو بھی اس راضی نامے اور معافی نامے کے بدلے جیل سے رہائی مل گئی کیونکہ اپنی قید کی سزا وہ پہلے ہی ان پانچ سالوں میں پوری کر چکا تھا، لیکن جیل سے باہر آنے والا اُٹو وہ اُٹو نہیں تھا جو اندر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ایسا بدلا ہوا انسان تھا، جس نے اسی دنیا میں اپنی ہر غلطی کے مداوے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

اُٹو کو تو قید سے رہائی مل گئی تھی لیکن اُس کی کرنی کی وجہ سے قیوآپی جس قفس میں جاگری تھیں اس قید سے وہ کبھی رہائی نہیں پاسکیں۔ ظفر کے مطالبے دن بدن بڑھتے جا رہے تھے اور ان کے بوڑھے ماں باپ کے پاس اب ایسا کچھ نہیں بچا تھا جو وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی نذر کر سکتے۔ حتیٰ کہ غیاث چچا نے اپنا جی۔ پی فنڈ بھی دفتر سے نکلوا کر ظفر کی فرمائشوں کی نذر کر دیا تھا۔ لیکن ایک بے کار اور گھر میں چار پائی توڑتے ہوئے شخص جس کی جھوٹی شان اور دوستوں کے دکھاوے کے لیے لٹانے کی کوئی حد نہ ہو اس کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی ہو تو کم پڑتا تھا، لہذا اس کی قیوآپی سے نکرار بھی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اب تو اس کا ہاتھ بھی کھل چکا تھا لہذا وہ گاہے بگاہے قیوآپی پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن قیوآپی کو خدا نے جس مٹی سے بنایا تھا اس میں شکایت یا اُف تک کرنے کا خیر شامل نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی انہوں نے اپنے ماں باپ ہی کو اس بات کی کبھی بھٹک بھی پڑنے دی کہ ان کی وہ بیٹی جسے اپنے گھر میں گرم ہوانے بھی کبھی نہیں چھوا تھا اور جس کی زبان سے اُف نکلنے سے پہلے ہی ہر کوئی اپنی پلکیں اس کی راہ میں بچھا دیتا تھا وہ اب کس حال میں ہے۔ لیکن وہ نہ بھی بتائیں تو کیا ہوتا؟..... غیاث چچا کی جہانمیدہ نظریں کیا ایسا ہر راز پانے کی صلاحیت نہ رکھتی تھیں؟ اور کیا ان کی چیمپی اماں، جو ماں ہونے سے زیادہ ان کی سیمپلی بھی تھیں، کیا انہیں اپنی بیٹی اور سیمپلی کی آنکھوں میں یہ سب کچھ دکھائی نہ دیتا ہوگا؟ ظفر کی چڑچڑاہٹ بڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے اب اندازہ ہو چلا تھا کہ قیوآپی کے میکے پاس انہیں دینے کے لیے اب کچھ نہیں بچا تھا، ان تلوں میں جتنا بھی تیل تھا وہ پہلے ہی نچوڑ چکا تھا۔ اُٹو کا معاملہ اس کی پھانسی ٹلنے سے ایک بار پھر اٹھا تو اس کے ہاتھ و جو کو طعنے اور طعنوں سے چھلنی

کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا، اب وہ بہانے بہانے سے اٹھو اور طاہر بھائی کے جھگڑے اور قتل کا ذکر چھیڑ دیتا اور وہ جو کو گھائل کرنے کے لیے لفظوں کے ایسے ایسے تر چلاتا کہ اس معصوم لڑکی کی سانس ہی رکنے لگتی۔ کبھی کہتا کہ غیاث پچھانے اُسے دھوکے میں رکھ کر یہ شادی کروائی ہے۔ کبھی کہتا کہ اگر اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ وہ جو کا قصہ طاہر بھائی کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ کبھی اس گڑھے میں نہ گرتا۔ ظفر کمینگی کی اس حد تک گر چکا تھا کہ اس نے اٹھو کے ساتھ بھی وہ جو کا نام جوڑ دیا اور اس کو عزیزہ خالہ کی طرف سے جو معافی ملی تھی، اُسے بھی اُس نے وہ جو کی کوششوں کے کھاتے میں ڈال دیا کہ ضرور انہوں نے محلے جا کر طاہر بھائی کے ماں باپ کو مجبور کیا ہوگا کہ اٹھو کو معاف کر دیں، تاکہ ان کا ایک عاشق تو دنیا میں انہیں سراہنے کو زندہ باقی رہے۔

پھر ایک دن تو حد ہی ہو گئی جب ظفر نے باقاعدہ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر باہر کے دروازے پر لا کھڑا کیا کہ یا تو گھر سے کچھ رقم لے کر آئیں یا پھر ہمیشہ کے لیے اُس کے گھر سے نکل جائیں۔ اور گھر بھی اس کا کہاں تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے مالک مکان روزانہ کرائے کے تقاضے کے لیے دروازے پر صبح سویرے ہی آن موجود ہوتا۔ ظفر خود تو اُس سے جان چھڑانے کے لیے اب باہر نکلتا ہی نہیں تھا اور بے چاری وہ جو کو شرمندہ ہونے کے لیے دروازے پر بھیج دیتا۔ ڈھونڈ بھلا آج تک اپنی پوری زندگی میں ایسے معاملات کہاں جھیلے تھے۔ انہیں تو کسی غیر مرد سے بات کرنے کا کبھی کوئی اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ گھر میں تو فضلو بابا اور ان کے ابا ساری بیرونی دنیا سے ان کے رابطے کا ذریعہ تھے اور پھر میں بھی تو تھا۔ میں نے کبھی انہیں کسی ٹھیلے والے سے یا سائیکل رکشہ والے سے بھی کبھی بات نہیں کرنے دی تھی۔ جہاں کہیں رابطے کی ضرورت ہوتی میں، فضلو بابا یا غیاث پچھا ہمیشہ ان کی مدد کو موجود ہوتے۔ پتہ نہیں مجھے کبھی بھی یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ ڈھونڈ کسی بھی ایرے غیر مرد سے بات کریں۔ اس کام کے لیے ہم سب جو موجود تھے۔ خود ڈھونڈ بھی میری اس عادت کا پتہ تھا اور جب کبھی رکشے یا تاکے والے کو کرایہ دینا ہوتا یا پھر محلے میں پھیری والے سے کچھ منگوانا ہوتا تو وہ پہلی آواز مجھے ہی دیتیں اور اگر میں اس وقت نہ بھی ہوتا تو کسی اور بچے یا فضلو بابا کے ذریعے کہلوا بھیجتیں۔

اب ایسے میں جب انہیں مالک مکان کو کرایہ نہ دینے کی تاویل میں پیش کرنا پڑتی ہوں گی تو وہ کس اذیت سے گزرتی ہوں گی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ مالک مکان اچھے خاندان سے تھا اور وہ ظفر کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایک شریف گھرانے کی عفت مآب بیٹی اُس کم ظرف کے گھر آ چھنی ہے، اس لیے وہ جو کو دروازے پر دیکھ کر وہ زیادہ بحث کئے بنا ہی وہاں سے پلٹ جاتا تھا۔

لیکن گھوڑا اگر گھاس سے دوستی کر لے تو پھر کھائے کیا.....؟ آخر کار پانچویں مہینے اُسے ڈھونڈی سے کہنا ہی پڑا کہ ان حالات میں تو اُس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ ظفر کے نام وکیل سے کہہ کر نوٹس نکال دے کہ اگلی پہلی سے مجھے مکان خالی کر دے، ورنہ معاملہ پولیس میں دے دیا جائے گا۔ پولیس کا نام سن کر ڈھونڈی سرا سیمہ ہو گئیں اور انہوں نے دروازے کی اوٹ سے پہلی مرتبہ مالک مکان، جنہیں وہ سب خان صاحب کہتے تھے، سے درخواست کی کہ جہاں اس نے اتنا انتظار کیا ہے، کچھ دن کی مزید مہلت دے دیں، وہ کوشش کریں گے کہ جلد از جلد کرایہ اُتار دیں۔ خان صاحب نے جواباً کہا کہ وہ صرف ڈھونڈی کے کہنے پر ظفر کو مزید کچھ وقت دے رہا ہے لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہے کہ ظفر کبھی ان کا کرایہ نہیں چکائے گا۔ اُس نے ڈھونڈی سے کہا کہ اُسے ان پر ترس آتا ہے کہ ایک عزت دار خاندان کی لڑکی یہ

کس ذلت کے گڑھے میں گر گئی ہے۔ اس نے قوآپی کے سامنے ایک پیش کش رکھی جس سے اس کا کرایہ بھی ادا ہو جاتا اور خود قوآپی کا ہاتھ بھی کچھ گھٹنے کا آسرا ہونے کی امید تھی۔ قوآپی نے کہا کہ وہ خان صاحب کی بات غور سے سن رہی ہیں۔ وہ گھل کر بات کریں۔ خان صاحب نے بتایا کہ ان کے ایک جاننے والے پشاور سے اس شہر میں اپنی تعیناتی پر آئے ہیں۔ عہدے میں ریل کے بڑے افسر ہوتے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں، دس سال کا ایک بیٹا اور آٹھ سال کی ایک بیٹی، دوسرے صوبے سے ٹرانسفر ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم درمیان میں ہی منقطع ہو گئی تھی اور جب تک انہیں اس شہر کے اسکول میں داخل کروایا گیا تو تب تک دونوں بچے اصل کورس سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ خان صاحب نے قوآ سے کہا کہ اُن کے دوست نے انہیں کسی ٹیوٹر کا بندوبست کرنے کا کہا ہے۔ اگر قوآ مناسب سمجھیں تو دن میں دو گھنٹے ان کے بچوں کو پڑھا دیا کریں۔ اس طرح سے جو رقم انہیں فیس کے طور پر ملے گی اس کا آدھا وہ خان صاحب کو کرائے کے طور پر ادا کر دیا کریں اور آدھی رقم سے اپنا گھر چلا لیا کریں۔ خان صاحب نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوست سے کہہ کر قوآ کا معاوضہ بھی دوسرے کسی ٹیوٹر سے کافی زیادہ مقرر کروادیں گے۔ شاید مالک مکان بہت پہلے ہی قوآپی کے لب و لہجے اور ان کے تہذیب اور رکھ رکھاؤ کے اطوار سے یہ بات جان چکا تھا کہ قوآپی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ تبھی اس نے یہ پیش کش کی تھی۔ قوآپی نے خان صاحب سے کہا کہ وہ اپنے میاں سے بات کر کے انہیں بتائیں گی۔ خان صاحب انہیں دعا دے کر واپس پلٹ گئے اور قوآپی واپس پلٹی تو ان کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ظفر جانے کب سے ان کے پیچھے کھڑا ان کی اور خان صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ دراصل جب قوآ کچھ دیر دروازے سے نہیں پلٹیں تو اس کی شکی مزاج طبیعت نے فوراً اس کے ذہن میں گھد بد شروع کر دی اور وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے وجود کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے وجود کی اور مالک مکان کی ساری باتیں سُن لی تھیں۔ قوآ کو اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی، اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں، اسے اور کیا چاہیے تھا۔ گھر میں پڑے پڑے بیوی کی کمائی کھانے کا موقع مل رہا تھا۔ اُس نے قوآپی کو حکم دیا کہ وہ کل سے ہی ٹیوشن پڑھانے کے لیے جانا شروع کر دیں اور کوشش کریں کہ دو تین ماہ کا معاوضہ ایڈوانس ہی مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ اگلے دن خان صاحب آئے تو قوآ نے ان سے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے اکیلے جانے سے معذوری کا اظہار بھی کر دیا کہ انہوں نے کبھی اپنے میکے سے بھی اکیلے باہر قدم نہیں رکھا لہذا اگر ہو سکے تو بچوں کو شام یہیں ان کے گھر بھجوا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ خان صاحب نے بتایا کہ بچوں کا تو یہاں آنا ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ دونوں بہت ضدی ہیں، اور بمشکل ٹیوشن پڑھنے پر ہی رضامند ہوئے ہیں۔ اب ایسے میں ان پر مزید کوئی شرط رکھی گئی تو بالکل ہی بدک جائیں گے ہاں البتہ ریحان صاحب (خان صاحب کے دوست) ہر روز شام چار بجے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت بھجوا دیا کریں گے جو دو گھنٹے بعد انہیں گھر واپس چھوڑ جایا کرے گی۔ قوآپی کیا کہہ سکتی تھیں۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے چپ ہو رہیں۔

غیاث چچا اور سکیٹہ خالہ کو جب قوآپی کی نوکری کا پتہ چلا تو ان دونوں کے دل میں جیسے تیر سا گڑھ گیا۔ غیاث چچا تو ویسے بھی تقریباً بستر ہی سے لگ چکے تھے اور اب ان کی طبیعت زیادہ تر نڈھال ہی رہتی تھی۔ سکیٹہ خالہ بھی بہت دن تک چھپ کر روتی رہیں۔ جانے ان کی وجہ یہ کی قسمت میں ابھی مزید کتنے عذاب جھیلنے لکھے تھے۔

کتاب گھر کی پیشکش پہلا انقلاب

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

چار ہفتے بعد ہم پانچویں کے پلستر کھل گئے اور دو دن کے بعد ہمارے سالانہ امتحانات شروع ہو گئے۔ یہ ہمارے اس کالج میں آخری امتحانات تھے۔ آج سے چھ سال پہلے جب میں اس کالج میں داخل ہوا تھا اس وقت کے پہلے امتحانات میں اور بارہویں جماعت کے ان امتحانوں میں کس قدر فرق تھا۔ اس وقت مجھے ٹھیک طرح سے یہ پارکرفلم بھی پکڑنا نہیں آتا تھا اور آج چھ سال بعد میں ہر مضمون کے سادہ جوابی پرچوں کی نہ جانے کتنی فاضل کاپیاں بھرتا جا رہا ہوتا تھا کہ کبھی تو میری سیٹ کے ارد گرد کاغذوں کا اتنا بڑا انبار جمع ہو جاتا جسے پرچہ ختم ہونے کے بعد باندھنے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا اور ہم امتحان کی منتیں کر کر کے اپنی فاضل کاپیاں (extra sheets) جلدی جلدی دھاگے سے باندھ کر اس کے حوالے کر دیتے۔ ہماری ساری ڈارمیٹری پڑھائی میں جُت چکی تھی، اور تو اور مولے ٹھنسی کو بھی کھانے کی سُدھ بدھ تک نہیں رہتی تھی۔ ایک ایک کر کے ہمارے پرچے ختم ہو رہے تھے، امتحانات کے بعد پریکٹیکل ہونا تھا اور اس کے بعد آخر میں ہماری پاسنگ آؤٹ پریڈ، جس کے لیے ابھی سے کالج کی انتظامیہ نے ہمارے والدین اور گھر والوں کو دعوتی کارڈ بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ صوبے کے گورنر صاحب مہمان خصوصی کے طور پر تشریف لا رہے تھے، اور ہماری آخری پریڈ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

پرچوں کے بعد ہمیں حسب معمول چھوٹی کلاسوں نے الوداعی رات کے کھانے دینا شروع کر دیئے۔ چھ سال پہلے جب ہم نے ساتویں جماعت کی طرف سے اس وقت کی بارہویں جماعت کے کیڈٹس کو الوداعی ڈنڈیا تھا تو ہم سب بچوں کے دل میں کتنی حسرت تھی کہ جانے یہ دن ہماری زندگیوں میں کب آئے گا جب ہمیں بھی کوئی الوداعی ڈنڈے کررخصت کرے گا۔ کیڈٹ کالج کی ایک ریت یہ بھی تھی کہ الوداعی کھانے کی رات جونیئر کیڈٹس سینئر کیڈٹس بن جاتے اور کچھ دیر کے لیے سینئر کیڈٹ جونیئر بن کر ان کا ہر حکم مانتے تھے۔ چاہے وہ کچھ بھی کہیں۔ آصف بھٹی کو کہا گیا کہ ایک وقت میں چار روٹیاں اکٹھی کھا کر دکھائے۔ مجید چھوٹو کو ٹیل والے جوتے پہن کر ڈانس کا کہا گیا۔ نثار ورنڈ کو اس طرح رونے کا کہا گیا جیسے وہ سی پی او کے سامنے ایکسٹرا ڈرل کے دوران ٹسوے بہایا کرتا تھا۔ مجھے اور فیصل کو چھت پر چڑھ کر اس طرح اترنے کا کہا گیا، جیسے ہم بنک کرتے وقت اُتر اُترتے تھے، اسفر کو وہ مخصوص سیٹی بجانے کا کہا گیا جو ہم خطرے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ ہم نے جونیئر کیڈٹس کی یہ ساری باتیں کسی حکم کی طرح بجالائیں۔ تقریب ختم ہوئی تو سارے جونیئر کیڈٹس ہمارے گلے لگ گئے۔ سب ہی نے ایک ہی بات کہی کہ ہماری کلاس ان کے لیے ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے یہاں جینے کا طریقہ ہم سے ہی سیکھا ہے۔ ہم نے سینئر ہونے کے باوجود کبھی جونیئر ڈکونگ نہیں کیا تھا۔ ہمیں اپنے ہی دھندوں سے فرصت کہاں تھی کہ کسی مظلوم جونیئر کیڈٹ کو تنگ کرتے۔ لیکن اس دن ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے جونیئر کیڈٹس کو ہم سے

کس قدر عقیدت تھی۔ فیصل اسٹیج پر آخری تقریر کے لیے آیا تو کچھ بولنے سے پہلے ہی رو پڑا۔ اس کے بعد ہم میں سے کوئی بھی اپنی الوداعی تقریر نہیں کر سکا۔ وہ اتر اتو میں بھی بیٹھی آنکھیں لیے اسٹیج پر آیا اور کچھ ہی دیر میں ہمارا پورا ہاؤس رور ہا تھا۔ کتنی حیرت کی بات تھی جب ہم یہاں آئے تھے تو تب بھی رور ہے تھے اور اب جو جانے کا وقت آیا تھا تب بھی ہماری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے دوسرے بچے کی روک کر بات جوڑنے کی کوشش کی۔

”ڈیئر فیلو کیڈٹس Dear Fellow Cadet's..... آئی فیل پراؤڈ ٹو بی I feel proud 2b..... آئی..... ان فیکٹ.....“

لیکن پھر اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا۔ میں تیزی سے اسٹیج سے اتر آیا راستے میں فرسٹ ایئر کے کیڈٹس نے مجھے روک لیا اور سبھی میری آنکھیں پوچھتے پوچھتے خود بھی رونے لگ گئے۔ یہ کیسا رشتہ تھا جو آنسوؤں سے شروع ہوا تھا اور آج آنسوؤں پر ہی ایک نئے موڑ پر جدا ہو رہا تھا۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ کیڈٹ کالج کے ان چھ سالوں میں میں نے پایا زیادہ تھا یا پھر کھویا زیادہ.....؟ میرا بچپن انہی راہدار یوں میں گھاس کے میدانوں میں اور پریڈ گراؤنڈ کے پتھر لیے فرش پر بھاگتے دوڑتے گزر گیا تھا۔ میں جب یہاں آیا تھا تو ایک چھوٹا بچہ تھا اور آج جب میں یہاں سے واپس جانے کے قریب تھا تو ایک نوخیز اور نوجوان تھا، جسے اپنے بھلے بڑے کا اچھی طرح پتہ تھا۔

پرنسپل صاحب نے بھی ہمارے اعزاز میں الوداعی کھانا دیا اور اس میں انہوں نے اسٹیج پر آ کر خاص طور پر اُس بات کا ذکر کیا جب ساتویں جماعت میں انہیں مجھے روکنے کے لیے مختلف ڈرامے کرنا پڑے تھے۔ ہماری شرارتوں پر انہوں نے اس رات ہم سب کے کان بھی کھینچے ہمیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہر وہ بات جو ہم اپنے تئیں یہ سمجھتے رہے کہ ہم نے چھپالی ہے، انہیں اس ہر بات کا پتہ تھا۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اُسی وقت ہو گیا تھا جب انہوں نے اسفر کی جانب اپنے سگار کا پیکٹ بڑھایا۔ اسفر نے کسر نفسی سے کام لیا۔

”نوسر آئی ڈونٹ اسموک“ No Sir I don't smoke

انہوں نے مسکرا کر بخشوشی پی او کو اشارہ کیا جو کھانے کی میز کی پرلی طرف کھڑا تھا۔ اُس نے جیب سے گولڈ لیف کا آدھا پیکٹ نکال کر اسفر کے حوالے کر دیا جو شاید کسی چھاپے میں اسفر کی الماری سے نکلا ہوگا۔ انہوں نے آہستہ سے اسفر سے کہا۔

”سگریٹ پینا بڑی بات نہیں۔ صرف عمو اور برائنڈ کا دھیان رکھنا چاہیے۔“

اسفر کا کندھا ٹھونک کر وہ آگے بڑھ گئے۔ دوسری جانب ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ انہوں نے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا اور دھیرے سے بولے۔

”کیڈٹ عباد..... تمہارے جونیئر سیکشن کی لٹچر شیرل آج کل چھٹیوں پر اپنے گھر آئی ہوئی ہے..... تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔ ناکس گرل شی از..... Nice girl she is“ غرض اس دن ہم میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جسے مکائنڈر صاحب نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں چھیڑا نہ ہو۔ اُس دن ہم سب کو احساس ہوا کہ ہم سب کیڈٹس کی ٹریننگ میں مکائنڈر صاحب کی خاموش تربیت کا کس قدر بڑا اور مرکزی حصہ شامل تھا۔ اس رات

میں نے کمانڈر صاحب سے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا سبق سیکھا اور وہ یہ کہ تربیت صرف چیخنے چلانے اور سزا دینے یا سزا کا خوف دل میں پیدا کرنے کا نام نہیں ہوتا۔ تربیت تو ایک خاموش انقلاب کا نام ہوتی ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو آپ کی روح سے شروع ہو کر آپ کے جسم پر ختم ہوتی ہے، نہ کہ اُسے جسم کے رویوں کے ذریعے روح میں ٹھونسنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کمانڈر صاحب نے یہ خاموش انقلاب ہماری روحوں کے ذریعے ہمارے جسموں پر لاگو کر دیا تھا۔ اب اگر ہمارے فانی جسم مٹ بھی جاتے تو یہ انقلاب ہماری روحوں سے آگے منتقل ہو جاتا۔

ہمارے پریکٹیکل ختم ہو چکے تھے اور دودن کے آرام کے بعد ہماری پائینگ آؤٹ پریڈتھی۔ ہماری آخری پریڈ.....

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مؤلف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز ”علم و عرفان پبلشرز“ کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک..... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے.....

خواتین کے لیے سنہری موقع..... سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق.....

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	تنزیلہ ریاض	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
وصی شاہ	سعید اثق	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔ اے۔ راحت	اعتبار ساجد	شیمابجید (تحقیق)
محی الدین نواب	علیم الحق حق	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایم۔ ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، 40۔ الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور (0300-9450911 & 042-37352332)

کتاب گھر کی پیشکش دیر ہو جاتی ہے

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن سے ڈوآپی کو حسب وعدہ ریحان صاحب کا ڈرائیور مقررہ وقت پر اپنی لمبی سی موٹر کار میں لینے کے لیے آنے لگا۔ پہلے دن تو ڈوآپی کو یوں اکیلے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہوئے بہت گھبراہٹ ہوئی۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ظفر سے کہا بھی کہ پہلے دن وہ ان کے ساتھ چلے چلیں لیکن ظفر نے ایک ٹکا سا جواب دے دیا کہ اس کے سر میں صبح سے درد ہے لہذا وہ نہیں جاسکتا۔ البتہ اس نے اپنا دوسرا فریضہ یعنی طنز کے تیر چلانے کا کام بخوبی انجام دیا اور ڈوآپی کو سیکڑوں مرتبہ یہ جتایا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جا رہا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس کی نظریں ڈوآپی کا تعاقب نہیں کر رہیں اور ڈوآپی اس کی غیر موجودگی کا کوئی ”غلط فائدہ“ اٹھانے کی کوشش نہ کریں اور سیدھے ٹیوشن پڑھا کر گھر واپس آ جائیں۔ وجوہ آپنی سر جھکائے ظفر کی ہدایات سنتی رہیں۔ ظفر نے سختی سے انہیں منع کیا کہ کسی بھی مرد سے گھریا ہر کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی دو گھنٹے سے ایک لمحہ بھی زیادہ باہر گزرنے کی انہیں اجازت ہے۔ جاتے جاتے اُس نے یہ دُہرائنا بھی ضروری سمجھا کہ ڈوآپی کو آج ہی اپنے معاوضے اور ایڈوانس کی بات بھی بچوں کے گھر والوں سے حتمی طور پر طے کرنی ہے۔ اس کی بک بک ابھی جاری ہی تھی کہ باہر گلی میں تیسری بار گاڑی کا بارن بجنے کی آواز آئی اور مجبوراً ظفر کو اپنا ہدایت نامہ ختم کر کے وجوہ جانے کی اجازت دینی پڑی۔

ریحان صاحب کا بنگلہ ریلوے افران کے بنگلوں کی قطار میں تیسرا تھا اور اُس کی لمبی سی روش سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک بڑے سے پورچ میں رُک گئی۔ ڈوآپی کو نو کرنے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب جو ایک کچی عمر کے سنجیدہ سے مرد تھے، اپنے دونوں بچوں شارق اور فائزہ سمیت آن موجود ہوئے، ڈوآپی کو دیکھ کر انہیں کچھ حیرت سی ہوئی کیونکہ وہ اپنے طور پر سمجھ بیٹھے تھے کہ خان صاحب نے کسی عمر رسیدہ یا پھر کم از کم کسی تجربہ کار اُستانی کا بندوبست کیا ہوگا لیکن یہاں تو دوھان پان سی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، جسے اگر کالج کا یونیفارم پہنا دیا جاتا تو وہ خود بھی اسٹوڈنٹ ہی دکھتی۔ ریحان صاحب نے اپنا اور دونوں بچوں کا تعارف کروایا اور پھر جب ڈوآپی نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں ریحان صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کریں گی کہ جتنی جلدی ہو سکے، دونوں بچوں کو ان کی باقی کلاس کے برابر لاکھڑا کریں، تو ان کے لفظوں کے چناؤ اور ان کی تہذیب و شائستگی نے ریحان صاحب کا ڈو کے بارے میں پہلا تاثر یکسر زائل کر دیا۔ خان صاحب نے شاید اشارہ ریحان صاحب کو ڈو کے گھریلو پس منظر کے بارے میں بھی بتا رکھا تھا، اسی لیے انہوں نے پہلے سے دو چیک کاٹ کر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک چیک خان صاحب کے نام تھا اور دوسرا ڈوآپی کے نام، ڈو کا طالب علمی کے دور کا وظیفوں والا بینک کا کھاتا اب بھی چل رہا تھا اور غیاث چچا ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم اپنی تنخواہ میں سے اس کھاتے میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شادی کے بعد ظفر نے کبھی ان کے کاٹے گئے چیکوں کے

بدلے ایک دمڑی بھی ان کی ہتھیلی پہ لا کر نہیں رکھی تھی۔ ظفر نے جب آدھی رقم کا چیک خان صاحب کے نام پر دیکھا تو وہ بہت تلملایا اور اس نے مالک مکان کو اس کی غیر موجودگی میں سخت سست سناٹیں لیکن شام کو جب خان صاحب کرائے کے تقاضے کے لیے آئے تو اس نے چپ چاپ چیک ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

یوں ڈھکی لگی بندھی زندگی میں دو گھنٹے کی یہ تبدیلی ایسی آئی کہ انہیں بھی دو گھڑی کے لیے اس زندان سے چھٹکارا مل جاتا، بچے تو دودن میں ہی ان سے یوں گھل مل گئے جیسے ان کی برسوں سے ڈھ سے دوستی ہو۔ دراصل بچے ان کے آنے سے پہلے اس لیے بھی سہمے ہوئے تھے کہ انہیں کسی عمر رسیدہ، موٹی موٹی عینکوں والی کسی ایسی سخت گیر استانی کی آمد متوقع تھی جس کے ہاتھ میں ہمیشہ چھری یا لکڑی کا ڈٹ (اسکیل) دکھائی دیتا ہوگا، لیکن جب انہوں نے اس من موٹی سی، نازک سراپے والی ٹیچر کو دیکھا تو خود بہ خود اس کی جانب کھچے چلے آئے۔ اور پھر ڈھ آپ کے پڑھانے کا انداز بھی تو کچھ ایسا تھا کہ اب دونوں بچے خود ٹیوشن کے وقت کا انتظار کرتے رہتے اور ایک اتوار کی چھٹی بھی انہیں اس قدر گراں گزرتی کہ وہ سوال کر کر کے اپنے پاپا کی ناک میں دم کر دیتے۔

ظفر کی جیب میں ڈھ کی نوکری سے پھر سے پیسے آنے لگے تو اس نے بھی پھر سے اپنے پرہیزگارے نکالنا شروع کر دیے۔ ڈھ آپ کی کوواپسی میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو وہ باہر گلی میں نکل کر ٹھلنا شروع کر دیتا اور جیسے ہی ریحان صاحب کی گاڑی گلی میں داخل ہوتی وہ ڈھ آپ کی گاڑی میں سے اترنے سے پہلے ہی لپک کر قریب جا پہنچتا اور ڈرائیور اور اس پاس سے گزرتے راہ گیروں اور ہمسایوں کی پروا کیے بنا ہی اپنے ذہن کا گند اپنی زبان کے زہر کے ذریعے اگلنا شروع کر دیتا۔ ”کہاں رہ گئی تھی.....؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟ گھر واپس آئے کو تمہارا دل نہیں کرتا؟ کس کے ساتھ گپ لگانے کے لیے رُک گئی تھیں؟“ اور جب ڈرائیور گاڑی موڑ لیتا تو اس کے جاتے جاتے اس پر بھی فقرہ چست ہو جاتا۔

”کہیں یہ حضرت ڈرائیور ہی تو لمبے راستے سے گھمائے لیے نہیں پھرتے تمہیں.....؟ اسی لیے وجوہ آپ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی وہ گھر واپس پہنچ جائیں چاہے اس کے لیے انہیں ٹیوشن کچھ دیر پہلے ہی ختم کیوں نہ کرنی پڑے۔ انہوں نے دبے لفظوں میں ریحان صاحب کو بھی کہلوا بھیجا تھا کہ ان کے میاں کو ان کے دیر سے گھر پہنچنے پر تشویش ہوتی ہے لہذا اگر وہ چاہیں تو پیسوں میں سے کچھ کٹوٹی کر لیا کریں لیکن انہیں گھر دس پندرہ منٹ پہلے ہی جانے کی اجازت دے دی جائے۔ ریحان صاحب خود بھی صورت شناس تھے اور کچھ ڈرائیور نے بھی انہیں دفتر لاتے لے جاتے ظفر کے اس بُرے رویے کی شکایت اپنے مالک سے کر رکھی تھی لہذا خود ان کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈرائیور کو گھر واپس پہنچا آئے۔ حالانکہ بعض مرتبہ بچوں کی صورتیں ان کے یوں بیچ میں چلے جانے سے روٹی سی بن جاتیں کیونکہ وہ اپنی معصوم سی خوشیوں میں اپنی ٹیچر کو بھی شامل کرنا چاہ رہے ہوتے لیکن ان کی ٹیچر تو لپکتے جھپکتے آتیں اور ان کی پڑھائی ختم کروا کر پلک جھپکنے میں ہی واپس چلی جاتیں۔ اس دن بھی جب فائزہ کی سال گرہ تھی تو ان کو سب نے کتنا رُکنے کا کہا لیکن وہ نہیں رُکیں اور چند دن پہلے جب شارق کو اسکول میں اس کے مضمون پر پہلا انعام ملا تھا، جس کی تیاری اس کی وجہ سے ٹیچر نے ہی کروائی تھی، تو ان دونوں نے کس طرح منہ بسور بسور کر ٹیچر کو بھی اپنے ساتھ اپنے پاپا کی جانب سے انعام میں دی گئی آئس کریم پارٹی میں چلنے کی مٹیس کی تھیں، لیکن پھر بھی وہ مسکرا کر اور دونوں کے گال پر پیار کر کے واپس چلی گئی تھیں۔

لیکن اتنی احتیاط کے باوجود قدرت کی جانب سے آئی ہوئی رکاوٹیں تو اپنی جگہ موجود رہتی تھیں، کبھی ٹریفک کا رش، کبھی موسم کی خرابی، کبھی مشین کے کل پرزوں کی مجبوری، اُس دن بھی بھری دوپہر میں ہی اچانک کالے بادل یوں آنا فانا آسمان پر چھائے کہ چند ہی لمحوں میں دن میں اندھیرا سا چھا گیا۔ فُؤا آپنی ابھی یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ کسی طرح آج ڈرائیور سے کہلوادیں کہ آج انہیں لینے نہ آئے، لیکن اُسی لمحے گلی میں گاڑی کا ہارن سنائی دے گیا۔ ڈرائیور نے دونوں بچوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی فُؤا آپنی کو تھما دی جس میں ان دونوں نے اپنے کل کے ٹیٹ کے بارے میں لکھا تھا، جس کی تیاری آج ضروری تھی۔ مجبوراً فُؤا آپنی کو گھر سے نکلنا ہی پڑا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، راستے میں ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور فُؤا آپنی کے ریحان کے گھر سے نکلنے نکلنے سڑکیں ندیاں بن چکی تھیں۔ ڈرائیور بیچارہ نہ جانے کن گلیوں کے بیچ اور آڑھے تیز سے راستوں سے گاڑی ٹکالتا ہوا کسی نہ کسی طرح انہیں گھر تک پہنچا تو لایا لیکن اس اثناء میں وجوہ کے مقررہ وقت سے تقریباً آدھا گھنٹہ زیادہ ہو چکا تھا اور ظفر اپنے لال بھسوکا چہرے سمیت گلی میں ہی برستی بارش میں ٹھل رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے ڈرائیور کو ہی روک لیا اور اس پر برس پڑا کہ وہ ان کی بیوی کو لے کر کہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی اور فُؤا آپنی نے ظفر کے لاکھ ہاتھ جوڑے، منتیں کیں کہ یوں گلی میں سر بازار تماشا نہ بنائے لیکن اس دن ظفر بھی اپنی کرنی پر آیا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو تو اُس نے بسیار کوشش کے بعد جانے دیا لیکن فُؤا آپنی کے ساتھ اُس نے اس شام جو برتاؤ کیا اُس کے نشان ان کی روح سے تا عمر نہیں مٹ پائے۔

مصیبت یہ بھی تو تھی کہ اگر فُؤا آپنی ظفر کی خوشی کے لیے ٹیوشن چھوڑنا بھی چاہتیں تو یہ بھی ظفر کو گوارہ نہیں تھا کیونکہ اُسے گھر بیٹھے ہر مہینے ایک معقول رقم سے جو ہاتھ دھونا پڑ جاتے، اور وہ یہ کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اب تو اسے مالک مکان کی دھمکیوں کا بھی روزانہ سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کیونکہ فُؤا کی تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ بھی آسانی سے، چاہے قسطوں میں ہی سہی، پر ادا ہو رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے فُؤو نے مزید احتیاط شروع کر دی اور موسم ڈرا بھی خراب ہونے کا احتمال ہوتا وہ یکسر جانے سے ہی انکار کر دیتی تھیں۔ لیکن ظفر کے پاس انہیں ستانے کے لیے بہانے اور بہت تھے۔ دراصل ظفر کے اندر کا انسان ایک ایسی عجیب احساس کمتری کا شکار تھا، جس میں انسان اپنے مخالف کی خاموشی کو بھی طنز سمجھتا ہے۔ اُسے اس بات کا احساس تو پہلے دن ہی سے تھا کہ فُؤا آپنی شکل و صورت، تعلیم و تہذیب اور آداب و اطوار میں اس سے کہیں آگے ہیں۔ لیکن فُؤا آپنی نے آج تک کبھی اُس کے سامنے کبھی کوئی ایسی حرکت یا بات نہیں کی تھی جس سے ظفر کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہو۔ لیکن ظفر کے اندر کے خناس نے اسے فُؤا آپنی کی اس خاموشی کو بھی کچھ اور سی منی دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ یوں چپ رہ کر فُؤا سے یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں کہ جیسے اُس کے وجود کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ اس بات سے اور اس احساس سے اس کی انا کو مزید ٹھیس لگتی اور وہ قلمکار کمزیر انداز میں انتقامی کارروائیاں کر کے اپنی زخمی انا کو سہلانے کی کوشش کرتا۔

دن یوں ہی گزرتے جا رہے تھے اور زندگی دن بدن یوں ہی فُؤا آپنی پر تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ بیچ میں ایک آدھ مرتبہ ظفر نے ایک اور عجیب حرکت بھی کی۔ فُؤا آپنی کے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ہی وہ بننا بتائے خود ہی کچھ دیر بعد ریحان صاحب کے بنگلے پر آن دھمکا۔ ایک مرتبہ تو گھر میں کوئی اور بڑا نہیں تھا اور صرف مالی ہی باہر کے باغیچے میں کام کر رہا تھا جس سے اُس نے ٹوہ لے لی کہ فُؤو ہیں اندر ہیں اور بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ ایک آدھ

مرتبہ ڈرائیور نے خود اسے بنگلے کے باہر ٹہلنے ہوئے دیکھ لیا لیکن ڈرائیور کے باہر نکلنے سے پہلے ہی ظفر ادھر ادھر ہو گیا۔ جبکہ ایک مرتبہ اس کے گھنٹی بجانے پر خود ریحان صاحب گیٹ پر آ گئے کیونکہ وہ قریب ہی لان میں کرسی ڈالے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ظفر انہیں دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا لیکن جب اس نے آواز کی شوہر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا تو ریحان صاحب نے بڑی عزت سے انہیں اندر بلا کر بٹھایا اور چائے وغیرہ کا پوچھا۔ ظفر کو اور تو کچھ سوچا نہیں لہذا اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ یہاں سے گزر رہا تھا تو اس نے سوچا کہ جو کو ساتھ ہی لیتا جائے۔ ریحان صاحب نے ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر واپس بھجوایا اور نہ صرف یہ بلکہ جاتے ہوئے گھر کی ملازمہ کو یہ تاکید بھی کی کہ انہیں خالی ہاتھ نہ جانے دے اور فریق میں پڑا تازہ کیک بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

اس دن ظفر کو پہلی بار یہ پتہ چلا کہ ریحان صاحب کی بیوی تو انہیں پانچ سال پہلے ہی داغ مفارقت دے چلی ہیں اور اب اس گھر میں ڈرائیور اور مالی کی بیوی کے علاوہ تیسری کوئی عورت نہیں رہتی۔ ظفر نے گھر آ کر اس بات پر بھی بے حد ہنگامہ کیا کہ آواز نے یہ بات انہیں پہلے کیوں نہیں بتائی۔ آواز نے اُسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ بھلا اس بات سے ان کا کیا تعلق کہ بچوں کی ماں زندہ اور گھر میں ہے یا نہیں۔ ان کی تو ریحان صاحب سے بھی شاذ و نادر ہی کبھی ملاقات ہوتی تھی ورنہ ان کا تعلق تو اصل میں ان کے بچوں کے ساتھ تھا، لیکن وہ ظفر ہی کیا جو آواز کی سُن لے..... کئی دن تک یہ تکرار چلتی رہی اور کئی دن تک روزانہ آواز کی نئی سُن لی پر تنگنا پڑتا۔

اور پھر آخر کار ایک دن اس تکرار کی جلتی پرتیل چھڑکنے کا موقع قدرت نے خود ہی ظفر کو فراہم کر دیا۔ آواز کی بچوں کو پڑھا کر اپنے مقررہ وقت ساڑھے پانچ بجے پورچ میں نکلیں تاکہ حسب معمول ڈرائیور انہیں چھ بجنے تک گھر پہنچا دے تو یہ دیکھ کر ان کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی نکل گئی کہ پورچ میں نہ تو ڈرائیور تھا اور نہ ہی گاڑی کا کچھ اٹھ پتہ تھا۔ مالی اور گھر کے دوسرے نوکروں کو ادھر ادھر دوڑایا گیا تاکہ وہ ڈرائیور کی کچھ خبر نکال کر لائیں لیکن ڈرائیور کا دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو کارنگ پیلا پڑا گیا۔ بالآخر شام چھ بجے کے قریب ڈرائیور تو نہیں پلٹا لیکن ریحان صاحب اپنی سرکاری جیب میں دوسرے ڈرائیور سمیت گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظر راہداری میں بے چین اور نڈھال سی ٹہلتی آواز پر پڑی۔ اسی اثنا میں ڈرائیور بھی نہ جانے کہاں سے ہڑبڑایا ہوا سا گولی کی سی تیزی سے گھر میں داخل ہوا۔ ریحان صاحب سارا معاملہ خود ہی سمجھ گئے اور انہوں نے ڈرائیور کو سخت جھاڑا کہ جب اُسے سختی سے تاکید کی گئی ہے کہ جب تک بچوں کی لُچر کو واپس اپنے گھر نہ پہنچا دیا جائے تب تک وہ بھول کر بھی ادھر ادھر ہونے کی کوشش نہ کرے پھر وہ کار لے کر باہر کیوں گیا۔ ڈرائیور ہیں ریحان صاحب کے پیروں میں گر گیا کہ اچانک ہی اسے خبر ملی کہ اس کی بہن کا بیٹا پتنگ لُٹے ہوئے سڑک پر کسی موٹر سائیکل سوار سے ٹکرا گیا ہے اور اس کے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا ہے تو وہ رُک نہیں پایا اور بہن کے گھر کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ قریبی ہسپتال سے بچے کی پٹی کروا کر ساڑھے پانچ بجے سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے گا لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا اور بچے کے سر میں ٹانگے لگنے کی وجہ سے اُسے دیر ہو گئی۔

بہر حال وجہ جو بھی تھی، دیر تو ہو ہی گئی تھی۔ ریحان صاحب نے ڈرائیور کا معاملہ تو بعد پراٹھا رکھا، فی الحال انہیں آواز کی کو گھر پہنچانے کی جلدی تھی۔ سو انہوں نے ڈرائیور کو جلدی سے فوراً گاڑی نکالنے کا کہا اور خود بھی ڈرائیور کے ساتھ ہی آگے بیٹھ گئے کیوں کہ انہیں معاملے کی سنگینی کا

احساس تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ خود جا کر ظفر کو اس صورت حال سے آگاہ کریں تاکہ وہ ڈوآ پی پر برہم نہ ہو۔ وہیں بے چاری ڈوآ پی تو ان کے جسم کا خون تو ویسے ہی خشک ہو چکا تھا لہذا چپ چاپ بیٹھی اپنے مقدر کا سامنا کرنے کی تیاری کرتی رہیں۔

جب ریحان صاحب کی گاڑی ظفر کی گلی میں مڑی تو اس وقت شام کے سات سے کچھ اوپر ہی وقت ہوا ہو گا۔ گلی سنسان پڑی تھی اور سردیوں کے دن ہونے کی وجہ سے شام بھی گہری رات ہی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ڈوآ پی کو درود شریف سمیت اور متنی بھی دعائیں آتی تھیں، انہیں وہ سینکڑوں مرتبہ دل میں دہرائی تھیں۔ ریحان صاحب نے ان سے کہا کہ وہ یہیں باہر گلی میں گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں، تب تک وہ جا کر اندر سے اپنے میاں کو باہر بھیج دیں۔ ڈوآ پی نے ایک مرتبہ پھر ان سے اصرار کیا کہ انہوں نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے، یہی بہت ہے، اب مزید زحمت کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ اپنے گھر خیریت سے پہنچ گئی ہیں۔ دراصل ڈوآ پی کے ذہن میں یہ خوف بھی کہیں نہ کہیں پل رہا تھا کہ ظفر ریحان صاحب کے سامنے ہی کوئی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھے لہذا اس لیے بھی وہ ان دونوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن ریحان صاحب نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ظفر سے مل کر ہی گھر واپس جائیں گے۔ انہیں اس پریشان سی کول لڑکی کو یوں اکیلے چھوڑ کر واپس جانا کسی طور بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

مجبوراً ڈوآ پی ہی کو ہار ماننا پڑی اور وہ گاڑی سے اتر کر اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئیں، لیکن یہ کیا.....؟ دروازے پر ایک موٹا سا تالا پہلے سے لٹکا ڈوآ پی کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہجے کے تو ہوش ہی اڑ گئے ظفر اس وقت کہاں چلا گیا تھا؟ جبکہ اسے پتہ بھی تھا کہ وجوہ کے پاس چابی بھی نہیں ہے، پھر اس اندھیری رات میں وہ گھر کو تالا کیوں لگا گیا تھا؟ وجوہ کی پریشانی دیکھ کر ریحان صاحب بھی نیچے اتر آئے اور وہ بھی تالا دیکھ کر حیران تھے کہ اب کیا کریں۔ وجوہ کی کو تو ظفر نے آج تک اس پاس کسی ہمسائے کے گھر بھی آنے جانے نہیں دیا تھا نہ ہی وہ گلی میں کسی سے واقف تھیں۔ اس لیے ریحان صاحب نے طے کیا کہ ظفر کے آنے تک وہ سب یہیں گاڑی میں اس کا انتظار کریں گے، کیونکہ ڈوآ پی کو یوں دروازے پر تنہا بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔

لیکن انہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے جب مزید دو گھنٹے گزر گئے تو ریحان صاحب نے ڈوآ کو ان کے اپنے گھر چھوڑنے کی پیش کش کی کیونکہ ظفر کا تو دُور دُور تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہمسایوں کے ہاں رات بھر انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ ڈوآ اپنے گھر میں ہی انتظار کریں بعد میں غیاث چچا خود ہی ظفر کا پتہ لگا کر انہیں گھر چھوڑ آتے۔ ڈوآ پی کے پاس ہاں کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ لہذا وہ چپ چاپ سر جھکائے واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئیں اور ریحان صاحب انہیں ان کے میکے چھوڑ آئے۔ غیاث چچا کو انہوں نے باہر بلا کر پوری بات سمجھا دی تھی۔ وہ بے چارے بھی کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ ساری رات ظفر کے مختلف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرتے رہے۔ وہ رات اور بہت سی راتوں کی طرح ڈوآ پی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کائی اور تبھی آدی کی تصویر کے نیچے رکھے کارڈ (Invitation) پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ یہ آدی کی پاسنگ آؤٹ پر یڈ کا دعوت نامہ تھا۔ کل صبح آدی کی پاسنگ آؤٹ تھی اور کل کیا؟ صبح تو وہی چکی تھی..... گھڑی صبح کے چار بج رہی تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش تیسرا الوداع

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

صبح کے چار بجتے ہی سی۔ پی۔ او نے ہگل بجوا دیا۔ لیکن ہم سب کی آنکھوں میں نیند پہلے ہی کہاں تھی، یہ صبح کیڈٹ کالج کی دوسری صبحوں سے کتنی مختلف اور کتنی اہم تھی، اس کا اندازہ صرف ہم پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹ ہی لگا سکتے تھے۔ ہمارے کلف لگے کرکڑ خاکی یونیفارم اور ہماری کیپ بیرٹس، پر لگے رنگیں پڑوں (پلو مڑ) کے ساتھ جُوی ہماری الماریوں میں رات ہی کو ٹانگ دی گئی تھیں، ہمارے لانگ پریڈ شوز جم جم کرتے شور یکس پر بجے ہوئے تھے۔ باہر پریڈ گراؤنڈ میں الوداعی ترانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ آج ہمارا ناشتہ صبح چھ بجے ہی پیش کر دیا جاتا تھا تاکہ ہم واپس آ کر اپنے یونیفارم پہنیں اور اپنی آخری تیاری کر کے پریڈ گراؤنڈ جا پہنچیں۔ ہم سب بیک وقت اُداس بھی تھے اور خوش بھی..... ہم ایک دوسرے سے نظریں پُڑا رہے تھے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی دوسرے کی آنکھ میں چھٹی نمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا، سارے کیڈٹس ایک دوسرے کے ہاسٹلز جا کر اپنے گھر کے پتوں اور ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر رہے تھے تاکہ مستقبل میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ رکھ سکیں۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ہمارے گھر والوں میں سے کون کون ہماری پاسنگ پریڈ دیکھنے کے لیے گراؤنڈ میں پہنچ چکا ہوگا کیونکہ مہمان پریڈ سے صرف دو گھنٹہ پہلے ہی کالج آ سکتے تھے اور انہیں وہیں گیٹ سے ان کے کارڈز کے حساب سے باعزت طور پر پریڈ گراؤنڈ میں ان کی کرسی تک پہنچا دیا جاتا تھا۔ مجھے تو گھر سے کسی کے آنے کی کچھ کم ہی اُمید تھی کیونکہ ابا اور امی اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتے تھے اور عمارہ اور فاران بھیا اکیلے آ نہیں سکتے تھے۔ لیکن باقی کیڈٹس اور میرے دوستوں کے گھر سے کبھی آ رہے تھے۔ اور اب اُنہی کے خاندان میرے خاندان بھی تو تھے۔ چھ سال سے ویک اینڈز پر اور دو چار دن کی کم چھٹیوں میں میں کبھی فیصل کے گھر تو کبھی اسفر کے گھر جاتا رہا تھا، کبھی آصف موٹے کی امی کے ہاتھ کے پراٹھے کھائے تو کبھی ٹار روندو کے گٹے کے کھیتوں سے گئے توڑ کر کھاتے کھاتے میرا بچپن میرے اُنہی دوستوں کے گھر والوں کے ساتھ بیت گیا تھا۔ اور ان سب کی ”امیّاں“ اور ابا مجھے بھی اپنا ”ریڈی میڈ“ بیٹا ہی تو سمجھتے تھے۔ اسفر کے ڈیڈی سے تو میں اسفر سے بھی زیادہ جیب خرچ اینٹھ لیتا تھا اور فیصل کی مُمّی چھٹیوں میں فیصل کی نہیں بلکہ میری مرضی کا کھانا بنایا کرتی تھیں۔ آصف بھٹی کے ”بابے“ نے مجھے کبڈی اور داؤ لگانا سکھایا تھا اور ٹار روندو کے ابا سائیں نے مجھے گاؤں کے کھیتوں میں شکار کھیلنے کے جانے کتنے گُر بتائے تھے، میں ان سب کا لاڈ لاؤں تھا، جسے انہوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ سے دور ہے۔ اور میرے لیے میرے یر شتے، کسی بھی خون کے رشتے سے کم نہیں تھے۔

آخری ہگل بج چکا تھا اور اب ہم سارے سینئر پاسنگ آؤٹ کیڈٹس لمبی لمبی نظاروں میں اپنے اپنے ہاسٹل سے نکل کر پریڈ گراؤنڈ جانے کے لیے باہر فالن کی تیاریاں شروع کر چکے تھے۔ ہاسٹل کے دونوں طرف راستوں میں ہمارے جو نیرز ہاتھوں میں پھولوں کے گلہستے اور الوداعی

کارڈ لیے ہمیں خدا حافظ کہنے کے لیے جانے کب سے تیار کھڑے تھے، انہی میں ساتویں جماعت کے وہ چٹو، مٹو، بھلو، پو، سونو، مونو قسم کے کیڈٹس بھی تھے، جو آنکھوں میں وہی حیرت اور فخر آمیز سی روشنی لیے کھڑے ہمیں تک رہے تھے جو کبھی ساتویں جماعت میں ہماری آنکھوں میں اپنے سینئرز کو یوں بچے سنورے آخری پریڈ پر جاتے ہوئے دیکھ کر لہرائی تھی۔ انہی میں سے ایک ننھا سا تارہ آگے بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلہ دستہ میری طرف بڑھا دیا۔

”آدی سر..... دس از فار یو This is for you“

میں نے اس معصوم تارے سے گلہ دستہ لے لیا اور پھر اُسے ایڑیاں بجا کر ایک کڑک دار سا سیلوٹ کیا۔ سبھی ننھے تارے کھلکھلا کر ہنس دیے۔ اُس نے اپنی آٹو گراف بک آگے کر دی اور میں نے اپنی زندگی کے پہلے آٹو گراف کا غز پر ثبت کر دیے۔

”جیتے رہو ہمیشہ.....“

ہم سب پریڈ گراؤنڈ میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ سی۔ پی۔ او نے وِسل بجائی اور ہم نے پریڈ کی فارمیشن ترتیب دے دی۔ مہمان اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ اور بینڈ والے نے اپنے پورے 72 بہتر اوزاروں سمیت اپنی فوج کو دھن شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ بینڈ پر چوٹ لگی اور ایجوٹمنٹ نے سی۔ پی۔ او کو اجازت دینے کے لیے اپنی اسٹک لہرائی۔ پریڈ شروع ہو گئی۔ ہم سارے پاسنگ آؤٹ کیڈٹ اپنے اپنے ہاؤس کے جھنڈے تلے اپنے پی۔ او۔ سمیت پریڈ کرتے ہوئے اس چبوترے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں گورنر صاحب، پرنسپل اور ایجوٹمنٹ سمیت کھڑے ہم سے سلامی لینے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم گھوم کر اب اس قطار میں چل رہے تھے جس کے بالکل سامنے مہمانوں کا پنڈال تھا۔ تمام کیڈٹس کے گھر والے انہیں پہچان کر ان کی جانب دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلا رہے تھے کہ آج ان کے جگر کا کلوز اندنگی کے ایک بہت بڑے امتحان میں سُرخ رو ہو کر ان کا مان بڑھا رہا تھا۔ ہم نے ڈائس کی طرف گھوم کر سلامی کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ یہ سلامی دراصل تمام کیڈٹس کی اپنے گھروالوں اور پیاروں کے لیے بھی تھی جو دُور سے انہیں دیکھ کر خوشی سے نعرے لگا رہے تھے، ان کے نام پکار رہے تھے۔ دفعۃً میرے کانوں میں بھی ایک آواز اُبھری ”آدی..... آدی.....“

میں نے سلامی دیتے ہوئے بھیڑ میں نظریں دوڑائیں اور کچھ پل کے لیے میرا خود اپنی آنکھوں سے اعتبار اٹھ گیا۔ دُور تیسری قطار میں امی کھڑی تھیں۔ ہاں ہاں..... وہ میری امی ہی تھیں۔ میری پیاری امی..... جو اس وقت بھی اپنے مخصوص کالے برقعے میں ملبوس تھیں اور اتنے بہت سارے غیر مردوں کی موجودگی کی وجہ سے صرف اپنی بھیگی آنکھوں سے پلو ہٹائے کھڑی تھیں اور ان کا ایک ہاتھ میری جانب یوں اٹھا ہوا تھا، جیسے وہ اتنی دُور سے بھی اپنے راجے بیٹے کو بھیڑ میں ٹھوکر کھا کے گرنے سے روک لینا چاہتی ہوں..... یا اللہ یہ کیسا معجزہ ہے۔ پھر میری نظریں امی کے ساتھ کھڑے فاری بھیا پر پڑی۔ مجھے آواز دینے والی آواز انہی کی تھی۔ ارے..... یہ کیا..... ان کے ساتھ عمارہ بھی کھڑی پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اور پھر میری نظر عمارہ کے ساتھ کھڑے چوتھے شخص پر پڑی۔ مجھے اتنے زور کا جھکا لگا کہ اگر میں فوراً اپنے قدم سنبھال نہ لیتا تو ضرور پوری کی پوری پریڈ کے قدم توڑ کر سب کی پریڈ پر باد کر دیتا۔ عمارہ کے ساتھ ابا کھڑے تھے..... ہاں ہاں..... میرے ابا..... وہ کیسے یہاں تک آ پہنچے۔ اتنا لمبا سفر، امی کی بیماری، عمارہ کے امتحانات، کوئی وجہ بھی تو ان کے قدم روک نہیں پاتی تھی۔ کون کہتا ہے کہ میرے ابا مجھ سے پیار نہیں کرتے تھے۔ دیکھو..... وہ کھڑے ہیں

میرے ابا..... وہ رہیں میری پیاری امی جو اپنے آدمی کی سلامی لینے یہاں تک آچکی تھیں۔ شاید اپنی زندگی کا سب سے لمبا سفر طے کر کے۔ ابا نے مجھے دیکھ کر ہلکے سے ہاتھ بلایا۔ ان کی آنکھوں کی نمی میں یہاں سے بھی محسوس کر سکتا تھا، لیکن یہی خوشی کی نمی تھی۔ ان کے آدمی نے آج وہ کر دکھایا تھا جو ان کا خواب تھا۔ لوگ بیٹوں سے بھلا اور کیا چاہتے ہوں گے.....؟ فخر کا یہی کچھ لحوں کا احساس، غرور کی چند گھڑیاں..... جو ان کی ساری زندگی پر بھاری ثابت ہوتی ہیں..... میری اور ابا کی آنکھیں ملیں۔ میری آنکھوں سے صدیوں کا رُکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔ میرے قدم پر یڈ کی ہیٹ پر اٹھ رہے تھے، میرا ہاتھ ماتھے پر سلامی کے لیے جما ہوا تھا لیکن میری آنکھیں یوں بہہ رہی تھیں کہ آج ہی اندر کا ہر دریا نکال کر ہی دم لیں گی۔ امی نے دور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں نہ روؤں پر وہ۔ خود بھی تو رورہی تھیں۔ عمارہ مجھے دیکھ کر منہ چڑا رہی تھی لیکن وہ بھی تو رورہی تھی۔ فاری بھیا جو ایسے موقعوں پر بہت بہادر بنتے تھے، آج تو وہ بھی بنا چہرہ چھپائے یوں رورہے تھے کہ ان کے گالوں پر بہتے آنسو مجھے اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

سی۔ پی۔ اوزور سے چیخا ”کیڈٹ آخری سلامی دے گا۔“..... سلام آ آ آ مفن۔“

ہمارے ہاتھ تیزی سے ہوا میں لہرائے، ماتھے تک گئے اور نیچے گر گئے۔ میرے دل نے سرگوشی کی۔

”الوداع اے میری رہنما..... اے میری تربیت گاہ..... الوداع.....“

﴿اردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سیکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھیج جاسکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

تیسرا دور

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

دوسری قیامت

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

پاسنگ آؤٹ کے بعد کیڈٹ کالج کو الوداع کہہ کر جب میں اپنے گھر والوں سمیت اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر اترتا تو سب سے پہلی خبر جس نے میرا یوں استقبال کیا کہ میرے ہوش و حواس ہی چھین لیے، میں نے راجہ کی زبانی وہیں پلیٹ فارم پر سنی۔

”قوّ آئی کو طلاق ہو گئی.....“

مجھے یوں لگا کہ جیسے پورا ریلوے اسٹیشن ہی گھوم رہا ہے اور ابھی چند لمحوں میں میرے سر پر آگرے گا۔ کچھ دیر کے لیے تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ راجہ بول کیا رہا ہے۔ امی بھی محلے میں داخل ہوتے ہی تانگے سے اتر کر جلدی سے غیاث چچا کے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔ اسٹیشن پر راجہ کے ساتھ مٹھی، نھو، گڈو، بالے اور پوپو بھی مجھے لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اور وہ سب ہاتھوں میں ہار لیے یوں میرے استقبال کے لیے کھڑے تھے جیسے میں اکیڈمی سے نہیں، مکہ مکرمہ سے حج کر کے آیا ہوں۔ بہر حال میری ساری خوشی اور دوستوں سے ملنے کی مسرت اس خبر سے غائب ہو چکی تھی اور ہم سب راجہ کے گھر کی بیٹھک میں آکر بیٹھ گئے۔ میں بالکل خاموش تھا اس لیے وہ سارے بھی چپ تھے۔ پھر راجہ نے ہی پہل کی اور مجھے تین دن پہلے کی شام کا وہ سارا قصہ بتایا جب وجوہ پی کوریحان صاحب کے ڈرائیور کی وجہ سے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی تھی اور ریحان صاحب خود انہیں گھر چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ لیکن ظفر کے گھر پر نہ ہونے اور دروازے پر تالا پڑے ہونے کی وجہ سے آخر کار دیر رات انہیں قوّ کو ان کے اپنے گھر چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ غیاث چچا ریحان صاحب کے جاتے ہی ظفر کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رات دو بجے وہ ظفر کی گلی میں پہنچے تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں سے ہو کر گزرے تھے لیکن تب دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ظفر کے ایک آدھ ٹھکانے کا پتہ وہ جانتے تھے، لگے ہاتھوں انہوں نے اس کے پرانے شوروم کا بھی چکر لگا لیا لیکن سب طرف سے ایک ہی جواب ملا کہ ظفر وہاں نہیں آیا۔ مایوسی کے عالم میں گھر لوٹنے سے پہلے انہوں نے آخری امید کے طور پر دوبارہ ظفر کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور جیسے ہی ان کا اسکوٹر گلی میں مڑا انہوں نے ظفر کا دروازہ کھلا دیکھ لیا۔

غیاث چچا جلدی سے اسکوٹر لاک کر کے اترے اور دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد ظفر نے اندر سے دروازہ کھولا اور سر نکال کر باہر جھانکا اور غیاث چچا کو دیکھ کر طنز یہ انداز میں بنا کسی سلام دعا کے بولا۔

”اوہ..... تو آپ ہیں..... کیا آپ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں..... میرے خیال میں تو اسے اب تک آپ کے گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔“

غیاث چچا کچھ حیران بھی ہوئے کہ جب ظفر کو پتہ بھی ہے کہ جو اپنے گھر میں ہیں تو یہ انہیں لینے کیوں نہیں آیا۔

”ہاں بیٹا..... وہ تو کب سے گھر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ دراصل ٹیوشن سے واپسی پر کچھ دیر ہو گئی تھی۔ یہاں پہنچی تو دروازے پر تالا لگا ہوا تھا، اس لیے ریحان صاحب اُسے ہماری جانب چھوڑے چلے آئے..... چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں..... وجہ یہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

<http://kitaabghar.com>

ظفر کے چہرے پر ایک ذہر خندی مسکراہٹ ابھری۔

”اوہ..... ریحان صاحب..... تو وجہ یہ کہ کولانے لیجانے کا فریضہ اب بڑے صاحب نے خود سنبھال لیا ہے..... بہتر ہوتا وہ اسے آپ کے

گھر چھوڑنے کے بجائے واپس اپنے گھر ہی لیجاتے.....“

غیاث چچا کا صبر اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے گرجے۔

”ظفر..... تمہیں شرم آنی چاہیے خود اپنی بیوی کے متعلق ایسی بات کرتے ہوئے..... وہ بے چاری تو.....“

<http://kitaabghar.com>

ظفر نے ان کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

”بس..... بہت ہو چکا یہ ڈرامہ..... میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے اس افسر کے ساتھ یہاں آتے اور واپس جاتے دیکھا ہے۔ کیا

شریف زادیوں کے یہی لکھن ہوتے ہیں کہ شام ڈھلے دیر تک اندھیرا ہونے کے بعد بھی گاڑیوں میں افسروں کے ساتھ گھومتی پھریں.....؟“ غیاث

چچا نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ ظفر پر اٹھنے سے روکا، لیکن اپنی زبان کا کوڑا لہرانے سے خود کو نہ روک سکے۔

”شریف زادیاں ایسا کرنے پر تب مجبور ہو جاتی ہیں جب ان کے میاں گھر میں چار پائی پر بڑ کر بیوی کی کمائی کی روٹیاں توڑنے لگیں.....

<http://kitaabghar.com>

ایسے میں انہیں خود اپنا اور میاں کا پیٹ پالنے کے لیے گھر سے باہر قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

ظفر کے تن بدن میں غیاث چچا کی یہ بات ایسی آگ لگا گئی کہ وہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھا اور اس کی زبان سے غیاث چچا اور جَوّآپی کے لیے

مغلظات کا ایک ایسا ریلہا بہہ نکلا کہ جس کے آگے بند باندھنے والا کوئی نہ تھا۔ دراصل ظفر کو تو قہر یہ تھی کہ غیاث چچا جَوّآپی کی وجہ سے اس کے سامنے

گزر گرائیں گے، فریاد کریں گے کہ وہ آکر ان کی بیٹی کو ان کے گھر سے واپس لے جائے اور وہ ان کی بات مان تو لے گا لیکن کچھ نہ کچھ مزید غیاث چچا

سے اٹھنے کے بعد۔ کافی دنوں سے اس کی نظر غیاث چچا کے لمبرینا (Lumbrita) اسکوٹر پر تھی اور وہ دو تین مرتبہ وجوہ کے سامنے اس بات کا عذر بھی

پیش کر چکا تھا کہ شہر کے فاصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ بندہ گھر سے کام کی تلاش میں نکلے بھی تو کیسے۔ آدھا دن تو بس یا تا نکلے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے

میں اگر کوئی سواری ہوتی تو کم از کم اُسے لوگوں کے پاس کام مانگنے کے لیے جانے میں تو آسانی ہو جاتی۔

جَوّآپی نے اس سے جوابا کہا بھی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ٹیوشن کے پیسوں سے کچھ رقم جوڑ کر قسطوں پر ظفر کے لیے اپنے ابا سے کہہ کر کوئی سواری

دلوادیں گی لیکن ظفر کو بھلا اتنا صبر کہاں سے آتا.....؟

<http://kitaabghar.com>

وہ تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اُسے اپنی سواری کی ضرورت کہاں سے پوری کرنی ہے اور وہ کسی بہانے کی تلاش میں تھا کہ جب اسے وجوہ

آپی کے گھر والوں پر دباؤ ڈالنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آجائے اور وہ اپنی اس خواہش کا اظہار کر کے ان سے اپنی بات منوا سکے۔ اور پھر قدرت نے

اُسے وہ موقع فراہم کر ہی دیا اور بد قسمتی سے ڈو کو ٹیوشن سے واپسی پر دیر ہو گئی۔ جس وقت ریحان صاحبہ جو کولے کر گلی میں داخل ہوئے تھے، تب ظفر وہیں گلی کے ٹکڑے پر ہی کھڑا چھپ کر یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو اُس وقت بھی آگے بڑھ کر تالا کھول کر ڈو آپی کو گھر میں بلا سکتا تھا لیکن اذیت پسندی کا مارا، یہ شخص ایسے کھیل کھیلنے میں بہت لطف حاصل کرتا تھا اور پھر اُسے تو ویسے بھی ڈو آپی اور ان کے گھر والوں کی تذلیل کا کوئی نہ کوئی موقع چاہیے ہوتا تھا۔ اور یہاں تو ایک تیر سے دو شکار ہو رہے تھے۔ تذلیل کی تذلیل ہو جاتی اور محاورے میں اسکوٹر کا مطالبہ بھی ڈہرایا جاسکتا تھا۔ لیکن غیاث چچا کی ایک ہی کھری بات نے اُسے انگاروں پر لوٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔

ظفر کے شور شرابے سے سامنے کے مکان سے اُس کے ہمسائے کاظمی صاحب بھی باہر نکل آئے اور انہوں نے بھی ظفر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ظفر کا خون تو اُبال کھار ہا تھا۔ ایک مجبور لڑکی کے مجبور باپ کی یہ مجال کہ اُسے طعنے دے..... غیاث چچا بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے لہذا انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر کنٹرول کر کے دوبارہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی بیٹی اب ظفر کی بیوی ہے لہذا اس کے کردار پر کچھ اُچھالنا خود ظفر کی اپنی بے عزتی کے مترادف ہے لیکن ظفر کی شعلے اُگھتی زبان کو اب لگام دینا ناممکن تھا۔ وہ چلا کر بولا۔

”خوب جانتا ہوں میں کہ کس کا کردار کیا ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنی لاڈلی کو اب اپنے گھر میں ہی رکھیں۔ میں اس بدنامی کا بوجھ مزید نہیں سہہ سکتا۔ اس گلی محلے میں میری بھی کوئی عزت ہے۔ لیکن جب یہی آس پاس والے اُسے بڑی بڑی گاڑیوں میں صاحب لوگوں کے ساتھ آتے جاتے دیکھیں گے تو میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“

غیاث چچا ایک بار پھر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور دھیرے سے بولے۔
 ”میاں اس کا آسان حل تو یہی ہے کہ تم اپنی بیوی کو گھر میں بیٹھنے کا کہو اور کل سے خود روزگار ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑو۔ نہ وہ گھر سے باہر نکلے گی نہ تمہاری عزت پر کوئی حرف آئے گا۔“

ظفر غزایا۔ ”خوب..... ایک تو چوری..... اوپر سے سینہ زوری..... گویا آپ تمام الزام پھر مجھی کو دے رہے ہیں..... بڑا گھمنڈ ہے نا آپ کو اپنی لائق فائق بیٹی کی کمائی پر تو پھر ٹھیک ہے۔ رکھیں اپنی اُس کماد بیٹی کو اپنے گھر پر۔ نہ مجھے اُس کی ضرورت ہے اور نہ اس کی کمائی کی، میری طرف سے آج سے وہ فارغ ہے۔“

غیاث چچا نے اُس کی زبان روکنے کی کوشش کی اور وہ سراسیمہ ہو کر چلائے۔
 ”ظفر..... اپنی زبان پر قابو رکھو..... میرا مطلب وہ نہیں جو تم..... لیکن ظفر کی زبان سے جو نکلتا تھا وہ نکل کر ہی رہا.....“

”میں نے اسے طلاق دی..... طلاق دی..... طلاق دی.....“
 غیاث چچا وہیں کھڑے کھڑے زور سے چکرائے اور زمین پر آگرے، ظفر نے جانے کب کا دروازہ بند کر کے اندر جا چکا تھا۔ کاظمی صاحب نے چلا کر اُس پاس کے محلے داروں کو اکٹھا کیا اور غیاث چچا کو فوراً رکشہ میں ڈال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے دل کا دورہ تقیث کیا اور رات بھر غیاث چچا انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں پڑے رہے۔ سیکینہ خالہ اور ڈو آپی کو گھر پر خبر ملی تو وہ سول ہسپتال دوڑی چلی آئیں۔ صبح کے پچھلے پہر جب

غیاث چچا کو کچھ ہوش آیا تو غنودگی کے عالم میں بھی وہ یہی بڑبڑاتے رہے..... نہیں نہیں..... خدا کے لیے ایسا نہ کرو..... اُسے طلاق نہ دو.....“ تب ساتھ آئے کاظمی صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی سکیزنہ خالہ اور قوآپی کو تنہائی میں لے جا کر وہ رُوح فرسا خبر سنا ہی دی جو غیاث چچا کی اس حالت کی ذمہ دار بنی تھی۔ کہتے ہیں انسان کو شدید صدمے کی حالت میں اگر کوئی دوسری اور اس سے بھی بڑی صدمے کی خبر سنائی جائے تو پہلا صدمہ ہی کبھی دوسرے صدمے کے جھٹکے اور شاک کو برداشت کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ و جوآپی اور سکیزنہ خالہ پہلے ہی غیاث چچا کی ڈوبتی سانسوں کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس گنوا چکے تھے لہذا یہ دوسرا بڑا صدمہ انہیں مزید گم سم کرنے کا باعث تو بنا لیکن فی الحال انہیں اپنی خبر بھی نہیں تھی لہذا ان کے ذہن یہ صدمہ وقتی طور پر تو جھیل گئے کیونکہ وہ پہلے ہی ایک بڑے صدمے سے گزر رہے تھے۔ البتہ اس دوسرے صدمے کے اثرات دیر پا تھے اور یہ غم اور یہ کرب دھیرے دھیرے اور قطرہ قطرہ زہر بن کر ان کی رگوں میں اُترنا بھی باقی تھا۔

جس وقت راجہ مجھے یہ المناک داستان سنا رہا تھا اُس وقت بھی غیاث چچا دل کے وارڈ میں ہی پڑے ہوئے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر سیدھے ہسپتال ہی چلے گئے۔ وارڈ میں شور شرابے سے بچنے کی غرض سے ایک وقت میں صرف دو فرد ہی مریض کو دیکھنے اندر جاسکتے تھے لہذا باقی سب راہداری میں ہی رُک گئے اور میں اور راجہ اندر گئے۔ سکیزنہ خالہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ و جو وہاں نہیں تھیں، شائد گھر گئی ہوں کچھ دیر کے لیے غیاث چچا کو ہوش آچکا تھا لیکن وہ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے اور چپ چاپ پڑے چھت کو گھورے جا رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستہ سے ان کا ہاتھ تھام لیا، انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور دھیرے سے دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپایا۔ ان کے ہاتھ کی گرفت اور اُس سہارے کے طور پر قبول کیا ہے جو ایسے میں کوئی بھی ٹوٹا ہوا شخص کسی اپنے سے اُمید کر سکتا ہے۔

ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پکی عمر کا ایک باوقار اور سنجیدہ سا شخص ہاتھ میں پھولوں کا گلہ دستہ لیے اندر داخل ہوا۔ اُس نے بہترین تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر خوبصورت سے ہلکے سنہری فریم کی عینک تھی جو اس کے وجہ بہ چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ راجہ نے آہستہ سے میرے کان میں بتایا کہ یہی ریحان صاحب ہیں۔ ان کے ساتھ شاف نرس بھی غیاث چچا کے پردوں سے الگ کر کے بنائے گئے کیبن میں داخل ہوئی۔ کیبن میں اتنے لوگوں کی گنجائش نہیں تھی لہذا میں اور راجہ اٹھ کر باہر آ گئے۔ باہر راہداری میں ریحان صاحب کا باوردی ڈرائیور بھی ایک جانب کھڑا نظر آیا اور راجہ سے انتہائی پُر تپاک طریقے سے ملا۔ راجہ نے بتایا کہ گزشتہ تین چار دنوں سے ریحان صاحب کا ڈرائیور روزانہ انہیں قوآپی کے گھر اور ہسپتال لاتا رہا ہے لہذا محلے میں اور پھر یہاں ہسپتال میں روزانہ ہی راجہ سے ملاقات کی وجہ سے دونوں میں اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی ہے۔ بالے اور ننھو وغیرہ بھی راہداری میں پڑے بیچوں پر ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لمحوں میں غور سے اپنے بچپن کے ان ساتھیوں کو دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیوں اچانک ہی مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اپنے بچپن کے چلے جانے کا احساس۔ وہ سب بھی اب نوجوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ باقاعدہ شیوہ بنانے لگے تھے اور ان کے جسم بھی میرے جسم کی طرح سخت اور ٹھوس سانچے میں ڈھل چکے تھے۔ ہاں..... اگر کچھ نہیں بدلی تھی تو وہ تھی ان کے چہروں کی معصومیت..... شاید ہماری عمر کتنی ہی کیوں نہ بڑھ جائے اور ہم کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں لیکن اپنے والدین کے لیے اور اپنے بچپن کے دوستوں کے لیے ہم ہمیشہ عمر کے اُسی حصے میں رہتے ہیں، جسے بچپن کہتے ہیں۔ ایسے رشتوں

کے درمیان بچپن کا یہ دمبر کبھی ختم نہیں ہوتا..... جوانی کی دھوپ کے مصائب انہیں کبھی چھو بھی نہیں پاتے۔

غیاث چچا کو مزید ایک ہفتہ وہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا اور پھر بہت سی احتیاطیں بتا کر انہیں اگلے ہفتے ڈسچارج کر دیا گیا۔ وہ گھر واپس آ گئے لیکن ان کی زبان کو لگی چپ نہ ٹوٹ سکی۔ سیکینہ خالہ اور وجو نے اس بات کا خاص دھیان رکھا کہ وہ ان کے سامنے ایسی کوئی بات یا اپنی ادا سی اور ڈکھ کا اظہار نہ کریں جو غیاث چچا کو مزید دکھی کرنے کا سبب بن سکے۔ لیکن کیا ان کے اس طرح چھپانے سے ان دونوں کا دکھ غیاث چچا سے چھپ سکتا تھا.....؟

اُن کی بیٹی دو سال بعد ہی طلاق کا ٹیکہ لگا کر گھر واپس آ بیٹھی تھی اور اس سب کا ذمہ دار وہ کہیں نہ کہیں خود اپنے آپ کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں ہر وقت بس ایک اسی ”کاش“ کی گردان ہوتی رہتی کہ کاش وہ اس رات ظفر کے سامنے نہ بولتے، کاش وہ اپنی تلخی پر قابو پا لیتے، کاش وہ چند لمحے مزید خون کے گھونٹ پیتے رہتے اور ظفر کو اس کی شرطوں پر گھر مناللاتے، کاش وہ اس کم ظرف انسان کو خود اُسی کے سامنے، آمینہ دکھا کر کھڑا نہ کر دیتے..... کاش..... کاش..... کاش لیکن یہ کاش کی گردان اب سوائے اُن کے خون کے فشار کو بڑھانے کے، مزید اور کچھ نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

بہت دن تک میں خود بھی دُجو سے، جانے کیوں نظر ملا نہیں پایا۔ جب کبھی وہ ہسپتال میں یا پھر بعد میں، اپنے گھر میں میرے سامنے آ جاتیں تو میں نظریں جھکا لیتا تھا۔ شاید میرے اندر کہیں نہ کہیں یہ شرمندگی بھی پل رہی تھی کہ میں کبھی ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پایا تھا۔ وہ نازک سی لڑکی ہمیشہ ہی سے جانے کتنے طوفانوں کا سامنا کیلے ہی کرتی آئی تھی۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی.....؟ مجھ سے صرف سات آٹھ برس ہی تو بڑی تھیں وہ..... میں جب کبھی عمر کے اس فرق کو ہٹا کر یا پھر انہیں اپنی جگہ رکھ کر سات برس کا یہ میزان کرتا تو حوصلے، صبر اور طاقت میں میں انہیں اپنے آپ سے کہیں آگے پاتا تھا۔ یا پھر شاید کسی کا یہ کہا بھی ٹھیک ہی تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ کم از کم جُو آئی کی حد تک تو یہ بات بالکل اور سو فیصد درست تھی۔ پہلے اُن کا معاملہ، پھر طاہر بھائی کی موت، پھر پڑھائی ادھوری رہ جانا، پھر اس کم ظرف سے شادی اور اب یہ طلاق..... کیا کچھ نہیں سہا تھا انہوں نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں.....

اُس دن بھی میں ان کے صحن میں پڑی آرام کرسی پر بیٹھا انہیں دیکھتے ہوئے یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں غیاث چچا کو ٹھلانے کے لیے باہر لے کر گیا تھا اور چند لمحے پہلے ہماری واپسی ہوئی تو انہوں نے وجو سے قبوہ پینے کی فرمائش کی تھی۔ وجو سامنے باورچی خانے میں سے قبوہ کی پیالیاں ٹرے میں اٹھائے میری طرف ہی آ رہی تھیں، غیاث چچا شاید کچھ لمحے سستانے کے لیے اپنے کمرے میں گئے تھے۔ وجو اب بہت کم بولتی تھیں یا پھر بالکل ہی خاموش رہتی تھیں۔ ہم دوستوں میں سے کوئی نہ کوئی شام کو غیاث چچا کو کچھ دور تک ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ٹھلانے کے لیے لے جاتا تھا۔ ریحان صاحب نے بھی اس موقع پر اپنا بڑا پن دکھایا تھا اور وہ بھی تقریباً ہر دوسرے روز غیاث چچا کو دیکھنے کے لیے آ جاتے تھے، وجو سے انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بچے اب کسی بھی دوسری ٹیچر سے ٹیوشن لینے کے لیے تیار نہیں ہیں لہذا چاہے مہینہ بھر کے بعد ہی کیوں نہ سہی، وہ وجو ہی سے دوبارہ ٹیوشن جاری رکھنے کی استدعا کریں گے۔ مجھے اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوئے مہینہ ہونے کو آیا تھا اور دو چار دن

میں میرا رزلٹ بھی نکلنے والا تھا۔ اتنے بہت سے دنوں میں اگر وجوہ نے مجھ سے کوئی بات کی تھی تو یہی کہ میرے پرچے کیسے ہوئے ہیں؟ اور میرا رزلٹ کب تک آئے گا؟ یا یہ کہ اب آگے میرا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ وہ جانتی تھیں کہ مجھ سے ڈسپلن اور نظم و ضبط کچھ کم ہی برداشت ہوتا ہے لہذا میں فوج تو قطعی جوائن نہیں کروں گا۔ اس لیے انہیں میرے مستقبل کے شعبے کی ہمیشہ ہی فکر لگی رہتی تھی۔ خود میرے ذہن میں بھی ابھی تک اس بارے میں کوئی حتمی خاکہ تشکیل نہیں پاسکا تھا۔

اس دن بھی جَوَ نے بیٹھے ہی مجھ سے یہی سوال کیا کہ اب تو رزلٹ بھی ہفتے بھر میں آ ہی جائے گا تو اب تک میں کوئی حتمی فیصلہ کیوں نہیں کر سکا؟ میں ابھی انہیں جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک نے میری توجہ ہٹا دی، میں اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے چلا گیا۔ جَوَ اندر برآمدے کو ڈھانکتی جافری کی اوٹ میں چلی گئیں۔ باہر ریحان صاحب کھڑے تھے لیکن ان سے کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑے شخص کو دیکھ کر میرے سارے جسم کا خون لمحہ بھر میں میری کن پٹیوں کی جانب سٹ آیا اور میرے چہرے پر نفرت کے کچھ ایسے آثار پیدا ہوئے کہ لمحہ بھر کو ریحان صاحب بھی شپٹا سے گئے۔ وہ ظفر تھا، ہاں..... وہ ظفر ہی تو تھا۔ میں نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ جَوَ کی رخصتی کے موقع پر دو سال پہلے اُسے دیکھا تھا لیکن میں اس کی صورت کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ریحان صاحب صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ گئے اور انہوں نے آہستہ سے کھار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ میرا نام جانتے تھے۔

”عباد میاں..... ہو سکے تو اندر کسی طرح وجہہ کی امی کو خبر کروادیتجئے کہ ظفران سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ غیاث صاحب کو اس کی خبر نہ ہو۔ میں اسے یہاں کبھی لے کر نہ آتا لیکن یہ میرے گھر پر آ کر بہت گڑبڑ اور بہت معافی مانگی ہے اس نے اپنی غلطی اور اپنے بُرے سلوک کی، اسی لیے یہ اپنی غلطی کے ازالے کی خاطر وجہہ اور ان کی امی سے ملنا چاہتا ہے۔“

میں نے حیرت سے ریحان صاحب کی طرف دیکھا۔ دیکھنے میں تو اچھے خاصے عقل والے اور سمجھ دار لگتے تھے۔ پھر آج وہ کس طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ جب ظفر نے جَوَ کو آخر کار طلاق ہی دے دی تھی تو پھر اب بھلا کیسا ازالہ اور کون سا مہم؟..... اب تو قصہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ شاید ریحان صاحب نے بھی میری آنکھوں میں سے جھانکتی حیرت اور چہرے پر لکھے سوالوں کو پڑھ لیا تھا، تبھی انہوں نے یہ عقدہ کھولا کہ اس رات ظفر سے غصے کے عالم میں جو کچھ بھی ہوا، صبح تک اپنی اُس غلطی پر وہ بے حد نادم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی اس نے غیاث چچا کو بقول اس کے، جو بھی کہا تھا، وہ غصے میں کہا تھا اور غصہ تو ہے ہی ایسی لعنت کہ انسان کو حیوان بنانے میں ذرا سی بھی تاخیر نہیں کرتا۔ لہذا وہ دوڑا ہوا اپنی مسجد کے امام صاحب کے پاس گیا اور ان سے گول مول سا ذکر کیا کہ اُس نے اپنے سسر کے سامنے اپنی بیوی کو فارغ کیے جانے کے الفاظ غصے میں کہہ دیئے ہیں لہذا وہ بتائیں کہ اس کا کیا حل ہے۔ پیش امام صاحب نے اس سے کہا کہ طلاق تو دی ہی غصے کی حالت میں جاتی ہے، لہذا اگر اس نے اپنی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ کہا ہے تو طلاق واقع ہو چکی۔ ہاں البتہ اس نے غصے میں صرف ایک مرتبہ کہا ہے کہ وہ میری جانب سے فارغ ہے اور نیت اس کی تب بھی طلاق ہی کی تھی تو پھر تین طلاقیں میں سے ایک طلاق تو ہو گئی لیکن اب بھی وہ اپنی بیوی کو گھر لاسکتا ہے۔ لیکن یہ دھیان میں رہے کہ اب اس کے پاس صرف دو طلاق ہی کی گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ لہذا ظفر کا دعویٰ اب یہ تھا کہ اس نے جَوَ کو صرف ایک ہی طلاق دی تھی اور وہ بھی لفظ طلاق سے نہیں..... بلکہ اس جملے

سے کہ ”اب وہ میری طرف سے فارغ ہے.....“

ریحان صاحب صاف دل انسان تھے، انہوں نے ظفر کی یہ فریاد سنی اور اسے بظاہر اپنے کئے پر شرمندہ دیکھا تو وہ اسے یہاں لے آئے تھے۔ ظفر اسی طرح دُور سر جھکائے اور مسکین سا بنا کھڑا تھا۔ مجھے ظفر کی کسی بات کا زتی بھر بھی بھروسہ نہیں تھا لیکن چونکہ ریحان صاحب خود کافی دیر سے دروازے پر کھڑے تھے لہذا میں نے کسی طور اندر یہ اطلاع پہنچادی کہ ریحان صاحب کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے فی الحال غیاث چچا کی موجودگی، ان کی اہمیت کی وجہ سے کچھ مناسب نہیں ہوگی۔ میں نے جان بوجھ کر سیکنہ خالہ کو ظفر کی باہر موجودگی کے بارے میں نہیں بتایا۔ وہ خود بھی سوچ میں پڑ گئیں کہ اس وقت غیاث چچا کی موجودگی میں بھلا وہ کیونکر اور کیسے ریحان صاحب کی بات سن سکتی تھیں، میں نے انہیں تجویز دی کہ میں جا کر راجہ لوگوں کی بیٹھک کھلوادیتا ہوں وہ چاہیں تو وہاں جا کر بات کر لیں کیونکہ اگر وہ اتنی دیر دروازے پر کھڑی ہو کر بھی ریحان صاحب کی بات سنیں گی تو غیاث چچا کو شک تو ضرور ہو جائے گا۔ ہم ابھی اسی کش مکش میں تھے کہ قدرت نے ہمارا مسئلہ خود حل کر دیا۔ دُور غیاث چچا کے کمرے کا دروازہ بند کیا اور دھیرے سے آکر ہمیں آہستہ بات کرنے کا کہا کیونکہ غیاث چچا کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دُور کو ابھی تک اس سارے ماجرے کا سیکرپہ نہ تھا۔ سیکنہ خالہ نے مجھ سے کہا کہ میں انہیں یہیں ان کے مہمانوں کے کمرے میں لے آؤں۔ باہر آکر میں نے ریحان صاحب سے کہا کہ انہیں سیکنہ خالہ نے اندر آنے کا کہا ہے لیکن فی الحال وہ اکیلے ہی بات کر آئیں تو بہتر ہوگا۔ ریحان صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے اور انہوں نے ظفر کو ان کی گاڑی میں ہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر انتظار کرنے کا کہا اور خود اندر چلے گئے۔ میں وہیں دروازے پر جمنا کھڑا رہا کیونکہ مجھے ظفر سے کوئی اچھی اُمید بالکل بھی نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب واپس باہر آ گئے اور میں نے ان کے چہرے پر لکھی تحریر سے ہی نتیجہ اخذ کر لیا کہ سیکنہ خالہ نے اُن سے کیا کہا ہوگا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر پلٹ گئے، چند قدم دُور جا کر انہیں نہ جانے کیا خیال آیا کہ واپس میری جانب پلٹ آئے۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا، وہ قریب آکر بولے۔

”عباد میاں..... میں نہیں جانتا کہ یہ شخص سچ بول رہا ہے یا جھوٹ، کیونکہ اس واقعے کے معنی گواہ خود غیاث صاحب ہیں اور وہی بہتر جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے لیکن اس وقت ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم ان سے بھی یہ حقیقت جان نہیں سکتے..... میں اسے یہاں صرف اس خیال سے لے کر آیا تھا کہ اگر کسی بھی طرح میری کسی بھی کوشش سے اس دُکھی گھرانے اور اس مظلوم لڑکی کے غموں کا کچھ مداوا ہو سکے، تو کرگڑروں..... لیکن وجہہ کی امی بھی ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ یہ وقت اس سارے قصے کو چھیڑنے کا ہے ہی نہیں..... ابھی بمشکل غیاث صاحب کی ذرا سی طبیعت سنبھلی ہے۔ ان کے سامنے اس وقت ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جو انہیں ذہنی یا دلی اذیت دینے کا باعث بن سکتی ہو۔ میں اس شخص کو اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ فی الحال چند ہفتے اس بات کو بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ لیکن جانے اسے میری بات سمجھ بھی آئے یا نہیں.....؟ لہذا اب تم کو یہاں بہت ہوشیار اور بیدار رہنا ہوگا تا کہ یہ موقع پا کر کوئی نیا فتنہ کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے.....“

میں نے ریحان صاحب کی بات توجہ سے سنی اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں۔ سیکنہ خالہ کی مرضی کے بغیر ظفر ان کے

دروازے پر تو کیا اس محلے کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔ ریحان صاحب میرا کندھا تھپتھا کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے جہاں ظفر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ریحان صاحب نے اس سے کچھ بات کی لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اُن کی بات سے پوری طرح متفق نہیں ہے لیکن ریحان صاحب نے پھر بھی ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

دراصل ظفر کو اُسی رات اپنی اس گھناؤنی غلطی کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن اس میں بھی اس کی طرف سے کسی نیک نیتی کا عمل دخل نہیں تھا، نہ ہی اسے اپنے کئے پر کوئی پشیمانی تھی۔ اُسے تو صرف ایک بات کی ہی فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس نے وقتی جوش اور غصے میں آکر فوکو طلاق تو دے دی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ بھی ختم کر بیٹھا تھا اور پھر ایک اچھی خاصی گھر کی نوکرائی سے بھی ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے، نوکرائی بھی کیسی؟ جو صبح سے لے کر رات تک نہ صرف اس کے گھر کے کام کاج اور بنانے سنوارنے میں جُٹی رہتی تھی بلکہ شام کو دوسروں کے گھر جا کر ان کے بچے پڑھا کر اتنی کمائی بھی کر لاتی تھی، جس سے ظفر کے پیٹ کا غار بھر جائے..... لہذا اگلے ایک ہفتے میں ہی ظفر کو اپنی حماقت کا شدید احساس ہونا شروع ہو گیا۔ پچھلے دو سالوں میں تو اُس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی تک خود نہیں پیتا تھا۔ اب جو گھر کے مختلف کام اور کھانے پینے کی مجبوری نے اس کے سامنے منہ کھولا اور اسے اپنی عیاشی اور جوئے کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو اُسے جو بُری طرح یاد آئیں۔ اس کا شاطر ذہن پہلے دس بارہ دن تو مختلف قسم کے منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا رہا، لیکن پھر جب اُسے کسی دوست نے کسی عالم سے مشورہ کرنے کی صلح دی اور وہ محلے کی مسجد کے امام کے پاس زندگی میں پہلی مرتبہ، اپنی اس مجبوری کی وجہ سے مسجد کی سرحد پار کر گیا تب مولوی صاحب کی باتوں نے اُسے یہ راستہ سمجھا دیا کہ وہ مکمل طلاق دینے سے ہی یکسر انکار کر دے گا۔ دوسرا منصوبہ اُس نے یہ بنایا کہ براہ راست غیاث پچا کے گھر جانے کے بجائے وہ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ بڑے افسر تھے اور فوکو کے خیر خواہوں میں سے ایک تھے، اور فوکو کی عزت بھی بہت کرتے تھے۔ انہیں ہمیشہ وہ جو جیسی احساسات کی پڑھی لکھی لڑکی کا ایسے جنگلی اور اُجڑ شخص سے رشتہ ہونے پر بھی دل ہی دل میں بہت افسوس ہوتا تھا لیکن ظاہر ہے یہ قدرت کے کھیل تھے اور اس میں بھلا ریحان صاحب کیا کر سکتے تھے۔ لہذا وہ ظفر کی باتوں پر اعتبار کر بیٹھے تھے، صرف اس لیے کہ اگر ظفر پچ بول رہا ہوگا تو فوکو کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ دراصل وہ خود کو بھی فوکو کے ساتھ ہوئے اس ظلم کا کہیں نہ کہیں ذمہ دار ٹھہراتے تھے نہ اس شام اُن کا ڈرائیور فوکو چھوڑ کر اپنی بہن کے گھر جاتا، نہ فوکو لیٹ ہوتیں اور نہ ہی انہیں آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ ڈرائیور کو تو انہوں نے اگلے دن ہی نوکری سے فارغ کر دیا تھا لیکن وہ بے چارہ روتا دھوتا کچھ دن بعد فوکو کے گھر آن پہنچا کہ اُس سے جو بھی غلطی ہوئی انجانے میں ہوئی اور اس کی بے روزگاری سے بچے گھر میں فاقوں پر مجبور ہیں۔ لہذا فوکو نے خود ہی ریحان صاحب سے کہہ کر اُسے دوبارہ نوکری پر لگوا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس بات پر فوکو اس قدر احسان مند تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں دعائیں دیتا رہتا تھا، لیکن شاید اُسے بھی اس بات کی خبر نہیں تھی کہ کچھ لوگوں پر قدرت دعاؤں کے ذریعہ بھی بند کر دیتی ہے۔ شاید وہ بد قسمت، بہت خاص لوگ ہوتے ہوں گے کہ جن کے لیے اتنا کڑا نصیب لکھ کر انہیں زمین پر بھیجا جاتا ہوگا۔

فوکو بھی انہی میں سے ایک تھیں کہ جن کے مقدر کی کنجیاں قدرت تالا لگا کر نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گئی تھی؟ ظفر نے دو چار دن تو ریحان صاحب یا وہ جوئے کے گھروالوں کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا اور پھر کوئی پیش رفت ہوتی نہ دیکھ کر اس نے پھر غیاث پچا کے گھر کا رخ کیا، لیکن اس بار وہ اکیلا تھا۔ میں پہلے ہی راجہ اور بالے کو بتا چکا تھا کہ اب ہمیں چوبیس گھنٹے اس بات کا دھیان رکھنا ہوگا کہ ظفر کسی بھی طرح غیاث پچا کے گھر

تک نہ پہنچ پائے، ہم میں سے کوئی نہ کوئی وہاں آس پاس موجود ہی رہتا تھا لیکن یہ ظفر کی بد قسمتی تھی کہ جس شام وہ ہمارے محلے میں گھسا، اس وقت ہم سارے ہی دوست بڑے میدان میں موجود تھے۔

راجہ نے مجھے کہنی مار کر ظفر کی جانب متوجہ کیا جو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے ”گزشتہ سُسرال“ کی جانب جا رہا تھا۔ بالے نے سیٹی بجا کر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”میں نے کہا ظفر بابو..... جاتے کہاں ہو..... دو گھڑی ہماری بات تو سن لو۔“

ظفر ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر کچھ ٹھٹکا، مجھے تو وہ پہلے بھی وجوہ کے دروازے پر اس دن دیکھ ہی چکا تھا لہذا اُسے ہمارا مقصد سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ ہم نے آگے بڑھ کر ظفر کے گرد یوں گھیرا لیا کہ اس کے آگے بڑھنے کا راستہ ہی بند ہو گیا۔ لیکن وہ بھی اپنی ذات کا ایک ہی کایاں شخص تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور اکڑ کر بولا ”تم لوگ یوں میرا راستہ نہیں روک سکتے..... مجھے غیاث چچا سے ملنا ہے۔ میں اپنی بیوی کو لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میں نے بہت مشکل سے اُسے تمیز سے جواب دیا۔

”غیاث چچا کی طبیعت اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کچھ دن بعد تشریف لائیں۔“

ظفر کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔

”نہیں..... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا..... اور خبردار جو تم میں سے کسی نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو..... تم لوگ ابھی ظفر سے

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

واقف نہیں ہو۔“

ظفر نے قدم آگے بڑھائے۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے۔ ظفر نے اسے اپنی فتح جانتے ہوئے فخر سے سرواٹھا کیا لیکن دوسرے ہی لمحے بالے کی اڑائی ہوئی ٹانگ کے جھٹکے سے وہ زمین بوس ہوتے ہوتے بچا۔ ظفر غر اکر ہماری جانب پلٹا، اب راجہ اس کے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ را جب نے ظفر کی کلائی پکڑ لی اور جھٹکا دے کر بولا۔

”یہ مت سمجھنا کہ یہ باقی سارے تم سے ڈر کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ دراصل ہم نہیں چاہتے کہ تم اس محلے سے باہر جا کر لوگوں سے یہ کہتے پھرو کہ یہاں تمہارے ایک کے مقابلے میں پانچ پانچ آگئے تھے لہذا تم کچھ کر نہ پائے۔ تمہارے لیے صرف میں ہی کافی ہوں..... بولو کیا ارادہ ہے پیارے.....؟“

ظفر نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے دو چار بار زور لگایا لیکن میں راجہ کی گرفت کو بہت اچھی طرح جانتا تھا، بچپن میں جب ہم زور کا مقابلہ کرتے تو راجہ کی پکڑ کو ہم تین تین مل کر بھی نہیں کھول پاتے تھے۔ کچھ ہی لمحوں میں ظفر بھی پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم سب کو کسی طرح کچا ہی چبا جائے۔ اس نے آخری حربہ آزمایا۔

”ٹھیک ہے..... تو تم لوگ اس غنڈہ گردی سے باز نہیں آؤ گے۔ میں ابھی واپس جا کر پولیس کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ پھر دیکھنا پولیس تم لوگوں کا کیا حشر کرتی ہے۔“

بالے نے اُس کی بات سنی تو زور سے ہنس کر بولا۔

”یہ تکلیف کرنے کی بھی کیا ضرورت ہے ظفر بابو..... پولیس کو ہم خود بنا لیتے ہیں۔ سنا ہے اپنا پرانا علاقہ تھا نیدار ملک ریشم ترقی پا کر ڈی۔ ایس۔ پی ہو گیا ہے اور آج کل اس کی ڈیوٹی بھی دوبارہ ہمیں ہمارے علاقے میں لگا دی گئی ہے۔ بڑا ظالم افسر ہے۔ جھوٹے کو تو قبر تک پہنچا کر ہی دم لیتا ہے..... اباؤنٹو..... جا جا کر ملک صاحب کو ہمیں بلا کر لے آ..... تب تک ہم ظفر بابو کی ہمیں خاطر مدارات کرتے ہیں۔“

تھو نے جلدی سے دانت نکالے اور ظفر کی جانب دیکھ کر بولا۔

”قسم خدا کی..... بلاؤں کیا.....؟؟“

ظفر کو اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ ہماری موجودگی میں اس کا مقصد حل ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں لہذا وہ پلٹ کر بکتے جھکتے ہوئے محلے سے واپس چلا گیا۔ میں نے احتیاطاً اسی وقت محلے کے باہر بنے پی۔ سی۔ او سے ریحان صاحب کے نمبر پر انہیں فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا انہوں نے مجھے تسلی دی کہ ہمارے علاقے کا ایس۔ پی ان کا کورس میٹ ہے لہذا ایس۔ ایچ۔ او یا کوئی بھی دوسرا پولیس افسر ظفر کی کسی بھی شکایت پر ایس۔ پی کو اطلاع کئے بنا نہ تو کوئی کاغذی کارروائی کرے گا اور نہ ہی ظفر کے ساتھ کہیں جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ ظفر تک کر بیٹھنے والی ہڈی نہیں ہے لہذا ہم لوگوں نے ڈھوکے گھر کے گرد پہرہ مزید سخت کر دیا۔ ظفر نے ایک آدھ بار اور کوشش کی لیکن محلے کے باہر سے ہی ہمیں دیکھ کر اُلٹے پیروں واپس لوٹ گیا۔ ہم نے رات والے محلے کے چوکیدار کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ باہر کا پھانک بند ہونے کے بعد کسی بھی باہر کے آدمی کو اندر داخل ہونے نہ دے، اور اگر کوئی اُسے مجبور کرے بھی تو ہم دوستوں میں سے کسی بھی ایک کو آکر اس بات کی اطلاع دے دے۔ لیکن ظفر نے رات کے اندھیرے میں محلے میں گھسنے کی جرأت نہیں کی۔ شاید اسے اس شام ہماری آنکھوں میں چھپے غصے سے ہمارے ارادوں کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم رات کی تنہائی میں اسے اپنے سامنے پا کر اس کی کیا گت بنا سکتے ہیں۔

لیکن ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود میرے اندر کوئی چیز ایسی تھی، جو ہر لمحہ مجھے بے چین کئے رکھتی تھی۔ اور پھر مجھے میری بے چینی کا جواب بھی مل ہی گیا۔ تیسرے ہفتے کے آخر کی بات ہے، ڈاکیہ ایک رجسٹری لے کر محلے میں داخل ہوا اور اُس نے سیدھے جا کر غیاث چچا کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فضلو بابا نے رجسٹری وصول کر کے دستخط کر دیئے۔ اور چند لمحوں بعد ہی میرے اندر کی بے چینی اور واہموں نے باہر نکل کر حقیقت کا رخ اختیار کر لیا۔ ظفر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کو اس کی مرضی کے بغیر اس کے گھر والوں نے حصے بے جا میں رکھا ہوا ہے لہذا اس نے عدالت سے شنوائی کی درخواست کی تھی۔ ڈوآپی کے خاندان پر ایک اور ڈکھ اور مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا پہلے تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ غیاث چچا کو اس بات کی خبر نہ ہونے دی جائے۔ ڈوآپی نے مجھے ریحان صاحب سے بات کرنے کا کہا۔ ریحان صاحب نے کہیں سے کہلو کر ایک وکیل کی کا نظام کروادیا جو ایسے معاملات میں مہارت کی شہرت رکھتی تھی۔ وہ گھر پر سیکنہ خالد کی دور کی جان پہچان والی بن کر آتی رہی اور معلومات حاصل کر کے کیس آگے بڑھاتی رہی۔ ایک بار ڈوآ کا بیان بھی عدالت میں ہوا اور انہوں نے گھل کر جج کو بتا دیا کہ وہ کسی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ خود اپنے گھر میں اور اپنی مرضی سے رہ رہی ہیں۔ کیونکہ درخواست گزار اب ان کا شوہر نہیں رہا اور انہیں طلاق دے چکا ہے۔ کیس نے اپنا رخ پلٹ لیا اور اب اس بات کا فیصلہ ہونا باقی رہ گیا کہ آیا طلاق ہوئی بھی ہے یا نہیں.....؟ اور ایسے موڑ پر غیاث چچا کی گواہی لازمی ہو گئی تھی لہذا اس موقع پر بھی ریحان صاحب نے ہی یہ

معرکہ سرانجام دینے کا فیصلہ کیا اور ایک شام اپنی موٹر خود چلاتے ہوئے غیاث چچا کے گھر آئے اور انہیں قریبی پارک تک گھمانے کے بہانے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نہ جانے کہاں لے گئے۔ غیاث چچا جب تین گھنٹے بعد گھر واپس لوٹے اور ریحان صاحب کی گاڑی سے اترے تو ان کے قدم ڈمگے رہے تھے۔ گھر میں داخل ہوئے تو جو صحن میں ہی بیٹھیں کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ وہ کچھ لمحے کھوئی کھوئی نظروں سے ڈوکودیکھتے رہے، جوان کے اس طرح دیکھنے سے کچھ گھبرا سی گئیں، اور جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں۔

<http://kitaabghar.com>

”ابا..... کیا ہوا.....؟ آپ تھیک تو ہیں نا.....؟“

غیاث چچا کی دہنی آنکھ سے ایک آنسو پڑکا۔ ان کی لاڈلی آج بھی اپنے سارے دکھ بھلا کر صرف انہی کی وجہ سے پریشان تھی..... انہی کی تکلیف کا مداوا چاہتی تھی، انہوں نے دُک کے سر پہ ہاتھ رکھا اور پھر جیسے ضبط کے سارے دامن چھوٹ گئے۔ وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ سارا جل تھل ہو گیا۔ دُک بھی ہچکیاں بندھ گئیں، وہ باپ کے گلے سے یوں لگیں کہ اب دوبارہ کبھی علیحدہ نہیں ہوں گی، سیکڑہ خالہ اندر سے ہڑبڑائی ہوئی بھاگی آئیں اور باپ بیٹی کو یوں گلے ملے روئے دیکھ کر بنا کچھ پوچھے ہی رو پڑیں۔ ویسے بھی اس بد قسمت خاندان کے پاس رونے کی وجوہات کی کبھی کمی نہیں رہی تھی۔

لیکن یہ آنسو بھی کتنی عجیب چیز ہوتے ہیں، کھل کر بہہ جائیں تو کم از کم وقتی طور پر ہی سہی، لیکن دل کا بوجھ کچھ نہ کچھ ہلکا ضرور کر دیتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیسی کمال کی تاثیر ہوتی ہے اس بے ضرر سے مانع کے اندر.....؟

ریحان صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے انداز سے غیاث چچا کو دھیرے دھیرے ظفر کے نوٹس کی تمام تفصیلات بتادی تھیں۔ دنیا میں ہر بات اور ہر راز کھولنے کا ایک سلیقہ ضرور ہوتا ہے، ایک ایسا سلیقہ جو کڑوے سے کڑوے سچ کو بھی گھونٹ گھونٹ پینے پر مجبور کر دیتا ہے اور انسان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ کیسا کڑوا زہ اپنے اندر اتار چکا ہے۔ ریحان صاحب اس سلیقے سے بخوبی واقف دکھائی دیتے تھے، انہوں نے غیاث چچا کو پورا سچ بتا دیا تو ضرور، لیکن کچھ ایسے انداز سے کہ اس سچ کی کڑواہٹ نے ان کے پہلے سے زخمی اور بیمار دل کو وہ جھکا نہیں دیا جو کسی اور صورت انہیں یہ بات پتہ چلنے کی صورت میں لگ سکتا تھا۔

کہتے ہیں تمہید بات کا اثر بڑھا بھی سکتی ہے اور ایسی ہی کوئی لمبی تمہید اپنی بات کا اثر زائل بھی کر سکتی ہے۔ لہذا ریحان صاحب نے لمبی تمہید تو باندھی لیکن اپنی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے..... بہر حال اب غیاث چچا کو بھی آنے والے دنوں کی مشکلات کے بارے میں اعتماد میں لیا جا چکا تھا۔ غیاث چچا نے ریحان صاحب کو بتا دیا تھا کہ انہوں نے خود اپنے کانوں سے ظفر کی زبان سے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سنا تھا اور انہیں اس بات میں ذرہ برابر بھی شک نہیں تھا۔ لہذا صاف ظاہر تھا کہ ظفر جھوٹ بول رہا ہے ورنہ کوئی بھی باپ خود اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کا گھر کیوں توڑنا چاہے گا؟..... وہ تو خود ظفر کو یہ کہنے کے لیے گئے تھے کہ وہ ان کے گھر آ کر اپنی امانت کو واپس لے جائے۔ لیکن اس کم بخت نے وہیں دروازے پر ہی یہ کفر کر ڈالا، تبھی تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ خود ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

ریحان صاحب کو تو ظفر کا سچ پتہ چل چکا تھا لیکن ابھی یہ سچ عدالت کو پتہ چلنا باقی تھا اور ہم سب ہی جانتے تھے کہ یہ بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ اگلی ہی پیشی پر غیاث چچا کو بھی عدالت میں حاضری دینی پڑی اور انہوں نے اس رات جو بھی بتی تھی، حرف بہ حرف عدالت کے سامنے بیان کر دی۔ لیکن

ظفر بھری عدالت میں اس بات سے منکر گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے کسی مولوی کا دیا ہوا فتویٰ بھی عدالت کے روبرو رکھ دیا کہ ایک طلاق دینے سے مکمل طلاق واقع نہیں ہوتی اور چونکہ اس نے ایک طلاق ہی دی تھی لہذا اس کا اپنی بیوی سے تعلق اب بھی برقرار تھا اس لیے اُس نے عدالت سے استدعا کی کہ قانون اور مذہب کی رُو سے اسے اپنی بیوی کو گھر لیجانے کی اجازت دی جائے۔ غیث چچا کے تین طلاق کے دعوے کو اس نے یکسر یہ کہہ کر جھوٹ قرار دے دیا کہ چونکہ اس کا سسر اس رشتے سے خوش نہیں تھا لہذا اس رات وہ ظفر کو یہی دھمکانے آیا تھا کہ اگر ظفر نے اس کی بیٹی کو طلاق نہیں دی تو وہ ظفر کا نام و نشان تک اس دنیا سے مٹا دے گا لہذا ظفر نے ڈر کر ایک طلاق تو دے دی تھی لیکن اس نے منہ سے تین طلاق کا لفظ نہیں نکالا تھا۔

کیس پیچیدہ ہو گیا تھا۔ کیس کا واحد معنی گواہ خود لڑکی کا باپ تھا اور مدعی نے پہلے ہی لڑکی کے باپ پر اپنے شک و شبہ کا اظہار کر دیا تھا لہذا عدالت بھی سوچ میں پڑ گئی اور اُس نے مختلف مذہبی علماء سے مشورے تک اگلی تاریخ دے دی اور اس دن کیس مؤخر ہو گیا۔

اگلی پیشی تک ہم سب پھر سے اسی سولی پر تنگ چکے تھے، جو ہمارے مقدروں نے جانے کیوں جیون کی ہر راہ پر اور ہر نئے آنے والے موڑ پر ہم سب کے لیے ٹانگ رکھی تھی۔ اگلی پیشی پر عدالت کچھ کچھ بھری ہوئی تھی۔ ہر طرف نظروں کی برچھیاں تھیں جو اس مدینہ کی موم جلد میں گڑی جاتی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں جو اس پری رُو کی کول ساعتوں کو چھیل رہی تھیں۔ عدالت نے قاضی صاحب کو بھی معاونت کے لیے طلب کیا ہوا تھا۔ ظفر بے حد مطمئن دکھائی دیتا تھا کیونکہ اس نے اپنے تئیں عدالت کو شک میں ڈال کر آدمی جنگ تو جیت ہی لی تھی۔ اب اس کا مقصد حل ہوتے نظر آ رہا تھا۔ وہ اس معاملے کو اسی طرح کھینچتے رہنا چاہتا تھا تاکہ دو اور ان کے سارے خاندان کی ہمت کچھ اس طرح ٹوٹے کہ وہ سب اُس کے قدموں میں آ گریں۔ کیس کی شنوائی شروع ہوئی تو ظفر کے وکیل نے پھر وہی اعتراض کیا کہ مقدمے کا واحد اور عینی گواہ جس کا دعویٰ ہے کہ ظفر نے زبان سے تین طلاق کہا تھا، دراصل خود بیٹی کا رشتہ توڑنا چاہتا ہے لہذا اس کی گواہی معتبر نہیں مانی جاسکتی، نہ ہی اس کے حلفیہ بیان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ اور لڑکی بھی اپنے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے ورنہ دل سے وہ اب بھی اپنے گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ عدالت نے ہماری وکیلانی سے پوچھا کہ کیا اس وقوعے کے بارے میں مزید کوئی شہادت اس کے پاس ہے۔ میں نے راجہ کو اشارہ کیا جو میرے ساتھ ہی عدالت کے ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ اس نے جلدی سے پیچھے پلٹ کر اپنے بالکل پیچھے بیٹھے ایک عمر رسیدہ شخص کے کان میں کچھ کہا اور اس شخص نے اچانک ہی بھری عدالت میں کھڑے ہو کر آواز لگادی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”جی..... دوسری شہادت میری ہے۔“

یہ ایک عدالت میں پہلے گھمبیر سنانا چھٹا گیا اور پھر اچانک ہی سبھی لوگ بیک وقت بولنے لگ گئے۔ جج نے اپنے لکڑی کے ہتھوڑے کو تین بار زمین پر مارا، آہستہ آہستہ سب چپ ہو گئے۔ عدالت نے اس بوڑھے شخص کو کٹہرے میں آنے کے لیے کہا اور وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گواہوں کے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ظفر کے چہرے پر اسے دیکھ کر بے چینی کے تاثرات پیدا ہونے لگے تھے۔

بوڑھے شخص نے عدالت کو بتایا کہ اس کا نام جہانگیر کاظمی ہے اور وہ ظفر کا ہمسایہ ہے اور جس رات غیث چچا ظفر کو بلانے کے لیے اس کے گھر آئے تھے، وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھا اور اچانک اس نے لگی میں ظفر کے زور زور سے چلانے اور کسی سے لڑنے کی آوازیں سنیں۔ حالانکہ یہ ساری گلی کے لیے معمول کی بات تھی کیونکہ ظفر کے قرض خواہ ہر روز ہی اس کے دروازے پر آ کر کوئی نہ کوئی تماشہ کر کے جاتے تھے لیکن پھر جب بات

طول پکڑنے لگی تو وہ باہر نکل آیا۔ اور اس نے دیکھا کہ غیاث چچا ظفر کی منت سماجت کر رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ گھر چل کر اپنی بیوی کو واپس لے آئے لیکن ظفر نے ان کی ایک نہیں سنی اور دوسرے ہی لمحے اپنے منہ سے طلاق کے تین لفظ نکال کر ہمیشہ کے لیے رشتہ ہی ختم کر دیا۔ یہ سنتے ہی غیاث چچا کودل کا دورہ پڑا اور وہ وہیں ظفر کے دروازے پر ہی گر گئے، جنہیں اٹھا کر وہ لوگ قریبی ہسپتال پہنچا آئے۔ کاظمی صاحب کا بیان ختم ہونے تک عدالت میں چہ میگوئیوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا، جسے جج نے بڑی مشکل سے خاموش کرایا۔ عدالت نے تین مرتبہ کاظمی صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ کیا انہوں نے اپنے کانوں سے طلاق کے لفظ سنے تھے اور یہ تین مرتبہ کہے گئے تھے۔ کاظمی صاحب نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ انہوں نے مقدس کتاب کا حلف لیا ہے لہذا وہ جھوٹ ہرگز نہیں بول سکتے۔ انہوں نے خود اپنے کانوں سے واضح طور پر یہ لفظ سنے تھے۔ جج نے قاضی صاحب کی طرف دیکھا جنہوں نے کاغذ پر کچھ لکھ کر جج کی جانب بھجوا دیا۔ جج نے بغور کاغذ کو دیکھا اور آدھے گھنٹے کے وقفے کے بعد فیصلہ سنایا۔

”معتبر گواہوں کی شہادت اور تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مدعی ظفر کا دعویٰ جھوٹا ہے اور وہ خود اپنی مرضی سے، اپنے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے اپنی بیوی وجیہہ بنت غیاث الدین کو طلاق دے چکا ہے لہذا عدالت اس کا دعویٰ خارج کرتی ہے اور وجیہہ بنت غیاث الدین کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دیتی ہے۔“

عدالت میں ایک شور مچ گیا۔ عدالت نے ظفر کی غلط بیانی کے خلاف بھی سرکاری وکیل کو درخواست دائر کرنے کی ہدایت کی کہ کیوں نہ اس کے غلط بیان پر عدالت اس کے خلاف کارروائی کرے؟ عدالت میں ہی لوگوں نے ظفر کے خلاف نعرے لگانا شروع کر دیئے تھے لہذا وہ بڑی مشکل سے پیچھے کے دروازے سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔

اس شام بہت عرصے کے بعد میں نے غیاث چچا کے چہرے پر چھائے غبار کو بڑی حد تک دھلے ہوئے دیکھا۔ انسان کے اندر غم سہنے کا بھی قدرت نے کچھ عجیب سا نظام جوڑ رکھا ہے۔ شاید یہ سارا کھیل ہی اعصاب کا ہے۔ اور انسانی اعصاب پل پل اپنے آپ کو وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، تبھی ہم ایک غم کو سہہ کر اپنا اگلا دن پھر سے شروع کر سکتے ہیں۔ ورنہ شاید ہم سب ہی اپنے پہلے غم کے ساتھ ہی خاک ہو چکے ہوتے۔ کاظمی صاحب کو عدالت میں لانے کا ہم نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا جب عدالت نے دوسری گواہی طلب کی تھی۔ ظفر کا قصہ ختم ہوا تو زندگی دھیرے دھیرے پھر سے اپنے معمول کی جانب پلٹنے لگی۔

میر انٹر کالز کا بھی نکل چکا تھا اور حسب توقع میری پہلی پانچ پوزیشنز میں نامزدگی ہوئی تھی۔ چونکہ ہم سب کیڈٹس اپنی اکیڈمی سے ہی آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی (ISSB) کلیئر کر چکے ہوتے تھے لہذا فوج میں کمیشن لینے کا راستہ بھی فی الحال میرے لیے کھلا تھا لیکن جانے کیوں میری طبیعت پھر سے اتنے نظم و ضبط کے پھیرے میں پڑنے کی طرف مائل نہیں تھی۔ جو مجھ سے روزانہ میری مستقبل کی پڑھائی کے بارے میں سوال کرتی تھیں اور میں روزانہ انہیں ایک ہی جواب دیتا کہ فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ مزید پڑھائی کس شعبے کے لیے اختیار کروں۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے، اور پھر ایک دن قدرت نے خود ہی اس بات کا فیصلہ بھی کر ہی دیا کہ مجھے آگے کے لیے کون سی لکیر اختیار کر کے چلنا ہوگا۔

کتاب گھر کی پیشکش آخری نشر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اُس دن فضلہ بابا نے صبح سویرے مجھے ایک رجسٹری لا کر دی کہ غیاث چچا نے دی ہے اور کہا ہے کہ اسے پوسٹ بھی کر دوں اور اُس کی ایک نقل کروا کر دیتی اُن کے دفتر دے آؤں۔ یہ ان کی مزید چھٹی کی درخواست تھی جس کے ساتھ اُن کا ڈاکٹری سٹوفکیٹ بھی منسلک تھا۔ میں رجسٹری پوسٹ کروا کر اور اس کی نقل ان کے دفتر میں وصول کروا کر شام کو انہیں کاغذ واپس کرنے کے لیے گیا تو وہ چھت پر کمپوٹروں کے ڈربے کے پاس بیٹھے آس پاس ٹہلتے کمپوٹروں کو دانہ ڈالتے ڈالتے جانے کن سوچوں میں گم ہو گئے تھے کہ ان کا کمپوٹر کو دانہ ڈالنے والا ہاتھ بھی ویسے ہی ہوا میں ٹھہرا رہ گیا تھا، میں نے کچھ دیر ان کی توجہ کا انتظار کیا اور پھر وہیں چھت کی منڈیر سے سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ہلکے سے کھنکرا کر انہیں متوجہ کیا۔ وہ چونک سے گئے اور پھر مجھے دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے۔

”ارے آدی بیٹا..... تم کب آئے..... آ جاؤ..... وہاں کیوں کھڑے ہو.....“ میں نے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کاغذات رجسٹری کی رسید سمیت ان کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”چائے پیو گے.....“

”جی خالہ نے مجھے اوپر آتے دیکھ لیا تھا، وہ بھجواتی ہی ہوں گی..... آپ کن سوچوں میں گم بیٹھے تھے..... ڈاکٹر نے آپ کو دل پر زیادہ بوجھ لینے سے منع کیا ہے۔“

وہ مسکرائے ”ارے میاں..... یہ ڈاکٹر بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں..... بوجھ لینے سے منع تو کرتے ہیں، لیکن بوجھ نہ لینے کا طریقہ نہیں بتاتے..... اور بھلا سوچوں پر کس کا اختیار ہے، کاش یہ ڈاکٹر کوئی ایسی دوا بھی ایجاد کر پاتے جس کو کھانے کے بعد یہ سوچیں اور یہ وہاں ہمیشہ کے لیے ہمارے دماغوں سے نکل جاتے۔“

میں نے دھیرے سے ان سے پوچھا۔

”اب آپ کو کون سا واہمہ پریشان کر رہا ہے۔ ہر تلخ اور ڈراؤنا واہمہ حقیقت بن کر آپ کے سامنے آ بھی چکا اور جانے کب سے ماضی کا جھٹہ بھی بن گیا، تو اب ان واہموں سے کیسا خوف؟..... اور ان کی فکر کیسی.....؟“

غیاث چچا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید انہیں میری زبان سے ایسی باتیں سن کر کچھ حیرت ہوئی ہو کیونکہ میں نے آج تک کبھی اس طرح بیٹھ کر ان سے زندگی کے کسی فلسفے پر بات نہیں کی تھی۔

”ہاں میاں..... کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو، ہر ڈراؤنا خواب حقیقت بن کر سامنے تو آ چکا..... اب اس سے زیادہ اور مزید کیا برا ہوگا؟ لیکن پھر

بھی انسان اپنے ماضی کو بھی 'کاش' کے نشتر سے بار بار کریدتا رہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس کے زخم کبھی بھر نہیں پاتے۔ میں بھی ایسے کئی 'کاش' کے نشتر اپنے آپ کو چھونے کے لیے لیے بیٹھا رہتا ہوں.....“

”مثلاً کیا.....؟ یہی ناکہ کاش آپ ڈوکا ظفر سے رشتہ طے کرنے سے پہلے مزید چھان بین کر لیتے..... یا پھر یہ کہ رشتہ ہو ہی گیا تھا تو آپ کسی نہ کسی طرح اس رشتے کو پختہ رہنے کا مزید اہتمام کرتے اور اسے اتنی آسانی سے ٹوٹنے نہ دیتے.....؟“

غیاث پچانے غور سے میری جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کر بولے۔

”ہمارا آدمی اب واقعی بڑا ہو گیا ہے..... اُسے اب بولے گئے لفظوں کے پس منظر کو پڑھنا بھی خوب آ گیا ہے.....“

میں بھی مسکرا دیا۔

”چلیں اب تو بتادیں..... یہی چند واہے گھرے رکھتے ہیں نا آپ کو۔“

غیاث پچانے لمبی سی سانس بھری۔

”ہاں میاں..... ہر لمحہ بس یہی خیال کا تار ہوتا ہے کہ اپنی بیٹی کی بربادی کا کہیں نہ کہیں میں خود بھی ذمہ دار ہوں۔ اگر اُس رات میں ظفر سے بحث نہ کرتا تو.....“

”تو کیا ہوتا..... یہی کہ ڈو چند سال مزید اس جہنم میں اور گزر دیتیں..... یونہی ان کی وفاداری اور انا کو روزانہ کچلا جاتا اور یونہی وہ روز جیتی اور روز مرتی رہتیں، ظفر ان کو ڈھال بنا کر مزید آپ کو اور سیکھنے خالہ کو خون کے آنسوؤں لانا رہتا، روز اسی طرح کے مزید تماشے ہوتے اور ڈوکا کی روح ہر بل مزید زخمی ہوتی رہتی.....“

میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اور پھر مجھے خیال آیا تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا، لیکن غیاث چچا میری بات سن کر سر جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق ہو گئے تھے، پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

”یہ سب دلیلیں میں خود کو دیتا رہتا ہوں۔ بات صرف میری اور سیکھنے کی ہی ہوتی تو ہم خود وجہہ کو جا کر اس عذاب سے نکال کر لے آتے، لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرے کے ساتھ چلنا اور رکن پڑتا ہے۔ یہاں طلاق یافتہ لڑکی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چاہے وہ کتنی ہی بے قصور کیوں نہ ہو..... الزام ہمیشہ اس کے سر ہی آتا ہے میاں.....“

”اگر یہ سارا معاشرہ ایک جانب اکٹھا ہو جائے اور آپ سے یہ کہے کہ آپ دوسری جانب کھڑی ڈوکا کو خود انہی کی مرضی سے کسی اندھے کنویں میں دھکیل آئیں تو کیا آپ ایسا کریں گے؟ میں مانتا ہوں کہ عام حالات میں ہمیں اسی معاشرے کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا پڑتا ہے، اور اسی کی پرکھی ہوئی عزت اور بے عزتی کی کوئی کواپنے لیے بھی سچ ماننا پڑتا ہے، لیکن میں نے کہا نا..... یہ صرف عام حالات میں ہو سکتا ہے۔ جو کچھ ڈوکا پر بتی اسے صرف ڈوکا آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان کے اپنے ہیں، آپ پر اُس عام معاشرے کے اصول لاگو نہیں ہوتے، اور پھر ان سب باتوں کے باوجود، آپ نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن نبھانے کی کوشش بھی تو کی۔ لیکن اگر اس کے باوجود نتیجہ اگر آپ کی توقعات کے برعکس نکلا ہے تو آپ

اسے قدرت کی جانب سے کوئی غیبی مدد کیوں نہیں سمجھ لیتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوا کہ وہ اس ظالم اور کم ظرف شخص کے چنگل سے نکل آئیں؟ کیا آپ یہ چاہتے تھے کہ وہ ساری زندگی اس جھوٹے اور دوغلی معاشرے کے بنائے ہوئے اصولوں کی بھیشت چڑھتی رہیں اور ان کی باقی عمر بھی اسی دوزخ میں جل جاتی.....؟؟“

غیاث چچا کے پاس میرے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، اتنے میں وجوہ کے کھنکارنے کی آواز آئی اور وہ چائے کی ٹرے اٹھائے آتیں نظر آئیں۔ ہماری باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غیاث چچا نے اٹھتے ہوئے دھڑکے کہا۔

”چلو بھی تم دونوں چائے پیو۔ میں کچھ ضروری کاغذات اپنی دراز سے چھانٹ لوں۔“

غیاث چچا دو قدم بڑھے اور پھر جانے کیا سوچ کر دوبارہ میری جانب پلٹے۔ اور قریب آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر بولے۔

”تمہارا زندگی کو دیکھنے کا نظریہ اچھا لگا مجھے..... کوشش کروں گا کہ آئندہ میں بھی تمہارے نظریے سے زندگی کو دیکھ سکوں، کیونکہ مجھے تمہاری کبھی ہوئی ہر بات سے اتفاق ہے۔“

غیاث چچا میرے بال سہلا کر مسکراتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گئے۔ میری نظر دھڑک پڑی، وہ سادہ سے سفید لباس میں ملبوس تھیں اور ان کا سگوار سا حسن جانے کیوں مجھے اس ڈھلتی شام کی طرح لگ رہا تھا، لیکن اس وقت وہ بے حد حیرت سے اور کچھ عجیب نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے انہیں اپنے مخصوص انداز میں چھیڑا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں ایسے..... نظریہ لگائیں گی کیا.....؟“

وہ چونک کر بولیں۔

”نظریہ لگ جانے کا خدشہ ہے آج مجھے۔ میں کافی دیر سے سیڑھیوں پر کھڑی تمہاری اور ابا کی باتیں سن رہی تھی، ایسا کرنا تو نہیں چاہتی تھی لیکن تم جس طرح ابا کو سمجھا رہے تھے، اُسے سن کر مجھے درمیان میں ٹوکنا مناسب نہیں لگا۔ تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں آدی.....؟ میں تو اب تک حیران ہوں۔ کتنی خوبصورتی سے تم نے ابا کو ان کے دکھوں کو برتنے کا ایک نیا نظریہ دے دیا۔ کیا یہ میرا وہی ننھا مناسا دوست بول رہا تھا..... مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا.....“

میں ان کی یہ لمبی تمہید سننا رہا اور مسکراتا رہا۔

”جہاں آپ نے مجھے بھیجا تھا وہیں سے سیکھ کر آیا ہوں، اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ اب میں پرائمری اسکول میں منہ بسور کر جانے والا آدی نہیں رہا، آپ کے سامنے کیڈٹ کالج کا پاس شدہ کیڈٹ عباد بیٹھا ہوا ہے۔ جو اس کے امی کے بقول اپنے ابا سے بھی قدمیں آگے نکل گیا ہے.....“

دھڑکے سے ہنسیں۔ جل ترنگ سے بچ گئے۔

”ہاں بھئی..... یہ تو میں بھول ہی گئی کہ ہمارا آدی اب کیڈٹ عباد بن کر واپس لوٹ آیا ہے، سوری سر کیڈٹ عباد۔“

ڈونے ہنستے ہوئے سیلوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ ماتھے تک اٹھا دیا۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا اور وہ ناراضگی سے بولیں۔

”ارے ہاں..... یاد آیا..... یہ تم ابا کے سامنے مجھے صرف ڈوکھ کر کیوں پکار رہے تھے، پورا ڈوآ پی کیوں نہیں کہا.....“

”ڈوآ پی کہنے سے ایسا لگتا ہے، جیسے میں شکورن بوا کی عمر کی کسی بڑھیا کا ذکر کر رہا ہوں، اور میں نہیں چاہتا کہ لوگ ابھی سے آپ کی عمر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔“

اس وقت تو بات ہنسی میں ٹل گئی اور ڈوآ چائے بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ لیکن سچ یہی تھا کہ جب سے میں اکیڈمی سے واپس آیا تھا،

چاہے انجانے میں ہی سہی، لیکن جانے کیوں میرے لبوں سے ان کے لیے وجوہات کی جگہ صرف ڈوہی نکلتا تھا۔

اُس شام کے بعد سے میری اور ڈوآ کی ازلی دوستی نے ایک نیا رخ پلٹا۔ وہ اب مجھ سے اپنی ہر وہ بات بھی بانٹنے لگ پڑی تھیں جو پہلے وہ

مجھے چھوٹا سمجھتے ہوئے نظر انداز کر جایا کرتی تھیں۔ موسموں کی باتیں، شاعری کی باتیں، خزاں میں گرتے پتوں کی باتیں، نیلے گنگن کے آوارہ بادلوں

کی باتیں، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ زیادہ تر بلکہ تقریباً سبھی معاملوں میں ہماری پسند یکساں ہی تھیں، انہیں بھی میری طرح برقی بوندیں بارش اور

سب کچھ دو دھیا کر دینے والی برف باری پسند تھی۔ وہ بھی خزاں کے پتوں کے گرنے کی آہٹ کو خوب محسوس کرتی تھیں اور انہیں بھی آسمان پر بکھرے

بادلوں کو کسی رنگین شیشے سے دیکھنا بہت بھلا لگتا تھا۔ ہماری پسند کے سبھی موسم ایک جیسے ہی تھے۔ وہ بھی غالب کی دیوانی تھیں اور میرا خیاں ان کے

شلیف میں بچے رہتے تھے۔ وہ بھی میری طرح ہر منظر کو ایک الگ نظر اور نظریے سے دیکھنے کی عادی تھیں۔ سخت سردیوں میں لوگ جب آگ کے گرد

ٹھہر رہے ہوتے تب ہم دونوں گولہ گندہ یا برف ملائی کی قلفیاں کھا رہے ہوتے تھے۔ انہیں بھی میری طرح پیا نوا اور والکن پر بجائی گئی ڈھنسن بے حد

پسند تھیں۔ اور میں بھی ان کی طرح گہرے سیاہ اور شفاف سفید رنگ کا دیوانہ تھا۔ اردو ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مضمون تھا اور دونوں کو ہی ریاضی سے

شدید چوٹ تھی۔ دونوں کو ہی ذرا سی مرچ کھاتے ہی ہچکیاں لگ جاتی تھیں اور دونوں کو ناریل پانی اور انناس کا رس بہت مزے کا لگتا تھا۔ ذہنی دھوپ

کے زاویوں کو ٹکنا اور آسمان پر بکھرے بادلوں سے مختلف خاکے جوڑنا اور ذہن میں ان کی تصویریں بنانا ہم دونوں کا ہی پسندیدہ مشغلہ تھا۔ غرض کون سی

ایسی بات تھی، جس میں مماثلت نہ ہو؟ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے وجوہی ہر پسند کو محسوس کیا تھا اور اُسے اپنے اندر اتارا تھا۔ اور

پھر ایک ایسے ہی دن ڈوآ نے باتیں کرتے کرتے اچانک مجھ سے کہا۔

”آدی..... تم مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتے..... میں جانتی ہوں تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔“

بس وہی دن تھا، جب میں نے آخر کار طے کر لیا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ غیاث چچا کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ڈوآ مقابلے کے

امتحان میں بیٹھیں اور سول آفیسر بنیں۔ قسمت نے پلٹا کھایا اور اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی، اب وہی ذمہ داری ڈوآ نے میرے کاندھوں پر ڈال

دی تھی، اور میں جانتا تھا کہ مجھے ہر حال میں ڈوکھا یہ ٹونا خواب پھر سے جوڑنا ہے اور مجھے سول آفیسر بننا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش پہلی نظر

<http://kitaabghar.com>
<http://kitaabghar.com>

مجھے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے چھ ماہ سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہو گیا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پرائیویٹ بی۔ اے کا امتحان دیتے ہی مقابلے کے امتحان کے فارم بھی بھردوں گا تا کہ مزید ایک لمحہ بھی ضائع کئے بنا امتحان میں شریک ہو سکوں۔ ڈو کی مدد سے میں نے مضامین بھی وہی منتخب کئے تھے، جو بیک وقت بی۔ اے اور سول سروس کے امتحان میں مشترک تھے اور ظاہر ہے کہ اردو ان میں سرفہرست مضمون تھا۔ یہ سارے مضامین وہی تھے، جن میں ڈو پہلے ہی گریجویٹیشن کر چکی تھیں اس لیے میری رہنمائی کرنے میں انہیں کوئی مشکل نہیں ہوئی اور ان کی آنکھوں کا سپنا میری پلکوں تلے منتقل ہو گیا۔ کبھی کبھی تو غیاث چچا ہم دونوں کی گھنٹوں کی بحث اور مضامین کے متعلق خیالات کی کھینچا تانی دیکھ کر مسکرا دیتے کہ ”یوں لگتا ہے کہ جیسے مقابلے کے امتحان میں آدی نے نہیں، ڈو نے بیٹھنا ہے۔“ اور سچ یہی تھا کہ وجوہ کوئی کسر بھی نہیں چھوڑ رکھی تھی ہر مضمون کو گھول کر مجھے پلانے میں۔ ویسے بھی وہ زندگی کے اس معاملے میں کاملیت پسند (Perfectionist) تھیں اور وہ کوئی بھی وجہ یا بہانہ قسمت یا مقدر کے لیے ایسا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، جس کی بنا پر کل ہمیں یہ کہنا پڑتا کہ کاش یوں کر لیتے..... کاش وہ کتاب بھی دیکھ ہی لیتے..... کاش یہ باب بھی زیر بحث لے ہی آتے..... وغیرہ وغیرہ، لہذا ہم دونوں ہی اُس امتحان کی تیاری کے لیے یوں جُٹے ہوئے رہتے جیسے کل ہی ہمارا پہلا پرچہ ہو۔

لیکن اس طوفانی تیاری کا ایک اثر یہ ہوا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو پورا وقت نہیں دے پاتا تھا جس پر راجہ کی ہر وقت کی بک بک اور باقیوں کی نان اسٹاپ کنٹری جاری ہی رہتی تھی۔ آخر کار بے حد لمبی بحث اور درجنوں جھگڑوں کے بعد طے ہوا کہ باقی پورا ہفتہ چاہے میں کچھ بھی کروں کہیں بھی غائب رہوں لیکن جمعرات کی شام سے لے کر رات دیر گئے تک میرا وقت میرا نہیں بلکہ ان سب ”لوفروں“ کا ہوگا۔ ایسے میں ہماری ابتدائی بیٹھک ہمیشہ بالے کے گیار پر ہوتی تھی۔ بالے نے میٹرک کے بعد اسکول چھوڑ دیا تھا اور پرائیویٹ ایف۔ اے کیا تھا کیونکہ میٹرک کے بعد اس کے ابا نے اسے گھر کے حالات کی وجہ سے ایک چھوٹا سا گیار کھلوا دیا تھا، جس میں ان کی تمام پینشن اور گریجویٹی کی رقم صرف تو ہو چکی تھی لیکن کم از کم ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بھی میسر آ گیا تھا۔ بالے کو اسکول کے دور سے ہی موٹر گاڑیوں اور اس کی مشینری میں بے حد دلچسپی تھی۔ پانچویں میں آنے تک وہ آدھے گھنٹے میں ہمارے دینیات کے ماسٹر حافظ صاحب کی ٹرانف موٹر سائیکل کھول کر پُر زہ پُر زہ کر دیتا تھا، یہ اور بات ہے کہ اسے دوبارہ جوڑنے میں اسے ہفتہ لگ جاتا تھا اور تب تک حافظ صاحب پیدل آتے جاتے اس گھڑی کو کوستے رہتے کہ انہوں نے بالے کو موٹر سائیکل کی خرابی دیکھنے کا کہا ہی کیوں تھا۔ لیکن اب بالا گاڑیوں کے کام کا ایسا ماہر تھا، جو انجن کی آواز سن کر ہی اس کی بیماری کو سبھر کے فاصلے سے بتا دیتا تھا۔

راجہ اور خٹو کی ”تعلیم“ جاری تھی اور دونوں ہی تیسری مرتبہ انٹر میڈیٹ کے امتحان میں شامل ہوئے تھے۔ مٹی اور گڈو نے انٹر میڈیٹ

تو جیسے تیسے کر ہی لیا تھا لیکن وہ بھی اب پرائیویٹ تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے کیونکہ دونوں ہی کسی سرکاری محکمے میں باوبھرتی ہو چکے تھے۔ لیکن ان سب باتوں نے ہماری ازلی بچپن کی دوستی پر ذرہ برابر فرق بھی نہیں ڈالا تھا۔ جب ہم سب ملتے تھے تب صرف ہم ہی ہوتے تھے اور ہمارے ساتھ صرف ہمارے بچپن کا دسمبر.....

سچ ہے کہ سچی دوستی ایسے کسی بھی مجید بھائی یا ڈیٹی استطاعت کے فرق سے بہت بلند ہوتی ہے۔ ہمارے قصبے آج بھی روز اول کی طرح خالص تھے اور ہماری ایک دوسرے کے لیے فکر اور پریشانی کا وہی عالم تھا، جو پہلی دوسری جماعت کے وقت ہوتا تھا۔

ہم جمعرات کی شام سب کچھ بھول کر مناتے تھے۔ ایسے میں زیادہ تر پروگرام راجہ کے ترتیب دیئے ہوئے ہوتے تھے۔ کبھی وہ ہمیں کوئی نئی فلم دکھانے کے لیے لے جاتا، اس کے ٹکٹ لینے کے طریقے ابھی تک وہی بچپن والے تھے۔ اور کوئی نہ کوئی ”شاہ صاحب“ قسم کی شخصیت یا بہانہ اس کو مل ہی جاتا تھا۔ حالانکہ اب ہم سبھی اپنے تمام دوستوں کے لیے سب سے مہنگا ٹکٹ خرید کر فلم دیکھ سکتے تھے لیکن ایسی فلم کا مزہ کیا.....؟ لہذا فلم کا موضوع ہم نے راجہ کے ہی سپرد کر رکھا تھا، کبھی ہم شہر سے باہر جھیل پر پکنک کے لیے چلے جاتے اور خوب ہلہ گلہ کرتے۔ جھیل کے کنارے لکڑی کے وہ پرانے خستہ حال بیٹھ اور تختے ابھی تک موجود تھے، جن پر ہمارے بچپن کے گھدے ہوئے نشان آج بھی باقی تھے۔ کبھی گیراج ہی میں رات کی دعوت کا پروگرام بن جاتا اور ہم سب گیراج کے ہی چھوٹے سے باورچی خانے میں مل کر مختلف تجربے کرتے رات بتا دیتے۔

جمعرات کی اس شام کی چٹھی مجھے خصوصی طور پر ڈوکی طرف سے بھی تھی۔ میں انہیں اکثر اپنے دوستوں کی شرارتوں کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور وہ یہ سُن کر مسکراتی رہتی تھیں۔ پھر ایک دن جب میں نے انہیں تفصیل سے راجہ، بالے، نھو اور گڈو کی ان باتوں اور کوششوں کے بارے میں بتایا جو وہ میری غیر موجودگی میں ڈوکی حفاظت کی غرض سے اپنے طور پر ہی کرتے رہے تھے اور جن معصومانہ کوششوں اور منصوبوں کا ڈوکی کبھی پیہ پی نہیں چل پایا تھا، تو وہ سب سن کر بہت دیر تک ڈوکی آنکھیں نم رہیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس جمعرات کی شام کو میں اپنے سارے دوستوں کو اُن کے گھر اُن کی طرف سے چائے کی دعوت پر بلا لاؤں۔ جب ان سب نے میری زبانی یہ خبر سنی تو سارے کے سارے ہکا بکا رہ گئے۔ کیونکہ ان سب کے ذہن میں کہیں نہ کہیں یہ بات موجود تھی کہ ڈوکی انہیں نکلا اور آوارہ سمجھتی تھیں، اور میں جانتا تھا کہ بچپن میں کسی حد تک یہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ ڈوکی جب مجھے سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ محلے کے بڑے میدان میں دھما چوکڑی مچاتے ہوئے دیکھتی تھیں تو مجھے ان سے ڈانٹ بھی پڑتی تھی کہ سارا دن اپنے ”آوارہ“ دوستوں کے ساتھ ضائع نہ کیا کروں۔

ڈوکی دعوت کا سُن کر پہلے تو کبھی شک اور سکتے میں آ گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد سب کو اپنے اپنے لباس کی فکر پڑ گئی کہ انہیں کیا پہن کرو جو کہ گھر جانا چاہیے۔ آخر یہ سب کی ”عزت“ کا سوال تھا۔ ڈوکی نظر میں اچھا بننے کا ایک موقع قدرت نے دے ہی دیا تھا تو پھر ان میں سے کوئی بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا بھی ڈوکی سے ایک عجیب سا رشتہ تھا، بچپن سے وہ میرے ذریعے اس رشتے سے جُڑے ہوئے تھے، ڈوکی ان سب کو عزیز تھیں کیونکہ وہ ان کے سب سے پیارے آدمی کی ڈوکی تھیں۔ وہ سب انہیں یوں سنبھال سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے، جیسے وہ اپنے دوست آدمی کا سب سے قیمتی کھلونا سنبھال رہے ہوں جو آدمی ان کو کچھ لمحوں کے لیے بطور امانت دے کر ذرا سی دیر کے لیے کہیں گیا ہو.....

ہم سب میں بچپن سے راجہ ہی سب سے زیادہ ”خوش لباس“ تھا اور وہ ہر نیا فیشن ٹرائی ضرور کرتا تھا لہذا اس موقع پر بھی اس کی الماری ہی ان سب کے کام آئی، اور کچھ ہی دیر میں وہ سب خاصے معقول نظر آنے لگے، راجہ میرے لیے بھی اپنا پسندیدہ گرے کوٹ لے کر آیا تھا لیکن میں نے ان کے ہاتھ جوڑے کہ میں اسی جین شرٹ میں ٹھیک ہوں، لہذا اب وہ سب چلنے کی کریں کیونکہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔

دھوکے دروازے پر غیثاٹ چچا نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بتایا کہ دھوکے نے چھت پر چائے کا بندوبست کیا ہے، لہذا ہم سب بھی چھت پر ہی چلے جائیں۔ چھت پر تو دھوکے نے واقعی پوری چھوٹی موٹی دعوت کا انتظام کر رکھا تھا اور میز پر چائے کے ساتھ جتنے لوازمات ہو سکتے تھے وہ سبھی موجود تھے۔ اور اس میں بھی آدمی سے زیادہ چیزیں خود دھوکے کے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ دھوکا چہرہ ہم سب کو آتے دیکھ کر کھل سا گیا۔ وہ میرے سارے دوستوں کو اچھی طرح جانتی تھیں کیونکہ ہم سب اسی محلے میں ان کے سامنے ہی تو بڑے ہوئے تھے لیکن اس شام انہوں نے سب سے فردا فردا سب سے خصوصی طور پر ہاتھ ملایا اور سب سے پوچھا کہ وہ کیسے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہ سبھی شرمناکرا کر جواب دیتے رہے اور پھر جب دھوکے نے تعارف کے وقت راجہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بالے کے بال بکھیر دیئے تو وہ دونوں ہی خود پر قابو نہیں رکھ سکے اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں، بالے کی آنکھوں سے تو باقاعدہ ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگ گئے۔ دھوکا اپنی ”ارے ارے“ ہی کرتی رہ گئیں اور وہ سبھی اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ پھر ایسے میں بھلا دھوکا کہاں پیچھے رہنے والی تھیں۔ اگلے ہی لمحے خود وہ بھی بھل بھل رو رہی تھیں کیونکہ انہیں تو ویسے بھی رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔ آنسوؤں کی کمی تو کبھی نہیں رہی تھی ان کے پاس اور میں بے چارہ ان سب سے دور چھت کی منڈیر پر اپنا سر تھا میٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ دیر بعد غیثاٹ چچا اوپر آ گئے اور انہیں آتا دیکھ کر وہ سارا ”گروپ مقابلہ“ ختم ہوا اور نہ چائے کی خیالی پیالیاں ان سب کے ہتھے آنسوؤں سے ہی بھر جاتیں۔ غیثاٹ چچا نے مجھ سے اشاروں میں پوچھا کہ ہوا کیا ہے؟ میں نے بے چارگی سے سر ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ ان سب کو اللہ ہی سمجھائے۔ غیثاٹ چچا دھیرے سے مسکرا دیئے اور ہمیں اطلاع دی کہ ریحان صاحب اپنے دونوں بچوں کے ساتھ نیچے آئے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ انہیں بھی یہیں چھت پر لے آئیں۔ ہم سب نے کہا ”بڑی خوشی ہے“ اور کچھ لمحوں بعد ہی ریحان صاحب بھی اپنے بچوں سمیت ہماری ”ٹی پارٹی“ میں شامل ہو چکے تھے۔ دھوکے نے میرے سارے دوستوں کا فردا فردا خصوصی طور پر ریحان صاحب سے بھی تعارف کروایا، اور وہ مسکرا کر سبھی سے ملتے رہے۔

دھوکا نے بہت عرصہ پہلے ہی کیس کے ختم ہونے کے بعد ریحان صاحب کے گھر ٹیوشن کے لیے جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب ان کا من کہیں آنے جانے کا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اب انہیں ٹیوشن پڑھانے کی ضرورت تھی، البتہ دونوں بچے اب بھی تقریباً ہر ہفتے ڈرائیور کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اپنی کتابیں اٹھائے و جو کے پاس ضرور آ جاتے تھے اور ان سے ضروری ٹیوشن لے لیتے تھے۔ اس شام بھی ریحان صاحب نے وجوہ سے دوبارہ درخواست کی کہ یہ سال تو اب خاتمے پر ہے لیکن اگلے سال بچوں کو دو ماہ بعد ان کی مدد کی شدید ضرورت ہوگی کیونکہ تب ان کی نئی کلاس شروع ہو چکی ہوگی۔ لہذا اب انہیں ان کے بچوں کا باقاعدہ ٹیوشن پڑھانا ہی ہوگی۔ و جو نے انہیں تسلی دی کہ فی الحال نئی کلاس شروع ہونے میں کافی دیر ہے وہ ابھی سے پریشان نہ ہوں۔ میں جانتا تھا کہ و جو نے صرف میری پڑھائی کی وجہ سے خود کو اس مصروفیت سے باز رکھا ہوا ہے، کیونکہ وہ اپنی

پوری توجہ میرے مقابلے کے امتحان کی تیاری پر دینا چاہتی تھیں۔

رات کو جب ہم گیارہ بجے واپس آئے تو کبھی رات گئے تک صرف دو کی ہی باتیں کرتے رہے۔ کبھی کابلس یہی کہنا تھا کہ یہ انہی کی ہمت ہے جو اتنے بڑے دکھوں کے ساگر سے گزر کر بھی ابھی تک اپنے آپ کو مجتمع رکھے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کسی بھی خوشی یا بڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ماشاء اللہ ضرور کہنا چاہیے۔ ورنہ جس کا ذکر کیا جا رہا ہو اسے نظر لگ جاتی ہے۔ لیکن شاید اس روز ہم سب دو آبی کے ذکر پر ماشاء اللہ کہنا بھول گئے تھے۔ لہذا شاید اس بار ہماری ہی نظر دو کی خدا خدا کر کے پڑ سکون ہوتی زندگی کو لگ گئی۔ لیکن ہم کیا جانتے تھے کہ اس کانچ کی شہزادی کی قسمت کا پیرا ہن بھی اتنے ہی نازک کانچ کا بنا ہوا ہوگا کہ ہماری ایک ذرا سی ماشاء اللہ نہ کہنے کی بھول بھی اسے ٹھیس لگانے کا سبب بن جائے گی۔

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

چور بازار

بعض لوگ سیاست کا سہارا لے کر کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، **چور بازار** پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ جرم و سراغرسی کی دلچسپ کہانی۔ ایک سپر مارکیٹ میں ہونے والی عجیب و غریب چوریوں کا احوال جہاں دکانوں کا ساز و سامان تالا توڑے اور نقب لگائے بغیر غائب ہو رہا تھا۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرسیاں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **چور بازار** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

ہیرے کے آنسو

ہیرے کے آنسو ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کونسل کی کانوں کو قیمتی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لالچ اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے نئی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرسیاں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **ہیرے کے آنسو** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہیں۔

کتاب گھر کی پیشکش

آخری کفارہ

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اگلے دن جمعہ تھا اور رجب مجھے لے کر جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے بالے کے محلے چلا گیا کیونکہ اُسے بالے کو اپنے ابا کی فوکسی کار دکھانا تھی جس کی عمر رجب کی عمر سے دو چار سال زیادہ ہی ہوگی البتہ رجب کے ابا نے یہ مصیبت ابھی پچھلے سال ہی خریدی تھی۔ ہم سب دوستوں نے اس فوکسی کا نام بلیلہ رکھ چھوڑا تھا اور بلیلہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی سڑک پر کھانسی ہوئی کھڑی ملتی تھی۔

بالے نے ہم سے کہہ رکھا تھا کہ ہم جمعے کی نماز پڑھ کر جامع مسجد کے باہر ہی اس کا انتظار کریں پھر ہم ایک ساتھ ہی گیراج چلیں گے۔ میں اور رجب مسجد کے باہر کھڑے بالے کا انتظار کر رہے تھے، رجب نے اُسکا کر کہا۔

”یار آدمی..... لگتا ہے اس بالے کے بچے نے بھی آج ہی اپنے سارے گناہ بخشوانے کی ٹھان رکھی ہے۔ اب تو ساری مسجد خالی ہوگئی ہے۔ جانے وہ کہاں رہ گیا ہے۔“ میں نے رجب کو تلی دی اور خود مسجد کی طرف بالے کو ڈھونڈنے کی غرض سے چل پڑا۔ مسجد کا صحن تقریباً خالی پڑا ہوا تھا اور وسیع صحن میں دو ایک بارش شخص سر پہ سفید ٹوپی رکھے ہاتھ اٹھائے دعا مانگتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دفعۃً میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص دعا مانگتے ہوئے ہچکیاں لے لے کر رو رہا ہے اور اس کا چہرہ دُور سے بھی آنسوؤں کی چمک سے ڈھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور شانوں تک تھے اور داڑھی بھی شرعی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک میری توجہ بالے کی جانب مبذول ہوگئی جو اندر سے مولوی صاحب کے ساتھ نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ بالے نے مجھے دیکھا تو جلدی سے مولوی سے رخصت ہو کر میری جانب چلا آیا۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر کہاں لگا دی۔ بالے نے بتایا کہ وہ نکل ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب نے اسے روک لیا اور صحن کی کچھلی جانب مسجد کی پانی کی موٹر دکھانے کے لیے لے گئے جو پچھلے چند دنوں سے گڑبڑ کر رہی تھی اور آج تو بالکل رُک ہی گئی تھی۔ اسی موٹر کو چلانے میں کچھ دیر لگ گئی تھی اُسے۔ بالا آگے بڑھنے لگا تو میں نے اسے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا اور اسے صحن میں بیٹھے بارش شخص کی جانب متوجہ کیا کہ جانے اُسے کیا مسئلہ کیا تکلیف ہے؟ میں نے بالے سے کہا کہ جا کر اس شخص سے پوچھ آئے کہ اُسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دے۔ بالے نے میری جانب حیرت سے دیکھا۔ ”ارے یار..... تو نے انہیں پہچانا نہیں..... یہ اُنکو بھائی ہیں۔“

”اُنکو“..... میرے ذہن میں بیک وقت کئی جھماکے ہوئے۔ اُنکو کی صحت تو قابلِ رشک تھی لیکن یہ شخص تو ہڈیوں کا پنجر دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر اس کا حلیہ تو بالکل ملنگوں جیسا تھا جبکہ اُنکو تو ہمیشہ بہترین کپڑے پہنتا تھا چاہے اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو..... اور پھر اس شخص کا چہرہ..... مجھے یہ بات خود اُنکو کے سگے بھائی کے منہ سے نہ یہ چلتی تو میں کبھی اس بات پر اعتبار نہ کرتا، بالے نے مجھے بتایا کہ اب اُنکو کا ہر نماز کے بعد

عواما نگنے کا یہی طریقہ ہے، اور وہ گھنٹوں اسی جذب کے عالم میں مسجد میں بیٹھا اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہتا ہے۔ گزربسر کے لیے اٹھنے کے لیے ایک ٹیکسی لے رکھی تھی اور وہ صبح سے رات تک وہ ٹیکسی چلاتا تھا، اور اس پرانی ٹیکسی سے دن بھر جو بھی کماتا، وہ سیدھے رات کو اپنی ماں کے قدموں لے جا کر ڈال دیتا تھا۔ اُسی نے اپنے سینٹھ سے کھلوا کر اپنی بہن گڈی کے لیے سینٹھ کے منشی کے بیٹے کا رشتہ بھی طے کروا دیا تھا۔ لڑکا کسی سرکاری محکمے میں سپرنٹنڈنٹ بھرتی تھا اور اچھے شریف لوگ تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی انسان کی اتنی بڑی کایا پلٹ ہوتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اٹھو کا حلیہ بھی اس قدر بدل چکا تھا کہ اگر وہ میرے سامنے سے بھی گزرتا تو شاید میں بالے کے بتائے بنا اُسے پہچان نہ پاتا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ چند روز بعد جب ڈو اور سکیئر خالہ فضلہ بابا کے ساتھ محلے سے برگدوالے پیر بابا کے مزار پر منت کا چڑھاوا چڑھانے نکلیں اور فضلہ بابا نے ایک پرانی سی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر دوکان تینوں میں سے کوئی بھی اٹھو کو نہیں پہچان سکا۔ ایک تو ویسے بھی شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا اور مغرب قریب تھی اور دوسرے یوں بھی عورتوں کی نظر جھکی ہوئی تھی۔ رہے فضلہ بابا تو اب تو وہ ہم کو بھی بمشکل پہچان پاتے تھے۔ وجوئے غیث پچا کی صحت یابی کے لیے جانے کب سے نذر کی منت مانگ رکھی تھی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ان کا جانا موخر ہو ہی جاتا تھا۔ ڈو نے مجھے بھی میری پڑھائی کا وقت ضائع ہونے کے خدشے سے نہیں بتایا تھا کہ وہ مزار جائیں گی۔ ان کا خیال یہی تھا کہ سڑک سے ٹیکسی لے کر اُسی ٹیکسی میں مزار کے احاطے کے باہر اتر کر اُسے رُکنے کا کہہ دیں گی اور چند لمحوں میں ہی چادر چڑھا کر اور نیاز بانٹ کر اُسی ٹیکسی میں واپس آ جائیں گی۔ نیاز کا وقت بھی مغرب کی نماز کے بعد کا مقرر ہوتا تھا اور مزار کے احاطے میں بھی کبھی نیازی مغرب کے بعد ہی نیاز بانٹتے تھے۔

ان تینوں میں سے تو کوئی بھی اٹھو کو نہیں پہچان پایا لیکن اٹھو بھلا و جو اور سکیئر خالہ کی صورت کو کیسے بھلا سکتا تھا؟ ان سب کی زندگی اٹھو کے جرم کی وجہ سے برباد ہو گئی تھی۔ اٹھو نظریں سڑک پر جمائے ٹیکسی چلاتا رہا اور اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلتی رہیں۔ بالے کی زبانی اُسے وجوہ کی زندگی کے حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ اور ہر بار وہ خود کو اُسی شرمندگی اور احساسِ جرم کے گڑھے میں گرا محسوس کرتا تھا، جس کی تپش سے بچنے کے لیے اُس نے خود اپنا آپ بھی جلا کر رکھ کر دیا تھا۔

اٹھو کی ٹیکسی مزار کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اٹھو یا ان تینوں میں سے کسی نے بھی یہ بات نوٹ نہیں کی تھی کہ ان کے محلے سے نکلتے ہی ایک اور پرانی فیاٹ کار ان کی ٹیکسی کے پیچھے ہی فوراً روانہ ہو گئی تھی اور اب تک لگا تار ان کا پیچھا کرتی چلی آ رہی تھی۔ اٹھو نے اپنی ٹیکسی مزار کے احاطے کے باہر روک دی اور فضلہ بابا دونوں عورتوں کو لے کر اندر چلے گئے۔ اٹھو کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح سکیئر خالہ اور ڈو کے پاؤں پکڑ لے اور تب تک اپنا سر ان دونوں کے قدموں میں پختار ہے جب تک وہ اسے دل سے معاف نہ کر دیں۔

اٹھو بھی ٹیکسی سے باہر نکل آیا اور اُس نے مغرب کی نماز وہیں احاطے کے باہر ہی کپڑا ڈال کر پڑھ لی۔ اتنے میں اندر سے ڈو لوگ بھی باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ اٹھو نے جلدی سے عورتوں کے لیے پیچھے کا دروازہ کھول دیا اور خود انتظار کرنے لگا کہ وہ بیٹھ جائیں تو دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کرے۔ سکیئر خالہ ایک طرف سے اور ڈو دوسری طرف سے ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے آ گئے، اسی اثنا میں اچانک اٹھو کی ٹیکسی سے کچھ فاصلے پر کھڑی اُسی فیاٹ کار میں سے ایک شخص، خود کو کالی چادر میں لپیٹے، تیزی سے نکلا اور ڈو کی طرف لپکا، اس کے ہاتھ میں کوئی شیشے کی بوتل تھی،

جس کا ڈھکنا اس نے پہلے ہی سے کھول رکھا تھا، تو اس کے سراپے سے سراپہ سی ہو کر پیچھے کو نہیں لیکن پیچھے ٹیکسی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ڈونے اس شخص کے چادر سے جھلکتے آدھے چہرے کو پہچان لیا۔ وہ ظفر تھا جو اپنے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل لئے ان کی جانب لپکا تھا۔ ڈونے اپنی گھبرا کر چلا گئیں۔ اٹو بوکھلا کر پلٹا اور اس نے کسی چادر بردار شخص کو جو کی جانب کچھ پھینکتے ہوئے دیکھا، اس شخص کا ہاتھ ابھی پوری طرح ہوا میں ہی تھا کہ اٹو نے ایک ٹائیے کی تاخیر کئے بنا جھپٹ کر اس شخص کا ہاتھ دبوچ لینا چاہا، لیکن تب تک وہ آتش سیال بوتل سے پوری طرح چھلک چکا تھا، لیکن تب تک اٹو، جو آواز اُس سیال مادے کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔ اٹو کے منہ سے کرب کے مارے ایک زوردار کراہ نکل گئی اور اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ہاتھ اور سینے پر انگارے ڈال دیئے ہوں۔ گردن کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا اور تیزاب کے چھیننے اس کے چہرے تک آئے تھے لیکن شدید تکلیف نے اسے آنکھیں میچ لینے پر مجبور کر دیا تھا اس لیے اس کی آنکھیں ان چھینٹوں سے بچ گئیں۔ لمحہ بھر میں ہی مزار کے باہر بھگدڑ مچ گئی۔ ظفر اگلے ہی لمحے لپک کر بیٹھڑ میں غائب ہو چکا تھا اور وہ پرانی فیٹ بھی اُسی لمحے ریورس ہو کر کہیں گم ہو گئی تھی۔ اٹو کا تکلیف کے مارے برا حال تھا۔ ڈونے خراش تک نہیں آئی تھی اُس پاس چند دوسرے رکشہ اور ٹیکسی والے بھی تھے، جن میں سے کوئی ایک آدھ شاید اٹو کو جانتا بھی تھا اسی لیے وہ لپک کر بیٹھڑ میں سے نکلا اور زور سے چلا یا۔ ”ارے..... یہ تو اپنا اٹو اُستاد ہے یار..... جلدی کرو، اسے اپنی ٹیکسی میں ڈالو..... یہ تو بُری طرح سے جل گیا ہے۔“

اٹو کا نام سن کر جو آواز سکینہ خالہ دونوں ہی بُری طرح سے چونکے اور اب انہوں نے غور سے ٹیکسی والے کی جانب دیکھا تو بیچ میں سے اٹو کے خدو خال اُبھر آئے۔ لیکن اس وقت وہاں ایک ہلا مچا ہوا تھا۔ اٹو نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا لیکن پھر بھی اُس نے کسی دوسرے ٹیکسی والے کو ہدایت کی کہ یہ پیہیاں اس کے پرانے محلے کی سواری ہیں لہذا وہ انہیں سیدھے اور بہت حفاظت سے ان کے گھر چھوڑ آئے۔ فضلو بابا نے اٹو کے ساتھ جانے کی کوشش کی لیکن اٹو نے انہیں منع کر دیا کہ اس وقت وہ جو آواز خالہ کو لے کر سیدھے گھر پہنچیں۔ دوسرے ہی لمحے ایک ٹیکسی اٹو کو لے کر ہسپتال کی جانب اور دوسری دوڑوگوں کو لے کر محلے کی جانب دوڑ پڑی۔

ڈونے گھر میں داخل ہوئیں تو زار و قطار رو رہی تھیں۔ میں جو کافی دیر سے کتابیں لیے وہیں ان کے گھر میں غیاث چچا کے ساتھ صحن میں بیٹھا تھا انہیں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر بُری طرح گھبرا گیا۔ غیاث چچا بھی بوکھلائے ہوئے سے انہیں تسلیاں دینے کی کوشش کرتے رہے، پھر سکینہ خالہ نے ہی اپنے آپ پر قابو پایا اور سارا ماجرا اٹو کے اس طرح جل کر زخمی ہونے کا واقعہ سنایا۔ میں راجہ کو لے کر ہسپتال کی طرف دوڑا جہاں بالے اپنے ابا کے ساتھ ہم سے پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اٹو کی جلد بُری طرح سے ٹھس گئی تھی اور وہ پیوں میں جکڑا ہوا بستر پر نہایت تکلیف کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔

ظفر بہت دنوں سے جو کے ہاتھوں عدالت میں ملی بے عزتی اور شرمندگی کا بدلہ چکانے کی تاک میں تھا اور اسی لیے وہ پچھلے کئی ہفتوں سے محلے کے آس پاس کسی دوست کی گاڑی میں چہرہ چھپائے نوہ لیتا رہتا تھا کہ اگر کبھی ڈونے باہر نکلیں تو وہ ان کے چہرے کو ہمیشہ کے لیے داغدار کر کے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکے، وہ جانتا تھا کہ ڈونے کا گھر سے اکیلے نکلنا تو ناممکن ہی ہے لیکن پھر بھی وہ اُسی مستقل مزاجی سے محلے کے چکر کاٹتا رہا کیونکہ یہ انتقام ہی اب اس کی زندگی کا واحد اور آخری مقصد رہ گیا تھا۔ ڈونے کی وجہ سے شارے شہر میں اس پر ٹھوٹھو ہوئی تھی اور اب تو اس کے آوارہ اور

بدچلن بھاری دوست بھی اُسے طعنے دے دے کر ہنستے تھے کہ جس بیوی کو بھیگی بلی بتاتا تھا، وہ تو ایسی شیرنی نکلی کہ بھری عدالت میں ظفر کی عزت اتار گئی۔ اور یہ طعنے رات بھر ظفر کا خون اُبلتے رہتے تھے۔ اسی لیے اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ جہاں کہیں بھی جھو دکھیں، وہ ان کا چہرہ بگاڑ دے گا اور اسی نیت سے وہ یہ تیزاب کی بوتل بھی ہمیشہ اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ لیکن قدرت ایک بار پھر اس کے آڑے آئی اور تیزاب انکو کا مقدر بن گیا، ظفر نے جب جھوکی طرف تیزاب اُچھالا تھا تو اسے بیک وقت دو چینی سنائی دی تھیں۔ ایک تو اس ٹیکسی والے کی جو نہ جانے بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا تھا اور دوسری جھوکی۔ لہذا اسے مکمل یقین نہیں تھا کہ ان دونوں میں سے زیادہ نقصان کسے ہوا ہے کیونکہ دوسرے ہی لمحے اسے وہاں سے فرار ہونا پڑا تھا۔

انکو کا بیان لینے کے لیے پولیس تو گھنٹہ بھر بعد ہی ہسپتال پہنچ گئی تھی لیکن انکو کو اگلے دن ہی ہوش آیا۔ ملک ریشم جواب ہمارے علاقے کا ڈی۔ ایس۔ پی ہو چکا تھا اس نے انکو کا بیان تولے لیا لیکن ظفر کی تلاش میں چھاپے وہ گزشتہ آدھی رات سے ہی مار رہا تھا۔ غیاث پچانے خود تھا نہ جا کر اسے ساری تفصیل بتادی تھی لیکن ان کی درخواست پر جھوکا نام کیس کی تفصیل میں درج نہیں کیا گیا تھا، غیاث پچا اب مزید عدالتوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتے تھے، اس لیے ملک ریشم خان نے صرف انکو کے بیان پر ہی انحصار کیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ ایک دفعہ ظفر اس کے قابو آ جائے تو پھر عدالت کے سامنے اُسے انکو سے شناخت کروا کر اس کا کچھ بندوبست کرے گا۔ کیونکہ خوش قسمتی سے جھو کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی اور مقدمے کا مدعی خود انکو بھی بن سکتا تھا۔ لیکن ظفر پولیس کے ہتھے نہیں چڑھ پایا تھا۔ ملک نے اس کے ہر ممکن ٹھکانے پر خفیہ کے بندے بھی لگا دیئے تھے اور اس کے کچھ دوستوں کو گرفتار بھی کیا تھا لیکن ان سب کا ایک ہی بیان تھا کہ ظفر گزشتہ شام سے ہی غائب تھا۔ کچھ جوار یوں نے یہ شکایت بھی کی کہ کل شام ظفر انتہائی جلدی میں ان سب کے پاس آیا اور کبھی سے ہزاروں روپے کی رقم دودن کے لیے ادھار کے نام پر لے گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ظفر لمبے عرصے کے لیے شہر سے غائب ہونے کے ارادے سے جتنی رقم دوستوں سے اینٹھ سکتا تھا، وہ ساری سمیٹ کر بھاگ گیا تھا۔

انکو کو ہسپتال کے وارڈ میں پڑے 24 چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے، وہ آنکھیں بند کئے اپنے جسم پر گزرتی اس بے انتہا اذیت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس کے روئیں روئیں میں انگارے سے بھر رہی تھی۔ دفعۃً اسے اپنے چہرے پر کسی قطرے جیسی چیز کے گرنے اور پھر نمی کا احساس ہوا، اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پھر سکتے اور حیرت سے آنکھیں بند نہیں کر پایا، غیاث پچا اس کے سر ہانے کھڑے تھے اور ان کی آنکھ سے نکلتا پانی انکو کے چہرے کو دھور رہا تھا۔ چہرے کوئی کیا..... انکو کو تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے غیاث پچا کے آنسوؤں کے وضو سے ہی آج اس کے تن اور من پر لگی گناہوں کی ساری کالک دھل جائے گی۔

انکو ان سے کچھ کہہ نہیں پایا اور اس مجبور باپ کے آنسوؤں نے اُسے بھی اپنی آنکھوں کا نمکین پانی بہانے پر مجبور کر دیا۔ کیسی عجیب بات تھی، وہ دونوں شخص آج مل کر رو رہے تھے، جن میں سے ایک دوسرے کی زندگی کی بربادی کا سارا سامان کر گیا تھا۔ دوسرا اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا اور آج اسی پہلے لیئر کے غم اور تکلیف میں آنسو بہا رہا تھا جس نے کل اس کی متاعِ حیات کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ کیسا لیئر تھا اور یہ لٹ جانے والا بھی کیا کمال تھا۔

انکو کو ہسپتال سے فارغ ہونے میں تقریباً تین ماہ سے بھی کچھ زیادہ کا عرصہ لگ گیا لیکن تیزاب کے وہ داغ اس کے جسم سے کبھی نہیں مٹ پائے۔ لیکن داغ کب تھے، یہ تو اس کے لیے وہ چمکتی مہر تھیں، جنہیں وہ اپنے بازوؤں اور سینے پر..... کسی جنگ میں ملے تمغوں کی طرح سجائے

اب ساری دنیا کے سامنے فخر یہ جاسکتا تھا کہ دیکھ لو یہ ایک گناہ گار شخص کا وہ کفارہ ہے جسے تقدیر نے اسی جہاں میں اس کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔

ظفر کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں چل پایا تھا۔ دھواپی کا گھر سے کہیں باہر آنا جانا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر وہ دن بھی آیا جب میرے بی اے کا نتیجہ نکل آیا اور میں مقابلے کے امتحان کے فارم بھی جمع کروا کر آ گیا۔ جس دن میرا پہلا پرچہ تھا اس دن صبح سویرے میں دھو سے ملنے گیا۔ وہ صحن میں ہی جائے نماز پر بیٹھیں دعا کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا کہ ”اگر صرف دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہونا ہوتے تو ہماری مسجد کے مولانا صاحب کے چاروں لڑکے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے۔“ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا اور مجھے نظروں نظروں میں ہی گھور کر دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بنا کچھ بولے دعا ختم کر کے مجھ پر زور سے پھونک دیا۔ لیکن میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ میرے لیے تو سب سے بڑی دعا خود وہ تھیں، ان کا چہرہ تھا، جسے دیکھ کر میں اپنی زندگی کے ہر امتحان کا سامنا کرتا تھا اور اپنی اسی ”دعا“ کی بدولت ہی میں آج تک زندگی کے ہر امتحان میں سُرخ رو بھی ہوا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ دنیا کی ہر دعا رد ہو سکتی ہے لیکن میری یہ ”دعا“ کبھی نامراد پلٹ کر واپس نہیں آ سکتی۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ریشمی خطرہ

مسعود جاوید کے باصلاحیت قلم کی تحریر۔ جرم و سزا اور جاسوسی و سراغ رسانی پر ایک منفرد تحریر۔ ایک ذہین قابل اور خوبصورت خاتون (پرائیوٹ) سراغ رساں کا دلچسپ قصہ، ایک مجرم اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ ان کی ممکنہ شادی کی شرط بھی عجیب و غریب تھی۔ ایک نہایت دلچسپ سنسنی خیز ناول۔ سراغ رساں کے نام کی مناسبت سے ایک خاص ترتیب سے کون قتل کر رہا تھا؟ جاننے کے لیے پڑھیے..... **ریشمی خطرہ**..... جو کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغ رسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابن صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

کتاب گھر کی پیشکش

پہلی تعبیر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

ٹرین تیزی سے بل کھاتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور ایک زوردار سیٹی بجا کر دھیرے دھیرے جھٹکے لیتی ہوئی رُک گئی۔
ایئر کنڈیشنڈ سلیپر کی بوگی کے سٹاپ پر ایک سپاہی حوالدار اور ایک ڈرائیور مستعد کھڑے اپنے افسر کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر آوارہ
سے لڑکوں کا ایک پورا گروہ کا گروہ ہاتھ میں مویسے، گیندے اور گلاب کے ہار لیے انتظار کر رہا تھا اور انہوں نے اس قدر دھما چوکڑی مچا رکھی تھی کہ
حوالدار نے انہیں کئی بار خشمتیں لگا ہوں سے گھورا تھا لیکن مجال ہے کہ اُن پر اُس کی اس ”گھو ری“ کا کوئی اثر ہوا ہو۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل
ہوتے ہی حوالدار اور ڈرائیور مستعد ہو گئے۔ بوگی کا دروازہ کھلا اور دونوں نے کھٹ سے نئے آنے والے صاحب کو پولیس والوں کا کڑک سیلوٹ پیش
کیا اور اس کی جانب بڑھے لیکن یہ کیا اس سے پہلے کہ وہ اپنے افسر سے ملے، اسی لوفر لڑکوں کے گروہ نے ان کے صاحب پر ہلہ بول دیا اور چیختے
چلاتے ان کے صاحب کی طرف دوڑ پڑے۔ لیکن اُن کا صاحب تو خود ہی بڑھ کر ان سے پلٹ گیا تھا۔ حوالدار اور ڈرائیور دونوں ہی کو کچھ سمجھ نہیں آیا
کہ یہ ہو کیا رہا تھا۔

سب سے پہلے راجہ نے زوردار نعرہ لگایا تھا۔ ”وہ رہا آدی“ پھر بالے چلایا۔ ”وہ آیا ہمارا شہزادہ“ پھر نھو کی پتلی سی آواز ابھری۔ ”ارے یار خدا
قسم..... یہ تو اپنا آدی ہے۔“ کچھ ہی دیر میں وہ سارے ٹرین سے نیچے اترنے سے پہلے ہی مجھ سے شہد کی مکھیاں کی طرح چپک چپکے تھے۔ میں سول
سروس اکیڈمی سے اپنی ٹریننگ ختم کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تھا جہاں میری انڈر ٹریننگ آفیسر کی حیثیت سے پہلی پوسٹنگ ہوئی تھی۔
اچانک میری نظر اپنے اسٹاف کے دو جوانوں پر نظر پڑی۔ میں نے ان سب کو خاموش کروا کر ان سے ہاتھ ملایا۔ دونوں نے مجھے سیلوٹ
کیا، اور بتایا کہ انہیں (S.P) ایس۔ پی ملک ریشم خان صاحب نے بھیجا ہے تاکہ وہ میرا استقبال کر سکیں اور ان کے دفتر تک میری رہنمائی کر سکیں۔
میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ میرا اپنا شہر ہے اور ایس۔ پی صاحب کے دفتر کے بارے میں میں جانتا ہوں لہذا وہ بے فکر ہو کر
واپس جائیں میں کچھ دیر میں خود ہی ایس۔ پی آفس پہنچ جاؤں گا۔ وہ دونوں مجھے سیلوٹ کر کے پلٹ گئے۔ بالے نے انہیں میرا سامان بھی نہیں
اٹھانے دیا اور خود ہی میرا سامان اٹھائے وہ سب میرے ساتھ ہی اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

امی اور بابا سے مل کر میں دو گھڑی کے لیے ڈھوکے گھر کی جانب دوڑا۔ وہ صحن میں بی بی بے چینی سے ٹہل رہی تھیں، جتنے عرصے میں اکیڈمی
میں ٹریننگ کر رہا تھا وہ راجہ سے میری لمحہ بلحہ کی خبر لیتی رہتی تھیں اور راجہ کے خطوط میں ان کی جانب سے کہی ہوئی باتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔
انہیں پتہ تھا کہ آج میں فیلڈ ٹریننگ کے لیے اپنے ہی شہر میں تعینات ہو کر آ رہا ہوں۔ اسی لیے ان کے ساتھ ساتھ سکیڈنہ خالہ اور غیاث چچا

بھی میری راہ تک رہے تھے۔ ان سبھی نے میرا استقبال اسی طرح کیا جیسے کوئی اپنا کسی اپنے کا کر سکتا ہے۔ غیاث چچا مجھے بہت دیر تک گلے لگا کر میری کمر تھپکاتے رہے اور پھر جب مجھ سے جدا ہوئے تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں ان کے احساسات سمجھ سکتا تھا۔ انہوں نے کبھی ایسی ہی کسی کامیابی کا خواب اپنی وجہہ کے لیے بھی دیکھا تھا۔ لیکن افسوس مقدر نے جو کا ساتھ نہیں دیا، لیکن آج انہی کی بیٹی کا دیکھا ہوا پسنا میں نے پورا کر دکھایا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آج خوشی کے آنسو تھے کیونکہ میری یہ کامیابی بھی تو جو کی محنت کے بدولت ممکن ہوئی تھی۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی کہ آج یہ مان صرف میرا نہیں، ان کا اور جو کا بھی تو ہے۔

اس دن میں نے جو کے بلج چہرے پر ایک عرصے کے بعد مکمل سکون کی لہر دیکھی۔ ایسا سکون جو کسی ناخدا کے چہرے پر اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنی ڈوبتی کشتی کو طوفانوں سے بچا کر مسافروں سمیت خیریت سے ساحل پر لگا دیتا ہے۔ سیکنہ خالد اور غیاث چچا ایک طرف ہوئے تو وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔

”ہاں تو اے۔ ایس۔ پی عباد خان صاحب..... کیا کہا تھا آپ نے..... اگر دعاؤں سے ہی مقابلے کے امتحان پاس ہوا کرتے تو ہماری مسجد کے مولانا کے تمام بچے سی۔ ایس۔ پی آفیسر ہوتے..... ہاں.....؟ تو اب کیا کہتے ہو؟ میری مانو تو جاتے ہوئے مولانا صاحب سے ملے ہوئے انہیں بھی اپنا یہ سدا بہار مشورہ دیتے جانا.....“ اچھا ہے کچھ اور لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔“

جو کی اس بات پر ہم سبھی بے اختیار ہنس پڑے۔ ان کے گھر سے نکلتے نکلتے میں نے پھر ان سے کہا کہ میں آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں لیکن شرط صرف اتنی ہے کہ مولوی صاحب بھی اپنے بچوں کے لیے وجہ سے ہی دعا کروائیں۔ جو مسکرا کر بولیں کہ ”بسرو چشم۔ لیکن محنت انہیں بھی آدی جیسی ہی کرنی ہوگی۔“

کچھ دیر بعد میں ایس۔ پی ملک ریشم خان کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا اپنی جوائننگ رپورٹ انہیں پیش کر رہا تھا۔ میں انہیں بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا اور میرے سامنے ہی وہ ترقی کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے انسپکٹر سے ایس۔ پی کے عہدے تک پہنچے تھے۔ جب ان کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے انہیں سیلوٹ کر کے ”اے۔ ایس۔ پی انڈر ٹیننگ عباد خان رپورٹنگ سر“ کہا تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے میرے سلام کا جواب دیا اور اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ مجھے بھی اچھی طرح پہچانتے تھے اور جو کے کیس کے دوران محلے میں آتے جاتے انہوں نے کئی بار مجھے دیکھا تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ بچپن میں ہم سب محلے کے بچے ان کا نام سن کر ہی بھاگ جایا کرتے تھے تو وہ بہت ہنسے۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ وہ اوپر سے جس قدر سخت گیر دکھائی دیتے تھے، اندر سے اسی قدر شفیق تھے، لیکن مجرموں کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا، اور جرم کے معاملے میں وہ کوئی نرمی برتنے کے قابل نہ تھے۔ انہوں نے تفصیل سے مجھے میرے زیر اختیار علاقے اور ان کیسوں کی تفصیل بتائی، جس میں مجھے ان کی معاونت کرنا تھی، آخر میں اشتہاری ملزمان کی فہرست کی باری آئی اور میں تیسرے ہی نام پر اس زور سے چونکا کہ میرے ہاتھ میں پڑے کافی گگ سے کافی چھلکتے چھلکتے پچی۔ وہ ظفر کا نام تھا۔ ایس۔ پی صاحب نے بھی میری اس بدلتی کیفیت کو محسوس کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس نام سے ہم سب کا پرانا تعلق ہے۔ انہوں نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی خبر بھی سنائی کہ ان کی مخبری کے مطابق ظفر گزشتہ ایک ہفتے سے اسی شہر میں موجود ہے۔ لیکن اُس نے اپنا ٹھکانہ

بدل لیا ہے اور فی الحال اس کے نئے ٹھکانے کے متعلق کسی کو علم نہیں ہے۔ ہمارے خُمروں میں بھانت بھانت کے لوگ شامل ہوتے تھے اور یہ تازہ خُمری بھی ایک پرانے جواری نے کی تھی جو گزشتہ ہفتے ہی ظفر کے ہاتھوں اپنی ایک لمبی رقم سے جوئے کے دوران محروم ہو چکا تھا۔

ظفر کی شہر میں آمد کی اطلاع نے جہاں ایک جانب میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھردی تھیں، وہیں مجھے کافی متفکر بھی کر دیا تھا۔ میں نے اُسی دن ایس۔ پی صاحب سے درخواست کر کے ایک دوسادہ لباس والے محلے کے ارد گرد تعینات کروا دیئے تاکہ اگر ظفر اُس جانب آنے کی کوشش کرے تو وہیں ڈھر لیا جائے۔

میں نے غیاث چچا کو بھی احتیاطاً فون کر دیا کہ وہ جو کو کہیں آنا جانا ہو تو وہ مجھے بتا دیا کریں۔ غیاث چچا نے مجھ سے تفصیل نہیں پوچھی لیکن شاید وہ بھی کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ اور فکر کے یہ رنگ شام کو مجھے تب نظر آئے جب میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ میں نے انہیں شہر میں ظفر کی آمد کے بارے میں تو نہیں بتایا بس یونہی سرسری سا تذکرہ کر دیا کہ یہ روزمرہ کی احتیاط ہے اور کچھ نہیں۔ پتہ نہیں میری اس بات سے ان کی تسلی ہوئی یا نہیں لیکن سیکنہ خالہ کی فکر اور بڑھ گئی اور انہوں نے وہ جو کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے دل کی بات پھر غیاث چچا کے سامنے رکھ دی کہ اس طرح وہ اپنی جوان بیٹی کی پل پل حفاظت کب تک کر پائیں گے؟ انہیں یہ فکر بھی کھائے جا رہی تھی کہ وہ جو تیس ۳۰ کے ہندسے کو چھونے لگی ہیں اور ایک آدھ سال اور گزرا تو شاید لوگ اُن کے گھر کا راستہ ہی بھول جائیں۔ آج کل کنواروں کو پلٹ کر کوئی نہیں پوچھتا اور وہ جو تو پھر.....“ لیکن غیاث چچا نے سیکنہ خالہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی انہیں جھڑک کر روک دیا۔ لیکن یہ بات غیاث چچا بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ سیکنہ خالہ کے خدشات بے جا نہیں ہیں۔ لیکن ایک بار وہ اپنی ایسی ہی ایک جلد بازی کی وجہ سے اپنی بیٹی کے دامن میں انگارے بھر کر اسے ظفر جیسے شخص کے جہنم میں جھونک چکے تھے لہذا دوبارہ وہ اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا چاہتے تھے۔ اور پھر بات صرف انہی کی مرضی اور اجازت کی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی، اب تو وہ جو سے ایسی کسی بات کا تذکرہ کرنا بھی محال تھا۔ اور ان کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ان کے دل کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچانا چاہتا ہو یا ایسی کوئی بات کر کے ان کے پرانے زخم اُدھڑنا چاہتا ہو۔ لیکن سیکنہ خالہ کے اندر وہ جو کی ایک بہت گہری اور سب سے پکی سیٹھیلی بھی تو رہتی تھی، اس لیے جو بات ماں کی زبان سے نہیں نکل پاتی تھی، اسے اس وقت وہ سیٹھیلی وہ جو کو منتقل کر دیتی تھی، جب کبھی دونوں سہیلیاں سر جوڑ کر بیٹھا کرتیں لیکن ایسے میں وہ جو کا اپنی اس سیٹھیلی کو دیا گیا جواب بھی صرف ایک لمبی چپ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو اپنی اس سیٹھیلی کی ہر نشوونما اور ہر خدشے سے آگاہ تھیں لیکن وہ شاید اپنے دل اور ذہن کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس موضوع پر بند کر چکی تھیں۔ کیونکہ اس عمر میں ہی وہ یکے بعد دیگرے اتنے زیادہ تلخ تجربوں سے گزر چکی تھیں کہ یہ بھی انہی کی ہمت تھی کہ وہ ابھی تک اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ ظفر کی شہر میں موجودگی کی خبر سنا کر انہیں مزید پریشان کروں۔ لیکن پریشانیوں سے تو ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا، ہم ایک کھڑکی بند کرتے تھے تو وہ دوسرے روشن دان سے اندر جھانکنے لگتی تھیں۔ ایک درز پر قفل لگاتے تھے تو وہ دوسری تھڑی کھول کر ہمارے من کے اندر کود پڑتی تھیں۔ اُس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔

ریحان صاحب کی چھوٹی بیٹی فائزہ کی سالگرہ تھی اور دونوں بچے خود اپنے پاپا کے ساتھ خصوصی طور پر اپنی اُستانی کی ساری فیملی کو مدعو کرنے کے لیے ان کے گھر آئے تھے۔ غیاث چچا نے جوئے کے سامنے تو ان سے کچھ نہیں کہا لیکن ان کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ریحان

صاحب کو میری ہدایت کے بارے میں بتا دیا کہ میں نے انہیں وجوہی نقل و حرکت محدود رکھنے کے لیے کہا ہے۔ ریحان صاحب نے فوراً اس کا حل بھی غیاث چچا کو بتا دیا۔ انہوں نے غیاث چچا ہی کے ہاں میرے نام کا دعوت نامہ بھی لکھ کر چھوڑ دیا کہ ”جس نے نقل و حرکت محدود کرنے کی ہدایت کی ہے، وہ خود ہی آپ سب کو لے کر ٹھیک چار بجے میرے غریب خانے پہ حاضر ہو جائیں۔“

غیاث چچا نے مجھے دفتر فون کر کے ساری تفصیل بتادی۔ میں نے انہیں بتایا کہ جمعرات کو فاری بھیا اپنے آسٹریلیا والے پڑھائی کے وظیفے کے سلسلے میں دو سال کے لیے پہلے کراچی اور پھر وہاں سے آسٹریلیا بذریعہ ہوائی جہاز سفر کے لیے روانہ ہو رہے ہیں لہذا میں انہیں ایئر پورٹ چھوڑ کر وہاں سے سیدھا ریحان صاحب کے گھر آ جاؤں گا۔ البتہ انہیں لیجانے کے لیے میں اپنی سرکاری گاڑی بھیج دوں گا لہذا وہ اُسی میں ریحان صاحب کے گھر پہنچ جائیں۔

جمعرات کو میں نے فاری بھیا کو مشکل گھر سے نکالا ورنہ ان کی فلائٹ ہی رہ جاتی۔ امی کی دھونیاں اور عمارہ کے امام ضامن ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ امی کا بس چلتا تو وہ بھیا کے ساتھ ہی ایک مستقل دھونی ان کے گلے میں ڈال کر بھیج دیتیں تاکہ ہوائی جہاز میں بھی انہیں مناسب دھواں ملتا رہے البتہ خود بھیا کا کھانسنے کا کھانسنے کا رُحال ہو چکا تھا۔ اُن کا وظیفہ باٹنی میں ریسرچ کے لیے ہوا تھا اور دو سال میں انہیں صرف دو مرتبہ عید پر ہی چھٹی مل سکتی تھی اس لیے ان کے گھر سے نکلتے نکلتے ماحول کافی افسردہ سا ہو گیا تھا۔ عمارہ کی منگنی خاندان میں ہی طے ہو چکی تھی لیکن رخصتی کے لیے اس نے شرط یہی رکھی تھی کہ فاری بھیا کی واپسی کا انتظار کیا جائے گا، وہ بھی بھیا کے نکلتے نکلتے رو پڑی۔ مجھے تو ویسے بھی ایسے الوداع ہمیشہ روح کے اندر تک کاٹ دیتے تھے، میرا سارا بچپن ایسے الوداعی لمحوں اور آنسوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ اور مجھ سے زیادہ بھلا اس اذیت اور کرب کو کون محسوس کر سکتا تھا، جس سے اس وقت فاری بھیا گزر رہے تھے۔ ویسے بھی وہ کبھی گھر سے اتنے عرصے کے لیے دور نہیں گئے تھے۔ وہ صرف امی کی وجہ سے خود پر قابو کئے ہوئے تھے ورنہ وہ تو عمارہ سے پہلے ہی رونے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وہ تو شکر ہوا ابا کا کہ ان کی ایک زوردار کھکار نے عمارہ، بھیا اور امی تینوں کو ہی آخری ”وارنگ“ سنادی ورنہ ان لوگوں کا گھن کے دروازے سے ہلنے کا کوئی پروگرام بننا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایئر پورٹ پر بھیا مجھ سے مل کر پلٹنے لگے تو میں نے پیچھے سے انہیں ہم دونوں کے بچپن کے انداز میں آواز دی۔ ”فاری بھیا.....“ وہ چونک کر پلٹے۔ میرے ہاتھ میں ہم دونوں کے بچپن کی وہی پسندیدہ ٹینس بال تھی، جو انہوں نے میرے کیڈٹ کالج جاتے ہوئے، ریلوے اسٹیشن پر میرے سامان میں رکھ دی تھی۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہیکلی نمی اُتر آئی۔ وہ پلٹ کر واپس آئے اور انہوں نے مجھ سے بال لے لی اور پھر اچانک ہی زور سے مجھے گلے لگا لیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلے رونے والے نہیں تھے۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔ ہم بھی کتنے عجیب بھائی تھے۔ جب کبھی ساتھ ہوتے تو لڑ لڑ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے اور آج جب ایک بار پھر جد اہور ہے تھے تو ہمارے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہاز ہوا میں بلند ہو گیا اور میں جو جھل دل کے ساتھ ریحان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں تو خاصا اہتمام نظر آ رہا تھا۔ کافی مہمان آچکے تھے اور اب بھی مزید آمد جاری تھی۔ شارق اور فائزہ اپنے دوستوں سے اپنی پیاری ٹیچر کا تعارف کروا کر اتر چکے تھے۔ میں

نے اچانک جھوکو برآمدے میں نکلتے دیکھا تو میں انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ برآمدے میں ڈھلتی شام کے ملگھے اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی رنگین بتیوں کی لڑیاں جگمگا رہی تھیں اور ان روشنیوں کے درمیان جھو خود بھی ایک چمکدار ستارہ ہی تو دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے گہرے سبز رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور کانوں میں اُسی مناسبت سے ہلکے سے فیروزی موتیوں والے ٹاپس ڈال رکھے تھے۔ ضروریہ سارا اہتمام ان کی سنبلی سکیزنہ خالہ نے کروایا ہو گا، ورنہ جھوکو میں نے کبھی اتنا اہتمام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی سادگی ہی اتنی دل فریب اور پُر وقارت تھی کہ انہیں ایسے کسی مصنوعی سہارے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہوں نے برآمدے سے ہی مجھے دیکھ کر دُور سے ہاتھ ہلایا۔ وہ حسب معمول بچوں کے ساتھ بچہ بنی ہوئی تھیں۔ میں نے مسکرا کر دُور ہی سے ان کے لباس کو اور ان کے ہلکے سے میک اپ کی اشارے سے تعریف کی اور بچپن کی طرح فضا میں ۱۰۰ میں سے پورے سو یعنی ۱۰۰/۱۰۰ سو بٹہ سو کا نشان بنایا۔ جھو جھینپ سی گئیں اور ہنس پڑیں۔ بہت پہلے جب میں کیڈٹ کالج بھی نہیں گیا تھا اور اپنے اردو میڈیم پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو جب کبھی میں اپنی خفنی بہت اہتمام سے لکھ کر جھوکو لے جا کر دکھاتا تو وہ یونہی فضا میں ۱۰۰/۱۰۰ کا نشان بنا کر میری خوش خطی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ اور آج تو اگر میرا بس چلتا تو میں ہزار میں سے ہزار نمبر بھی انہیں دینے سے نہ چوکتا۔

اتنے میں ریحان صاحب کی امی اپنے پوتے پوتیوں سمیت باہر برآمدے میں نکل آئیں اور انہوں نے پیار سے جھوکو کے سر پر ہاتھ پھیرا، شاید بچے اُن کا دادی سے تعارف کروا رہے تھے، لیکن جب میں ان سب کے قریب پہنچا تو میرے کان میں فائزہ کا صرف آخری جملہ ہی پڑ سکا۔ وہ اپنی دادی سے لپٹ کر کہہ رہی تھی۔

”دادو آپ ٹیچر سے کہتی کیوں نہیں کہ وہ ہماری مٹی بن جائیں۔“ میں نے جھو اور جھو نے مجھے بوکھلا کر دیکھا۔

کتاب گھر کی پیشکش ہم سفر

ہم سفر..... فرحت اشتیاق کا خوبصورت ناول، ہماری سماجی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کے ایک اہم پہلو پر لکھی جانے والی تحریر..... زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والوں (ہم سفر) کے درمیان، محبت اور خلوص کے ساتھ ساتھ اعتماد کا رشتہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتماد ڈگمگا جائے تو بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ہم سفر ساتھ چھوڑ دینے کی باتیں کرتے ہیں، لیکن ان حالات میں بھی ایک اور تعلق اور واسطہ ہم سفر کو بچھڑنے نہیں دیتا اور وہ مضبوط تعلق ہوتا ہے..... اولاد..... ہم سفر کتاب گھر کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش بچپن کا دمبر

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اب جانے بچوں کے دل میں یہ بات کہیں پہلے سے ہی دبی تھی یا پھر اُسی محفل کے ہنگامے میں ان کے دلوں میں یہ خواہش گھد بڑائی تھی، لیکن ان کی اس بات پر ڈوا ایک دم سے ہی خاموش ہو کر اندر چلی گئیں، دادی نے بچوں کو چھڑکا کہ ایسا نہیں کہتے، آس پاس کچھ دیر چمگوئیاں ہوئیں پھر سب لوگ بھول بھال کر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی لیکن ڈوا آپنی کو پھر کسی نے محفل میں مسکراتے نہیں دیکھا۔ ریحان صاحب نے بھی ان کی اس خاموشی کو محسوس کیا لیکن انہیں اس چپ کی وجہ سمجھ نہیں آ سکی اور وہ پارٹی ختم ہونے تک کبھی غیاث چچا اور کبھی خالہ سے پوچھتے رہے کہ جو اتنی سنجیدہ کیوں بیٹھی ہیں؟ لیکن کوئی بھی انہیں ان کی غیر موجودگی میں بچوں کے دل سے نکلی وہ بات نہیں بتا سکا۔

پارٹی ختم ہوئی تو ریحان صاحب ہمیں گیٹ پر رخصت کرنے کے لیے آئے۔ انہوں نے ہم سب کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے وہاں آ کر ان کا مان بڑھایا۔ پھر انہوں نے خاص طور پر ڈوا کی جانب مڑ کر ان سے کہا کہ وہ خصوصی طور پر جو کے ممنون ہیں کیونکہ شاید ڈوا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تب بھی وہ بچوں کی خوشی کے لیے یہاں تک آئیں۔ ہم سب ان سے رخصت ہو کر باہر نکلے تو ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر جلدی سے گاڑی رپورس کی۔ اتنے میں سڑک سے گزرتا ایک تانگلہ جس نے ابھی ابھی ہمیں کراس کیا تھا، آگے جا کر ایک دم رُکا جیسے کسی نے گھوڑے کی لگا میں اچانک ہی دوڑتے دوڑتے کھینچ لی ہوں۔

میں ایک دم ہوشیار ہو گیا اور ڈوا کے سامنے آ گیا، تانگلے سے کوئی شخص گوا اور شور مچاتا ہوا ہماری جانب بھاگا، میری ساری حسیں ایک دم ہی بیدار ہو گئیں، پھر غیاث چچا کی آواز میرے پیچھے سے اُبھری ”ارے..... یہ تو اپنا کرمو ہے۔“ غیاث چچا ہنستے ہوئے آگے بڑھے اور کرمو کو گلے لگا لیا۔ ہاں، وہ کرمو بابا ہی تھا۔ ڈوا آپنی کے بچپن سے لے کر جوانی تک انہیں اپنے تانگلے میں اسکول اور کالج تک چھوڑنے والا کرم دین۔

ہم سب کو دیکھ کر کرمو بابا کی باچھیں کھلی جاری تھیں اور وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین کرنا چاہتا ہو کہ میں ہی وہ چھوٹا سا آدمی ہوں جو روزانہ اس کے تانگلے کے پائیدان پر لٹک کر ڈوا کے گھر سے لے کر محلے کے پھانک تک بطور فیس جھولا لیا کرتا تھا۔ ڈوا بھی اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی تھیں اور چند لمحوں کے لیے ان کے چہرے پہ چھایا تمام تکدر بالکل ہی چھٹ گیا تھا۔ کرمو نے ڈوا کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے بے شمار دعائیں دیں۔ اور ڈوا کے بچپن کو یاد کرتا رہا کہ وہ کتنی نفاست پسند تھیں کہ اگر تانگلے کی سیٹ پر ذرا بھی گرد ہوتی تھی تو وہ بیٹھنے سے یکسر انکاری ہو جاتی تھیں اور جب تک خود کرمو یا فضلہ بابا اس گرد کو کسی کپڑے سے صاف نہ کر دیتے تب تک وہ ”میم صاحب“ نہیں نیچے ہی ٹہکتی رہتی تھیں۔ غیاث چچا نے کرمو سے کہا کہ کبھی کبھار گھر کا چکر لگا جایا کرے، وہ بھی اس کا اپنا ہی گھر ہے۔ کرمو نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے غیاث چچا سے کہا کہ وہ سکیڑ خالہ کو لے کر گاڑی میں گھر چلے جائیں۔ میں اور ڈو آج بچپن کی طرح کرمو کے تانگے پر گھر جائیں گے۔ سب نے حیران ہو کر میری جانب دیکھا لیکن میں جانتا تھا کہ ڈو کے دل پر چھائے غبار کو دھونے کا اس سے بہتر طریقہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ کرمو نے خوشی سے وہی فقرہ لگایا، جو وہ ہمارے بچپن میں تانگے کو تیز دوڑانے کے لیے لگاتا تھا۔ غیاث چچا نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور مسکراتے ہوئے سکیڑ خالہ کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈو کو اشارہ کیا اور شامی ادب و آداب کے ساتھ بولا۔

”آئیے شہزادی صاحبہ کبھی تیار ہے اور کو چوان کرمو آپ کا انتظار کر رہا ہے۔“ ڈو نے مسکرا کر سر جھٹکا اور تانگے کی طرف چل دیں۔

”آدی..... تم بھی نا..... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی ہاں.....؟“

”ارے بھئی آپ ٹھہریں اپنے ماں باپ کی لاڈلی اور اکلوتی..... آپ کا تو سارا بچپن ہی اس شامی بگھی کی سواری میں گزرا ہے۔ جبکہ مجھ غریب کی کمرابا کی پرانی سائیکل کی جتھوں اور اُچھل کود نے توڑ کر رکھ دی تھی۔ میں نے سوچا کہ آج موقع ملا ہے تو ذرا ہم بھی اس سواری کا لطف اٹھا لیں۔“ ڈو کچھ دیر مجھے مصنوعی غصے سے گھور کر دیکھتی رہیں اور پھر ہنس کر تانگے پر بیٹھ گئیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ پھر سے وہی نو دس سال کی ڈو بن چکی تھیں جو اپنے کرمو بابا سے سارے راستے ضد کرتی تھی کہ تانگہ اور تیز چلائے، ڈو سب بھول کر اب بھی کرمو سے وہی جملہ دہرا کر ضد کر رہی تھیں۔

”اور تیز..... اور تیز نا کرمو بابا..... بھلا کوئی ایسے تانگہ چلاتا ہے۔“

اور کرمو بھی وہی پرانا کرمو بن چکا تھا جو اپنی وجوہ کے کہنے پر گھوڑے کو اور تیز دوڑائے جاتا تھا اور راستے میں زور زور سے ”ہو..... ہو.....“ کے نعرے بھی مارتا جاتا۔ تانگہ سڑک پر سرپٹ دوڑا جا رہا تھا اور آس پاس کے لوگ حیرت سے تانگے اور اس میں بیٹھی سوار یوں کو دیکھ رہے تھے۔

تانگہ اب شہر کی دورویہ درختوں سے گھری ٹھنڈی سڑک کی جانب مُڑ چکا تھا راستے میں ایک ٹھیلے پر گرم مونگ پھلیاں بھننے دیکھ کر وجوہ پہلے کی طرح زور سے چلائیں۔

”آدی..... گرم مونگ پھلی۔“

میں بھی بچپن کی طرح ان کے حکم کی تعمیل میں تانگے سے کودا اور بھاگ کر اخبار کی بڑی بڑی گئی نما پڑیوں میں گرم مونگ پھلی کے بھنے دانے، اُن کے اوپر بہت سا چٹ پٹا مصالحہ اور نیبو چھڑکوا کر بھاگتا ہوا دوبارہ تانگے میں آ بیٹھا، کرمو نے پھر ہنس کر زوردار نعرہ مارا ”ہو..... ہو.....“ پھر تو راستے میں جو بھی پھیری والا یا ٹھیلہ آتا گیا، ڈو یونہی چلاتی رہیں۔ ”آدی گزک والا۔“ ”آدی..... بھٹے.....“ ”آدی..... قلفی.....“ اور میں ہر بار اُسی چھوٹے آدی کی طرح بھاگ کر ان کو یہ سب لا کر دیتا رہا۔ جانے کتنی صدیوں بعد میں نے ڈو کو یوں کھل کر ہنستے، قہقہے لگاتے سنا تھا، ان کا چہرہ پھول کی طرح کھلے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں وقت کو وہیں روک دیتا۔ زمانے کی ہر ساعت کو اپنے اور ڈو کے بچپن کے دسمبر میں ساکت کر دیتا۔

ہمیں یوں بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے دیکھ کر کرمو نے بھی تانگے کو سڑکوں پر ڈالے رکھا، اس روز تانگے پر بیٹھے بیٹھے میں نے اور ڈو نے اپنے بچپن کو پھر سے جی لیا۔ ہمیں تب ہوش آیا جب دُور کسی شہر کے گھڑیاں نے رات کے نو بجنے کا اعلان کیا۔ ڈو نے کرمو سے کہا کہ تانگہ گھر کی طرف موڑ

لے کیونکہ غیاث چچا اور سکیہ خالہ پریشان ہوتے ہوں گے۔ میں نے سڑک کنارے بنے پی سی او سے غیاث چچا کو فون کیا اور کہا کہ ان کی لاڈلی میرے ساتھ ہے، پریشان نہ ہوں، وہ ہنس کر بولے ”میں جانتا تھا تم دونوں جب تانگے پر بیٹھ جاؤ تو پھر جب تک گھوڑا خود تھک کر نہ گر جائے، تب تک تم لوگ نیچے اترنے کے نہیں۔“ میں نے اُن سے کہا کہ ہم ذرا دیر سے لوٹیں گے۔ وہ بولے ”صبح بھی ہو جائے تو کچھ پروا نہیں۔“ میں نے ہنس کر فون بند کرنا چاہا تو ان کی آواز کچھ بھڑائی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ میں نے وجہ پوچھی تو ان سے کچھ بولا نہ گیا۔ پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے بولے ”آدی بیٹا..... شکریہ۔“ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، کیا دھومیری ذمہ داری نہیں ہے؟ اگر میں چند لمحوں کے لیے ان کے لبوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا یہ میری جیت نہیں ہوگی.....؟ جواب میں ان سے مزید کچھ نہیں کہا گیا اور انہوں نے ”جیتے رہو“ کہہ کر فون رکھ دیا۔

جب میں نے دھوکو بتایا کہ ہم گھر نہیں کھانا کھانے جا رہے ہیں، اور پھر کھانے کے بعد ریگل چوک سے ان کی پسندیدہ ہاتھ والی مشین سے بنی ”پوکا“ کون آکس کریم کھا کر گھر واپس جائیں گے تو وہ سراسیمہ سی ہو گئیں کہ گھر میں سبھی پریشان ہوں گے، پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ کچھ دیر تو میں انہیں ستاتا رہا کہ غیاث چچا سمجھیں گے کہ میں ان کی لاڈلی کو لے کر کہیں بھاگ گیا ہوں، یا پھر کرمو کا گھوڑا ہی ہم دونوں کو اتنے سال بعد اپنے پیچھے بیٹھے پا کر کہیں رفو چکر ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب وہ بہت زیادہ ہلکان ہونے لگیں تو میں نے انہیں سچائی بتادی کہ غیاث چچا نے پہلے ہی اجازت دے دی ہے۔ لہذا اب وہ چپ کی بیٹھی رہیں اور مجھے اور کرمو کو فیصلہ کرنے دیں کہ ہمیں کھانے کے لیے کہاں جانا چاہیے۔ کرمو نے کہا کہ جگہ ہے تو سبھی..... پر ذرا دُور ہے، لیکن وہاں پر رش اور بھیڑ نہیں ہوگی اور کھانا بھی بہت عمدہ ملے گا۔ میں نے کرمو سے کہا کہ تانگہ اُسی جانب موڑ لے، کرمو نے شہر سے باہر جانے والی اس سڑک پر اپنا تانگہ دوڑا دیا اور کچھ ہی دیر بعد ہم جھیل کی طرف جانے والی اس سڑک پر اڑے جا رہے تھے، جس کے دونوں اطراف شہوت کے بڑے بڑے پیڑ، آسمان پر چمکتی چاندنی سے سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ”دیکھو آج کون اُن کی مہمان ہے؟“ دھو حیرت اور دلچسپی سے وہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے تاثرات بالکل اس شہزادی جیسے تھے جسے عمر بھر کبھی اپنے محل سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی، لہذا ایک رات وہ اپنی خادمہ کے کپڑے لے کر اور ایک نوکرانی کا بھیس بدل کر دنیا دیکھنے نکل پڑتی ہے اور صبح تک سارا شہر گھوم کر واپس اپنے محل جا پہنچتی ہے۔

میں نے شاید دوسویں کی انگریزی کی کتاب میں اس شہزادی کا یہ قصہ پڑھا تھا اور آج میں خود اس شہزادی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، کیا میری قسمت مجھ پر کبھی اتنی مہربان بھی ہوگی.....؟ ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

تھوڑی دیر میں ہم جھیل کے کنارے بنے اس چھوٹے سے خوبصورت مگر خاموش اور پُرسکون ریسٹورنٹ تک پہنچ گئے جہاں پچھلی جانب لکڑی کے تختوں کا ایک پلیٹ فارم جھیل کے اندر تک لکڑی کے بڑے بڑے ستونوں کے ذریعے اس طرح کھڑا کر دیا گیا تھا کہ وہ دُور سے پانی پر تیرتا ایک بڑا سا شکار دکھائی دیتا تھا اور جھیل کے پانی کی لہریں جب دھیرے سے اُس سے ٹکراتیں تو وہ آہستہ آہستہ ہلکوارے سے لینے لگ جاتا تھا۔ دھونے بیٹھنے کے لیے اُسی تختے کا سب سے آخری حصہ منتخب کیا تھا۔ آسمان پر چاندنی اس طرح سے چمکی ہوئی تھی کہ باہر کی فضا سے زیادہ جھیل کے پانی کے

اندر اُجالا پھیلا ہوا تھا، ایک چاند آسمان پر اور دوسرا پانی کے اندر جھیل کی لہروں پر تیر رہا تھا۔ دُور پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور ان پر پھیلی سفید دُودھیا برف ہمیں حیرت سے تنک رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے ”دیکھو تو..... کون آیا ہے آج ان کی گود میں دو گھڑی بیٹھنے کے لیے.....؟“

کرموڈور ریسٹورنٹ میں کھلی فضا میں باربی کیو بناتے اسٹاف سے جھگڑ رہا تھا کہ ”آدی صاحب“ آئے ہوئے ہیں۔ کھانا ٹھیک نہ ہوا تو کسی کی خیر نہیں، اور ریسٹورنٹ والے بے چارے حیران ہو رہے تھے کہ یہ کون سے لاٹ صاحب ہیں جو اس پرانے تانگے پر اتنی رات کو شہر سے اتنی دور کھانا کھانے آئے ہیں۔ ان سے پوچھنے کے بعد کرمو اپنے گھوڑے کو کھول کر دُور جھیل کے کنارے سے پانی پلانے کے لیے اس کی لگام تھام کر بڑھ گیا۔ فو نے چاند کی روشنی میں دُور کرمو کے گھوڑے کو جھیل کے کنارے پانی پیتے دیکھا تو انہوں نے مجھے فوراً اس جانب متوجہ کیا۔

”آدی..... وہ دیکھو..... Robert Frost کی اسٹاپنگ بائے ووڈز ان اے سنوئی ایوننگ

"Stopping by woods in a snowy evening"

”لیکن یہاں برف کہاں ہے؟..... صرف گھوڑا اور جنگل ہی دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ارے تو پھر کیا ہوا۔ ہم اسے ”اسٹاپنگ بائے کرمو بابا ایٹ لیک سائیڈ

(Stopping by karmoo baba at lake side) بھی تو کہہ سکتے ہیں نا۔“

فوکو اس اچانک اور بر محل تشبیہ پر ہم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے میں نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”یونہی ہنستی رہا کریں..... آپ ہنستی ہوئی ہی اچھی لگتی ہیں۔“

انہوں نے جھیل سے نظریں ہٹا کر مجھ پہ ڈالیں۔

”جانتی ہوں..... آج میرا دوست مجھے ہنسانے اور خوش کرنے کے لیے ہی شام سے لیے گھوم رہا ہے۔ اور اسی مقصد کے لیے شہر سے اتنی

دُور بھی لے کر آیا ہے۔“

”آپ کی خوشی اور یہ ہنسی دیکھنے کے لیے مجھے اگر آپ کو چاند پر بھی لیجانا پڑے تو لے کر جاؤں گا..... پکا.....“

”لیکن..... آدی..... کیا ضروری ہے کہ دنیا کا ہر شخص خوش ہی رہے..... سدا ہنستا ہی رہے..... آخر کسی کو تو اس غم اور یاس سے بھی دوستی

کرنا ہوگی نا.....“

”مجھے باقی دنیا کا نہیں پتہ..... مجھے صرف آپ سے غرض ہے اور میں کبھی کسی غم اور یاس کو ہمیشہ کے لیے آپ کا مقدر نہیں بننے دوں گا.....“

انہوں نے اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں پر ٹکا کر مجھے چھیڑنے کے لیے کہا۔

”اچھا جی..... تو بتاؤ بھلا آدی کیا کرے گا ایسے موقع پر۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور عزم سے کہا۔

”اپنی جان بھی دے دوں گا..... اپنی آخری سانس تک لڑے گا آدی آپ کے لیے..... فنا ہو جائے گا.....“

فونے ایک دم سے ”شش“ کہہ کر مجھے چپ کر دیا اور بے حد بنجیدگی سے بولیں۔

”نہیں آدی..... ایسا نہیں کہتے..... دوبارہ ایسی بات ہرگز نہ کرنا۔ ورنہ میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی.....“

میں ان کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

”اگر بات نہ کرنے کی قسم پر لوگ چپ ہونے لگتے تو آج راجہ گونگا ہوتا۔“ جو کچھ دیر تو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ پھر جب سمجھیں تو زور

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

”کیوں..... کیا راجہ ہر وقت بات نہ کرنے کی قسمیں کھاتا رہتا ہے؟“

میں نے انہیں بتایا کہ راجہ تو دوستوں میں چٹے بٹے وقت کم چٹے ملنے پر بھی آئندہ ہم سے بات نہ کرنے کی قسم کھا لیتا تھا۔ ہم انہی باتوں میں مشغول تھے کہ کھانا بھی آگیا۔ کھانا واقعی بہت عمدہ اور لذیذ تھا۔ میں نے کرمو کا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں وہاں جھیل کنارے کھانا کھا رہے ہیں۔

وہ کچھ پل میری زندگی کے سب سے حسین اور سب سے زیادہ یادگار لمحے تھے۔ کھانے کے بعد بھی میرا وہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اسی جھیل کے کنارے اسی رات میں جو کے ساتھ یونہی بیٹھے بیٹھے اپنی ساری زندگی گزار دینا چاہتا تھا۔ اور شاید اگر مجھے کرمو کا خیال نہ ہوتا تو میں صبح تک انہیں یونہی اپنے سامنے بٹھائے رکھتا۔

واپسی پر میں نے جو سے پوچھا کہ انہوں نے ریحان صاحب کے گھر میں بچوں کی بات کا اتنا زیادہ اثر کیوں لے لیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں بچوں کی بات کا اتنا قلق نہیں تھا، جتنا اپنے آس پاس بکھرے لوگوں کی سوچ سے تھا۔

”آدی..... یہ لوگ آخر عورت کو صرف ایک رشتے کے ترازو پر رکھ رہی کیوں تو لیتے ہیں؟ کیا عورت کی ذات خود اپنے اندر مکمل نہیں ہوتی؟ کیوں اس کے آس پاس ہمیشہ اس کی زندگی کے کسی مرد مالک کو ہی ڈھونڈا جاتا ہے؟ اور اگر ایسا کوئی رشتہ ساتھ نہ ہو تو سب اُس کے ساتھ عجیب سا برتاؤ شروع کر دیتے ہیں۔ اُسے یا تو مظلوم سمجھنے لگتے ہیں اور یا پھر طرح طرح کے الزام اُس کی ذات پر منڈھ دیئے جاتے ہیں۔ کیا میری ذات خود میرے اپنے ساتھ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتی؟ کیا وجیہ صرف وجیہ نہیں ہو سکتی؟ کیا اُس کے نام کے ساتھ کسی لافتنے کا ہونا اتنا ضروری ہے کہ لوگ اس کے ہنا وجیہ کو ہی بھول جاتے ہیں.....؟“

بولتے بولتے جو کی آواز بھڑانے لگی۔ وہ چپ ہو گئیں۔

کچھ دیر تک فضا میں گھمبیری خاموشی چھا گئی۔ صرف کچی سرک پر دوڑتے تانگے کی ٹک ٹک اور تیزی سے چلتی ہواؤں کا شور سنائی دیتا رہا۔ پھر میں نے اپنے لفظ جمع کئے اور دھیرے سے بولا۔

”آج میری ایک بات غور سے سن لیں اور پھر کبھی بھی اس بات کو دہرائیے گا نہیں..... وجیہ اپنے اندر ہی خود ایک مکمل کائنات ہے، اُسے اپنے ساتھ کسی سابقے یا لافتنے کی کبھی ضرورت تھی..... اور نہ ہی کبھی ہوگی۔ ہاں البتہ وہ بڑی خوش نصیب ہستی ہوگی، جس کو وجیہ کے نام کا سابقہ مل جائے کیونکہ یہ سابقہ کسی بھی شخصیت کو ہمیشہ کے لیے مکمل کر سکتا ہے۔ وجیہ اپنے اندر مکمل ہے اور اس کے بنا اس کے ساتھ جوڑنے والا کوئی

بھی نام، چاہے وہ سابقہ ہو چاہے لاحقہ..... ہمیشہ نامکمل ہی رہے گا.....“

میں جانے کیا کچھ بولتا رہا اور جو خاموشی سے سر جھکائے میری بات سنتی رہیں۔

”اور ایک اور بات بھی ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ آپ کے بارے میں میری یہ رائے اس لیے نہیں کیونکہ خوش قسمتی سے میں آپ کے دوستوں میں شامل ہوں۔ میری رائے آپ کے بارے میں تب بھی یہی ہوتی اگر میں آپ سے زندگی میں آج پہلی اور آخری بار ملا ہوتا..... کیونکہ آپ سے ایک ملاقات بھی انسان کو اپنے اندر مکمل کرنے کے لیے بہت ہے۔“

جو نے چونک کر میری جانب دیکھا، اتنے میں تانگے نے موڑ کاٹا اور محلے کے پھانک سے اندر داخل ہو گیا۔ کر موکو زخصت کرنے سے پہلے میں نے جیب میں جتنے روپے تھے وہ زبردستی اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیئے، جنہیں لوٹانے کے لیے وہ تین بار پلٹا لیکن جب و جو نے بھی اس سے کہا کہ یہ اس کے لیے نہیں بلکہ اس کی ڈھکی ہم عمر بیٹی رانی کے لیے ہیں تو بادل نخواستہ اُسے وہ رقم قبول کرنی ہی پڑی اور وہ ہم دونوں کو دعائیں دیتے ہوئے تانگہ موڑ کر چلا گیا۔ میں نے بھی ڈھکودروازے تک پہنچا کر واپسی کی راہ لی۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے سے جو کی آواز سنائی دی۔

”آدی.....“

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

”میرے چھوٹے دوست آدی کا شکریہ ادا کر دینا۔“

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

میں مسکرایا۔

”شکریہ..... کس بات کا؟“

”آج کی شام ان چند گھڑیوں میں مجھے میرا بچپن لوٹا دینے کا شکریہ..... اور کچھ دیر کے لیے مجھے میرا اپنا آپ واپس دینے کا شکریہ.....“

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

”اس خدمت کے لیے یہ بندہ ہمیشہ حاضر ہے.....“

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

جو نہس پڑیں۔ میں نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر ان کے انداز میں اسے دبایا۔ اور انہیں یونہی مجھے دیکھ کر ہنستے چھوڑ کر، ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن ابھی میں اپنی گلی میں مڑنے بھی نہیں پایا تھا کہ میری سرکاری جیب تیزی سے محلے کے پھانک سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھٹھک کر وہیں رُک گیا۔ رات کی ڈیوٹی والا اشرف ڈرائیور اور دو سپاہی بھی موجود تھے۔ پتہ چلا کہ ایس۔ پی کا پیغام آیا ہے کہ شہر کی ایک مٹروک عمارت کے تہہ خانے میں کچھ لوگوں کے جھگڑنے کی اطلاع آئی ہے اور آس پاس لوگوں نے دو فائرزوں کی آواز بھی سنی ہے۔ میں اُسی وقت ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

http://kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

ہمارے موقع واردات پر پہنچنے سے پہلے وہاں باقی نفری بھی پہنچ چکی تھی اور انہوں نے عمارت کو گھیرے میں بھی لے رکھا تھا۔ مجسٹریٹ

صاحب بھی تشریف لائے تھے، سو ہم نے مزید وقت ضائع کئے بنا تہہ خانے میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا۔ آس پاس مکینوں سے یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ جھگڑے اور فائر کی آواز کے چند لمحوں بعد ہی دو تین افراد کو انہوں نے تیزی سے عمارت سے باہر نکلتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان تھا کہ اندر کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ لیکن جیسے ہی ہم نے آدھی سیڑھیاں طے کیں، اندر تہہ خانے میں اتاری کے آثار نمایاں ہونے لگے، ایسے لگتا تھا جیسے یہاں شدید دھندلکائی ہوئی ہو۔ اندر لائٹ نہیں تھی، یا کٹ چکی تھی، اس لیے میں نے گارڈ کوٹارچ روشن کرنے کا کہا۔ ایک ساتھ کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں اور زمین پر اوندھے منہ پڑی میز کے پیچھے کوئی شخص اُلٹا گرا ہوا دکھائی دیا۔ سپاہی نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا اور ہلانے جلانے کی کوشش کی، لیکن وہ بالکل بے سُدھ پڑا تھا۔ سپاہی نے جلدی سے کہا۔

”جناب یہ تو لگتا ہے مر گیا ہے۔۔۔۔۔“

میں نے دوسرے سپاہی کو اس شخص کے چہرے پر روشنی مارنے کو کہا۔ طاقتور ٹارچ کے ہالے نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بچھو نے مجھے ڈنک مارا ہو۔ وہ شخص ظفر تھا، جواب لاش کی صورت میں اس تہہ خانے میں بے یار و مددگار پڑا ہوا تھا۔ ظفر مر چکا تھا۔

شہرِ تمنا

خواتین کی پسندیدہ مصنفہ..... **سانرہ عارف** کا بہت خوبصورت اور اچھوتا انداز تحریر..... زندگی کے تمام رنگوں سے سجا..... دکھوں کے بحرِ بیکراں اور خوشیوں کے نخلستانوں سے آباد..... ایک دلچسپ اور طویل ناول..... **شہرِ تمنا**..... کتاب گھر کے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

ایمان کا سفر

محی الدین نواب کی نشتر سے تیز معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ..... **ایمان کا سفر**..... خوبصورت نقابوں کے پیچھے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کرتی..... ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں کی کہانیاں..... کہانیوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر کے معاشرتی کہانیاں/افسانے سیکشن میں دستیاب ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش آخری ٹیس

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

میرے اگلے تین دن بے حد مصروف گزرے۔ شہر کی ناکہ بندی تو ہم نے اسی لمحے کروادی تھی جب ظفر کی لاش ہمیں ملی تھی، اور تیسرے دن چند مشکوک پرانے جوار یوں کو مچھپ کر مال گاڑی کے ذریعے شہر سے باہر جاتے ہوئے ہم نے گرفتار بھی کر لیا۔ تفتیش کے دوران اُن میں سے کوئی ظفر کا قاتل تو ثابت نہ ہوا لیکن یہ پتہ ضرور چل گیا کہ ظفر کا جھگڑا کن لوگوں سے ہوا تھا۔ وہ اُس کے وہی پرانے قرض خواہ تھے جن سے رقم اینٹھ کر وہ شہر سے فرار ہو گیا تھا۔ انہیں جب اطلاع ملی کہ ظفر اسی شہر میں ہے اور اس پرانی عمارت کے تہہ خانے میں چار مزید جوار یوں کے ساتھ بازی جمائے بیٹھا ہے تو وہ اُس سے اپنی رقم کا تقاضا کرنے پہنچ گئے۔ ظفر نے پہلے تو بہانے تراشنے کی کوشش کی کہ اس وقت اس کا ہاتھ تنگ ہے، لہذا فی الحال وہ رقم کی ادائیگی سے معذور ہے لیکن جب اس کے پرانے ساتھیوں نے اس کی ایک نہیں مانی اور اس سے بازی پر لگی رقم بھی چھیننے کی کوشش کی تو معاملہ بگڑ گیا اور بات باتھاپائی تک پہنچ گئی۔ اسی اثنا میں ان میں سے کسی ایک نے ریوالور نکال لیا اور پیسے لے کر بھاگتے ہوئے ظفر پر پیچھے سے دو فائر کر دیئے۔ ظفر وہیں گرا اور زپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ گولی مارنے والے بھی رقم اٹھا کر بھاگ گئے اور یوں ظفر کی کہانی کا عبرت ناک انجام ہوا۔

غیاث چچا کو میں نے اگلے دن اخبار کا وہ صفحہ صبح سویرے ہی بھجوا دیا تھا، جس میں ظفر کی موت کی خبر شائع ہوئی تھی۔ میں خود بے پناہ مصروفیت اور دن رات کے چھاپوں کی وجہ سے ان سے بات نہیں کر سکا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے اور فوج کے زخموں میں آخری بار ٹیس اٹھے گی تو ضرور لیکن اس کے بعد زخم خود ہی مندمل بھی ہو جائیں گے اور اس بدنصیب خاندان کو سکون بھی مل جائے گا۔ شاید اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔

قتل کے چھٹے دن ہم نے اصل قاتلوں کو بھی ایک پرانے قبرستان کے گورن کی کوٹھڑی سے گرفتار کر لیا، جو خود بھی کبھی ان جوار یوں کا ساتھی تھا اور اپنی کوٹھڑی میں ہی انہیں جوا بھی کھلاتا تھا۔ ملک صاحب نے میری زندگی کے پہلے کیس میں ہی کامیابی پر مجھے مبارکباد دی لیکن مجھے اصل خوشی اس بات کی تھی کہ آخر کار غیاث چچا کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتے لیکن اندر ہی اندر ظفر کی جانب سے مزید کسی انتقامی کارروائی کی فکر اور غم ہمیشہ کھائے جاتا تھا۔

پچھلی جمعرات کو میں ریحان صاحب کے گھر پارٹی کی وجہ سے بالے کے گیراج نہیں جاسکا تھا لہذا اگلی جمعرات سے پہلے ہی راجہ کا پیغام آ گیا کہ اگر اس ہفتے بھی میں نے نانہ کیا تو ”وہ آئندہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گا۔۔۔۔۔“

لہذا جمعرات کا دن آتے ہی میں ٹھیک چار بجے خود گیراج کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ سارے لوگر اندر ہی موجود تھے اور جانے کس بات پر زوروں کی بحث چل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بالے نے خوشی سے چلا کر کہا۔

”تھا جس کا انتظار، لو آ گیا وہ شاہکار۔۔۔۔۔“

راجہ نے گھور کر مجھے دیکھا۔

”آگے آپ اے۔ ایس۔ پی صاحب..... مل گئی فرصت ہم غریبوں سے ملنے کی..... ہاں بھئی..... اب بھلا ہمیں کون پوچھے گا۔ اب تو تانگے کی سیر کو جانے لگے ہیں لوگ.....“ کبھی اپنے دن بھی پھریں گے پیارے.....“

اس کا مطلب تھا کہ اس چنڈال چوڑی کو بھی میری جوتوں کے ساتھ سیر کو جانے کی خبر مل چکی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ پڑے ایک پرانے کٹن پر قبضہ جما کر بیٹھے ہوئے کہا۔

”جلنے والے جلا کریں..... قسمت ہمارے ساتھ ہے.....“

نخنو نے وہیں سے نکلنا جوڑا۔

”حسرت اُن ”گل“ غنچوں پہ ہے جو ہن کھلے مڑجھا گئے۔“

نخنو کی پرانی عادت تھی کہ وہ ہر شرع میں ایک آدھ لفظ اپنی جانب سے بڑھایا گھٹا کر اُس کے وزن کا بیڑہ غرق کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

راجہ نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

”کوئی بات نہیں پیارے اپنے ساتھ بھی ماں کی دعا، جنت کی ہوا ہے۔“

بہت پہلے جب ہم سب پانچویں جماعت میں تھے تو ہم نے ایک انوکھا کھیل ایجاد کیا تھا۔ ہم نے سڑک پر چلتی بسوں، ٹرکوں اور رکشوں کی پشت پر لکھے اشعار اور ”اقوال زریں“ میں بات کرنے کی شرط لگالی اور طے کیا کہ جو کوئی بھی ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری بات کرے گا تو اُسے جرمانے کے طور پر سب کو قادر ماما کی ریڑھی سے نان چھو لے کھلانے پڑیں گے۔ لہذا ہم نے سینکڑوں ایسے اشعار اور اقوال یاد کر لیے تھے۔ یہاں سے راجہ چلا تا

”اوپو یا رنگ نہ کر، پیسے لے جنگ نہ کر۔“

وہاں سے بالے کہتا۔

”ہارن دو، راستہ لو۔“

یہاں سے میں چھیڑتا۔

”اپنا تو وقت ہی خراب ہے پیارے۔“

نخنو آہ بھرتا۔ ”سچ کہا“ وقت وقت کی بات ہے۔“

مُشی وہاں سے فریاد کرتا۔ ”ماں کی دعا..... جا بیٹا تانگہ چلا.....“

گڈ وہاں سے دھمکی دیتا۔ ”وقت کا شہزادہ..... پھر لوٹ کر آئے گا۔“

غرض اسی فضولیات میں ہمارا سارا دن کٹ جاتا تھا۔ آج بھی جب بالے نے مجھے دیکھتے ہی مخصوص بس والا نعرہ لگایا تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ سب مجھ سے ناراض ہیں۔ بہر حال بڑی مشکل سے اور مختلف ”تراغیب“ دے کر میں نے انہیں منایا۔ پھر راجہ نے ہی سب سے پہلے ایک ٹھنڈی سی آہ

بنو الئے اکسٹر

فرت اشتیاق



بھری اور بولا۔

”یار کوئی میری بھی ”لو میرج“ کرواؤ..... میری اماں کا تو اس طرف دھیان ہی نہیں ہے۔ ہر وقت نوکری کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔“
میں نے اسے ٹوکا کہ ”لو میرج“ کی سب سے پہلی شرط ایک عدد لڑکی اور دوسری انتہائی بنیادی شرط اس لڑکی سے محبت کا ہونا اشد ضروری ہے اور بد قسمتی سے راجہ کے معاملے میں یہ دونوں شرائط پوری نہیں ہوتی تھیں۔ ”ویسے بھی لو میرج کروائی نہیں جاتی، عمو ما بھاگ کر کی جاتی ہے۔“
راجہ نے برا سامنہ بنایا۔ نھونے دُور سے دانت نکالے۔

”خدا قسم آدی یار..... راجہ نہ سہی..... پر تیرے کیس میں تو یہ دونوں شرطیں پوری ہوتی ہیں..... پھر تو کیوں نہیں کر لیتا شادی..... میرا مطلب ہے لو میرج۔“
”کیا مطلب.....؟“

کتاب گھر کی پیشکش

کتاب گھر کی پیشکش

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

بالے اُچھل کر نا کارہ چیپ کے بونٹ سے نیچے اتر آیا۔
”مطلب یہ کہ لڑکی بھی موجود ہے اور تو اُس سے شدید محبت بھی کرتا ہے، پھر انتظار کس بات کا ہے۔“
راجہ نے وہیں گیراج کے پرانے صوفے پر لیٹے لیٹے آواز لگائی۔

”اسے اس بات کا انتظار ہے کہ ایک بار پھر کوئی اور اُس کا ہاتھ مانگ کر لے جائے، اور یہ جناب پھر سے دیو داس بنے ادھر ادھر پھرا کریں۔“

<http://kitaabghar.com><http://kitaabghar.com>

میں نے ان سب کو گھورا۔
”تم سب ہوش میں تو ہو..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“

راجہ نے نے تکیہ اٹھا کر زور سے میری طرف مارنے کے لیے پھینکا۔

”تو تو کیا چاہتا ہے کہ وہ یونہی بنا کسی رشتے کے تیرے انتظار میں گھر میں بیٹھی رہیں..... اور تو مہینے میں ایک آدھ بار انہیں گھمانے کے لیے کہیں لے جایا کرے، اور کوئی اگلا تجھ سے پوچھے کہ میاں، بتاؤ تو رشتہ کیا ہے تم دونوں کے درمیان، تو تو ہنس کر کہہ دے کہ ”صرف دوستی“.....“

”ہاں تو دوستی کے رشتے میں بُرائی کیا ہے؟ وہ میری دوست تھیں، میری دوست ہیں اور ہمیشہ رہیں گی..... کسی کو اس میں کوئی شک ہے؟“
”کوئی شک نہیں..... کم از کم ہمیں یا پورے محلے کو تو تم دونوں کی دوستی پر اپنے ایمان سے بھی زیادہ یقین ہے۔ لیکن آدی میری جان.....“

یہ دنیا صرف ہم یا ہمارا محلہ ہی نہیں ہے، اپنے آپ کو اُن کی جگہ پر رکھ کر سوچ..... سب سمجھ میں آ جائے گا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ وہ یونہی ہمیشہ تیری دوست رہیں تو اس کا حل صرف یہ رشتہ ہے۔ ورنہ آج نہیں تو کل کوئی نہ کوئی آئے گا اور انہیں تجھ سے چھین کر لے جائے گا۔ پھر وہ خود چاہیں بھی تو ان کی زندگی میں آنے والا تیرے اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ اور انہیں بھی آخر کار تجھ میں اور اس نئے آنے والے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی ہوگا.....“ میں نے حیرت سے اپنے دوستوں کو دیکھا۔ یہ سب آج کیسی باتیں کر رہے تھے؟ بقول فضلہ بابا ”یہ سب آج کون سی بوٹی ٹاپ کر آئے تھے؟“ سچ یہی تھا کہ میں نے آج تک اپنے اور دو دو کے رشتے کو سوائے دوستی کے، کسی اور نام سے پکارنے کا اپنے خواب میں بھی نہیں

سوچا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اس رشتے کو کوئی بھی اور نام دینے سے ہمارے درمیان موجود اس دوستی کے عظیم ترین رشتے پر حرف آجائے گا، جو مجھے دیگر کسی بھی رشتے سے زیادہ عزیز تھا۔ اسی لیے میں اسے محبت کا وہ نام دینے سے بھی گریز کرتا تھا، جو آج بالے نے شاید انجانے میں دے دیا تھا۔

ہاں..... مجھے ان سے محبت تو تھی پر یہ محبت تو ہوش سنبھالتے ہی میں نے اپنے اندر موجود پائی تھی۔ اُس وقت تو کبھی کسی نے اس محبت کو کسی رشتے یا کسی نام سے نکالنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی..... تو پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آج اس معاشرے کو یہ ضرورت کیوں پڑ گئی تھی.....؟

لیکن بات تو راجہ کی بھی ٹھیک ہی تھی، کوئی دوسرا اگر دھوکے کی زندگی کا مالک بن جائے تو وہ بھلا میری اس دوستی کو کیوں قبول کرے گا۔ چاہے میرے اور دھوکے کے درمیان کا یہ رشتہ کتنا ہی پاک، کتنا ہی معصوم کیوں نہ ہو، وہ تو اسے اپنے اور موجودہ زمانے کے پیمانے پر ہی ناپے اور تولے گا، اور زمانے کا ترازو تو سدا بہی صدا دیتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان دوستی کا کوئی رشتہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ عورت یا تو بہن ہو سکتی ہے، یا ماں یا بیوی یا بیٹی..... اور بس..... اس کے آگے رشتوں کی ڈکٹری میں ہمارے ہاں عورت کے نام کے آگے ایک بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ دوسرا ہر رشتہ بس ایک سوالیہ نشان ہی بن جاتا ہے۔ اور میں بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جب تک وہ اپنے گھر میں ہیں۔ ہم دونوں اس سوالیہ نشان سے کسی حد تک بچے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسے ہی انہوں نے کسی دوسرے گھر میں قدم رکھا، یہ سوالیہ نشان پوری شدت سے ہم دونوں کے درمیان آکھڑا ہوگا۔

کہتے ہیں کبھی کبھی ہماری سوچ ہی حالات کی صورت اختیار کر کے ہمارے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے سیانے ہمیشہ اچھا سوچنے کی صلاح دیتے ہیں۔ لیکن ان دنوں میرے دوستوں سمیت ہم میں سے شاید کوئی اچھا نہیں سوچ رہا تھا۔ اسی لیے اگلی ہی شام جب غیاث چچا کا پیغام آیا کہ شام کی چائے ان کے ساتھ پیو تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں صورت حال کچھ ایسا رخ اختیار کر لے گی۔

میں جب شام کو غیاث چچا کے گھر پہنچا تو ریحان صاحب کی گاڑی پہلے ہی سے باہر کھڑی نظر آئی۔ وہ بہت گرم جوشی سے مجھ سے ملے۔ و تبو مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیں۔ غیاث چچا نے خود ہی چائے ڈال کر مجھے بھی کپتھا دیا اور ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھیں۔ آدی ان کے گھر کے فرد جیسا ہی ہے۔ ریحان صاحب نے کھنکھار کر اپنی اس ادھوری بات کو پھر سے جوڑا جو میرے اندر آنے سے پہلے وہ آدھی مکمل کر چکے تھے۔

”جی تو میں کہہ رہا تھا کہ اسی لیے میں نے امی کو روک دیا کہ پہلے مجھے بات کر لینے دیں۔ پھر اگر آپ لوگ اور وجیہہ اجازت دیں گی تو امی باقاعدہ وجیہہ کا رشتہ مانگنے کے لیے یہاں آئیں گی.....“

میرے ہاتھوں میں چائے کا کپ اس زور سے لرزا کہ مجھے اس کو جلدی سے دوبارہ میز پر رکھ دینا پڑا۔ گویا راجہ کے خدشات نے چوبیس گھنٹے کے اندر ہی حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ریحان صاحب کی امی۔ جو کسی اور شہر میں رہتی تھیں اور ریحان صاحب کی بیٹی کی سال گرہ کی تقریب کے سلسلے میں چند دن کے لیے ریحان صاحب کے پاس رہنے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے جب دھوکہ دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں اور اسی لمحے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دھوکہ اپنی بہو بنانے کی پوری اور سرتوڑ کوشش کریں گی۔ لیکن ریحان صاحب نے انہیں حتیٰ رشتہ لے کر جانے سے اس وقت تک کے لیے روک دیا تھا جب تک کہ وہ خود پہلے غیاث چچا کی مرضی معلوم نہ کر لیں۔

غیاث چچا نے ریحان صاحب سے کہا کہ وہ اس معاملے میں فی الحال کوئی بھی قطعی رائے دینے سے قاصر ہیں کیونکہ یہ وجیہہ کی زندگی کا

اپنا فیصلہ ہے اور خود ہی اس سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کی مختار ہیں۔ لہذا وہ صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ریحان صاحب کا یہ رشتہ جو کے سامنے رکھ دیں۔ اب مجھے وہاں جو اور سیکینہ خالہ کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آئی کہ ضرور خود ریحان صاحب نے پہلے تنہائی میں غیاب چچا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی تاکہ اگر غیاب چچا ہی کو کوئی اعتراض ہو تو بات وہیں ختم ہو جائے۔ کچھ ہی دیر میں ریحان صاحب نے چائے ختم کر کے اٹھنے اور رخصت لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔

غیاب چچا نے مجھے انہیں گاڑی تک چھوڑنے کا اشارہ کیا اور میں ریحان صاحب کے ساتھ ہی باہر ان کی گاڑی تک چلا آیا۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے اچانک رُک کر پلٹے اور کہا۔

”عباد..... جہاں تک میں جانتا ہوں..... وجیہہ کے گھرانے کے باہر والوں میں سے، آپ ان سے سب سے زیادہ قریب ہیں اور وجیہہ آپ ہی پر سب سے زیادہ اعتماد بھی کرتی ہیں۔ کیا آپ انہیں میرا ایک پیغام دے دیں گے.....؟“

میں ہڑبڑاسا گیا ”جی..... جی ضرور.....“

”اُن سے کہیے گا کہ اس رشتے کی خواہش صرف امی کے دل میں ہی نہیں جاگی۔ خود مجھے بھی کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ مجھے اُن کی ضرورت ہے۔ لیکن اپنی اور وجیہہ کے عمر کے فرق کی وجہ سے یہ بات زبان پر نہیں لاسکا۔ آپ وجیہہ سے یہ ضرور کہہ دیجئے گا کہ انہی کا فیصلہ اب بھی آخری اور حتمی ہوگا۔ اور خدا را کبھی بھی اس پروپوزل کو ”نہ“ کرنے کی صورت میں بھی وہ اسے اپنے اور میرے خاندان کے بیچ میں کسی دیوار کی صورت میں محسوس نہ کریں۔ وہ ہر حال میں میرے لیے محترم تھیں اور محترم رہیں گی.....“

ریحان صاحب مجھ سے ہاتھ ملا کر جانے کب کے وہاں سے جا چکے تھے لیکن میں اب بھی اس ملاح کی طرح بے بس سا وہاں کھڑا تھا، جسے بچہ پنور میں اس بات کا پتہ چل جائے کہ اس کی کشتی میں ایک ایسا شگاف ہے، جسے بھرنے کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

راجہ کو جب میں نے یہ بات بتائی تو وہ غصے سے چلا اٹھا۔

”دیکھا..... میں نہ کہتا تھا..... ہوگئی تھئی..... یہ ریلوے کے سارے بابو ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ چلنے میں پنجر جیسے دھیمے..... لیکن مستقل مزاج اتنے کہ دھیرے دھیرے اور سرک سرک کر اپنی منزل کے پلیٹ فارم تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا آدی..... جا کر جو سے اپنے دل کا حال کہہ دے..... آج اور ابھی..... اس سے پہلے کہ وہ ریلوے بابو انہیں لے اڑے.....“

لیکن جس بات کو راجہ اتنی آسانی سے کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ دنیا کی سب سے مشکل ترین کسوٹی تھی۔ میں نے ساری زندگی میں صرف یہی ایک جو کی دوستی ہی تو کمائی تھی باقی عمر بھر کے گوشوارے میں صرف اور صرف خسارہ ہی تو تھا۔ کہیں یہ دوستی، یہ رشتہ بھی مجھ سے چھن گیا تو.....؟ اس سے آگے سوچنے کی نہ مجھ میں ہمت تھی اور نہ ہی سکت.....

ساری رات میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور آخر کار صبح ہونے تک میں ایک فیصلے تک پہنچ چکا تھا۔ مجھے کوئی ایک بھرم تو دواؤ پر لگانا ہی تھا۔ لہذا میں نے بھی یہ بازی اپنے طور پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کتاب گھر کی پیشکش آخری بھرم

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چچا میری بات سن کر بہت دیر تک گم سم بیٹھے رہے، اور میں اُن کے سامنے بیٹھا سولی پہ لٹکا رہا۔ میں نے انہیں گاڑی بھیج کر اپنے ہی دفتر بلوا لیا تھا اور وہ اس وقت میز کی دوسری جانب بیٹھے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ میں لفظوں کے معاملے میں ہمیشہ ہی سے بہت محتاط واقع ہوا تھا اور اس روز تو میں نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اپنی احتیاط کی ہر حد کو ہی پار کر لیا تھا تا کہ غیاث چچا کے آگینہ دل کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ لگنے پائے۔ لیکن یہ بھی تو ٹھیک ہی تھا کہ ہر کہی بات اپنے ایک معنی تو ضرور رکھتی ہے۔ پھر چاہے بات کو کتنے ہی اچھے اور خوبصورت ڈھنگ سے کیوں نہ پیش کیا جائے، اس کا آخری اثر تو وہی ہوتا ہے جو دوسرے سُننے والے شخص تک اس بات کے وہ اصل معنی پہنچا پاتے ہیں۔ میری تشویش بھی یہی تھی کہ غیاث چچا تک کہیں میری بات، میرے کسی غلط لفظ کے استعمال سے کوئی اور معنی نہ پہنچا دے۔

بہت دیر خاموش رہنے کے بعد آخر کار غیاث چچا نے سر اٹھایا اور اپنے سلب لب کھولے۔
 ”اگر میں تمہیں بچپن سے نہ جانتا ہوتا تو آج تمہاری اس بات کو میں ایک جذباتی نوجوان کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھ کر تم دونوں کی عمر کے فرق کا احساس دلاتا یا تمہیں یہ نصیحت کرتا کہ کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو جُڑنے سے پہلے ہی بہت کچھ توڑ جاتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں آدمی، اور تمہارے زندگی گزارنے کے نظریے سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ قُوکا رشتہ طلب کرنے کے پیچھے تمہارے دل میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ فیصلہ کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔“

میں نے غیاث چچا کو اپنے دفتر بلا کر سر جھکائے ہوئے ان سے یہی درخواست کی تھی کہ اگر ریحان صاحب نے قُوکا مرضی معلوم کرنے کے لیے غیاث چچا کی زبان کو اپنا پیامبر بنایا ہے اور بات آخر کار اگر قُوکا اس گھر سے رخصت کر کے سُرخرو ہونے پر ہی ختم ہونی ہے تو پھر انہیں قُوکا کے سامنے ایک نہیں دو نام رکھنے ہوں گے۔ اور وہ دوسرا نام میرا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میرے گھر والے میرے اس فیصلے پر چونکیں گے تو ضرور لیکن انہیں زیادہ حیرت بھی نہیں ہوگی۔ امی تو کبھی کبھی مجھے قُوکا کے ارد گرد چکر کاٹنے دیکھ کر مجھے چھیڑنے کے لیے عمارہ کو با آواز بلند کہہ بھی دیا کرتی تھیں۔

”ارے یہ گھر میں تک کر کیسے بیٹھے گا۔ اس کی جان جو وہاں انگی رہتی ہے..... میں تو کہتی ہوں بھائی کو گھر میں دیکھنا چاہتی ہو تو پہلے قُوکا اس گھر میں لے آؤ۔“

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

غیاث چچا واپسی کے لیے کھڑے ہوئے۔ میں ان کے ساتھ دفتر کے دروازے تک آیا۔ جانے سے پہلے انہوں نے میرے کاندھے پر

اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”آدی..... میں تمہاری ایمانداری اور سچائی کی قدر کرتا ہوں..... آج مجھے اس بات کا پوری طرح احساس اور یقین ہو گیا ہے کہ تم زندگی کی ہر سچائی کا سامنا کرنا خوب جانتے ہو..... کاش..... کاش یہ چناؤ اگر میرے ہاتھ ہوتا تو میری پہلی اور آخری پسند تم ہی ہوتے۔“

وہ میرا کندھا تھپتھا کر کمرے سے نکل گئے۔ اور میں اپنی آخری بازی کھیل کر کسی ڈرے ہوئے جوار کی طرح تقدیر کے پتے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن میری قسمت کے بازگیر کا جواب بہت دیر سے آیا۔ غیاث چچا کے چلے جانے کے بعد اس روز دیر تک میں لاشعوری طور پر کسی کے بلاوے کا انتظار کرتا رہا لیکن ہر آہٹ پر چونک پڑنے کے باوجود وہ دستک میرے لیے نہیں ہوتی تھی۔ اور یوں دھیرے دھیرے پورا دن گزر گیا اور بالآخر رات بھی ڈھل گئی۔ یونہی دوسرا اور پھر تیسرا دن بھی ڈھل گیا۔ اب اس انتظار نے مجھے رفتہ رفتہ اندر سے گھلانا شروع کر دیا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں لمحہ بہ لمحہ اندر سے گھلتا جا رہا ہوں، چوتھے دن تک تو میرا کچھ ایسا حال ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ سیدھے جا کر وہ سانسے کھڑا ہو جاؤں کہ جو فیصلہ بھی انہیں سنانا ہے، جو سزا بھی میرے لیے مقرر کرنی ہے۔ بس ابھی کر دیں لیکن اس انتظار کی صلیب پر مجھے مزید نہ لٹکانیں۔ لیکن بے بسی کی یہ کیسی انتہا تھی کہ میں خود چل کر اُن کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے اُن کا سامنا کرنے کی ہمت ہی مجھ میں نہیں رہی۔

پھر یوں ہوا کہ میں نے دن، لمحے اور پلوں کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا۔ کیونکہ وقت کو یاد رکھ کے کاٹنا شاید دنیا کا سب سے اذیت ناک عذاب ہوتا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے نامہ بر میرا حکم سیاہ لے کر آئی گیا۔ دُکھ کی جانب سے فضلو بابا پیغام لے کر آ گئے کہ مجھے شام کو طلب کیا گیا ہے۔ جو لوگ اپنے حواس رکھتے ہوں گے اُن کے لیے تو شاید چار پانچ دن ہی گزرے ہوں گے، پر میرے لیے تو نہ جانے کتنی صدیاں بیت چکی تھیں۔ شام تک میرے دل میں عجیب سے عجیب سے دوسو سے آتے رہے اور چند گھنٹوں کا وہ وقت کیسے گزرا یہ میں ہی جانتا ہوں۔

شام ڈھلے جب میں دُکھ کے گھر پہنچا تو فضلو بابا جو صحن میں لگے انگور کی بیلوں کی شاخیں تراش رہے تھے، نے دُور ہی سے مجھے چھت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دُکھ چھت پر ہیں۔ سورج ڈھل چکا تھا لیکن اس کی سنہری گلابی روشنی ابھی کچھ فضا میں باقی تھی۔ میں دھیرے دھیرے یوں سیڑھیاں چڑھنے لگا، جیسے کوئی قیدی پھانسی گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔

دُکھ منڈیر کے قریب ہی کرسی پر خاموش سی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کی سوجی ہوئی آنکھیں اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ پچھلے چند دنوں میں بس لگا تار روتی رہی ہیں۔

میں چُپ چاپ خاموشی سے ان کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں، پھر انہوں نے سر اٹھایا اور میں نے نظریں جھکا لیں۔ ان کی آواز مجھے کسی دُور کے صحرا سے آتی محسوس ہوئی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا آدی..... میرے پاس ایک ہی تومان بچا تھا۔ تمہاری دوستی کا مان اور تم نے میرا یہ آخری بھرم، آخری مان بھی توڑ دیا..... کیوں کیا تم نے ایسا.....؟“

میں نے یونہی جھکی نظر سے جواب دیا۔

”میں آپ کو ایک مرتبہ پھر کھونے سے ڈرتا ہوں۔ میرے پاس بھی آپ کی اس دوستی کے مان کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا ہے..... اور کوئی بھی غیر آکر اس بھرم کو مجھ سے چھین کر لے جائے، یہ مجھے گوارہ نہیں ہے.....“

”تم سے کس نے کہا کہ کوئی تم سے میری دوستی، میرے اعتماد، میرے خلوص کا بھرم چھین سکتا ہے؟ اور تم نے تو اس دن خود مجھ سے کہا تھا نا، کہ وجہہ اپنے اندر خود ایک مکمل کائنات ہے؟ پھر کیوں اُسی وجہہ کو نامکمل سمجھتے ہوئے غیروں کے ساتھ تم بھی اُسے نام کا لاحقہ پیش کرنے چلے آئے..... تم آدمی..... تم.....؟.....“

”آپ شاید بھول رہی ہیں۔ اُسی دن میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ جس کسی بھی خوش قسمت کے نام کے ساتھ آپ کے نام کا سابقہ جڑے گا، اس کا نام، اس کی شخصیت، اس کی کائنات ہمیشہ کے لیے مکمل ہو جائے گی۔ اور پھر اگر اس پوری کائنات میں کسی کو اس نام کے جُونے سے اپنے آپ کو مکمل کرنے کا حق ہے، تو وہ پہلا حق دار میں کیوں نہیں ہو سکتا..... کیا آپ مجھے ہمیشہ نامکمل ہی دیکھنا چاہتی ہیں؟..... یا پھر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کو کھودینے کی تلوار ہمیشہ میرے سر پر لٹکتی ہی رہے.....؟..... اگر آپ کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس روک لینے کا صرف یہی ایک رشتہ ہی واحد ذریعہ ہے تو پھر یونہی سہی.....“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے.....“

”کیوں..... کیا صرف اس لیے کہ آپ عمر میں مجھ سے صرف سات آٹھ سال بڑی ہیں..... یا اس لیے کہ اس رشتے سے پہلے ہی آپ کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں اور اب آپ اپنے آپ کو سرائے والوں کو صرف ہمدردوں کی قطار میں شمار کرتی ہیں یا پھر صرف اس لیے کہ آپ کے ذہن میں بھی وہ صدیوں پرانا اور گھسا پٹا جملہ گردش کرتا رہتا ہے کہ ”لوگ کیا کہیں گے.....؟“

تُو نے دُکھ کی اذیت ہی ڈوبی نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”نہیں تو مجھے اپنی اور تمہاری عمر کے فرق کا کچھ ایسا شدید احساس ہے، نہ ہی میں ماضی کے کسی رشتے کی وجہ سے خود کو کسی ہمدردی کا شکار محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی مجھے زمانے کی پروا ہے..... مجھے اگر فکر ہے تو صرف اور صرف اُس رشتے کی جو میرے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ لوگوں کی نظر کی پروا تو میں تب کرتی جب خود اپنے آپ سے نظر ملا پاتی۔ تم نے تو خود مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا آدمی..... میں تو اتنے دن سے خود اپنا ہی سامنا نہیں کر پا رہی۔ اتنے خوبصورت اور انمول رشتے کو تم نے دنیا کے ایک عام سے رشتے میں بدلنے کا سوچا بھی تو کیسے؟ دوستی کی سیپ میں سے موتی نکال کر اُسے کچڑ میں پھینک دیا..... کیوں؟

”مجھے ایسا کرنا پڑا، اس رشتے کی کچڑ سے اس انمول رشتے کی چمک کو جان بوجھ کر دھندلانا ہی پڑا کیونکہ اس کی چمک ہی لوگوں کو قبول نہ تھی، اور یہی چمک آپ کو مجھ سے ایک بار پھر دُور لے جانے کا باعث بن رہی تھی۔ کیونکہ وجہہ خود ایک ایسا چمکدار ہیرا ہے جس کی چمک اور جس کی کشش بار بار لوگوں کو اس کی جانب کھینچتی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ ایک دن کوئی نہ کوئی اس رتن کو مجھ سے چُرا لے جائے گا..... آپ ہی بتائیں..... پھر آدمی

کیا کرے گا.....؟“

”قوبے بی سے رو پڑیں۔“

”میرے لیے یہ زندگی پہلے ہی بہت کٹھن ہے آدمی..... اسے میرے لیے اور مشکل نہ بناؤ..... مجھے اپنے اور تمہارے رشتے سے بہت محبت ہے آدمی..... خدا کے لیے اس محبت کو میرے دل میں زندہ رہنے دو..... اسے کسی اور رشتے کا الزام نہ دو..... دنیا کا اور کوئی بھی رشتہ اس کی حرمت کو چھو بھی نہیں سکتا..... مجھے میری محبت واپس لوٹا دو آدمی..... واپس لوٹا دو.....“

”مجھے بھی اس رشتے سے اتنی ہی محبت ہے جتنی آپ کو..... اور مجھے آپ سے بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی ہم دونوں کو اس رشتے سے..... اور یہ محبت مجھے آج یا کل سے نہیں ہے..... جس لمحے میں نے ہوش سنبھالا اور آپ کو دیکھا تھا..... تب ہی سے یہ محبت میرے خون میں شامل ہے۔ یہ سچ ہے کہ ریحان صاحب کا رشتہ آنے تک میں نے بھی کبھی اس روحانی محبت کو کسی دنیاوی رشتے میں ڈھالنے کا نہیں سوچا تھا۔ مجھے بھی اس رشتے کی حرمت کا اتنا ہی خیال ہے جتنا آپ کو ہے..... اور یقین مانیے کہ ہمیشہ رہے گا..... آپ میرے لیے سدا ”آپ“ ہی رہیں گی۔ مجھے اس پوری کائنات میں سے صرف آپ کا ساتھ چاہیے..... صرف یہ اعتماد چاہیے کہ آپ صرف میری ہیں اور اب کوئی آپ کو مجھ سے چھین کر ڈور لیجانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں آپ کو کہیں بھی چلنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا..... حتیٰ کہ آپ کو آپ کا گھر چھوڑنے تک کا بھی نہیں کہوں گا۔ آپ ہمیشہ اتنی ہی آزاد، اتنی ہی خود مختار رہیں گی جتنی آپ آج ہیں۔ بولیں..... کیا صرف اتنا سا احساس بھی آپ مجھے نہیں دے سکتیں.....؟ کیا میرا آپ پر اتنا سا بھی حق نہیں ہے.....؟ میں جانتا ہوں آج نہیں تو کل غیاث پچا اور سیکینہ خالہ کے آنسو آپ کو اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی فیصلہ لینے پر مجبور کر ہی دیں گے کیونکہ آپ کی اس زندگی پر ان کا بھی آپ جتنا ہی حق ہے۔ اور ایک وقت آئے گا کہ آپ صرف ان کے حق کی خاطر ہی سہی، لیکن ہار مان ہی لیں گی۔ تو پھر میرے حق میں ہار جانے میں کیا حرج ہے.....؟ یقین کیجئے..... آپ ہار کر بھی سب جیت جائیں گی..... ہمارے درمیان کے رشتے کی حرمت سدا برقرار رہے گی..... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے.....“

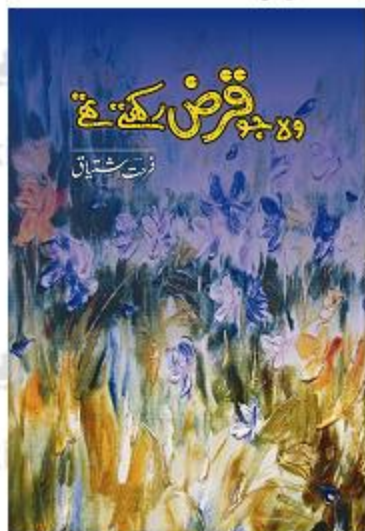
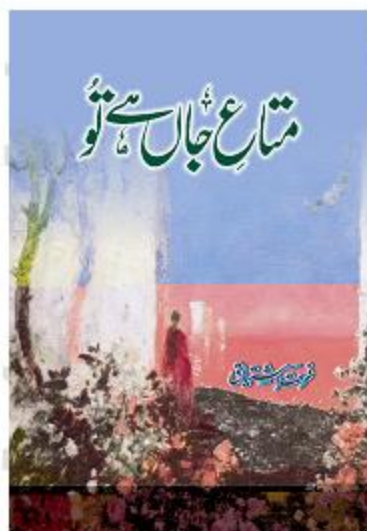
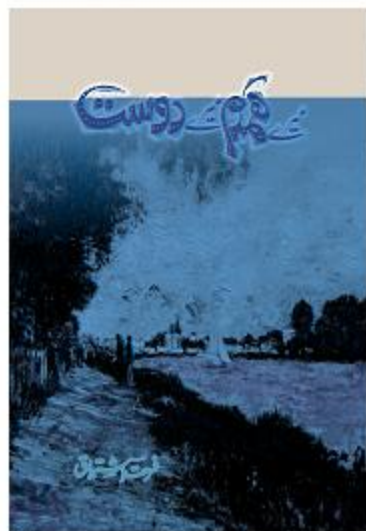
بولتے بولتے میں ہانپنے سا لگ گیا تھا۔ شاید میرے لفظ ختم ہو گئے تھے۔ لفظ بھی تو آپ کو سانس دینے کا کام کرتے ہیں..... لفظ بھی کبھی کبھی ہوا کی طرح آپ کی زندگی کے لیے اشد ضروری ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اچانک لفظ ختم ہو جائیں تو انسان کا دم اکھڑنے لگتا ہے..... جیسے اس وقت میرا دم اکھڑ رہا تھا، دھویوں ہی چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے بہتے آنسو ان کے گالوں سے ہو کر ان کے دامن کو بھگور رہے تھے۔ میں واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ اب بھی میرا آپ پر میرا کچھ حق باقی ہے..... اور اگر ابھی تک آپ کی اعتماد کی دیوار میں حتیٰ شکاف نہیں پڑا اور آپ کا مجھ پر بھروسہ باقی ہے..... تو مجھے آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا..... آپ کے آدمی کی آخری امید اب آپ ہی سے بندھی ہے..... اور یہ سدا بندھی رہے گی.....“

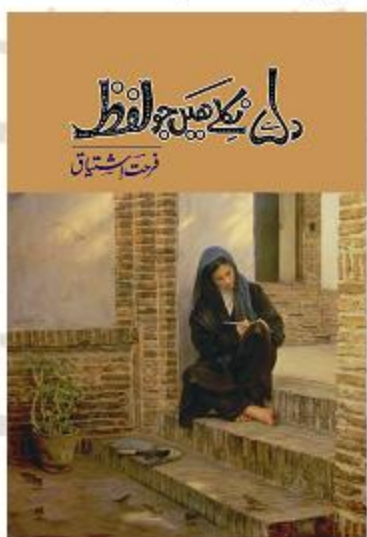
میں وہاں سے پلٹا اور اس اندھے تیر کی طرح وہاں سے چلا آیا جسے کمان سے چھوٹے وقت خود اپنی منزل کا پتہ نہیں ہوتا۔ میری منزل بھی

نہ جانے کہاں تھی۔ مجھے یہ بات کبھی بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری زندگی کے نوے فیصد سے بھی زیادہ اور بیشتر فیصلوں پر دوسروں کا اختیار کیوں ہوتا ہے؟ ہم اتنے بے بس کیوں ہوتے ہیں کہ اپنے حصے کی سانسیں بھی دوسروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں؟ میں بھی اُس روز اپنے حصے کی تمام سانسیں دھوکے پاس چھوڑ آیا تھا۔ صرف سانسوں کی ہی کیا بات تھی، میں تو اپنی تمام ساعتیں، تمام ساعتیں اور ساری مینائی بھی وہیں گروی رکھ آیا تھا اور اب مجھے صرف ان کے فیصلے کا انتظار تھا۔

اور پھر ٹھیک سات دن بعد دھوکا فیصلہ بھی آئی گیا۔ دھونے ریحان صاحب کے حق میں فیصلہ سنا دیا تھا۔ اگلے ماہ دھوکا ریحان صاحب کے ساتھ رخصتی تھی۔



علم و عرفان پبلشرز پیش کرتے ہیں..... محترمہ فرحت اشتیاق کے 8 خوبصورت ناول



کتاب گھر کی پیشکش آخری دستک

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

اس روز جب دفتر کے فون کی گھنٹی بجی تو میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اگلے چند لمحوں کے بعد میری زندگی سے ہر خوشی، ہر روشنی یوں پل بھر میں غائب ہو جائے گی کہ اس کے بعد صرف اور صرف اندھیرا ہی ہمیشہ کے لیے میرا مقدر ٹھہرے گا۔

میں نے فون اٹھایا، دوسری جانب غیاث چچا تھے جو ایک ہلکی سی ہیلو کے بعد بالکل ہی خاموش ہو گئے تھے۔ مجبوراً مجھے ہی پوچھنا پڑا۔

”آپ چپ کیوں ہیں..... سب خیریت تو ہے نا.....؟“

دوسری جانب سے ان کی لرزتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

”آدی..... وجہہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے..... وہ ریحان صاحب کے رشتے کے لیے مان گئی ہے..... مجھے..... مجھے بہت افسوس ہے بیٹا..... میں تمہیں تمہاری فون نہیں دلا سکا.....“

غیاث چچا اس کے بعد بھی نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے لیکن میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے..... میری تمام حیات نے یک دم ہی اور بالکل جواب دے دیا تھا۔ پتہ نہیں انہوں نے بات کس طرح ختم کی اور میں نے انہیں کیا جواب دے کر فون بند کیا، مجھے کچھ یاد نہیں۔

میں اُس وقت چونکا جب میرے اردلی نے آکر اندر کمرے کی روشنی جلائی۔ تب میری گھڑی پر نظر پڑی۔ اوہ..... تو گویا ہر شام ڈھل چکی تھی۔ غیاث چچا کا فون صبح گیارہ، سو گیارہ کے بیچ آیا تھا اور تب سے میں یہیں ساکت بیٹھا ہوا تھا۔

اس دن کے بعد مجھے ایک دم ہی یوں لگنے لگا تھا، جیسے میرے اندر سے جینے کی ہر خواہش ہی مٹ گئی ہو۔ میں جہاں بیٹھ جاتا، بس وہیں بیٹھا رہتا اور جہاں کوئی مجھے کھڑا کر جاتا، میں ساکت سا وہیں کھڑا رہتا۔ دفتر سے میں نے بہت سے دنوں کی چھٹی لے لی تھی لیکن گھر میں نکلنے کے بجائے میں صبح سویرے ہی نکل جاتا اور کسی بھی سنان سڑک کی راہ پکڑ کر پیدل چلتا رہتا، دھوپ اور سائے کا احساس بھی میرے لیے جیسے ختم ہو گیا تھا اور میرا کسی سے بھی کچھ بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنے دوستوں سے بھی کتنا شروع کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ میرے لیے اذیت میں ہوں گے مگر میں ان کے سامنے آکر ان کی اذیت مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

گھر میں آتے جاتے آس پاس سے ہی یہ خبر سننے کو ملی تھی کہ اگلے ماہ ڈو کی رخصتی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ عمارہ کی زبانی یہ بھی پتہ چلا کہ خود ڈو نے ریحان صاحب کے آگے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ ڈولی اٹھانا چاہتے ہیں تو پھر رخصتی میں تاخیر نہ کریں۔ ریحان صاحب یا ان کی امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو خود کل کی جگہ آج کے قائل تھے اس معاملے میں..... لہذا رخصتی کی تیاریاں دھوم دھام سے شروع ہو چکی تھیں اور سیکنہ

خالہ اپنی بیٹی کے نصیب ایک بار پھر سے جاگ جانے پر بے حد شاداں و فرحاں تھیں۔ اور وہ ہی کیا، پورا محلہ ہی اس رشتے سے بے حد خوش تھا۔ وہ سب اُس خاندان پر گزری تمام آفتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اب خدا خدا کر کے ان پر قسمت نے خوشی کا ایک دروازہ کھولا تھا تو سبھی کی یہ خواہش تھی کہ دُورِ خیر سے اپنے آنگن سے سُدھاریں اور خدا ان کے نصیب اچھے کرے۔ میں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا کہ میں صبح منہ اندھیرے گھر سے نکل جاتا تھا تا کہ راجہ یا بالے یا کسی بھی دوسرے دوست کا سامنا ہونے سے بچ سکوں۔ گھر میں امی وغیرہ کو میں نے ڈیوٹی کا کہہ رکھا تھا اس لیے انہیں مجھ پر کچھ زیادہ شک نہیں ہوا کیونکہ میری ڈیوٹی کے اوقات ہمیشہ سے کچھ ایسے ہی اوٹ پٹا لگتے تھے۔

عمارہ نے البتہ شاید میری آنکھوں میں کوئی تحریر پڑھ لی تھی لیکن وہ بھی مصلحتاً خاموش ہی رہی۔ اس روز میں منہ اندھیرے گھر سے باہر نکلا تو وہ سارے کے سارے بالے کی پرانی جیب میں گلی میں ہی میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے لاکھ دامن چھڑانے کی کی کوشش کی، ہزار بہانے کیے لیکن انہوں نے مجھے دبوچ ہی لیا اور سیدھے بالے کے گیراج لے آئے۔ میں چپ چاپ زمین پر پڑے گُشن پر بیٹھ گیا۔ ننھو اور ننھی چائے بنانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ راجہ میرے بالکل سامنے آکر زمین پر بیٹھ گیا اور میری ٹھوڑی اپنی انگلی سے ذرا سی اٹھا کر بہت دیر تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ راجہ کی آواز بھی بھرا سی گئی۔

”تو اپنے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے آدی..... کیوں اپنے آپ کو جلا کر بھسم کر رہا ہے..... ارے یا رانا نہیں تو کچھ ہمارا ہی خیال کر لے.....“ میں چپ رہا۔ دُور بیٹھے بالے نے کہا۔

”جانتا ہے دُور تیری وجہ سے کس قدر پریشان ہیں۔ پچھلے تین ہفتوں سے وہ ہم میں سے ہر کسی کو، ہر روز تیری خبر لینے بھیجتی ہیں..... لیکن تیرا تو کوئی اتہ پتہ ہی نہیں ملتا..... دفتر سے تو نے چھٹی لے رکھی ہے، گھر پر تو نکلتا نہیں..... ہم سے ملتا نہیں..... تو پھر بتا ہم کیا کریں..... تجھے ڈھونڈنے کہاں جائیں.....“

”ڈھونڈا اُن کو جاتا ہے جو کہیں کھو چکے ہوں..... میں تو یہیں ہوں..... تمہارے سامنے۔“ راجہ نے مجھے ڈانٹا۔

”نہیں..... یہ تم نہیں ہو..... یہ کوئی اور ہے..... یہ ہمارا آدی نہیں ہے۔“ وہم ہے تمہارا..... مجھے کچھ نہیں ہوا..... اور بھلا دُور کو میرے لیے پریشان ہونے کی یا میری تلاش میں تم لوگوں کو کہیں بھیجنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ سنا ہے ان کی رخصتی ہونے والی ہے..... ان کے پاس تو نمٹانے کے اور بہت سے کام ہوں گے.....؟ ان سے کہنا کہ میری فکر چھوڑ دیں..... اپنی آنے والی زندگی کی فکر کریں.....“ بالے نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

”آدی..... یہ تو بول رہا ہے..... اپنی دُور کے لیے..... کیا ہو گیا ہے تجھے..... اتنا زہر تو تیرے لہجے میں پہلے کبھی نہ تھا.....“ میں نے اُسی زہر خند لہجے میں اسے جواب دیا۔

”زہر نگلنے والوں سے امرت اُگلنے کی توقع کرنا ہی سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔“ راجہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔

”ایسا مت بول آدی..... یقین کر تو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ تم دونوں کا رشتہ ہم سب کی بلکہ اس پوری دنیا کی سوچ سے بھی اونچا ہے۔ تجھے میری قسم..... جو کی نیت پہ کبھی شک نہ کرنا۔“

میں ان سب کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ تو گویا اب یہ بھی انہی کی سکھائی ہوئی بولنے لگ گئے ہیں۔ اس میں ان بے چاروں کا قصور بھی کیا تھا.....؟ وہ تو تھیں ہی ایسی..... کہ جس سے ایک بار زندگی میں مل لیں تو پھر وہ ساری عمر انہی کے گن گاتا رہے اور انہی کی زبان بولتا رہے۔ راجہ نے جلدی سے اپنی جیب سے ایک بند لافانہ نکالا۔

”جھوٹے دیا ہے تیرے لیے اور ہمیں سختی سے تاکید کی ہے کہ تو اسے یہیں ہمارے سامنے پڑھے گا۔ ورنہ وہ تیری ضد سے اچھی طرح واقف ہیں کہ باہر جاتے ہی اسے پھاڑ دے گا۔“

راجہ نے لافانہ میرے حوالے کر دیا اور وہ اور بالے میرے دائیں بائیں یوں بیٹھ گئے، جیسے اگر میں واقعی و..... جو کا خط پھاڑنے لگوں تو دونوں مجھ سے خط ہی دوبارہ چھین لیں گے۔ مجھے ان کی اس بے اعتباری پہ پیار بھی بہت آیا اور غصہ بھی بہت، میں نے ان دونوں کو ڈانٹ کر اپنے سے دُور بیٹھنے کا کہا اور دھمکی دی کہ اگر وہ لوگ مجھ سے پوئنی چپکے رہے تو میں خط پڑھوں گا ہی۔ بڑی مشکل سے دونوں بچپن کی تمام قسمیں دے کر مجھ سے دُور ہوئے کہ میں خط نہیں پھاڑوں گا۔ اتنے میں نغوا اور مٹھی چائے بھی لے آئے تھے اور وہ سب چائے پیتے پیتے مجھے خط پڑھتے ہوئے یوں دیکھتے رہے جیسے ابھی کچھ دیر میں میں انہیں کسی لائٹری کا نتیجہ بتانے والا ہوں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے خط کھولا۔ وہی و..... جو کی دل میں اُتر جانے والی سبک اور رواں تحریر تھی۔

”ناراض ہو.....؟ اب کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گے؟ کبھی اپنی و..... جو کی صورت بھی نہیں دیکھو گے؟ شاید میں تمہاری جگہ ہوتی تو بالکل ایسا ہی سوچتی..... لیکن یقین کر و آدی..... اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا..... میں یہ فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ کرتی اور شاید کچھ عرصہ مزید ابا اور اماں کی یاس بھری صورتیں، دل پر پتھر رکھ کر برداشت کر ہی لیتی مگر تم نے مجھے یہ فیصلہ اس قدر جلد لینے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل میں ریحان صاحب کے لیے بے پناہ احترام اور عزت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، لیکن تم نے شاید ٹھیک ہی کہا تھا کہ جلد یا بدیر مجھے ابا اور اماں کی خوشی کے لیے سر جھکانا ہی پڑتا، تو پھر اُس شخص کے لیے ہی سہی جس کے لیے میرے دل میں احترام تو ہے..... اور جو مجھے کسی حوالے سے محترم تو سمجھتا ہے۔

مجھے تمہارے جذبے کی سچائی اور تمہارے خلوص پر شاید تم سے بھی زیادہ یقین ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا دوست اپنے وعدے نبھانا بھی خوب جانتا ہے۔ لیکن کچھ جذبے آگینوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں اور کسی نئے رشتے کا صرف نام ملنے پر بھی اپنی شناخت کھو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بھی ویسے ہی جذبے سے گندھا ہوا ہے آدی..... اسے کسی دوسرے رشتے کا نام دینے سے بھی یہ نازک سا رشتہ، جس تاثر و عکسوت سے بندھا ہوا ہے..... وہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے گا، چاہے دوسرا کوئی اُسے محسوس نہ بھی کر پائے..... لیکن خود ہمارے اندر اُس کے ریزے ساری عمر اک خلش کی کاٹ اور چٹھن پیدا کرتے رہیں گے۔ اور مجھے یہ رشتہ بہت عزیز ہے آدی..... شاید دنیا کے ہر رشتے سے بڑھ کر عزیز..... اس لیے میں اپنے ہاتھوں سے اپنے اس جذبے اور اپنے اس رشتے کا گلا نہیں گھونٹ سکتی ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا، لیکن ایک بات کا یقین اپنے دل سے کبھی مٹنے نہ دینا کہ تمہاری دُعا اپنے آس پاس بکھرے ان دنیاوی رشتوں میں بٹ کر اپنے

اس ازلی روحانی رشتے سے کبھی غافل نہیں ہوگی، چاہے تمہارا ساتھ رہے یا نہ رہے..... چاہے تم سامنے رہو، چاہے نظروں سے اوجھل، تمہاری جھو ہمیشہ تمہارے بچپن کے دمبر میں تمہارے ساتھ رہے گی۔

آدی..... دنیا میں کچھ رشتے ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جنہیں بات یا ملاقات کی مجبوری نہیں ہوتی۔ وہ انسان کی ہر بات اور اُس کی ہر ملاقات میں ہمیشہ شامل رہتے ہیں..... مانتے ہونا کہ لفظ اور تصویر ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ جہاں یہ سب کچھ ختم ہوتا ہے وہاں سے تھوڑا سا رشتہ شروع ہوتا ہے۔

تمہاری جھو نے صرف اُسی رشتے کو بچانے کے لیے ایک اجنبی شخص کا ساتھ ساری عمر کے لیے قبول کیا ہے، تو بولو..... اپنی جھو کا ہمیشہ کی طرح مان رکھو گے نا..... میری بات میں آؤ گے نا..... اور کان کھول کر سن لو..... اگر تم نہیں آئے تو میں سچ بچ بچوں راجہ، اُس ”ریلوے بابو“ کے ساتھ جانے سے انکار کر دوں گی۔ ”پکا“..... اور آدی جانتا ہے کہ جوب کسی بات پر پکا کہہ دے تو وہ بات پھر پتھر پر لکیر ہو جاتی ہے۔

اپنا بہت خیال رکھنا اور خاص طور پر اپنی اُس چھوٹی سی ناک کو سردی سے بچائے رکھنا۔

تمہاری جھو.....

خط ختم ہونے تک اپنے آس پاس کا مجھے کچھ احساس نہیں رہا تھا۔ میں نے نظریں اٹھائیں تو راجہ، بالا، ننھو اور منشی چاروں مجھے اپنے سامنے ایک قطار میں یوں بیٹھے دکھائی دیئے کہ چاروں کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو رواں تھے، میں نے حیرت سے اُن سے پوچھا کہ وہ رو کیوں رہے ہیں؟ راجہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے روتا دیکھ کر ان کے آنسو بھی نہیں رُک پائے۔ لیکن میں کب رو رہا تھا؟ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے ہیگا ہوا محسوس ہوا..... اوہ..... میں نے جلدی سے جھو کا خط دوبارہ کھول کر دیکھا تو پورے خط پر ہی نمکین پانی کے دھبے یوں پھیل چکے تھے کہ خط کی روشنائی اور حرف دھندلے پڑ گئے تھے۔ جانے میں کب سے اور کس سطر سے اپنی آنکھیں بھگور رہا تھا۔ میں نے اُسی وقت بالے کے کان پر اٹکا ہوا قلم نکالا اور وہیں گیراج کے رجسٹر میں سے ایک صفحہ پھاڑ کر جلدی میں اس کے اوپر چند سطریں گھسیٹ ڈالیں۔

”شاید آپ کا نظریہ ہی صحیح ہو..... یا شاید میرے اندر ہی اتنی روشنی نہ ہو کہ میں نئے رشتوں کے اندھیرے روشن کر سکوں۔ بہر حال مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، نہ ہی کبھی ہوگی..... آپ رخصت ہو جائیں اُس ریلوے بابو کے ساتھ اور ہمیشہ خوش رہیں، لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ ہے نہ ظرف..... کہ آپ کو ان کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے دیکھ سکوں۔ لہذا اس معاملے میں میری معذرت قبول کر لیں۔ کہیں میری کوئی حرکت آپ کے اس نئے رشتے میں کوئی دراڑ نہ ڈال دے.....

اور ہاں..... ہمیشہ کی طرح آج بھی میرا یہی دعویٰ ہے کہ آپ کی ناک زیادہ چھوٹی ہے اور سردی بھی آپ ہی کو ہمیشہ زیادہ لگتی ہے لہذا آپ بھی اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آدی.....

صفحہ پھاڑ کر میں نے راجہ کے حوالے کیا کہ اسے آج ہی جھو کو دے آئے۔ تیسرے دن میری چھٹیاں ختم ہو گئیں اور میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بے انتہا مصروفیت میرے درد کا کچھ درماں کر دے گی لیکن یہ بھی میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔ ہمارے اندر کے کچھ

درد، ہر قسم کی مصروفیت، خوشی یا صدمے سے ماورا ہوتے ہیں اور ان پر ہماری اندرونی یا بیرونی کسی بھی قسم کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر مجھے تو اب سدا اسی درد کے ساتھ جینا تھا، تو پھر اس سے فرار کیسا؟

چھٹی ختم ہونے کے بعد دفتر میں میرا وہ دوسرا ہی دن تھا، جب چڑا سی نے آکر بتایا کہ کوئی ملاقاتی ملنا چاہتا ہے، میں کسی فائل کی ورق گردانی میں مصروف تھا اس لیے ملاقاتی کے کارڈ پر نظر ڈالے بغیر ہی میں نے سر ہلا دیا۔ کچھ ہی دیر میں دروازے پر کسی کے کھنکھانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر انہیں دیکھ کر ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے میں ریحان صاحب کھڑے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں اندر آنے کا کہا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کارڈ کا لفاظہ بھی تھا۔ شاید ان کی شادی کا ہی کارڈ ہوگا۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ حال احوال کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں کیونکہ ریحان صاحب بھی ایک دم ہی خاموش سے ہو گئے تھے۔ پھر میں نے ہی سکوت توڑا اور ان سے پوچھا کہ میں ان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے چونک کر اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا جیسے کسی گہری سوچ سے واپس پلٹے ہوں۔

”معافی چاہتا ہوں..... کبھی کبھی کچھ سوچیں اس بُری طرح سر پر سوار ہو جاتی ہیں کہ جا بے جا آپ کو بھنکا دیتی ہیں۔“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا، سب کچھ تو حاصل کر لیا ہے انہوں نے، پھر ایک جہان پا کر بھی ابھی تک یہ کس سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ریحان صاحب نے میرے چہرے کے سوالیہ نشان کو محسوس کر لیا اور ہاتھ میں پکڑا کارڈ میز پر رکھ کر بولے۔

”یہ میری اور وجہ یہی شادی کا کارڈ ہے۔ بس یہی تمہیں دینے آیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک درخواست بھی کرنی تھی۔“

کارڈ دیکھ کر میرا دل کچھ یوں ڈوبا کہ میں اُن سے کچھ کہنا ہی بھول گیا۔

مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ سامنے میز پر پڑا کارڈ اٹھا کر پڑھ ہی لوں۔ مبارکباد کے رسمی جملے بولنا تو بہت دور کی بات تھی۔ آخر کچھ دیر بعد ریحان صاحب نے خود ہی سلسلہ تکلم جوڑا۔

”یہ ایک ایسا عجیب شادی کا کارڈ ہے، جس پر ہونے والی شادی کی تاریخ ابھی تک درج نہیں کی گئی..... اس لیے تاریخ کی جگہ ابھی خالی ہے.....“

مجھے جھکا سا لگا۔

”جی..... میں کچھ سمجھا نہیں.....؟“

ریحان صاحب نے غور سے میری جانب دیکھا۔

”وجہ یہ نے پوری دنیا میں سے یہ اختیار صرف تمہیں دیا ہے عباد..... تم جو تاریخ اس کارڈ میں بھرو گے..... اُسی تاریخ کو ہماری شادی ہو گی..... اور اگر تم چاہو تو یہ جگہ ہمیشہ خالی بھی رہ سکتی ہے..... تمہارے تاریخ نہ بھرنے کی صورت میں یہ شادی کبھی نہیں ہوگی..... تم چاہو تو اس کارڈ میں لکھے نام کو کاٹ کر کوئی اور نام بھی لکھ سکتے ہو۔“

مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا سارا کمرہ ہی گھوم رہا ہو، ریحان صاحب یہ کیا کہہ رہے تھے، ڈوا خرمیرا اتنا بڑا امتحان کیوں لینا چاہتی تھیں.....؟

یہ کیسی آزمائش تھی.....؟

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں..... میں بھلا کیسے.....؟ میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں کے رشتے کی تاریخ مقرر کرنے کا بھلا مجھے کیا حق ہے.....؟“

ریحان صاحب دھیرے سے مسکرائے۔
”حق دینے والے نے دے دیا ہے، کیونکہ میں نے اس سلسلے میں ہر اختیار وجہہ کو دے رکھا تھا کہ وہ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے منظور ہوگا۔ ہاں یا نہ..... کچھ بھی..... لیکن انہوں نے اپنی ہاں کو تمہاری ہی ہاں سے مشروط کر دیا ہے۔ ایسا اختیار تو بہت قسمت والوں کو ملتا ہے عباد یہ حق اور یہ اختیار تو وجہہ نے کبھی مجھے بھی نہیں دیا.....“

”لیکن میں خود کو اس اختیار کے قابل نہیں سمجھتا..... آپ جا کر قوسے کہہ دیں کہ.....“
لیکن میری بات درمیان میں ہی کاٹ دی گئی۔

”صرف تم ہی اس پوری دنیا میں اس اختیار کے حق دار ہو عباد.....“
”وجہہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، تمہارے اور اُس کے رشتے کے بارے میں تمہارے پروپوزل کے بارے میں اور تم دونوں کے بچپن سے جوے اُس ماورائی تعلق کے بارے میں، جسے محسوس کرنے کے لیے اگلے انسان کے پاس بھی ویسا ہی دل ہونا چاہیے جیسا تم دونوں کے سینوں میں دھڑک رہا ہے، میں نے کبھی اس قدر اعلیٰ ظرف اور صاحب دل ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا، نہ ہی مجھے ایسے کسی احساس کی پرکھ کا فخر حاصل ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جس رشتے کے لیے وجہہ جیسی لڑکی اپنا ہر اختیار، ہر حق تیاگ دے، وہ ضرور سب سے خاص ہی ہوگا۔ ورنہ اس دنیا میں تمہاری جیسی دوسری کون ہوگی جو چند دن بعد اپنے ہونے والے شوہر کو بلا کر خود اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ پہلے اُس شخص سے جا کر نام اور تاریخ ڈالوائے جس کا میرے ہر ہونے والے رشتے پر سب سے زیادہ حق ہے..... وہ شخص تو ضرور دنیا میں سب سے الگ، سب سے خاص ہی ہو گا..... اور مجھے خوشی ہے کہ میں چاہے کسی طور ہی سہی..... پر دنیا کے اس سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ مضبوط رشتے کا گواہ تو بناتا..... اب چاہے وجہہ سے میرا رشتہ ہو یا نہ ہو..... تم اس کارڈ پر کوئی تاریخ ڈالو یا اسے پھاڑ کر اپنی رڈی کی نوکری میں پھینک دو..... لیکن مجھ سے تم دونوں کے اس احساس کے گواہ ہونے کا فخر اب کوئی نہیں چھین سکتا، اور میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ سدا کے لیے رہیں گی.....“

ریحان صاحب اپنی بات ختم کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں اپنی گری پر یونہی ساکت بیٹھا رہ گیا۔ ریحان صاحب دروازے کے پاس جا کر کچھ پل کے لیے رُکے۔

”تم ایک خاص لڑکے ہو عباد..... بہت خاص..... اور مجھے خوشی ہوگی اگر ہم مستقبل میں بھی دوست رہیں..... کسی بھی رشتے کسی بھی حوالے سے۔“

ریحان صاحب دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے اپنا گھومتا ہوا سر میز پر ٹکا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میری قسمت شاید آخری بار خود چل کر میرے در پر آخری دستک دینے کے لیے آئی تھی۔

کتاب گھر کی پیشکش

آخری الوداع

<http://kitaabghar.com>

<http://kitaabghar.com>

شام ڈھلتے ہی غیاث چچا کا گھر رنگین برقی قمقموں سے جھلملانے لگا تھا۔ محلے کی چھوٹی بچیوں نے اپنی دھوا آبی کی شادی کے لیے گھروں میں جوگی کے ننھے منے سے سینکڑوں چراغ بنائے تھے۔ وہ انہیں گھر کی دیواروں اور چھت کی منڈ پر پر سجا سجا کر قطاروں میں رکھ رہی تھیں، شہنائی والا سرشام ہی آگیا تھا اور غفور چچا باہر شامیانے میں ہی کرسی ڈالے جانے کب سے اپنی اور غیاث چچا کی پسند کے فرمائشی گیت بجوا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں بینڈ والوں کی ٹولی بھی سرخ وردیاں زیب تن کئے اور سر پر بڑی بڑی سنہری پگڑیاں سجائے آن پہنچی۔ یہ شہر کا خاص بینڈ تھا، جسے غفور چچا کی خصوصی ہدایت پر وہاں بلایا گیا تھا۔ صدیقی صاحب ہانپتے کانپتے آتش بازی کے سامان کے ٹوکے اتر وارہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ محلے کے بچوں کو بھی دُور بھگاتے جاتے، جو صدیقی صاحب سے نظر بچا کر ایک آدھ انا یا پٹاخہ لے کر فو چکر ہو ہی جاتے۔ کچھ ہی فاصلے پر شکور چچا تو رے، زرڈے اور پلاؤ کی دیگوں کی رکھوالی اور حساب پر بیٹھے، باورچیوں کو آگ تیز یا دھیمی کرنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ اتنے میں کرموتا ننگے پر دو دھ اور روح افزا کے سیکنجیں اور شربت کی بوتلوں کے ٹھنڈے کرپٹ لے کر آن پہنچا اور لگا ”ہو ہو“ کرنے..... شکورن بوا اندر اُستانی خالہ کے ساتھ مل کر مہندی کے تھال بجوا رہی تھیں اور ان کی آواز باہر بڑے میدان تک آرہی تھی۔

”ارے یہ لال اور ہری مٹی پھر کم پڑ گئی..... اور یہ سنہری اور چاندی کی چم چم کے ڈبے کہاں رکھ دیئے ہیں..... اب مہندی سوکھ گئی تو پھر مجھ سے نہ کہنا ہاں..... اور یہ گوڑ ماری مہندی لایا کون تھا.....؟ آدھی مٹی آدھی مہندی.....“

گردھاری مل کو یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ وہ چھوہاروں اور میوے کے ٹوکروں کو بچوں کی نظر سے کہاں بچا کر رکھے تاکہ نکاح سے پہلے کوئی بچہ ان میں ”نقب“ نہ لگا سکے۔ وہاں ماشکی قطار میں رکھے تقریباً تمام حمام بھر چکا تھا اور اب اسے صرف پیٹرو میکس کے ڈیوڑوں کا انتظار تھا تاکہ وہ گرم پانی والے حماموں کے نیچے آگ روشن کر سکے۔ غرض ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا، سبھی کو اپنی پڑی ہوئی تھی، کسی کی سینڈل گم تھی تو کسی کی شیروانی کے بٹن نہیں مل رہے تھے۔ کوئی دُہن کے جوڑے کے دوپٹے کی تلاش میں تھا تو کسی کو دیگ میں ڈالی جانے والی اشرفیوں کی تھیلی نہیں مل رہی تھی۔ کوئی کیمرے میں فلم ڈالنا بھول گیا تھا تو کسی کے پاس کیمرے کی فلم تو تھی پر کیمرہ نداد۔ بارات پر پھولوں کی پتیوں نچھاور کرنے والیاں پتیوں کی کسی کی شکایت کر رہی تھیں اور غیاث چچا ایک جانب کھڑے رجبہ اور بالے کو ہدایات دے رہے تھے کہ بارات آتے ہی انہیں مردانے اور زنانے کے راستے کس طرح جُدا کر دینے ہیں۔ غرض سبھی کسی نہ کسی تیاری میں تھے لیکن جن گھرانوں میں باراتیں اُتری ہوں گی، وہ ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ تیاریاں کبھی مکمل نہیں ہو پاتیں اور بارات آ جاتی ہے۔ اُس روز بھی یہی ہوا، بارات آگئی اور سبھی اپنی آدھی اور ادھوری تیاریوں سمیت ہی بارات

کے استقبال کو دوڑ پڑے، راجہ، بالا، مٹی اور نخبو باراتیوں کا استقبال کر رہے تھے، گدو اور پودو دودھ اور شربت سے ان کی خاطر تواضع کر رہے تھے، اور کیوں نہ کرتے..... آج ان کی زندگی کا سب سے خاص دن جو تھا۔ کچھ دیر بعد ہی شور مچا کہ قاضی صاحب آگئے اور گردھاری مل نے اطمینان کی لمبی سانس بھری کہ اس کی جان چھو ہاروں اور میوے کی حفاظت سے چھوٹی۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے مبارک سلامت کا شور اٹھا۔ اور نکاح ہونے کی خوشی میں باراتیوں پر چھو ہارے اور بتائے پہلے نچھاور کئے گئے اور پھر محفل کی خوبصورت تھیلیوں میں بانٹے گئے۔ میرے ابا غیاث چچا کے ساتھ کھڑے ان کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے، غیاث چچا مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ سیکنہ خالہ نے میری امی کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر مردانے میں پیغام دینے چلی گئیں، کچھ ہی دیر میں مجھے غیاث چچا نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور زنانے میں لے آئے۔ عورتوں نے مجھے دیکھ کر ایک دوسرے سے مسکرا کر سرگوشیاں کیں اور جھو کے آس پاس بیٹھی سہیلیوں نے کھلکھلا کر میرے لیے جھو کے ساتھ والی جگہ خالی کر دی۔ اور ہر کوئی بھانت بھانت کی بولی بولنے لگی اور مجھے چھیڑنے لگی۔ جھو جانتی تھیں کہ ایسے موقعوں پر مجھے بہت گھبراہٹ شروع ہو جاتی ہے، اس لیے انہوں نے گھونگھٹ کے نیچے ہی سے سہیلیوں کو گھور کر آنکھیں دکھائیں اور انہیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جھو گلابی کا مدانی شرارے میں دلہن بنی بیٹھی تھیں اور آج اگر آسمان سے فرشتے بھی اتر آتے تو ان کی نظر بھی و جو کے روپ پر نہ ٹھہر پاتی، میں تو پھر بھی ایک انسان تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اتنی بھڑکے درمیان بھی میری جھو پر چپکے سے نظر پڑی جاتی اور گھونگھٹ تلے سے جب کبھی ان کی نظر پلٹ کر میری طرف آ جاتی تو میں جلدی سے نظریں پڑا لیتا تھا۔

پھر اچانک ہی شور اٹھا کہ ”ڈولہا کو لے آئے.....“ ڈولہا میاں آگئے۔ ”وہ دیکھو ڈولہا آگیا“ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ریحان صاحب کو اُن کی امی اور خاندان کی دیگر عورتیں دوپٹے کے سائے میں نکاح کے بعد جھو کے ساتھ دھانے کے لیے لے کر آ رہی تھیں۔ جھو نے نظریں نیچی رکھ کر ہی مجھے بیٹھنے رہنے کا اشارہ کیا لیکن میں جھو کے بائیں سے ہٹ گیا اور ریحان صاحب کو جھو کے دائیں بٹھا دیا گیا۔ ہر جانب ایک شور سے مچا ہوا تھا۔ رسمیں پوری کی جا رہی تھیں۔ جوتا چھپائی، منہ دکھائی، دودھ پلائی اور جانے کیا کیا۔

میں بھڑکے سے نکل کر باہر آ گیا اور کسی ایسے گوشے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، جہاں مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اُس دن ریحان صاحب میرے دفتر میں مجھے جس آزمائش میں ڈال گئے تھے اور جھو نے مجھے جو حق دیا تھا اُس کے تقاضے میں نے اُسی شام پورے کر کے کارڈ شام ہی کو غیاث چچا کے ہاں بھجوا دیا تھا۔ میں نے کارڈ پر تاریخ بھی وہی ڈالی تھی، جو مجھے پہلے ہی اپنے گھر والوں اور راجہ سے جھو کی رخصتی کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی۔ میں شاید دنیا کی تاریخ میں سزائے موت کا وہ پہلا قیدی تھا، جس نے اپنی سولی کی تاریخ خود مقرر کی تھی۔

کچھ ہی دیر میں شامیانوں اور قناتوں میں مہمانوں کے لیے کھانا بھی لگا دیا گیا اور کھانے کے بعد رخصتی کا وقت بھی سر پر آن پہنچا۔ سیکنہ خالہ جواب تک جانے کس طرح خود پر قابو پائے ہوئے تھیں، جھو کے سر پر قرآن رکھ کر انہیں نیچے سے گزارتے وقت یوں ہلک ہلک کر روئیں کہ انہیں چپ کراتے کراتے محلے کی ہر آنکھ اشک بار ہو گئی، سبھی رورہے تھے۔ ان سب کی وجہ یہ ایک بار پھر انہیں چھوڑ کر جا رہی تھی۔ غفور چچا کی آنکھیں یوں بھیگیں کہ ان میں تو جھو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ہٹانے کی سکت بھی نہیں رہی۔ غیاث چچا دوسری جانب سے جھو کو تھامے یوں چل رہے تھے کہ جیسے ابھی خود بھی ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں گے۔ امی نے دُور سے مجھے اشارہ کیا کہ میں آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سنبھالوں، پر مجھے کون

سنجھتا؟ میں دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا سارا وجود پتھر کا ہو چکا ہو۔ ابا نے آگے بڑھ کر غیاث چچا کو سہارا دیا اور میرے دونوں ہاتھ دونوں جانب سے راجہ اور بالے نے زور سے تھام لیے۔ شاید انہوں نے دُور سے ہی میرے لرزتے اور کانپتے وجود کو محسوس کر لیا تھا۔ محلے کی عورتیں ایک ایک کر کے آگے بڑھیں اور ڈھکی بلائیں اپنے سر لے کر پیچھے ہٹ جاتیں، لیکن شکورن بوا آگے بڑھیں تو پھر بہت دیر تک ہٹ نہ پائیں۔ انہوں نے ڈھکے ہاتھ تھام کر ان کی پٹھت اپنی آنکھوں سے لگائی تو پھر دیر تک ہڑک ہڑک کر روتی رہیں۔ ڈھکے پہلے ہی سے ہکان ہوئی جا رہی تھیں۔ یا خدا..... یہ ایک لڑکی اتنے سینکڑوں لوگوں سے اندر ہی اندر کیسے رشتے بنا گئی تھی؟ یہ کیسا الوداع تھا، جوان جانوں کو بھی اپنوں کے ساتھ مل کر رُلا رہا تھا؟..... عمارہ نے دو چار بار اُچک اُچک کر مجھے بھیڑ میں سے اشارے کیے کہ میں بھی آگے بڑھ کر ڈھکے سے رخصت ہوں، لیکن میرے تو پاؤں ہی پتھر کے ہو چکے تھے۔ میں اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ دُور ریحان صاحب کی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھیں اور ان کے لیے دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ ریحان صاحب کو آگے بٹھا دیا گیا تھا اور ڈھکے کو ریحان صاحب کی امی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ میں پتھر بنا وہیں دُور کھڑا انہیں رخصت ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ الوداع تھا جو میری زندگی پر سب سے بھاری تھا۔ میں نہیں جانتا کہ روح کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہوگی لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری روح کے دھاگے ادھر رہے ہوں، اس کا ریشہ ریشہ الگ ہو رہا ہو، کاش یہ میری زندگی کا آخری الوداع ہو..... کاش اس آخری الوداع کے ساتھ ہی میں بھی مٹ جاؤں کیونکہ اب مجھ میں مزید کوئی اور الوداع جھیلنے کی اک ذرا سی سکت بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس آخری الوداع نے مجھے ریت کا بنا کر رکھ دیا تھا۔..... خشک ریت کا..... جسے ہلکی سی ہوا کا جھونکا بھی ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رُک سی گئی تھیں۔ اُن کی پٹو تلے تھکی نظریں نہ جانے کسے تلاش کر رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی مطلوبہ ہستی کو قریب نہ پا کر گھونٹ کے نیچے سے ہی نظریں اٹھائیں۔ میری نظر تو انہی پر جمی ہوئی تھی۔ ہماری نظریں ٹکرائیں اور میں پل بھر میں جل کر خاستہ ہو گیا۔ اُن کی بیگی آنکھ سے ایک آنسو پکا اور تیر کی طرح میرے دل کی زمین میں پیوست ہو گیا۔ میرے دل سے اپنی عمر بھر کی دعاؤں کے بدلے صرف ایک ہی دُعا نکلی کہ ”یارب..... اس پھولوں جیسی لڑکی کی یہ قربانی رازِ گاہاں نہ جانے دینا..... اب اس کے ہر ڈھکے کا خاتمہ کر دے.....“ میں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا..... وہ ویسے ہی اپنی جگہ جمی ہوئی کھڑی رہیں اور میری جانب دیکھتی رہیں۔ سب مجھے دُور سے اشارہ کر کے اور آوازیں دے کر ڈھکے قریب آنے کا کہہ رہے تھے، راجہ نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”آدی وہ تیری وجہ سے رُکی ہوئی ہیں۔“

ڈھکی نظر اب بھی مجھی پہ لڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی اُننگی سے اپنی ناک دبائی، جیسے بچپن میں وہ دباتی تھیں، اور اپنی آنکھیں زور سے میچ کر کھول دیں۔ آنسوؤں کا ایک ریلہ ڈھکی آنکھوں سے تمام بند توڑ کر نکلا اور اس کے بعد وہ مزید نہ رُک پائیں۔ عورتوں نے گھیر گھا کر انہیں گاڑی میں بٹھا دیا۔ سارے محلے کے ہاتھ لہراتے رہ گئے اور گاڑی دھیرے دھیرے چل پڑی۔ غیاث چچا سمیت چند محلے دار بھی بے اختیاری میں گاڑی کے ساتھ ہی چل پڑے۔ گاڑی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی محلے کے پھانک تک پہنچ گئی۔ لوگ پیچھے رہ چکے تھے، میری بہتی آنکھیں اب بھی گاڑی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ گاڑی نے محلے سے باہر جانے والی سڑک پر اترنے کے لیے ایک لمبا سا موڑ کاٹا۔ پچھلے دروازے کی کھڑکی سے اندر بیٹھی ڈھکی اک

آخری جھلک دکھائی دی۔ مجھے اتنی دُور سے بھی یوں محسوس ہوا کہ ان کی نظریں اب بھی میری ہی جانب اٹھی ہوئی ہوں، انہوں نے دھیرے سے ہاتھ ہلا کر اپنے محلے، اپنے میکے اور مجھے الوداع کہا اور گاڑی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہوتی چلی گئی۔

رخصت ہوا تو ہاتھ ملا کر نہیں گیا

وہ کیوں گیا ہے یہ بھی بتا کر نہیں گیا

یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی لوٹ آئے گا

جاتے ہوئے چراغ بجھا کر نہیں گیا

شاید وہ مل ہی جائے..... مگر جستجو ہے شرط

وہ اپنے نقش پا کو مٹا کر نہیں گیا

ہر بار مجھ کو چھوڑ گیا اضطراب میں

لوٹے گا کب؟ کبھی وہ بتا کر نہیں گیا

رہنے دیا نہ اُس نے کسی کام کا مجھے

اور خاک میں بھی مجھ کو ملا کر نہیں گیا

ہاشم ندیم

1947ء کے مظالم کی کہانی

خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب و جگر کو تڑپا دینے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر نم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریروں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پیر کیا۔

تو پھر یہی صدا بلند ہوتی ہے کہ..... کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ یوم آزادی پاکستان کے موقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش..... نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔

اس کتاب کو کتاب گھر کے تارنخ پاکستان سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کی دیگر کتب

34- اُردو بازار لاہور (فون) 042-7352332-7232336

کتب کی خریداری کے وقت کتاب گھر کا حوالہ دیجئے اور خصوصی ڈسکاؤنٹ حاصل کیجئے۔

اسلامی کتب

2200/-	علامہ عماد الدین ابن کثیر	تفسیر ابن کثیر (اعلیٰ)	1
1800/-	علامہ عماد الدین ابن کثیر	تفسیر ابن کثیر	2
600/-	محمد شریف بقاء	قرآنی موضوعات	3
600/-	محمد شریف بقاء	Quranic Topics (Vol:1)	4
600/-	محمد شریف بقاء	Quranic Topics (Vol:2)	5
70/-	محمد شریف بقاء	قرآن کی 20 سورتیں	6
70/-	محمد شریف بقاء	قرآن کی 2 عظیم سورتیں	7
300/-	مولانا الیاس قادری	قرآن اور ہماری زندگی	8
250/-	مورس بوکائے/ مترجم: مسعود مفتی	قرآن، بائبل اور سائنس	9
160/-	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل	10
150/-	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	منہاج القرآن	11
80/-	ڈاکٹر افتخار احمد فاروقی	نباتات قرآن	12
100/-	مترجم: مولانا فتح محمد جالندھری	ہدایات قرآنی	13
300/-	پروفیسر محمد جاوید	کعبہ پر پڑی جو پہلی نظر	14
150/-	مترجم: پروفیسر محمد جاوید اقبال	قرآن حکیم اردو منظومات کے آئینے میں	15
60/-	خولیا نیس اقبال	دینا (قرآن میں مذکور انبیاء کرام کی دعائیں)	16
120/-	محمد شریف بقاء	قرآنی دعاؤں کا انسائیکلو پیڈیا	17
120/-	محمد شریف بقاء	قرآنی معجزات کا انسائیکلو پیڈیا	18
400/-	مسعود مفتی، منصور احمد بٹ	سیرت النبیؐ اعلان نبوت سے پہلے	19
1660/-	ترجمہ و تشریح: مولانا ظہور الباری اعظمی	بخاری شریف	20
500/-	مترجم: ابو یحییٰ امام خان نوشہروی	حیات محمد ﷺ محمد حسین بیگل	21
850/-	شبلی نعمانی	سیرت النبیؐ	22

23	معجزات محمد کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	مسعود مفتی	600/-
24	انوار اسماء الحسنی	قیصرہ حیات	500/-
25	سیرت ہادی برحق	گوہر ملیانی	400/-
26	حضرت محمد ﷺ بطور ماہر معاشیات	حکیم ایم۔ اے قاسم	300/-
27	طیب اعظم ﷺ	حکیم ایم۔ اے قاسم	300/-
28	سیرت سید البشر ﷺ	چوہدری غلام رسول چیمہ	500/-
29	مذہب عالم کا تقابلی مطالعہ	چوہدری غلام رسول چیمہ	550/-
30	اسلام کا عمرانی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
31	اسلام کا سیاسی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
32	اسلامی کا معاشی نظام	چوہدری غلام رسول چیمہ	300/-
33	اسلامی ریاست کے خدو خال	انور صدیقی	150/-
34	عشق مصطفیٰ ﷺ	کرٹل سید سلیمان سرور گیلانی	100/-
35	آخرت کا خزانہ	کرٹل سید سلیمان سرور گیلانی	150/-
36	طب نبویؐ اور اکیسویں صدی (جلد اول)	سیف اللہ سیکو	250/-
37	طب نبویؐ اور اکیسویں صدی (جلد دوم)	سیف اللہ سیکو	250/-
38	احادیث میں مذکورہ نباتات، ادویہ اور غذائیں	ڈاکٹر اقتدار احمد فاروقی	100/-
39	منتخب احادیث	مولانا محمد یوسف کاندھلوی	300/-
40	شمال ترمذی	حضرت مولانا زکریا صاحب	250/-
41	درود لامحدود (حضور ﷺ کی شان میں پیش کئے گئے درود و سلام کا انسائیکلو پیڈیا)	خواجه محمد انیس بھیروی	300/-
42	لاشریک (حمدیہ کلام)	مظفر وارثی	130/-
43	صاحب التاج (نیانعتیہ مجموعہ)	مظفر وارثی	150/-
44	سیدنا ﷺ (نیانعتیہ مجموعہ)	سلیم گیلانی	130/-
45	بیٹھا بیٹھا ہے میرے محمد ﷺ کا نام (نعتیہ انتخاب)	عمران چوہدری	150/-
46	صل علی کہتے کہتے	عبدالرزاق	100/-
47	تاجدار حرم ﷺ (نعتیہ مجموعہ)	فرحت عباس شاہ	120/-
48	میرے آقا آئے جموں	فرحان قادری	150/-
49	بزرگند کے سائے تلے	اولیس رضا قادری	150/-
50	بزرگند کے سائے تلے (پہرہ یک)	اولیس رضا قادری	100/-
51	تخلیق کائنات	محمد اسلم لودھی	200/-

52	کارگل سے واپسی کیوں	محمد اسلم لودھی	120/-
53	رؤف پیغمبر صدیق اکبرؐ	ساجد الرحمن اکمل	100/-
54	حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ	محمد حسین ہیکل	250/-
55	حضرت عمر فاروق اعظمؓ	محمد حسین ہیکل	330/-
56	فقد عمرؓ	مترجم: ابوبیگی امام خان نوشہروی	300/-
57	حضرت عمرؓ کے سیاسی نظریے	ابوبیگی امام خان نوشہروی	150/-
58	زندگی کے نمونے	ابوبیگی امام خان نوشہروی	75/-
59	مکالمات نبوی ﷺ	ابوبیگی امام خان نوشہروی	70/-
60	الفاروق (حضرت عمر فاروقؓ کی سوانح حیات)	علامہ شبلی نعمانی	200/-
61	تفہیم اسلام	سلیم گیلانی	150/-
62	حضرت بلال رضی اللہ عنہ	سلیم گیلانی	300/-
63	سیرت عائشہؓ	سید سیدمان ندوی	200/-
64	خطبات ذاکر نائیک		300/-
65	غازی علم الدین شہید	خولہ متین	150/-
66	عشرہ مبشرہ	عبدالرشید عراقی	400/-
67	زیر دستوں کی آقاؐ	مولانا عبدالرحمن	100/-
68	صلاح الدین ایوبی	ہیر الدلیم	350/-
69	سکندر اعظم	مقصود شیخ	250/-
70	چنگیز خان	مقصود شیخ	180/-
71	ہٹلر	مقصود شیخ	250/-
72	دہشت زدہ گرد (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
73	نیل (ناول)	علی نواز شاہ	120/-
74	کالک (ناول)	(علی نواز شاہ)	150/-
75	مجاہد اسلام شیخ سلطان	شیم علی خان	120/-
76	احمد شاہ ابدالی	قیصر علی آغا	80/-
77	محسن پاکستان ناکردہ گناہوں کا قیدی	فضل حسین اعوان	250/-
78	محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان	عمران چوہدری	300/-
79	ڈاکٹر عبدالقدیر خان نیٹ ورک کا عروج و زوال	گورڈن کوریہ مترجم: قاضی اختر جونگڑھی	150/-
80	عزم کے کوہ گراں	فضل حسین اعوان	250/-
81	نپولین بونا پارٹ	روبینہ ناز	150/-

300/-	امیر علی خان	اکبر بادشاہ اور بیربل کی داستانیں	82
300	امیر علی خان	اکبر بادشاہ کے 9 رتن	83
200/-	مسعود مفتی	اکبر نامہ	84
200/-	ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ	پنجاب کے آثار قدیمہ	85
2500/-	ڈاکٹر محمد اقبال بھٹہ	لاہور اور خطاطی (5 کٹر آرٹ پیپر)	86
300/-	سید انصاری علی کرمانی	جموئے نبیوں کا انجام	87
150/-	عمران چوہدری	20 صدی کی 100 مسلم شخصیات	88
250/-	ابوعلی عبدالوکیل	اسلام، سائنس اور مسلمان	89
100/-	ابو عبدالوکیل	داستان سرائے کا مسافر (اشفاق احمد)	90
250/-	حمیر ہاشمی/اسلم انصاری	100 عہد ساز شخصیات	91
60/-	ڈاکٹر برہان احمد فاروقی	حضرت محمد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ توحید	92
120/-	اختر حمازی	مولانا مودودی سے مولانا نعمانی کے اختلافات کا علمی جائزہ	93
100/-	عبدالرشید عراقی	برصغیر پاک و ہند میں علماء ماجدیہ کے علمی کارنامے	94
220/-	موسیٰ خان جلال زئی	مولانا رومی کا نظریہ عشق	95
100/-	موسیٰ خان جلال زئی	فلسفہ روح انسانی	96
400/-	ڈاکٹر نایک (مترجم سید امتیاز احمد)	خطبات ڈاکٹر ڈاکٹر نایک	97
150/-	حافظ محمد نجفی	نجومیوں کی کارستانیوں	98
280/-	حضرت علی ججویری رحمہ اللہ تعالیٰ: مولانا میاں محمد رمضان علی	کشف المحجوب	99
36/-	(حکیم سید امین الدین دہلوی)	تذکرہ حضرت علی ججویری رحمۃ اللہ علیہ	100
150/-	خالد پرویز ملک	پنجاب کے عظیم صوفی شعراء	101
200/-	خالد پرویز ملک	پنجاب اور اہل پنجاب	102
180/-	خالد پرویز ملک	ذکر وارث شاہ	103
100/-	خالد پرویز ملک	حیات و تعلیمات اور کلام بابو محمد علی	104
100/-	خالد پرویز ملک	حیات و تعلیمات اور کلام فرید محمد علی	105
100/-	خالد پرویز ملک	حیات و تعلیمات اور کلام وارث شاہ محمد علی	106
100/-	خالد پرویز ملک	حیات و تعلیمات اور کلام بیسے شاہ محمد علی	107
100/-	خالد پرویز ملک	حیات و تعلیمات اور کلام محمد بخش محمد علی	108
80/-	علامہ محمد جاوید	حقیقت تصوف اور حضرت بوعلی قلندر	109
120/-	پروفیسر اویس لطیف عبداللہ	روحانیت کے تاجدار	110
120/-	احمد مصطفیٰ صدیقی	شان اولیاء	111

112	اڑھائی قلندر	حکیم لیاقت علی سہروردی	200/-
113	درویش	حکیم لیاقت علی سہروردی	160/-
114	الہدیٰ نیک پیمیاں	عبدالرب درویش	160/-
115	حسین، منصور علاج حیات و کلام	شیماء مجید	280/-
116	حضرت رابعہ بصریؒ	مسعود مفتی	120/-
117	آثار زندگی	قلب حسین وڑائچ	150/-
118	ریزہ فکر	قلب حسین وڑائچ	200/-
119	افکار صداقت	قلب حسین وڑائچ	200/-
120	زندہ لمحوں کا احساس	قلب حسین وڑائچ	250/-
121	انسان اور حقیقت	قلب حسین وڑائچ	350/-
122	ضمیر شب کا سفر	قلب حسین وڑائچ	300/-
123	نوید صبح	میاں عبدالحمید	300/-
124	تریت اولاد کا اسلامی نظام	السید عبداللہ تاج صحیح علوان	250/-
125	تحدہ خواتین (اعلیٰ)	مولانا محمد عاشق الہی بلند شہری	250/-
126	نایاب ذخیرہ		120/-
127	تاریخ اسلام (جلد مکمل سیٹ)	شاہ معین الدین ندویؒ	550/-
128	تاریخ اسلام (جلد مکمل سیٹ)	مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی	600/-
129	بہشتی زیور (مدل)	مولانا اشرف علی تھانوی	380/-
130	تاریخ اندلس	حامد مختار مدح پوری	300/-
131	تاریخ ایران قدیم	محمد حیات خان	150/-
132	تاریخ ملت اسلامیہ	محمد حیات خان	500/-
133	فضائل اعمال	مولانا محمد زکریاؒ	250/-
134	غنیۃ الطالبین (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)	ترجمہ: علامہ ظہیر الدین بدایونیؒ	280/-
135	تعبیر الرویا	علامہ ابن سیریں	250/-
136	لیک	ممتاز مفتی	180/-
137	حج و عمرہ پاکٹ	استیاز طلوی	45/-
138	سرزمین آسمان میں چند روز	جمیل احمد عدیل (سفر نامہ عمرہ)	126/-
139	رواداری اور مغرب؟	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	200/-
140	رواداری اور پاکستان	ڈاکٹر محمد صدیق شاہ بخاری	200/-
141	قوم یہود اور ہم قرآن کی روشنی میں	مولانا حضرت عبدالکریم پاریکھ	200/-

142	پاکستان کی اسلامی اساس اور جدید تقاضے	کے ایم۔ اعظم	400/-
143	قومی ہیروز (حصہ اول)	محمد اسلم لودھی	250/-
144	قومی ہیروز (حصہ دوم)	محمد اسلم لودھی	250/-
145	افواج پاکستان	محمد اسلم لودھی	300/-
146	رشتے محبتوں کے	محمد اسلم لودھی	200/-
147	وطن کے پاسبان	محمد اسلم لودھی	150/-
148	محترمہ فاطمہ جناح حیات و افکار	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	200/-
149	محترمہ فاطمہ جناح حیات و افکار (کارڈ)	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	15/-
150	بلوچ تاریخ کے آئینے میں	مظہر علی لاشاری	150/-
151	پارلیمنٹ میں قادیانی شکست	مولانا اللہ وسایا	300/-
152	نگاہ عشق دل زندہ	مہر نگاری مصطفوی	100/-
153	نزول مسیح آ کر کیوں؟	نور محمد قریشی ایڈووکیٹ	60/-
154	تعلیم الاسلام	مولانا مفتی کفایت اللہ	60/-
155	کامیابی کیا ہے؟	مولانا محمد عمر پانپوری	24/-
156	مجموعہ علم و حکمت	سید مسعود رحمن شاہ	100/-
157	تحفۃ العروس	علامہ محمود مہدی	250/-
158	تحفہ برائے دلہن	مولانا حافظ محمد اسلم زاہد	250/-
159	A Pound of Flesh	S-Hamgah Saleem Gilan	80/-
160	اسائے الحسنى واسائے نبی (بڑی)	فورکلر آرٹ پیپر	180/-
161	اسائے النبی ﷺ	فورکلر آرٹ پیپر	60/-
162	اسائے الحسنى واسائے نبی (اکٹھی)	فورکلر آرٹ پیپر	60/-
163	کامیاب زندگی کا تصور	پروفیسر انور دل	100/-
164	گھریلو آلودہ نسلوں کا انسائیکلو پیڈیا	مرتبہ: سید امتیاز علی تاج	150/-
165	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مولانا سعید الرحمن علوی	120/-
166	فیضِ غوث (مجموعہ افادات مولانا ہزاروی)	مولانا غلام غوث ہزاروی	80/-
167	انوارِ خطابت	پروفیسر مولانا ہارون الرشید	150/-
168	سفر حج و عمرہ مع اہم فتاویٰ	حافظ مظفر محسن	150/-
169	مسلمان خواتین کے میں سبق	مولانا محمد عاشق الہی صاحب	24/-
160	تحفۃ الزکاح	حضرت مولانا ابراہیم صاحب پالن پوری	120/-
161	آدابِ مباشرت	ڈاکٹر آفتاب احمد شاہ	20/-

162	سجدہ سہو کے مسائل	مفتی حبیب الرحمن مراد آبادی	20/-
163	خطبات بمبئی	مولانا محمد منظور نعمانی	100/-
164	روشنی	مولانا محمد متین ہاشمی	250/-
165	مشاہیر اسلام کی فصیحیں (وصایا)	افتخار فریدی	70/-
166	اسلام میں غلامی کی حقیقت	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	200/-
167	1857ء پہلی جنگ آزادی	میاں محمد شفیع	250/-
168	ہزارہ گزٹینئر	ڈی۔ ایچ۔ واٹسن / پروفیسر افتخار احمد	250/-
169	تاریخ ہزارہ	ڈاکٹر شیر بہادر خان پٹی	250/-
170	دولت غزنویہ	مولانا محمود الرحمن ندوی	250/-
171	نبی کریم ﷺ کی مبارک سنتیں	مولانا ابوالمظفر ظفر احمد قادری	120/-
172	بہار شباب	حکیم غلام محمود خاں	120/-
173	قرب الہی (عبادت کی روشنی میں)	مسز جوہر	150/-
174	وادی کاغان	منصف خان سحاب	200/-
175	مشرق کا سونہرا لینڈ..... وادی سوات	محمد پرویش شاہین	80/-
176	کافرستان کے رسم و رواج	محمد پرویش شاہین	80/-
177	سوات..... کوہستان	محمد پرویش شاہین	80/-
178	دریہ..... کوہستان	محمد پرویش شاہین	100/-
179	وادی چترال	محمد پرویش شاہین	100/-
180	ہماری حقیقت (سائنس انسان اور کائنات)	محمد آفتاب	200/-
181	شیخ اکبر - محمدی الدین ابن عربی	محمد شفیع بلوچ	300/-
182	پرفیشنل بیوٹیشن بننے	آسید آرزو	130/-
183	فضائل درود شریف	مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ	120/-
184	آداب الدعا	مولانا محمد اجمل خان	150/-
185	اسلامی حکومت کا فلاحی تصور	مولانا سعید الرحمن علوی	150/-
186	فضائل رمضان	مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ	80/-
187	آئینہ سلوک (یعنی شرح سیف الملوک)	میاں محمد بخش / محمد خلیل غائب	350/-
188	مجموعہ مسائل، علم شریعت و علم تصوف	خوشی محمد عاصی	500/-
189	قلم خدا کے لئے (ایک بھیا تک سازش)	رضوان یوسف	150/-

مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ

☆ لسان القرآن (3 جلد)	480/-	☆ عقلیات ابن تیمیہ	200/-
☆ مطالعہ قرآن	180/-	☆ چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں	150/-
☆ مطالعہ حدیث	200/-	☆ مسلمانوں کے عقائد و افکار (مکمل سیٹ)	400/-
☆ افکار ابن خلدون	200/-	☆ تعلیمات غزالی	300/-
☆ افکار غزالی	250/-	☆ سرگزشت غزالی	100/-
☆ مسئلہ اجتہاد	200/-	☆ تہافتہ الفلاسفہ	140/-

حکیم محمد طارق محمود چغتائی کی شہرہ آفاق کتب

☆ 1947ء کے مظالم خود مظلوموں کی زبانی	250/-	☆ مشاہیر کی آپ بیتی	150/-
☆ جذبات اور خیالات کے روگ نبوی ﷺ	120/-	☆ پرسکون زندگی کی تلاش نبوی ﷺ طریقے اور طریقے اور جدید سائنس	120/-
☆ پرکشش زندگی گزارنے کے گر علاج نبویؐ	120/-	☆ نوجوانوں کی جنسی الجھنیں علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-
☆ قدرتی ٹانک اور علاج نبویؐ	120/-	☆ معالجات نبویؐ اور جدید سائنس (جلد اول تا چہارم)	800/-
☆ کینسر کو شکست	140/-	☆ جادو جنات، اسلام اور جدید سائنس	200/-
☆ آسان نیکوں کے حیرت انگیز فضائل (انگلش)	200/-	☆ پیمانائش کا سائنسی اور روحانی علاج	80/-
☆ شوگر کا سائنس اور روحانی علاج	120/-	☆ گفتہ باتیں، بکھرے موتی، انمول بیادیں	120/-
☆ مہلک عادات نبویؐ طریقے اور جدید سائنس	90/-	☆ صحت مند عادات نبویؐ طریقے اور جدید سائنس	90/-
☆ مہلک غذائیں نبویؐ غذائیں اور جدید سائنس	90/-	☆ مہلک دوائیں نبویؐ دوائیں اور جدید سائنس	80/-
☆ ہائی بلڈ پریشر کا سائنسی اور روحانی علاج		☆ جنید حبیب گھوکار سے پرہیز گاری تک	70/-
☆ نوجوانوں کے جنسی مسائل علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-	☆ از دواچی مسائل علاج نبویؐ اور جدید سائنس	150/-
☆ شاداب زندگی کے راز		☆ بدترین خصلتوں کا بہترین علاج	120/-
☆ امراض معدہ علاج نبویؐ اور جدید سائنس	200/-	☆ شوگر کا کامیاب علاج	80/-
☆ روحانی پاکیزگی	200/-	☆ کولیسٹرول کا سائنسی اور روحانی علاج	120/-
☆ گھریلو الجھنوں کا روحانی علاج	120/-	☆ موٹاپے سے نجات علاج نبویؐ اور جدید سائنس	120/-
☆ بدترین خصلتوں کا بہترین علاج	120/-	☆ کمالات اولیاء	120/-
☆ روحانی عامل کی خفیہ ڈائری	150/-	☆ خواتین کے حسن و جمال کے قیمتی راز	200/-
☆ آداب معرفت	120/-	☆ شاداب زندگی کے راز	120/-
☆ ہارٹ ایٹک سے بچاؤ کی سائنسی اور روحانی ترکیب	120/-		

محرمین خالد کی ایمان افروز کتب

☆ احمدی دوستو تمہیں اسلام بلاتا ہے۔	250/-	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے (انگلش)	
☆ مراۃ سیر محمد ﷺ (نعتیہ انتخاب)	180/-	☆ شہیدان ناموس رسالت ﷺ	250/-
☆ معرفت اسم محمد ﷺ	150/-	☆ جب حضور ﷺ آئے	180/-
☆ ثبوت حاضر ہیں؟	400/-	☆ قادیانیت کے خلاف عدالتی فیصلے	200/-
☆ اسلام کا سفیر (قائد اعظم محمد علی جناح رحمہ اللہ)	250/-	☆ قادیانیت سے اسلام تک	200/-
☆ علامہ اقبال رحمہ اللہ قادیانیت	400/-	☆ مولانا وحید الدین خاں۔ اسلام دشمن شخصیت	200/-
☆ غازی عارجمند (رحمہ اللہ)	200/-	☆ قادیانیت اُس بازار میں	180/-

مسعود مفتی کی بصیرت افروز کتب

☆ خواتین کا مکمل اسلامی انسائیکلو پیڈیا	350/-	☆ غزوۃ الحبیب ﷺ	500/-
☆ صلح حدیبیہ	100/-	☆ غزوہ خندق	100/-
☆ غزوہ موتہ	100/-	☆ غزوہ أحد	100/-
☆ جنگ بدر	100/-	☆ فتح مکہ	150/-
☆ ملحقہ پیش کش کیپٹن کی اسلام دشمنی	150/-	☆ سورہ توبہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆ سورہ بقرہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورہ آل عمران سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆ سورہ فاتحہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ ہمارے بچوں کے پیارے نام	150/-
☆ سیرت نبی کا انسائیکلو پیڈیا (سوال جواب)	300/-	☆ زندہ اقوال	250/-
☆ برجوں پر مکمل کتاب	120/-	☆ دنیا کے تمام ممالک کا انسائیکلو پیڈیا	500/-
☆ اسلامی ناموں کی دشمنی	240/-	☆ بیوی محبت کیوں کرے!	60/-
☆ صلی علی کتبہ کہتے (نعتیہ مجموعہ)	75/-	☆ تاریخ کی کرپٹ ترین عورتیں	150/-
☆ اسلامی ناموں کا گلدستہ	150/-	☆ برجوں کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	250/-
☆ اسلامی ناموں کا انسائیکلو پیڈیا	100/-		

روحانی کتب سید علی حسین شاہ

☆ بچوں اور بڑوں کے برکت والے نام	240/-	☆ مفیض العملیات و تعویذات	250/-
☆ جادو کا آسان اور شرطیہ علاج (حصہ اول)	200/-	☆ جادو کا آسان اور شرطیہ علاج (حصہ دوم)	200/-
☆ سورہ الکافرون سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورہ یسین سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	75/-
☆ شرائط چلہ	60/-	☆ سورہ اخلاص سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆ بسم اللہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورہ الفلق سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆ سورہ الناس سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	☆ سورہ یسین آرٹ پیپر (مجلد)	80/-

روحانی کتب علامہ محمد جاوید

☆	جنات آسب جادو کا توڑ	200/-	حقیقت تصوف اور حضرت بوعلی قلندر رحمہ اللہ	80/-
☆	سورہ ق سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورہ حم السجدہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورہ مریم سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورہ قاتحہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورہ الکہف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورہ شریف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورہ رحمن سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورہ مزمل سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	آیت الکرسی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	نفل نمازوں سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورہ جنت سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	سورہ ملک سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	اسمائ محمدیہ علیہ السلام سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	اسمائ الہی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-
☆	سورہ یوسف سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	مختصر کلمات سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-

روحانی کتب خواجہ انیس اقبال

1-	درد و لامحدود	300/-	خواجہ انیس اقبال
2-	دینا (قرآن میں مذکور انبیاء کرام کی دعائیں)	60/-	خواجہ انیس اقبال
3-	دل کے حجرے میں	60/-	خواجہ انیس اقبال
4-	فقیر کی دنیا	50/-	خواجہ انیس اقبال
5-	فقیر کی حاضری	60/-	خواجہ انیس اقبال
6-	دعائے سیفی سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج	60/-	خواجہ انیس اقبال
7-	اللہ اللہ کرتے رہیے	60/-	خواجہ انیس اقبال
8-	استعارہ اور بد نظری کا علاج	120/-	خواجہ انیس اقبال

طبی و روحانی کتب

1-	روحانی تعویذات کی ڈائری	250/-	صوفی محمد ندیم
2-	پنج سورۃ و تلیف مفتی	70/-	امام احمد رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ
3-	قرآنی دعاؤں سے روحانی علاج	50/-	امام احمد رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ
4-	سورہ یٰسین (معرا) بڑی	10/-	سورہ یٰسین (معرا) چھوٹی
5-	جواہرات ستارے اور طبی علاج	120/-	علیم اقبال
6-	ہومیو میڈیسن اور صحت	80/-	ڈاکٹر آ۔ اے امتیاز
7-	امراض اور ہومیو ادویات	80/-	ڈاکٹر آ۔ اے امتیاز
8-	طیب عظم	250/-	حکیم ایم۔ اے قاسم
9-	بلڈ پریشر	40/-	حکیم ایم۔ اے قاسم
10-	شوگر کا علاج خود کریں	36/-	حکیم ایم۔ اے قاسم

40/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	تشیخ کا علاج خود کریں	11-
50/-	حکیم ایم۔ اے قاسم	ہیپاٹائٹس میں آپ تباہ نہیں	12-
100/-	ہومیو ڈاکٹر محمد اشرف قریشی	نوجوانوں کے جنسی و نفسیاتی مسائل (علاج مردانہ)	13-
100/-	عابد خاں	اپنا پرائز بانڈ خود نکالیں	14-
300/-	ڈاکٹر آصف محمود چاہ	دوا غذا اور شفا	15-
250/-	ڈاکٹر آصف محمود چاہ	زلزلہ زیارت اور زندگی	16
300/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	میرج گائیڈ	17
200/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	نسوانی حسن	18
150/-	ڈاکٹر جاوید اقبال	آزادی نسوان زوال نسوان	19
300/-	الحاج مسعود احمد خان درانی	خطرناک بیماریوں کا قدرتی علاج	20
300/-	الحاج مسعود احمد خان درانی	قدرتی غذاؤں کا انسائیکلو پیڈیا	21
200/-	اے صد مسافر	ماورائی علوم کا خلاصہ اور عمل	22
120/-	اے صد مسافر	ڈپریشن کا جدید طریقہ علاج (یوگا مراقبہ)	23
100/-	اے صد مسافر	سماء ہیلنگ انرجی	24
120/-	اے صد مسافر	ٹرینل سائنسز	25
170/-	حکیم کبیر الدین	مخزن المفردات	26

اقبالیات پر بہترین کتب

40/-	☆ کامیابی کے سات اصول (مفکر اسلام علامہ اقبال کی تفہیمات کی روشنی میں) حسن رازی	
150/-	☆ اسلامی فکر کی نئی تشکیل (خطبات اقبال) مترجم: شہزاد احمد	
150/-	The Reconstruction of Religious thought In Islam (علامہ اقبال کے 7 مشہور و معروف خطبات)	
300/-	☆ اقبال کا نور بصیرت (اقبال کی تین طویل نظمیں مسجد قرطبہ، الہیاس کی مجلس شوریٰ، پیر و مرید)	
300/-	☆ کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ) ☆ کلیات اقبال (کلاں)	700/-
150/-	☆ کلیات اقبال (پاکٹ) ☆ بانگ درا	200/-
120/-	☆ ضرب کلیم ☆ بال جبریل	120/-
180/-	☆ شکوہ جواب شکوہ (فرہنگ اور شرح کے ساتھ) از علامہ اقبال۔ شرح: محمد شریف بقاء	
200/-	☆ شکوہ جواب شکوہ ☆ کلیات اقبال (عوامی ایڈیشن)	15/-
40/-	☆ ذکر حسینؑ اور اقبال (محمد شریف بقاء) ☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ اول)	100/-
40/-	☆ اقبال کے تصور اسلام کا نچوڑ (حصہ دوم) ☆ ” ” ” از: حسن رازی	60/-

نثر، شاعری، افسانہ

150/-	علویہ فیصل	گلاب سے ہونٹ (آرٹ پیپر + فورکلر)	1-
150/-	علویہ فیصل	دل جسے اپنا کہتا ہے	2-
150/-	علویہ فیصل	کا جل تیری آنکھوں کا	3-
150/-	علویہ فیصل	پیار کا پہلا سال (فورکلر)	4-
150/-	علویہ فیصل	خوشبو اُداس کرتی ہے	5-
140/-	علویہ فیصل	ہونٹ غزل کے دو مصرعے	6
250/-	وسی شاہ	میرے ہو کے رہو	7
300/-	وسی شاہ	میرے ہو کے رہو (اعلیٰ)	8
150/-	حتاش	چاہتوں کی بارش	9
150/-	خالد بن حامد	ابھی یہ خواب مت دیکھو (شعری مجموعہ)	10
150/-	حتاش	رنگِ حنا (شعری مجموعہ)	11
150/-	خالدہ رشید	بچ رہا ایسا ہو جائے	12
130/-	ضیاء اللہ قریشی	پہلی سانسِ محبت کی	13
250/-	ناصر دہلوی	شرح دیوانِ غالب	14
200/-	مرزا اسد اللہ خاں غالب	دیوانِ غالب	15
100/-	مرزا اسد اللہ خاں غالب	دیوانِ غالب (پاکٹ)	16
250/-	ساغر صدیقی	دیوانِ غالب (فرہنگ کے ساتھ)	17
180/-	ساغر صدیقی	کلیاتِ ساغر صدیقی	18
220/-	ساحر لدھیانوی	کلیاتِ ساحر لدھیانوی	19
150/-	انتخاب: ندیم رضا	نیم کو صندل کر دو	20
150/-	بشیر بدر	انتامت چاہو اُسے	21
300/-	معاذ حسن	ٹاپ 10 شاعر	22
300/-	معاذ حسن	ٹاپ 10 شاعرات (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)	23
200/-	مسعود مفتی	ٹاپ 20 کلاسیک شاعر	24
150/-	معاذ حسن	100 مشہور و معروف غزلیں	25
120/-	علیم اقبال	شاہکار شاعری (ظہیں، غزلیں، گیت)	26
120/-	ایمان علی	تیرے پیار کا موسم (انتخاب غزلیات)	27
150.-	انتخاب شہباز اشرف	کہو تو اک شام چرالوں	28
150/-	ایم۔ نعیم	دو چار دن کا ساتھ	29

30	بیسویں صدی کی عشقیہ غزلیں	عاصمہ مشتاق	120/-
31	دیوان میر تقی میر	علامہ اقبال	75/-
32	التباس	شناور اسحاق	150/-
33	جلتے ہاتھ	محمد جمیل پرواز	160/-
34	موسم امرا آلودہ تھا (غزلیات)	افتخار احمد عاطر	150/-
35	کچھ دیر پہلے سحر سے (غزلیات)	افتخار احمد عاطر	180/-
36	گلاب آغوش	افتخار احمد عاطر	
37	تیرے وجود کی ٹھنڈی چھاؤں	افتخار احمد عاطر	
38	ٹھٹھے بول میں جادو	ذیل کار نیگی	250/-
39	تتلیوں کے شہر میں	فیصل محمود	130/-
40	پل دوپل کی چاہت میں	صابر ظفر	250/-
41	پھول میرے گلشن کا	سیلم احمد صدیقی	120/-
42	محبت جب سے وہ کرنے لگے ہیں	شہزاد احمد انتخاب گلزار احمد	150/-
43	آپ سانہیں کوئی (شعری مجموعہ)	اختر شمار	130/-
44	دیکھا جو تیر کھا کے (شعری مجموعہ)	مظفر وارثی	120/-
45	اردو افسانے میں رومانی رجحانات	ڈاکٹر محمد عالم خان	200/-
46	مقالات اجمل	ڈاکٹر محمد اجمل	200/-
47	نا قابل فراموش	دیوان سنگھ مفتوح	400/-
48	مقالات محمد حسن عسکری (حصہ اول)	مرتبہ: شیمابجید	300/-
49	مقالات محمد حسن عسکری (حصہ دوم)	مرتبہ: شیمابجید	300/-
50	مراۃ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	90/-
51	باغ و بہار (فرہنگ کے ساتھ)	میر امن دہلوی	180/-
52	فردوس بریں	عبدالحلیم شرر	80/-
53	مسدس حالی (جدید ایڈیشن)	مولانا الطاف حسین حالی	100/-
54	مضامین شورش	مرتبہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال	250/-
55	وحدت ملی		80/-
56	خون جگر ہونے تک	صاحبزادہ خورشید گیلانی	250/-
57	محاکمہ دیوان غالب نسخہ لاہور مسروقہ	پروفیسر جعفر بلوچ / رفاقت علی شاہد	200/-
58	آج کی بات	توصیف احمد خان	150/-
59	برجستہ (کالم)	جمیل احمد عدیل	200/-

60	حرف ملاقات (نامور ادیبوں کے انٹرویوز)	عمران نقوی	200/-
61	اک جبر جو ہم کو لاحق ہے (لازوال عشقیہ خطوط)	جواز جعفری	150/-
62	اپنے چاند کے لئے	اشتیاق احمد صاحب	150/-
63	تجہ مسافر	امیز حزن لون	175/-
64	شام تنہائی	محمد زاہد نواز دندہاوا	150
65	زمانے کی ٹھوکریں	اصغر شاہ اصغر	200/-
66	جب بھی دیکھا اداس دیکھا	حافظ مظفر محسن	120/-
67	پیار کے پیچھے دوپل	حافظ مظفر محسن	180-
68	محبت مرنے کی سکتی	ندیم گیلانی	140/-
69	میرے لفظ	حسن ساحل	200/-
70	تذکرہ الشعراء	عبدالرشید عراقی	200/-

پاکستان کے نامور کالم نگار جاوید چوہدری کی کتب

☆	زیر پوائنٹ نمبر 3	350/-	زیر پوائنٹ نمبر 4	350/-
---	-------------------	-------	-------------------	-------

نوجوان نسل کے شاعر سعید واثق کی کتب

☆	دل میں تم مہکتے ہو (نیا شعری مجموعہ)	150/-	☆	محبت ہو گئی تم سے	150/-
---	--------------------------------------	-------	---	-------------------	-------

منفرد لہجے کے شاعر اعتبار ساجد کی کتب

☆	مجھے اس قدر نہ چاہو (نیا شعری مجموعہ)	180/-	☆	روز یاد کرتے ہیں	150/-
☆	سرخ گلابوں کا موسم	180/-	☆	اک عشق ضروری ہے	120/-
☆	محبت ہو تو ایسی	150/-	☆	ترے انتظار کے شہر میں (کلیات)	600/-
☆	یہ موسم یونہی بیت گیا	150/-	☆	تمہیں کتنا چاہتے ہیں	150/-
☆	یہ شام تمہارے نام	180/-	☆	کوئی بات کرنی ہے چاند سے	150/-
☆	وہی اک زخم گلاب سا	150/-	☆	یہ تنہائی مجھے دے دو	180/-
☆	مجھے کوئی شام اُدھار دو	200/-	☆	دل کی دہلیز پر	150/-
☆	وہ سنہری دھوپ کہاں گئی	150/-	☆	محبت پھول جیسی ہے	150/-
☆	گلوب پرا جیسی	180/-	☆	ابھی آگ سرد نہیں ہوئی	150/-
☆	مرے خط مجھے واپس کر دو	130/-	☆	شاعری کیسے کریں؟	150/-

پاکستان کے مقبول ترین شاعرانہ قدیری کی کتب

☆	ہم نہ ملے تو اچھا تھا	150/-	تم اداس مت ہونا	150/-
☆	کب آؤ گے	180/-	مجھے تم سے محبت ہے	150/-
☆	تم اکثر یاد آتے ہو	150/-	میری آنکھیں نیند سے بھر دو	180/-
☆	تمہیں کیسے مناؤں؟	150/-	کیا ہے پیار پھر سے	200/-

طُور و مزاج

1	واہ بھئی واہ	150/-	انتخابِ ساجد	150/-
2	ہاؤس فل	150/-	انتخابِ ساجد	150/-
3	اُردو کی درمیانی کتاب	200/-	ڈاکٹر مشتاق احمد سحر	200/-
4	پطرس کے مضامین	60/-	پطرس بخاری	60/-
5	چکن فالودہ (بہترین مزاحیہ شاعری کا انتخاب)	150/-	انتخاب: گل فراز احمد	150/-
6	لطیف A (دنیا بھر کے انعام یافتہ لطیفے)	150/-	گل فراز احمد	150/-
7	ٹاپ 10 مزاح گو شاعر	250/-	گل فراز احمد	250/-
8	مکمل مزاحیات	250/-	معاذ حسن	250/-
9	مزاح نگار حاضر ہوں	250/-	پروفیسر جمیل احمد عدیل	250/-
10	شرطیہ بیٹھے (دنیا بھر کے انعام یافتہ لطیفے)	200/-	ایم۔ ایم۔ خالد	200/-
11	خوبصورت لطائف	80/-	ستار طاہر	80/-
12	منتخب لطائف	80/-	ستار طاہر	80/-
13	دل کے آس پاس (طُور و مزاج)	150/-	انجم انصار	150/-
14	خوبصورت مسکراہٹیں (لطائف)	70/-	محمد قیصر چوہان	70/-
15	قلمی دشمنی (طُور و مزاج)	120/-	اشفاق احمد ورک	120/-
16	مابدولت (طُور و مزاج)	150/-	عارف صبح خان	150/-
17	شٹ آپ (طُور و مزاج)	120/-	عارف صبح خان	120/-
18	کر کرے کردار (طُور و مزاج)	120/-	عارف صبح خان	120/-
19	تجاہل عارفانہ	300/-	عارفانہ صبح خان	300/-
20	بوٹا مائی فرینڈ	120/-	حافظ مظفر محسن	120/-
21	بہشت لاف اور سیاسی آلودگی	150/-	حافظ مظفر محسن	150/-
22	چڑیا گھر (مزاحیہ شاعری)	100/-	مہذب چشتی	100/-

معلومات عامہ، اقوال زریں

200/-	Ch. Mushtaq Ahmad (بنگلہ کے امتحان کیلئے رہنما کتاب)	Management & People in Banking	1
150/-	Prof. Muhammad Akram Tahir	PLEASING VOICES (انگریزی تقریر)	2
180/-	منصور احمد بھٹی	علم الاعداد کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	3
250/-	محمد زاہد گوگی	دست شناسی کا انسائیکلو پیڈیا	4
120/-		بہترین انعامی تقریریں	5
100/-	خان اکبر علی خان	اپنا انٹرویو خود کیجئے!	6
100/-	خان اکبر علی خان	اقوال محبت کا انسائیکلو پیڈیا	7
200/-	ملک زاہد محمود اعوان	اسرار الخوم	8
200/-	پروفیسر محمد نصیر خان	حقیقتوں کا سفر (اقوال زریں)	9
200/-	فیصل بٹ	عالمی معلومات کا انسائیکلو پیڈیا	10
600/-	شاہدہ لطیف	دنیا کے 70 عجوبے (4 کھر)	11
300/-	قیصر چوہان	100 عظیم مہمات	12
40/-	کاامران امجد	سٹارز (12 کتب کا سیٹ برج)	13
300/-	زاہد گوگی	قلمی دنیا پر حکمرانی کرنے والے خوبصورت چہرے	14
400/-	اعظم شیخ	بیسویں صدی کا انسائیکلو پیڈیا	15
200/-	اجمل سعید پراچہ	ناٹکا پرست کے حضور (سفر نامہ)	16
400/-	مترجم: اعظم شیخ	گنز بک آف ورلڈ ریکارڈز 2002 (اُردو)	17
150/-	قیصر علی آغا	کون کب اور کیا؟	18
40/-	یا سرفراز	کون بے گاروڑ پتی!	19
200/-	مترجم: مقصود شیخ	عقلوں کا انچوڑ	20
100/-	اورنگزیب تنویر سہروردی	انسانی وقد رتی وسائل کا استعمال	21
150/-	عمران چوہدری	علمی تقریریں	22
120/-	نجمہ منصور	فن خطابت	23
90/-	حافظ مظفر محسن	ستارے اپنی اپنی قسمت کے	24
120/-	فرحت عباس، نجمہ منصور	بیت بازی	25
130/-	حافظ مظفر محسن	ضرب المثل اشعار	26
120/-	اشتیاق الرحمن چوہدری	جدید تقریریں	27
300/-	ابوعلی عبدالوکیل	عقل والوں کے لیے حکایات	28

عالمی شہرت یافتہ پامسٹ ایم۔ اے ملک کی کتب

350/-	اسرار دوست شناسی	ایم۔ اے ملک
150/-	بیسویں صدی کی پیشین گوئی	ایم۔ اے ملک

سعادت حسن منٹو کی کتب

600/-	کلیات منٹو 1- (افسانے)	سعادت حسن منٹو
600/-	کلیات منٹو 2- (افسانے)	سعادت حسن منٹو
600/-	کلیات منٹو 3- (کہانیاں)	سعادت حسن منٹو
600/-	کلیات منٹو 4- (ڈرامے)	سعادت حسن منٹو
600/-	کلیات منٹو 5- (ڈرامے)	سعادت حسن منٹو
50/-	ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو
15/-	نور جہاں سردر جاں	سعادت حسن منٹو
100/-	سچے فرشتے	سعادت حسن منٹو
200/-	منٹو کے 10 بہترین افسانے	سعادت حسن منٹو

تاریخی و رومانوی ناول

250/-	1 حجاج بن یوسف	الماس ایم۔ اے
200/-	2 سلطان شہاب الدین غوری	الماس ایم۔ اے
140/-	3 پنجاب کی رومانوی داستانیں	الماس ایم۔ اے
150/-	4 رومیو جولیٹ	شیکسپیئر
250/-	5 سلطان محمود غزنوی	مبین رشید
200/-	6 بہادر شاہ ظفر کے شب و روز	ضیاء الدین لاہوری
120/-	7 1857ء کے چنڈا ہم کردار	ضیاء الدین لاہور
250/-	8 تاوان عشق	محمد فیاض مای
250/-	9 کاغذ کی کشتی	محمد فیاض مای
400/-	10 شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری
150/-	11 تم آخری جزیہ ہو	آمنہ ریاض
150/-	12 خدا دور نہیں ہے	محمد عرفان رامے
300/-	13 راجکمار	ڈاکٹر کرم حسین شاہ راہی
225/-	14 دلی	خسرو ننگہ، مترجم: عرفان احمد خان
100/-	15 مدہوش	عرفان احمد خان

120/-	شاہد رزاق کوہلر	اجل کاروپ	16
300/-	مقصود شیخ	سکندر اعظم	17
150/-	ایم۔ اسلم	خواب جوانی	18
150/-	ایم۔ اسلم	تیرنگہ	19
120/-	ایم۔ اسلم	اشک ندامت	20
250/-	غلام سرور	امر جیت	21
200/-	اے۔ زیٹ سید	کاشانیہ نور	22
100/-	اکرم خان نیازی	کالج کلیاں اور بھنورے	23
100/-	عمران چوہدری	تیرے پاس ہے اک حصہ	24
60/-	عرفان نوید	سایہ	25
120/-	شیخ الیاس	شیطانوں کی جنت	26
80/-	ایم۔ انور صدیقی	عشق اور آزادی	27
120/-	ایم۔ انور صدیقی	خزائن کے بعد	28
400/-	بشری رحمن	بے ساختہ	29
100/-	شکیلہ شرارت	شہر زاد	30

مشہور ناول نگار علیم الحق حق کے ناول

250/-	دوبوندیں ساوان کی	180/-	عشق کا عین	1
120/-	سانبان	500/-	عشق کا شین	2
120/-	تیل کی آگ	400/-	عشق کا شین پارٹ II	3
100/-	شب احتساب	250/-	دجال (اول)	4
200/-	سنگ حیات	250/-	دجال (حصہ دوم)	5
150/-	سلطانی جمہور	250/-	دجال (حصہ سوم)	6
150/-	اماوس کا دیا	120/-	قصہ ایک داماد کا	7
250/-	بساط	150/-	پاتال کی بلائیں	8
120/-	ضمیر کے اسیر	150/-	ضمیر کے اسیر	9
120/-	زندگی 40 کلومیٹر	120/-	ملک برائے فروخت	10
140/-	دوسری فصل	150/-	مٹی سے عشق	11

پاکستان کی نامور ناول نگار عمیرہ احمد کی بہترین کتب

1	من و سلوی	عمیرہ احمد	600/-
2	امر تیل	عمیرہ احمد	600/-
3	تھوڑا سا آسمان	عمیرہ احمد	700/-
4	حسنہ اور حسن آراء	عمیرہ احمد	250/-
5	در بارہ دل	عمیرہ احمد	250/-
6	ہم کہاں کے سچے تھے	عمیرہ احمد	250/-
7	میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے	عمیرہ احمد	250/-
8	سحراک استعارہ ہے	عمیرہ احمد	250/-
9	میری ذات ذرہ بے نشاں	عمیرہ احمد	250/-
10	لا حاصل	عمیرہ احمد	250/-
11	زندگی گھڑا رہے	عمیرہ احمد	250/-
12	واپسی	عمیرہ احمد	300/-
13	میرے پچاس پسندیدہ سین	عمیرہ احمد	150/-
14	حرف سے لفظ تک	عمیرہ احمد	100/-
15	حاصل	عمیرہ احمد	200/-
16	ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-

نگہت عبداللہ کے نئے ناول

1	محبت کا حصار	نگہت عبداللہ	200/-
2	محبوبوں کے ہی درمیاں	نگہت عبداللہ	250/-
3	دل پہلوں کی ہستی	نگہت عبداللہ	400/-
4	انتظارِ فصلِ گل	نگہت عبداللہ	150/-
5	مجھے روٹھے نہ دینا	نگہت عبداللہ	250/-
6	بس تم لوٹ آنا	نگہت عبداللہ	200/-
7	کوئی لمحہ گلاب ہو	نگہت عبداللہ	400/-

شاہدہ لطیف کی خوبصورت کتب

1	7 قدم عشق (ناول)	شاہدہ لطیف	350/-
2	محبت نہ ہو جائے	شاہدہ لطیف	200/-
3	دنیا کے 70 عجوبے	شاہدہ لطیف	600/-

قیصرہ حیات کی خوبصورت کتب

1	انوار اسائے النبی (تفصیلی شرح)	قیصرہ حیات	500/-
2	ذات کا سفر (ناول)	قیصرہ حیات	200/-
3	سایہ دیوار بھی نہیں (ناول)	قیصرہ حیات	300/-
4	گلاب چاہتیں	قیصرہ حیات	220/-
5	وقت جو ٹھہر گیا	قیصرہ حیات	200/-

رفعت سراج کی خوبصورت کتب

1	رشتوں کے ریشم	رفعت سراج	250/-
2	ایک گلاب	رفعت سراج	200/-

ملک کی مشہور ناول نگار ماہ ملک کی کتب

1	جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہ ملک	150/-
2	یہ بلبلیں یہ تتلیاں	ماہ ملک	250/-
3	اک دیا جلانے رکھنا	ماہ ملک	350/-
4	میرے خواب ریہہ ریہہ	ماہ ملک	350/-

خواتین کی مقبول ترین رائٹرز رخسانہ نگار

1	دل آئینوں کا شہر	رخسانہ نگار عدنان	200/-
2	خوشبو کا گھر کوئی نہیں	رخسانہ نگار عدنان	180/-
3	دیوار سنگ سے آگے	رخسانہ نگار عدنان	200/-
4	میرے چارہ گھر	رخسانہ نگار عدنان	300/-
5	پارس (نیا ناول)	رخسانہ نگار عدنان	250/-
6	زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
7	گر مجھ سے محبت ہے	رخسانہ نگار عدنان	200/-

تنزیلہ ریاض کی مشہور کتب

1	خواب گھر وندہ ٹوٹ نہ جائے	تنزیلہ ریاض	200/-
2	احدنا الصراط المستقیم	تنزیلہ ریاض	200/-

عصمت چغتائی کی کتب

1	ایک قطرہ خون (واقعہ کربلا پر ایک شاہکار تحریر)	عصمت چغتائی	200/-
2	خمدی	عصمت چغتائی	100/-
3	لجاف	عصمت چغتائی	80/-

گہت سیما کے بہترین ناول

250/-	گہت سیما	زخم سفر ہے محترم	1
250/-	گہت سیما	روشنی کے عذاب	2
200/-	گہت سیما	کتنا سہل جانا تھا	3
200/-	گہت سیما	محبت ابر کی صورت	4
	گہت سیما	راہ جنوں	5

نازیہ کنول نازی کی بہترین کتب

600/-	نازیہ کنول نازی	جوریک دشت فراق ہے (ناول)	1
250/-	نازیہ کنول نازی	خواب نگر کی مسافتیں (ناول)	2
170/-	نازیہ کنول نازی	اے مڑگان محبت	3
150/-	نازیہ کنول نازی	تجا چاند (شاعری)	4

میونہ خورشید علی کے مشہور ناول

250/-	میونہ خورشید	اے جنوں دشت ہے کہ منزل ہے	1
180/-	میونہ خورشید	تیری راہ میں زل گئی وے	2

سباس گل کے نئے ناول

200/-	سباس گل	میں محبت اور تم	1
250/-	سباس گل	تم ایسی شرارت مت کرنا	2

عائشہ سحر مرثی کے نئے ناول

200/-	عائشہ سحر مرثی	مجھے بکھرنے مت دینا	1
250/-	عائشہ سحر مرثی	تیری چاہ میں	2

نازیہ فرحت مایہ کے ناول

150/-	نازیہ فرحت مایہ	مجھ چھو کر تیری آنکھیں	1
200/-	نازیہ فرحت مایہ	ہوں درد عشق سے جہاں بال	2

روشانے سبعین کے نئے ناول

200/-	روشانے سبعین	کیسی یہ رسم دنیا.....!	1
-------	--------------	------------------------	---

مقبول ترین رائٹر امجد جاوید کی کتب

200/-	امجد جاوید	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	1
150/-	امجد جاوید	چہرہ	2

400/-	احمد جاوید	عشق کا شین (حصہ دوم)	3
400/-	احمد جاوید	عشق کا شین (حصہ سوم)	4
250/-	احمد جاوید	عشق کا قاف	5
200/-	احمد جاوید	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	6
250/-	احمد جاوید	تاج محل	7
120/-	احمد جاوید	لکھاری کیسے بنتا ہے	8
150/-	انتخاب: احمد جاوید	انقلابی شاعری	9
150/-	احمد جاوید	تمہیں چاہوں گا شدت سے (نیا شعری مجموعہ)	10
150/-	مترجم: احمد جاوید	کاسیانی 30 دنوں میں (ترجمہ)	11

صحت و تندرستی

250/-	مترجم: مقصود شیخ	دل توانا رکھنے کے 50 طریقے	1
150/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	فیملی ہیلتھ	2
200/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	ٹین ایج گائیڈ (اردو)	3
200/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	TEENAGE TINGLING	4
150/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	زلزلہ، زخم اور زندگی	5
250/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	زلزلہ زیارت اور زندگی	6
300/-	ڈاکٹر آصف محمود جاہ	دواء، غذا اور شفاء	7
120/-	پروفیسر ڈاکٹر ایم اے صوفی	دانتوں کی حفاظت و علاج	8
100/-	خواجه سلطان عارف	قیام حمل سے پرورش تک	9
150/-	اعظم شیخ	بسی زندگی اور آسان یوگا	10
100/-	ماجد رسول طاہر	بیوٹیشن گائیڈ	11
120/-	حنان شیخ	کامیاب گھریلو نوکروں کا انسائیکلو پیڈیا	12

کھانا پکانا

400/-	زیب النساء	اوون کے کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا	1
600/-	ساجد حسین قریشی	کھانے پکانے کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	2
250/-	ساجد حسین قریشی	آرٹ آف مغل کزین (بہترین کھانے)	3
200/-	ساجد حسین قریشی	آرٹ آف سب کا پیچیدہ (بہترین کھانے)	4
250/-	ساجد حسین قریشی	Art of Mughal Cuisine (بہترین کھانے)	5
200/-	ساجد حسین قریشی	Art of sub continental	6

7	سبزیاں اور پھل کا انسائیکلو پیڈیا	ساجد حسین قریشی	100/-
8	انسائیکلو پیڈیا آف پاست (مائیکرو ویڈیو اور ایڈون کے کھانے)	ساجد حسین قریشی	300/-
9	شیف ڈاکٹر کا دسترخوان	شیف ڈاکٹر	220/-
10	راحت کا دسترخوان	راحت بیگم	300/-
11	ڈالڈا کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا		600/-
12	منفرد چائیز کھانے	شمینہ سہیل نذر	130/-
13	ڈالڈا کھانے خواں	سعدیہ عابد	150/-
14	پگن بک	(پگن کے خوبصورت ڈیزائن)	380/-
15	مچھلی کے پکوان	نمل مسعود	150/-
16	شوگر فری کھانوں کا مکمل انسائیکلو پیڈیا	جویریہ کامران	150/-
17	تکے کباب چائیز کو فٹے پسندے	نمل مسعود	150/-
18	منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں	روبینہ شاہ	150/-
19	بیکری کا انسائیکلو پیڈیا	روبینہ شاہ	150/-
20	200 ذائقوں میں مچھلی پکائیں مع چائیز کھانے	روبینہ شاہ	150/-
21	نئے چائیز کھانے	بیگم سید	120/-
22	سبز یوں کے پکوان	شمینہ شاہ	150/-
23	چاول کے پکوان	شمینہ شاہ	80/-
24	بیکری گائیڈ (اردو انگلش)	اعجاز شیخ	150/-

فرحت عباس شاہ

☆	شام کے بعد (جلد اول)	☆	شام کے بعد (جلد دوم)	165/-
☆	شام کے بعد (جلد سوم)	☆	یاد آؤں اگر اداسی میں	120/-
☆	ہم اکیلے ہیں بہت	☆	محبت خوبصورت ہے	150/-
☆	تم اداس مت ہونا	☆	مرا انتظار قدیم ہے	120/-
☆	آوارہ مزاج	☆	دکھ بولتے ہیں	150/-
☆	جم گیا صبر مری آنکھوں میں	☆	کہاں ہو تم	120/-
☆	خٹوں میں دفنایا ہوا جیون	☆	میرے دیران کمرے میں	120/-
☆	ملو ہم سے	☆	☆	350/-
☆	محبت کی آخری ادھوری لقم	☆	اداس شامیں اجاڑتے	120/-
☆	مت بول پیا کے لہجے میں	☆	مت بول پیا کے لہجے میں	120/-
☆	آکسی روز کسی دکھ دیکھ پنا کٹھے روئیں	☆	اک بار کہو تم میری ہو	120/-

120/-	☆ ایک سو بیس صدی کی پہلی نظم	300/-	☆ Sarabi
300/-	☆ Love	150/-	☆ After Evening
110/-	☆ الوداع پاکستان	150/-	☆ America My Friend
90/-	☆ تیرے دکھ نے رستہ بنادیا	110/-	☆ موت زدہ
120/-	☆ بارشوں کے موسم میں	90/-	☆ باغی شاعر
100/-	☆ میرے ساتھ چل	120/-	☆ اور تم آؤ
120/-	☆ من بچھی بے چین	150/-	☆ روگ
120/-	☆ آگ جنگل درود یار سے	200/-	☆ محبت ذات ہوتی ہے
120/-	☆ ساتھ دینا ہے تودے	120/-	☆ چاند پر زور نہیں
150/-	☆ سرائی	120/-	☆ روز ہوں گی ملاقاتیں
120/-	☆ آنکھوں کے پار چاند	120/-	☆ محبت گمشدہ میری
120/-	☆ ابھی خواب ہے	120/-	☆ اے عشق ہمیں آزاد کرو
150/-	☆ دن نکلتا نہیں	200/-	☆ سوال درد کا ہے
450/-	☆ یہ عجیب میری محبتیں	200/-	☆ ہم جیسے آوارہ دل

کمپیوٹر و درسی کتب

240/-	اعجاز احمد	جاوا 2 (سرٹیفکیشن گائیڈ)	-1
180/-	ارشاد محمود	انفارمیشن ٹیکنالوجی	-2
300/-	ارشاد محمود	C++ اور وژ پول Ver.6	-3
300/-	ارشاد محمود	A+ اے پلس مکمل ہارڈ ویئر گائیڈ	-4
180/-	محمد متین خالد۔ محمد ارشد عرش	پرنٹنگ ٹول نوٹ بک (23 فوٹ میں ICS)	-5
60/-	محمد متین خالد۔ رضوان احمد شاہ	پرنٹنگ آف کمپیوٹر سائنس (21 فوٹ میں ICS)	-6
70/-	محمد متین خالد۔ ارشد محمود شاہ	کمپیوٹر وائرس	-7
100/-	محمد متین خالد	کمپیوٹر خود سیکھیں	-8
150/-	محمد متین خالد۔ مقصود شیخ	کمپیوٹر کے مسائل اور ان کا حل	-9
60/-	ارشاد محمود شاہ	مائیکروسافٹ ونڈوز انسٹالیشن گائیڈ	-10
60/-	ارشاد محمود شاہ	مائیکروسافٹ ونڈوز نیٹ ورکنگ	-11
60/-	ارشاد محمود شاہ	فراز آسان ونڈوز 98	-12
140/-	ارشاد محمود شاہ	فراز آفس 4-2003	-13
60/-	ارشاد محمود شاہ	فراز آؤ ٹو کیڈ 2004	-14
60/-	ارشاد محمود شاہ	فراز ایکسل 4-2003	-15

75/-	ارشاد محمود شاہ	عالمی انٹرنیٹ ڈائریکٹری	-16
100/-	اعظم شیخ	انٹرنیٹ گائیڈ مع ویب ڈیزائننگ	-17
130/-	اعظم شیخ - محمد متین خالد	انٹرنیٹ ڈائریکٹری (بڑی)	-18
60/-	اعظم شیخ - محمد متین خالد	انٹرنیٹ ڈائریکٹری (پاکٹ سائز)	-19
120/-	محمد متین خالد	اسلام انٹرنیٹ پر	-20
120/-	اعظم شیخ - محمد متین خالد	پاکستان انٹرنیٹ پر	-21
100/-	اعظم شیخ - محمد متین خالد	SCIENCE ON NET	-22
180/-	مقصود شیخ	ای کامرس (کھل گائیڈ)	-23
100/-	فرحان ڈار	ان چے 2000	-24
120/-	اعظم شیخ	فلپس 5	-25
300/-	محمد متین خالد - مقصود شیخ	انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کی جدید دشمنی (اُردو اور انگریزی میں)	-26
180/-	راہدہ ارم شاہ - ڈاکٹر بشیر احمد شاہ	فوٹوشاپ 7	-27
150/-	ارشاد محمود شاہ	کورل ڈرا 11 مکمل گائیڈ	-28
150/-	ارشاد محمود شاہ	کورل ڈرا 12 مکمل گائیڈ	-29
160/-	ارشاد محمود شاہ	فراز آسان کمپیوٹر گائیڈ	-30
60/-	ارشاد محمود شاہ	مائیکروسافٹ ورڈ XP	-31
130/-	ارشاد محمود شاہ	مائیکرو میڈیا ڈریم ویور 2004	-32
150/-	رضوان احمد شاہ - نعمان احمد شاہ	مائیکروسافٹ ایکسس ڈیٹا بیس	-33
120/-	مقصود خالد	انڈین انٹرنیٹ ڈائریکٹری	-34
120/-	مقصود خالد	آٹو بیکنیشن	-35
150/-	سمیرا شاہ	اپنا موبائل فون خود مرمت کریں	-36
120/-	سمیرا شاہ	3/D سٹوڈیو میس 6	-37
60/-	سمیرا شاہ	ڈاس مکمل گائیڈ	-38
150/-	M.MATEEN KHALID	ENCYCLOPEDIA OF FAQ COMPUTER/ INTERNET PROBLEMS & SOLUTIONS	-39
130/-	Noman A. Shah, Rizwan A. Shah	Visual Basic 6.0	-40
150/-	Noman A. Shah, Rizwan A. Shah	Window XP Professional	-41
120/-	نوید سنیل (For B.A, B.Com, B.Sc, BCS)	British English Grammar & Composition	-42

210/-	اعجاز احمد	(M.C.S) S.Q.L	-43
225/-	اعجاز احمد	PL/S.Q.L (Oracle 6i)	-44
210/-	M.Rizwan Jameel Qureshi	Introduction to Information Technology (C,C++, Java, ASP)	-45
210/-	Khalid Mahmood Mughal	Self Paced Training	-46
80/-	ڈاکٹر سکندر حیات خیات	Introduction to Numerical Analysis	-47
150/-	محمد سہیل	ادویول اردو (مکمل سیلےبس اے پیج II)	-48
120/-	میاں عصمت اللہ	مطالعہ معاشیات (برائے ڈی کام O ڈی بی اے)	-49
سیاسی کتب			
250/-	چوہدری غلام رسول چیمہ	فصل جمہوریت	1
250/-	رائے نواز کھرل	اورزنجیر ٹوٹ گئی	2
300/-	چوہدری غلام رسول چیمہ	ذوالفقار علی بھٹو (ایسی پاکستان کا بانی)	3
600/-	مقدور اقبال	سقوط بغداد	4
500/-	مقدور اقبال	طالبان کی واپسی	5
200/-	فضل حسین اعوان	شہید جمہوریت کا قاتل کون	6
200/-	ستار چوہدری	لندن پلان	7
500/-	میجر (ر) امیر افضل خاں	پاکستان کی کہانی (حضور پاک کے سپاہی کی زبان)	8
200/-	مبین رشید	اگر ایران پر حملہ ہوا.....؟	9
250/-	کامران راجپوت	پارلیمنٹ کے خوبصورت چہرے	10
200/-	اعظم شیخ	دنیا کی نامور شخصیات کے معاشقے	11
400/-	قیصر چوہان	پاکستان لوٹنے والے ہاتھ	12
200/-	قیصر چوہان	ناموں کا گلدستہ	13
40/-	قیصر چوہان	SMS بڑا سائز (6 ٹائٹل)	14
300/-	قیصر چوہان	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارٹ I	15
300/-	قیصر چوہان	پارلیمنٹ سے بازار حسن تک پارٹ II	16
250/-	عارف صبح خان	اماں حواسے اماں کو ستر تک	17
200/-	حافظ شفیق الرحمان	نواز شریف جیتی بازی ہار گیا	18
250/-	ظہیر احمد باہر	پاکستان میں جمہوری حکومتیں قیام سے انجام تک	19

200/-	مرنعتی انجم	بیسویں صدی کے فوجی حکمران	20
300/-	محمد نواز کھرل	تمازہ ترین شخصیت پروفیسر طاہر القادری کی شخصیت کا تنقیدی جائزہ	21
200/-	محمد جاوید	پاک امریکہ تعلقات	22
200/-	مرنعتی انجم	سیاست آئین اور عدالت	23
200/-	زاہد گوگی	ادیبوں اور دانشوروں کے محاشقے	24
150/-	طاہر انجم	یہ ہیں ہمارے حکمران؟	25
120/-	طاہر انجم	پاکستان جانی کے دہانے پر	26
200/-	خالد چوہدری	سیاستدانوں کے محاشقے	27
250/-	مقبول ارشد	خفیہ رپورٹیں	28
100/-	منظر غنی چوہدری	جنسی لذت	29
150/-	نواز کھرل	شرافت کاستون (میاں محمد شریف)	30
180/-	میاں علاؤ الدین	جکی نوکری؟	31
350/-	بل کلنٹن (مترجم: زاہد گوگی)	میری زندگی	32
150/-	لئیق احمد	مائیکل جیکسن پاپ یا پانی گلوکار	33
220/-	سید ناصر علی	بد معاش امریکہ	34
220/-	سید ناصر علی	پاکستان میں امریکی سازشیں	35
160/-	ڈاکٹر ندیم احمد	صدام حسین	36
160/-	ڈاکٹر ندیم احمد	چیف جسٹس کی معطلی	37
150/-	انتخاب: احمد جاوید	انقلابی شاعری	38

ملک کے نامور قانون دان ایس۔ ایم۔ ظفر کی بہترین کتب

650/-	ایس۔ ایم۔ ظفر	میرے مشہور مقدمے	1
150/-	ایس۔ ایم۔ ظفر	پاکستان بنام کرپشن عوام کی عدالت میں	2
200/-	ایس۔ ایم۔ ظفر	ڈکٹیٹر کون	3
250/-	ایس۔ ایم۔ ظفر	عوام پارلیمنٹ اسلام	4
175/-	ایس۔ ایم۔ ظفر	عدالت میں سیاست	5

انگریزی کتب

500/-	Muhammad Sharif Baq	Quranic Topics (Vol:1)	-1
500/-	Muhammad Sharif Baq	Quranic Topics (Vol:2)	-2
60/-	Fateh Muhammed Jallendhri	Quranic Advices	-3
80/-	S-Hamgah Saleem Gilani	A Pound of Flesh	-4
150/-	Allama Muhammad Iqbal (کے 7 مشہور و معروف خطبات)	The Reconstruction of Religious thought In Islam	-5
220/-	Zia-ud-Din Lahori	Hijra of Christian Calendars	-6
200/-	Ch. Mushtaq Ahmad (بنگلہ کے امتحان کیلئے رہنما کتاب)	Management & People in Banking	-7
120/-	Dr. Asif Mahmood Jafar	TEENAGE TINGLINGS	-8
120/-	Naveed Abdullah Khan Sumbal (For B.A, B.Com, B.Sc, BCS)	British English Grammar & Composition	-9

مکتبہ جمال

250/-	مولانا عبدالرازق طلیح آبادی	ذکر آزاد (مولانا ابوالکلام کی رفاقت میں ۳۸ سال)	1
100/-	مرتبہ: ڈاکٹر سید عبداللطیف	تصویرات قرآن (مولانا ابوالکلام آزاد)	2
100/-	مرزا اسد اللہ خاں غالب	دیوان غالب (پاکٹ)	3
250/-	مرزا اسد اللہ خاں غالب	دیوان غالب (فرہنگ کے ساتھ)	4
700/-	علامہ محمد اقبال	کلیات اقبال (فرہنگ کے ساتھ)	5
200/-	پروفیسر ڈاکٹر محمود سعید عالم قاسم	عصر حاضر میں اسوہ رسول اکرم کی معنویت	6
100/-	مولانا محمد منظور نعمانی	خطبات بمبئی	7
200/-	مولانا سعید احمد اکبری آبادی	اسلام میں غلامی کی حقیقت	8
200/-	محمد مظہر الدین صدیقی	اسلام کا نظریہ تاریخ	9
250/-	میاں محمد شفیع	1857ء کی پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)	10
300/-	ڈی۔ ایچ۔ واٹسن / پروفیسر افتخار احمد	ہزارہ گزٹینئر	11
250/-	ڈاکٹر شیر بہادر خان پٹی	تاریخ ہزارہ	12
200/-	مولانا محمود الرحمن ندوی	دولت غزنویہ (سلطان محمود غزنوی اور ان کے جانشین)	13
200/-	پروفیسر محمد عارف	کشمیر تاریخ کے آئینے میں	14

15	پاکستان سے اقبالستان تک	پروفیسر محمد عارف	250/-
16	نبی کریم ﷺ کی مبارک سلیس	مولانا ابوالمظفر ظفر احمد قادری	120/-
17	فضائل درود شریف	مولانا محمد زکریا	100/-
18	فضائل رمضان	مولانا محمد زکریا	60/-
19	آداب الدعاء	مولانا محمد اجمل خان	150/-
20	کامیاب زندگی کا تصور	پروفیسر انور دل	100/-
21	اسلام کی دنیا	ایڈیٹر تھ ہارڈر / بشری سمیل	100/-
22	گھر ملیو از مودہ نسوں کا انسائیکلو پیڈیا (قدیم حکماء کی تحقیقات کا مجموعہ)	سید امتیاز علی تاج	150/-
23	پروفیشنل بیوٹیشن بنیے	آسیہ آرزو	130/-
24	بہار شباب	حکیم غلام محمود خان	120/-
25	وادئ کاغان (تاریخ، لوگ، ثقافت، سیاحت)	منصب خان صاحب	200/-
26	مشرق کا سویٹزر لینڈ (وادئ سوات)	محمد پرویش شاہین	80/-
27	کافرستان کے رسم و رواج	محمد پرویش شاہین	80/-
28	سوات (کوہستان)	محمد پرویش شاہین	80/-
29	وادئ دیر..... کوہستان (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	محمد پرویش شاہین	100/-
30	وادئ چترال (تاریخ، ثقافت، سیاحت)	محمد پرویش شاہین	100/-
31	جہاں تین سلطنتیں ملتیں ہیں	ای ایف نائٹ / ظفر حیات پال	500/-
32	بروہو قبائل اور بروہال	سید محمد یحییٰ شاہ الحسینی	300/-
33	ہماری حقیقت (سائنس انسان اور کائنات)	محمد آفتاب	200/-
34	چمیل ہلے	محمد صدیق تنہا	250/-
35	پہلا قدم	ڈاکٹر سائرہ محبوب	100/-

کتب مولانا ابوالکلام آزاد

☆	تذکرہ	☆ 250/-	☆	مسلمان عورت	120/-
☆	قول فیصل	☆ 120/-	☆	قرآن کا قانون عروج و زوال	100/-
☆	انسانیت موت کے دروازے پر	☆ 120/-	☆	صدائے حق	90/-
☆	رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے آخری لمحات	☆ 70/-	☆	ام الکتاب	180/-
☆	غبار خاطر	☆ 250/-	☆	حقیقت الصلوٰۃ	80/-
☆	فیضان آزاد (منتخب ابوالکلام آزاد)	☆ 70/-	☆	شہادت حسین رضی اللہ عنہ	120/-

☆	☆	☆	☆	☆	☆
300/-	100/-	☆	☆	☆	☆
90/-	140/-	☆	☆	☆	☆
50/-	70/-	☆	☆	☆	☆
100/-	70/-	☆	☆	☆	☆
120/-	250/-	☆	☆	☆	☆

کلاسیک شعراء کے دیوان

☆	☆	☆	☆	☆	☆
50/-	50/-	☆	☆	☆	☆
50/-	50/-	☆	☆	☆	☆
50/-	50/-	☆	☆	☆	☆
75/-	50/-	☆	☆	☆	☆
50/-	50/-	☆	☆	☆	☆
50/-	50/-	☆	☆	☆	☆

صفہ فاؤنڈیشن

20/-	عمر حیات قادری	1- مسلمان خواتین کے نام اہم پیغام
35/-	مفتی محمد اقبال سعیدی	2- جرم توہین رسالت (فقہ حنفی کی روشنی میں)
18/-	جمید الاسلام امام محمد غزالی رحمہ اللہ: مفتی محمد خان قادری	3- قرآن اور روحانی علوم
25/-	تصنیف: شیخ عبداللہ سراج الدین شامی ترجمہ: مفتی محمد خان قادری	4- وسعت علم نبوی
35/-	تصنیف: شیخ زینی دحلان شافعی رحمہ اللہ ترجمہ: مولانا یونس اختر مصباحی	5- مسائل توکل و زیارت
25/-	مصنف: ڈاکٹر یحییٰ ابن عبداللہ مانع الحمیری ترجمہ: حضرت مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری	6- خواب میں دیدار مصطفیٰ ﷺ کی بہاریں قیامت تک جاری ہیں

متفرق کتب

150/-	الحاج سراج احمد عادل	1 قصص الانبیاء مجلد
150/-		2 قصص الانبیاء مجلد
24/-	(مصنف: سبیل ٹولے) (مترجم: آغا شرف)	3 شہد حسن و صحت کیلئے
24/-	ڈاکٹر اقبال کاردار	4 شہد سے علاج
25/-	حافظ اکرام الدین صاحب واعظ	5 طب نبوی

28/-	سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی	6	رسول اللہ ﷺ کے تین سو معجزات
200/-	محمد حبیب قادری	7	خزینہ مشکل کشا
60/-	سید آفاق حسین	8	چهار قل سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج
60/-	سید آفاق حسین	9	کلمہ طیبہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج
60/-	سید آفاق حسین	10	آیت کریمہ سے دینی و دنیاوی بیماریوں کا علاج
100/-	خواجہ محمد اسلام	11	موت کا منظر
120/-	مولانا امتیاز احمد علوی	12	اصولۃ الرسول
60/-	مسعود مفتی	13	کتاب الشفا
150/-	روبینہ شاہ	14	منفرد کھانوں کی منفرد ترکیبیں
150/-	روبینہ شاہ	15	بکیری کا انسائیکلو پیڈیا
180/-	روبینہ شاہ	16	200 ذائقوں میں چھلکی پائیں معہ چائیز کھانے
130/-	ثمینہ شاہ	17	گھر لیٹو ٹکے
120/-	ثمینہ شاہ	18	پیوٹی کوئیکشن
90/-	ارنسٹ ہینگنگر کا مشہور عالم ناول	19	بوڑھا اور سمندر (ناول)
90/-	ڈاکٹر گھڑا احمد	20	جادو اور سحر کا قرآنی علاج
120/-	مولفین: بیگم سید	21	نئے چائیز کھانے
150/-	ثمینہ شاہ	22	بزیوں کے پکوان
80/-	ثمینہ شاہ	23	چاول کے پکوان
100/-	حافظ مظفر محسن	24	ستارے اپنے اپنی قسمت کے
120/-	علی نواز شاہ	25	دہشت زدہ گرد (ناول)
120/-	علی نواز شاہ	26	فیمل (ناول)
100/-	کاشف فرازا احمد	27	خوشگوار زندگی کے اصول
120/-	کاشف فرازا احمد	28	اپنا علاج خود کریں
150/-	کاشف فرازا احمد	29	کامیاب مستقبل کے راز
120/-	ٹارا کبیر آبادی	30	شعر اور فن شعر
150/-	عزیز فقیر ویرسپائی	31	وارث لیکھا
250/-	ذوالفقار راشد گیلانی	32	تاریخ کا سفر
300/-	منصور بٹ	33	حکایات کا انسائیکلو پیڈیا
120/-	ڈاکٹر ذاکر نایک مترجم: سہیل بابریگ	34	اسلام میں عورت کا مقام
200/-	حکیم محمد طارق محمود چٹائی	35	خواتین کی اسلامی زندگی کے سائنسی حقائق

300/-	عبدالحمید شرر	تاریخ سندھ	36
200/-	کے آر کرپانی	مہاتما گاندھی	37
180/-	ضیاء الدین اکمل	قدیم تاریخ	38
180/-	ڈاکٹر میر ولی الدین	قرآن اور تصوف	39
180/-	کرمل ملین	شہنشاہ اکبر	40
150/-	کرمل سچا پیٹرن ترجمہ: سید علاؤ الدین	تساو کے آدم خور	41
200/-	آصف حسن	خدا اور سائنس	42
200/-	ایس ایچ علوی	روحانیت اور علم الاعداد	43
130/-	محسن اسحاق ورک	بہترین مزاحیہ شاعری	44
200/-	ایچ رائیڈ ریگر ترجمہ: سید علاؤ الدین	حضرت سلیمان کا فزانہ	45
200/-	ایس ایچ علوی	روح کا سفر	46
250/-	ڈاکٹر حشمت جاہ	قرآن اور جدید سائنس	47
300/-	ژنی کانپوری	ذکر جب چھیڑا گیا	48
300/-	مفتی شوکت علی فہمی	ہندوستان پر مغلیہ حکومت	49
120/-	اقبال احمد	اولیاء سندھ	50
300/-	مفتی شوکت علی فہمی	ہندوستان پر اسلامی حکومت	51
300/-	مرزا محمود علی	ارواح الجحیر	52
180/-	زینبدر کرشن سنہا ترجمہ: کیلاش چند چوہدری	مہاراجہ رنجیت سنگھ	53
300/-	شفیع عقیل	سرخ سفید سیاه	54
450/-	ڈاکٹر محمد اسماعیل دہلیوی شہری	بلوچ تاریخ اور عرب تہذیب	55
200/-	قرقریشی	محمد شاہ رگھبلا	56
300/-	ژنی کانپوری	داستان کہتے کہتے	57
250/-	ہر ہولنس دلائی لامہ ترجمہ: سید علاؤ الدین	خوش رہنے کا فن	58
350/-	ڈاکٹر ڈاکرنا نیک ترجمہ: سمیل بابر بیک	خطبات (والیم 1) ڈاکرنا نیک	59
150/-	علی نواز شاہ	کالک (ناول)	60

مکتبہ داستان کے تاریخی ناول

840/-	عنایت اللہ	داستان ایمان فروشوں کی (تین جلد)	1
440/-	عنایت اللہ	شمشیر بے نیام (دو جلد)	2
280/-	عنایت اللہ	ایک اور بت شکن پیدا ہوا (اول)	3
200/-	عنایت اللہ	ایک اور بت شکن پیدا ہوا (ادوم)	4

220/-	عنايت اللہ	ستارہ جٹوٹ گیا	5
250/-	عنايت اللہ	حجاز کی آمدی	6
150/-	عنايت اللہ	چار دیواری کی دنیا	7
150/-	عنايت اللہ	کشمیر کے حملہ آور اور پنڈی سازش کیس	8
200/-	عنايت اللہ	دشمن کے قید خانے میں	9
170/-	احمد یار خان	کار، شلووار اور دوپٹہ	10
170/-	احمد یار خان	ایک رات کی شادی	11
170/-	احمد یار خان	داستان ایک داماد کی	12
160/-	عنايت اللہ	لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ	13
150/-	عنايت اللہ	لہو جو ہم بہا کے آئے	14
180/-	عنايت اللہ	استانی اور نیکی درانیور	15
170/-	عنايت اللہ	جب میں تھمہ بنی	16
170/-	عنايت اللہ	دو پلو کی کہانی	17
180/-	عنايت اللہ	ہماری شکست کی کہانی	18
170/-	عنايت اللہ	لاہور کی دہلیز پر	19
120/-	شمیر حسین	روحانی مسرت جسمانی قوت	20
120/-	کیپٹن ڈاکٹر نصیر اے۔ شیخ	زندہ رہو جوان رہو	21
180/-	عنايت اللہ	میں کسی کی بیٹی نہیں	22
170/-	عنايت اللہ	بہرے کا جگر	23
170/-	عنايت اللہ	الکھے راستے	24
200/-	عنايت اللہ	طاہرہ	25
150/-	عنايت اللہ	خاک و ردی لال ہو (اول)	26
150/-	عنايت اللہ	خاک و ردی لال ہو (دوم)	27
180/-	عنايت اللہ	بی آربی بہتی رہے گی	28
270/-	عنايت اللہ	ڈوب ڈوب کے ابھری ناؤ	29
180/-	عنايت اللہ	پرچم اڑتا رہا	30
طارق اسماعیل ساگر			
250/-	☆ بے نام سی عقیدت	☆ میں ایک جاسوس تھا	300/-
250/-	☆ چٹاروں کے آئسو	☆ وطن کی مٹی گواہ رہنا	300/-
250/-	☆ کریک ڈاؤن	☆ کمانڈو	250/-

200/-	☆ فالگن کون تھا	250/-	☆ کفارہ
250/-	☆ گرفت	250/-	☆ ذیل کراس
250/-	☆ سازش	250/-	☆ را
200/-	☆ دھویں کی دیوار	180/-	☆ آپریشن بلیوٹار
100/-	☆ جب دشمن نے لٹکرا	200/-	☆ ریڈارٹ
200/-	☆ بیس کمپ	250/-	☆ ٹارگٹ پاکستان تھا
250/-	☆ کورٹ مارشل	200/-	☆ شیریں کانت
200/-	☆ الاؤ	250/-	☆ محاصرہ
250/-	☆ مسافت	300/-	☆ اے راہ حق کے شہیدوں
200/-	☆ اسامہ بن لادن	300/-	☆ جاسوس کیسے بنتا ہے
300/-	☆ حمود الرحمن کمیشن رپورٹ	250/-	☆ وادی لہورنگ
200/-	☆ کٹ آؤٹ	250/-	☆ کارگل کراسس
250/-	☆ ڈرگ مافیا	250/-	☆ کراس فائر
250/-	☆ وادی لہورنگ	200/-	☆ بھارت ٹوٹ جائے گا
200/-	☆ پھندہ	200/-	☆ ٹارگٹ کھوٹ
250/-	☆ بھٹکا ہوا راہی	250/-	☆ اور حصار ٹوٹ گیا
250/-	☆ فکلیج	250/-	☆ دہشت گرد
300/-	☆ پاکستان عالمی سازش کے زرخے میں	120/-	☆ دیوتا کی موت

نامور ناول نگار ایم۔ اے۔ راحت

1	گرین فورس	ایم۔ اے۔ راحت
2	بھید	ایم۔ اے۔ راحت
3	آتش زدہ	ایم۔ اے۔ راحت
4	دیوتا کی واپسی	ایم۔ اے۔ راحت
5	نشیب	ایم۔ اے۔ راحت
6	زہر	ایم۔ اے۔ راحت

مطبوعات SKY 7 پبلی کیشنز

1	میری زندگی	بل کلنٹن (زاہد گولی)	350/-
2	بابا گرو نانک (تعلیمات، کلام اور حالات زندگی)	سردار جی سنگھ (مترجم: امیر علی خان)	250/-
3	مشہور عالمی شخصیات	کامران احمد۔ اورنگزیب	250/-

4	کباب پسندے چاہیے	نمل مسعود	150/-
5	بہت یاد آنے لگے ہو	نجمہ مسعود	150/-
6	روحانیت اور جنسی لذت	گر وادشو	120/-
7	تمہارے اداس ہونے کے دن نہیں	نجمہ منصور	200/-
8	تاریخ فرعون	خواجہ حسن نظامی	250/-
9	SMS پاکت سائز (12 ٹائٹل)	محمد قیصر چوہان	25/-
10	قصص الانبیاء	حاجی سراج احمد عادل	130/-
11	سچا خواب نامہ	شیخ محمد حسین آزادی اجیری	80/-
12	سیرت عائشہؓ	علامہ سلیمان ندویؒ	120/-
13	پاکستان ٹریول گائیڈ	مسعود مفتی	200/-
14	منفرد پیکر سٹائل	نادیہ عامر	150/-
15	ناموں کا گلدستہ	محمد قیصر چوہان	200/-
16	SMS بڑا سائز (6 ٹائٹل)	محمد قیصر چوہان	40/-
17	تذکرہ الاولیاء	حضرت شیخ فرید الدین عطاء	150/-
18	کتاب الحج و عمرہ	الحاج اویس عمر	150/-
19	عورت کی حکمرانی اسلام کے آئینہ میں	علامہ فلک شیر	
20	لندن پلان	ستار طاہر	200/-
21	حج و عمرہ پاکت سائز	علامہ امتیاز احمد علوی	40/-
22	انسائیکلو پیڈیا آف اسلام	نجمہ منصور۔ مسعود مفتی	300/-
23	بیوٹی کیر	صائمہ خالد	120/-
24	عورت اور مرد میری زندگی میں	خسونت سنگھ۔ زاہد گوگی	160/-
25	لبیک	ممتاز مفتی	120/-
26	مسائل بہشتی زیور	مولانا اشرف علی تھانوی	70/-
27	سلام قائد اعظم (سوالا جوابا)	نجمہ منصور	60/-
28	تحفہ العروس	علامہ محمود مہدی انتہولی	180/-
29	ہنر	مقصود شیخ	250/-
30	پاکستانی کھانوں کا انسائیکلو پیڈیا	نفسیہ بیگم	150/-
31	قدیم ترین، مجموعہ روحانی تعویذات	مسعود مفتی	200/-
32	ایس۔ ایم۔ ایس (چار بکس)	ادارہ	20/-

کتب ابلاغ پبلشرز

350/-		سیرت ابن ہشام	1
200/-		بزرگ شہری	2
150/-		دیوان غالب	3
150/-		چادر صحرا	4
350/-		جلال و جمال	5

عالمی شہرت یافتہ کتب کے مترجم

250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	کامیابی اور روحانی مسرت (ڈورس پوزی)	
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	الفاظ کا جادو (جے۔وی۔سرنی)	
200/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	ٹال مول کی عادات سے نجات (ریٹائٹ)	
150/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	ہندومت (شکتیلاکھن ناتھ)	
300/-	قیصر چوہان	چارلی چپلن کی آپ بیتی	
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	با اصول لیڈر شپ (سٹیفن آر۔کووے)	
200/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	اعتماد کی قوت (سٹیفن آر۔کووے)	
250/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	اہم کام پہلے (سٹیفن آر۔کووے)	
190/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	اپنے گھر کا جم خانہ	
150/-	کیئٹھ گریگ مترجم: مسعود مفتی	مینار کی پکار	
	مترجم: مسعود مفتی	اسلامی معاشروں کی تاریخ	
	مترجم: قیصر چوہان	راہول ڈریوڈ (آپ بیتی)	
150/-	اے۔پی۔پریا مترجم: امجد جاوید	کامیابی 30 دنوں میں	
300/-	شیمامجید	ٹیکسیز کے مشہور ڈرامے	
300/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	مثالی کوچنگ	
300/-	مترجم: حافظ مظفر محسن	گڈ بزنس	
	ہارون میاں	انسانی تخلیق	